اوّل

رشید حسن خاں

تحریروں کے آئینے میں

(رشید حسن خاں کے ادبی کارناموں پر لکھی گئی تحریروں کا دستاویز)

مرتب

ابراہیم افسر

رشید حسن خاں
تحریروں کے آئینے میں

رشید حسن خاں کے ادبی کارناموں پر لکھی گئی تحریروں کا دستاویز

مرتبہ

ابراہیم افسر

''یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔
شائع شدہ مواد سے اُردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے''۔

RASHEED HASAN KHAN TEHREERO'N KE AAIENE MAIN

(Vol-1)

Edited by:

Ibraheem Afsar

Ward No-1, Mehpa Chauraha Nagar, Panchayt Siwal khas Distt, Meerut (UP)250501
+ 91 98970 12528, 80773 19637 || ibraheem.siwal@gmail.com

Year of Edition: 2019

ISBN: 978-93-84271-19-0

Price: ` 323/-

نام کتاب	:	رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں (جلد اوّل)
		(رشید حسن خاں کے ادبی کارناموں پر لکھی گئی تحریروں کا دستاویز)
مرتب و ناشر	:	ابراہیم افسر
سن اشاعت	:	۲۰۱۹ء
قیمت	:	-/۳۲۳ روپے
صفحات	:	۵۵۶
تعداد	:	۵۰۰
مطبع	:	ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

New Bismah Kitab Ghar

Distributor:

Kitabi Duniya

1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,
Opp. Anglo Arabic School, Turkman Gate, Delhi-110006 (INDIA)
M: 9313972589, 8826741174, 8929421423 Ph: 011-23288452
E-mail:kitabiduniya@rediffmail.com
kitabiduniya@gmail.com

خدائے تدوین
رشید حسن خاں کے نام

فہرست

مقدمہ

اُردو ادب میں رشید حسن خاں (1925-2006) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ تحقیق کی دنیا میں ان کا نام حافظ محمود خاں شیرانی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مختار الدین احمد کے بعد بڑے ہی ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ تحقیق و تدوین کی دنیا میں رشید حسن خاں کو ید طولیٰ حاصل رہا ہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی تحقیقی کاوشوں سے اُردو تحقیق و تدوین کو نئی سمت و جہت عطا کی۔ تحقیق و تدوین کو انھوں نے تاعمر اوڑھنا اور بچھونا بنایا۔ ان کی تحقیقی و تدوینی کاوشیں نئی نسل

اور آنے والی نسلوں کے لیے نہ صرف ایک مثالی نمونہ ہیں بل کہ میری نظر میں یہ مشعل راہ ہیں۔ رشید حسن خاں کی ان تحقیقی کاوشوں کو سامنے رکھ کر نئی نسل تحقیق کے آداب سیکھ رہی ہے۔ موصوف نے اپنی عمر عزیز کا بیش تر حصہ قدیم اور کلاسیکل مخطوطوں کے غائر مطالعے میں گزرا۔ دراصل کلاسیکل مزاج ان کی روح میں سرایت کر گیا تھا۔ رشید حسن خاں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اگر وہ کسی کلاسیکی فن پارے کی تحقیق و تدوین کا ارادہ کرتے تو اس کی اطلاع اپنے ادب نواز دوستوں کو بہ ذریعہ خط ضرور دیتے ان کی اس ادبی اور شعوری عادت نے اُردو مخطوطات شناسی میں گراں بہا اضافہ کیا۔ رشید حسن خاں نے تحقیق کے آداب قاضی عبدالودود سے سیکھے۔ قاضی صاحب کو انھوں نے تحقیق کا معلم ثانی اور حافظ محمود شیرانی کو تحقیق کو معلم اول قرار دیا۔ تدوین میں انھوں نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی پیروی کی۔ تنقید میں نیاز فتح پوری کی تحریروں اور رسالہ 'نگار' کے مطالعہ سے اپنے تنقیدی شعور میں نئی منازل طے کیں۔ نیاز فتح پوری کی تنقیدی تحریروں کے علاوہ رشید حسن خاں کلیم الدین احمد کی بے باک اور دوٹوک تنقیدی سطور کے بھی معترف اور مداح تھے۔ مشرقی علوم اور مشرقی شعریات پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ ان کے معاصرین ادبا، محققین، مدونین اور ناقدین نے ان کی تحقیقی و تدوینی فتوحات پر رشک کیا۔ معاصرین نے ان کی تحقیقی و تدوینی خدمات کے اعتراف میں انھیں کئی القاب و آداب سے سرفراز کیا۔ پروفیسر گیان چند جین نے ''خدائے تدین، انتظار حسین نے ''تعمیری محقق، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے ''خاتم المدونین'' شان الحق حقی نے ''اُردو میں اصول تدوین کا مجدد'' جمیل جالبی کے مطابق ''رشید حسن خاں کی تدوینات آنے الی نسلوں کے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں'' ڈاکٹر اسلم پرویز نے رشید حسن خاں کے اسلوب اور علم اکتسابی کی گہرائی اور گیرائی، قطعیت اور سائنٹفک نقطۂ نظر کے لحاظ سے ان کی زبان کو ''دستاویزی زبان'' کہا، محمد سعید نے انھیں ''اُردو کے پہلے ترقی پسند محقق'' قرار دیا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے رشید حسن خاں کی تحقیق کو اُردو کی تحقیقِ کلٹ (Cult) کہہ کر یاد کیا۔ پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، مشفق خواجہ، جمیل جالبی، مالک رام، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر مسعود حسین رضوی ادیب، پروفیسر نیر مسعود، پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر عبدالستار دلوی اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ اصحاب قلم نے ان کے تحقیقی، تدوینی اور تنقیدی کاموں کو نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھا بل کہ ان کے کارناموں پر وقت بہ وقت خامہ فرسائی بھی کی۔ رشید حسن خاں بیک وقت محقق، مدون اور نقاد کے ساتھ ساتھ ماہر املا، زبان و قواعد، تبصرہ نگار، مخطوطہ شناس، مشرقی علوم کے قدرداں، عربی، فارسی اور اُردو کے مایہ ناز عالم، اُستاد، خطیب اور مقرر بھی تھے۔ نابغۂ روزگار شخصیت رشید حسن خاں نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے بعد ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ آرڈیننس کلودنگ فیکٹری شاہ جہاں پور کی ملازمت سے 1945 میں برطرف کیے جانے کے بعد رشید حسن خاں نے بریلی سے نکلنے والے رسالے ''ندرت'' میں کام کرتے ہوئے اپنے ادبی شعور اور ذہنی بالیدگی میں اضافے کے علاوہ رسائل و جرائد کی فنی باریکیوں سے خوب واقفیت حاصل کی۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 'شعری تنقید' سے کیا، ایسا ناقدین ادب کا ماننا ہے۔ لیکن اس کے برعکس رسالہ نگار جلد 58 شمارہ 6، دسمبر 1950 میں رشید حسن خاں کا ایک مضمون ''افسانے میں نفسیاتی و جنسیاتی میلانات'' کے عنوان سے موجود ہے۔ اس مضمون کی مطالعہ کرنے کے بعد رشید حسن خاں کی شعری تنقید پر اولیت (جسے ایک زمانے سے زیادہ تر حضرات نے سند اور دعوے کے طور پر پیش کیا ہے) کا بھرم کھل جاتا ہے۔ ساتھ ہی بات بھی مترشح ہو جاتی ہے کہ رشید حسن خاں اُردو شاعری کی تنقید سے قبل اُردو فکشن پر بھی تنقیدی نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہ بات دیگر ہے کہ بعد کے زمانے میں رشید حسن خاں کا رجحان اُردو شاعری کی تنقید کی جانب ہوا۔ رشید حسن خاں کی فکشن تنقید کے حوالے سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ درزی خانہ شاہ جہاں پور میں ملازمت کے دوران انھوں نے جو فکشن پڑھا تھا ممکن ہے یہ مضمون اسی روش کا نتیجہ تھا۔ دراصل فکشن تنقید کے لیے وسیع مطالعہ اور عمیق مشاہدے کا ہونا ضروری ہے۔ اور رشید حسن خاں کے پاس مطالعے کے لیے وقت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اشتراکی نظریے کے حامی لیڈر درزی خانہ میں ان کے ساتھ کام کرتے تھے۔ اس مضمون میں رشید حسن خاں نے اشتراکی نظریات سے متاثر ہو کر افسانہ تخلیق کرنے والے ہندوستانی ادیبوں کو تنقید کا نشانہ بنایا، ساتھ ہی کارل مارکس کے اس نظریے کی بھی سخت لہجے میں تردید کی کہ ''مذہب انسان کے لیے افیون ہے۔'' موصوف کی نظر میں یہ نظریہ غلط تھا۔ کیوں کہ خاں صاحب افیون کی پھبتی مذہب کے بجائے حقیقت فراموش فن کاروں کے ترقی پسند آرٹ کے لیے زیادہ نقصان دہ تسلیم کرتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ افسانہ نگار زیادہ کامیاب ہے جو حقیقت کو بیان کرے۔ رشید حسن خاں نے اپنے نظریات کو واضح کرتے ہوئے تحریر کیا:

> ''افسانہ نویس معاشرت کے ہر حصے کا نقاد ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ہر طبقے اور ہر فرد کی زندگی یکساں نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہر شخص کے خیلات ایک طرح کے۔ اب اگر کوئی افسانہ نگار صرف ایسے ہی واقعات کا ذکر کرے جن میں صرف جنسیاتی تصادم کارفرما ہے تو یقیناً ہم اس کو ایمان دار نہیں کہہ سکتے اور ہم کو ماننا ہوگا کہ فن کار اس تلذذ میں اتنا از خود رفتہ ہے کہ وہ اس کے سوا کسی چیز کو پسند ہی نہیں کرتا۔ قدیم قصے کہانیوں اور داستانوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں غیر متعلق باتیں زیادہ ہوتی ہیں اور آغاز و انجام بھی ایک سا ہوتا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو ہمارے ان افسانہ نگاروں میں بھی یہی سپاٹ پن ملتا ہے۔ یہ حضرات ہر قسم کے واقعات میں جنسی محرکات کو اس طرح ملا دیتے ہیں گویا دنیا میں اب سوائے ان کے اور کوئی بات ہے ہی نہیں۔ (جیسے ممتاز مفتی، عصمت، منٹو وغیرہ کے افسانے) اس قسم کے افسانوں کا پورا مجموعہ پڑھ جایئے، چیختے ہوئے الفاظ کے ساتھ مریضانہ ومہنیت کا بیان اس ہمہ گیری کے ساتھ ملے گا جیسے ایک یہی اصل حیات ہو۔ جنسیات کی اہمیت سے انکار نہیں۔ لیکن اس کو اس طرح پیش کرنا کہ اس سے ذوق تلذذ بڑھے کوئی اچھی بات نہیں۔ ادب کو ''تنقید حیات'' کہا گیا ہے۔ لیکن حیات اتنی پابند نہیں کہ وہ صرف ''تنگنائے جنس'' ہی کی نذر کر دی جائے۔ یہ تو درحقیقت مکرہ قسم کی

رجعت پرستی ہے۔آخر قدیم ادب کے اس خواب آور سرمائے اور اس ذخیرے میں فرق ہی کیا ہے۔ بل کہ یہ تو ذہن کو اور زیادہ مفلوج کرنے والی ہے۔''

(رسالہ نگار، اڈیٹر نیاز فتح پوری، جلد 58، شمارہ 6، دسمبر 1950، صفحہ 37 تا 40)

رشید حسن خاں نے اپنی تنقید میں اپنے زمانے کے مشہور شاعروں کے کلام کی زبان و بیان پر طویل مضامین سپرد قلم کیے۔ رشید حسن خاں نے جن شاعروں کے کلام کا ادبی Post-mortem کیا ان میں فیض احمد فیضؔ، جوشؔ ملیح آبادی، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، نوبت رائے نظرؔ وغیرہ کے اسماسرِ فہرست ہیں۔ فیض احمد فیضؔ کی شاعری پر انھوں نے اپنا پرچہ سب سے پہلے دہلی میں ''انجمن تعمیر اُردو'' کے اجلاس میں پڑھا تھا۔ اُس وقت فیضؔ کی شہرت بلندیوں پر تھی۔ ان کی شاعری میں زبان و بیان کی کمیوں اور خامیوں کو طشت از بام کرنا بقول رفعت سروشؔ ''بڑے دل گردے کا کام تھا۔'' دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت کرنے سے پہلے رشید حسن خاں کی شناخت ایک ایسے مصنف کی بن چکی تھی جو شاعری بالخصوص اُردو شاعری کی زبان و بیان پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اس شہرت نے انھیں برصغیر کے اُردو حلقوں میں متعارف کرایا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ رشید حسن خاں نے فیض احمد فیضؔ کی شاعری کے علاوہ جس مایہ ناز ادیب و شاعر کے کلام، زبان اور بیان پر گرفت کی ان میں فراقؔ گورکھپوری کا نام بھی شامل ہے۔ رسالہ تحریک نومبر 1955 کے شمارے میں فراقؔ کی شاعری پر رشید حسن خاں نے باقاعدہ ایک مضمون ''شعر میں لفظ واسلوب کی اہمیت'' لکھا جس میں فراقؔ کی شعری، فنی وعروضی غلطیوں کو منظر عام پر لایا گیا۔ رشید حسن خاں کے اس مضمون کا فراق صاحبؔ نے تہِ دل سے شکریہ تو ادا کیا لیکن رسالہ تحریک کے اڈیٹر گوپال متل کے نام ایک طویل خط نما مضمون رقم کیا۔ اس خط میں رشید حسن خاں کے ان کی شاعری پر اٹھائے گئے سوالیہ نشانات کا تفصیلی جواب دیا گیا۔ مدیر رسالہ تحریک گوپال متل نے فراقؔ گورکھپوری کا پورا خط من وعن شائع کیا۔ ساتھ ہی رشید حسن خاں کا جواب فراقؔ کے نام کو بھی من وعن شائع کیا گیا۔ یہ دونوں خطوط رسالہ تحریک کے بیس سالہ انتخاب نمبر میں صفحہ 604 سے 612 کو محیط ہے۔ میں یہاں فراقؔ گورکھپوری اور رشید حسن خاں کے مراسلوں کے چند اقتباس پیش کررہا ہوں تاکہ قارئین یہ اندازہ لگاسکیں کہ اپنے وقت کے ایک بڑے شاعر اور ایک ابھرتے ہوئے محقق و ناقد کی زبان، بیان اور اسلوب کا پیرایہ کتنا دل کش اور سادہ ہے۔ فراقؔ گورکھپوری کے طویل خط سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے رشید حسن خاں کے مضمون کے جواب میں رسالہ تحریک کے مدیر کے نام رقم کیا تھا:

''تحریک کے اسی شمارے میں رشید حسن خاں کا مضمون ''شعر میں لفظ و اسلوب کی اہمیت'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس عنوان کی اہمیت کا میں دل سے قائل ہوں۔ اور موصوف کی کئی باتوں سے مجھے اتفاق ہے۔ اس اہم موضوع پر پہلے کچھ تمہیدی طور پر عرض کروں، کسی زندہ زبان وادب کے بڑے سے بڑے لکھنے والوں سے بڑی بڑی فنّی غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ سنسکرت کے عالموں سے پوچھیے تو شاعر اعظم کالی داس کے یہاں ڈھیروں غلطیاں زبان اور گریمر کی نکال دیں گے۔ کالی داس کی نرنکشتا (مطلق العنانی) کے نام سے ہندی کی مشہور کتاب شائع ہوچکی ہے۔ کئی برس ہوئے الٰہ آباد یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ عربی و فارسی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے ایک بڑا مقالہ کلام حافظ میں کلام کے عنوان سے شائع کیا تھا، جس میں صرف حافظ کے یہاں اتنی زیادہ تعداد میں غلطیاں گنوائی تھیں جتنی کسی مشہور شاعر کے یہاں اب تک نہیں بتائی گئیں۔ غالبؔ اور مرزا قتیلؔ کا معرکہ، شررؔ اور چکبستؔ کا معرکہ، انشاؔ و مصحفیؔ میں ''لنگور کی گردن'' والی بحث شبلیؔ اور پروفیسر شیرانی والی بحث۔ پروفیسر عندلیب شادانی کی کتاب دورِ حاضر کی اُردو غزل گوئی۔ جگرؔ اور جوشؔ پر اعتراضوں کی بھرمار۔ کلامِ اقبالؔ پر کرنل بھولا ناتھ کے مضامین۔ فیضیؔ اور عرفیؔ کے معرکہ۔ حالیؔ کے کلام پر اعتراضوں کی بوچھار۔ کلامِ غالبؔ پر مرزا یگانہ کے اعتراض۔ اصغرؔ گونڈوی کے کلام پر لے دے۔ خود حالیؔ کا گلزارِ نسیم کی زبان پر کئی جگہ اعتراض۔ ان تمام واقعوں کو دھیان میں تازہ کرلینا چاہیے۔ ENGLISH USAGE اور FOWLERS KING ENGLISH میں چوٹی کے انگریزی ادیبوں کے اغلاط کی سیکڑوں مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ تو بے چارے ترقی پسند اُردو ادیبوں ہی کی گردن کیوں ناپی جائے۔

...(یہاں فراقؔ صاحب نے کچھ معروف اور غیر معروف ترقی پسند ادیبوں کے نام لکھ دیے ہیں۔ ان کا بحث سے کوئی تعلق نہیں) اور درجنوں دوسرے اچھا لکھنے والے اُردو ادب کو ترقی پسند تحریک کی دین ہیں۔ ان سب کی غلطیاں جی کھول کر نکالیے۔ لیکن اس امر سے تو انکار نہ کیجیے کہ گذشتہ بیس برس کے اُردو ادب کا سب سے بلند اور جان دار حصے کا اسّی پچاسی حصہ ترقی پسند ادیبوں کی دین ہے۔ طومار اغلاط سمیت اگر ان لکھنے والوں کی خوبیوں کا اعتراف کرکے ان کے معائب یا ان کی فروگذاشتیں سامنے لائی جائیں تو ایسی پُرخلوص تنقید ہمارے ادبی اور قومی کلچر کے لیے بہت مفید ہوگی۔ لیکن یہ غلط فہمی نہیں پھیلانا چاہیے کہ محض ترقی پسند ادب کے مقاصد کو اپنانے سے کوئی ادیب ادبی صلاحیتیں کھو بیٹھتا ہے۔ یا فنّی لوازمات کو بھول جاتا ہے۔ اتنے بڑے بڑے ادیب ایسے احمق نہیں ہوا کرتے۔

جناب رشید حسن خاں نے میرے بھی کچھ اشعار پر تنقید کی ہے۔ مثلاً

ہم	پوچھیں	تو	گے	تیری	شوخی
دبنے	اور	سے	کڑھ	گئی	ہے

اب مفت نہ دیں گے دل ہم اپنا
ہر چیز کی شرح بڑھ گئی ہے

پہلے شعر میں کڑھ گئی کے ٹکڑے پر اعتراض کیا گیا ہے۔ میری گزارش یہ ہے کہ اس مصرع کو میں یوں بھی کہہ سکتا تھا ''گھٹے سے کچھ اور بڑھ گئی ہے''۔ یہ مصرع بھی نہایت نازک اور لطیف ہوتا، پھر میں نے کڑھ گئی کیوں کہا؟ اس لیے کہ یہاں کڑھ گئی کا مفہوم ہے۔ ابھر گئی، چمک اُٹھی وغیرہ کڑھیائی کے کام میں نقوش اُبھرتے ہیں پھر وبنے کے ساتھ اس مفہوم کو مناسبت ہے یا مصرع میں جو تضاد ہے معترض کے لیے ان باتوں کا سمجھنا نہ سمجھنا برابر ہو گیا ہے۔ دوسرے شعر میں نرخ کا لفظ جو مذکر ہے اسے مونث باندھنے پر اعتراض کیا گیا ہے اور بجا اعتراض کیا گیا ہے۔ مجھے یوں کہنا تھا ۔

''ہر چیز کی شرح بڑھ گئی ہے''

❖ ❖ ❖

کوئی رگِ دل افسردہ آج پھر اکساؤ
پھر آج غم کے شبستاں میں اک چراغ جلاؤ
ہائے وہ پاؤں جو ٹوٹے سرِ منزل آ کر
ہائے وہ ہاتھ جو آگے تیرے دلگیر ہے

پہلے شعر پر اعتراض ہے کہ رگ اُکسائی نہیں جاتی۔ میری گزارش ہے کہ رگ کی مشابہت ہی سے ہے۔ رگِ دلِ افسردہ بجھے ہوئے یا ٹمٹماتے ہوئے یا بجھے ہوئے چراغ کی بتی کی تصویر سامنے لاتا ہے۔ سوزنِ نظر یا کسی اور طرح سے اسے اُکسا دیا جائے تو اسے روشن کیا جا سکے گا۔ اُکسانے کا لفظ یہاں بالکل برمحل ہے۔ اپنے آغاز شاعری کے زمانے میں ATOMIC FUSSION پر میں نے یہ شعر کہا تھا۔ اب سے پینتیس برس پہلے کی بات ہے ۔

ضبطِ غم ذرۂ پامال سے سیکھ اے مجنوں
ابھی غارت گرِ عالم ہی پھٹ گیا ہوتا

میرے اُستاد حضرت وسیمؔ نے اعتراض کیا کہ ذرہ چمکتا ہے، اُڑتا ہے، پامال ہوتا ہے۔ لیکن پھٹتا نہیں۔ لکھنؤ کے ایک بہت بڑے اُستاد جو قدامت پسند بھی تھے اتفاق سے موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ ''پھٹنے کا لفظ لائے بغیر مفہوم ادا نہیں ہو سکتا۔ اُکسانے کے لفظ پر جو اعتراض ہے اسی قماش کا ہے۔''

اب رشید حسن خاں کا جواب فراقؔ گورکھپوری کے نام بھی ملاحظہ کیجیے۔ جب دونوں اصحاب قلم کے نظریات ہمارے سامنے رہیں گے تبھی ہم کوئی فیصلہ یا رائے کا اظہار کر پائیں گے۔ رشید حسن خاں نے اپنے جواب نما خط میں فراقؔ گورکھپوری کے تمام سوالات اور اعتراضات کا جواب مدلل، سائنٹفک طریقے سے اور صحت مند تنقیدی نکات کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیا ہے:

''فراقؔ صاحب نے لکھا ہے ایک زندہ زبان میں بڑے بڑے شاعروں سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ غلطیوں کے جواز کے لیے یہ بڑا کمزور سہارا ہے۔ جن اساطینِ شعروادب سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ ان کی حیثیت ہمارے ان ترقی پسند دوستوں کی غلط فروشی سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے یہاں غلطیاں کم اور بہت کم ہیں اور اس کے مقابلے میں خوبیاں زیادہ ہیں۔ لیکن یہاں اس کے برعکس یہ عالم ہے کہ زبان کی خدمت تو درکنار اس کو مسخ کرنا کمالِ فن سمجھ لیا گیا ہے۔ کسی بھی ترقی پسند شاعر کو لے لیجیے اُس کے مجموعۂ کلام سے ہنگامی معتقدات کا حصہ خارج کر دیا جائے تو کورے کاغذ کے سوا کچھ نہیں بچے گا اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ ہنگامی ادب ان غلطیوں اور خامیوں سے اتنا آراستہ ہے کہ پناہ بہ خدا۔ ہاں ایک دو شاعر ایسے بھی ہیں جن کے کلام کا ایک خاص حصہ قابلِ قبول ہے۔ لیکن، یہ وہی حصہ ہے جس پر ترقی پسندی یا صحیح معنی میں مارکسزم کی چھاپ نہیں لگ سکی ہے۔ اور خالص ''رجعت پرستار'' اسلوب وضوابط کا سہارا لے کر اس کی تخلیق کی گئی ہے۔

میرؔ، سوداؔ، نسیمؔ، غالبؔ وغیرہ زبان کے ابتدائی یا ارتقائی دور کے نمایندے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ میرؔ و غالبؔ کے مقابلے میں آج اُردو کے اسالیب بیان منجھتے منجھتے زیادہ صاف ہو چکے ہیں۔ اور زبان میں تراش خراش ہوتے ہوتے وہ حد سے زیادہ پاک صاف بن چکی ہے۔ اس لیے میرؔ و غالبؔ یا ان کے معاصرین کو جن بعض غلطیوں، خامیوں اور کمزوریوں کی بات تھی اور آج کی ترقی یافتہ زبان کے شاعروں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس پر قیاس کر کے انھیں خامیوں یا اُن جیسی غلطیوں کا سہارا لیں۔

اس کے علاوہ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے قدیم شعرا یا آج کے مستند شاعروں کے یہاں زبان و بیان کی جو غلطیاں ہیں وہ غلطیاں ہی ہیں۔ ایسا نہیں کہ ترقی پسند شعرا کی طرح وہ جان بوجھ کر سیدھے راستے سے کترا کر چلتے ہوں۔ پھر یہ کہ ان کی غلطیاں ان کی خدمت زبان اور شاعرانہ خوبیوں کے سامنے مشکل سے نظر آتی ہیں۔ اور

ان کی غلطیوں کا صرف اس لیے تذکرہ کیا جاتا ہے کہ اُن سے استناد نہ ہو سکے۔

فراقؔ صاحب نے فرمایا ہے کہ گذشتہ بیس پچیس برس میں اُردو ادب کے سب سے بلند حصے کا اسّی پچاسی فی صد حصہ ترقی پسند ادیبوں کی دین ہے۔ یہاں سلسلۂ سخن شعر کے بارے میں ہے۔ اس لیے اس سے متعلق عرض کر دوں کہ فن شعر کے نقطۂ نظر سے ترقی پسند شعرا نے مذکورہ بالا تناسب سے امانتؔ کی ضلع جگت کی طرح زبان و بیان کی خامیاں استعارہ وتشبیہ کا مستقل غلط استعمال اور اندازِ بیان کی بدقواعدگی عطا کی ہے۔ یقین نہ ہو تو مخمورؔ، میرا جیؔ، ن۔م۔ راشدؔ، فیضؔ، مجروحؔ، مخدوم محی الدین وغیرہ کے کارنامے دیکھئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ان حضرات کے یہاں اگر چند خوبیاں ہیں تو اس سے ہزار گنا زیادہ خامیاں۔ اور ایسی خامیاں جو دوسرے نوساماں افراد کے لیے غلط روی کا باعث بن سکتی ہیں۔ قدما نے جتنی بھی غلطیاں کی ہوں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان کی غلطیاں نشانِ راہ بنی ہوں۔

میرے مضمون میں فراقؔ صاحب کے بھی پچیس چھبیس شعر آ گئے تھے جن میں سے چار پانچ اعتراضات کو موصوف نے تسلیم کر لیا ہے۔ جس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چودہ پندرہ اشعار کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ غالباً اُن پر جو اعتراضات کیے تھے ان کو بھی صحیح مان لیا ہوگا۔ ہاں بعض اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ جن پر مختصر طور پر نظر ثانی کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شعر فراقؔ ہے ؎

ہم تو یہ کہیں گے تیری شوخی
دبنے سے کچھ اور کڑھ گئی ہے

میرا اعتراض تھا کہ ''کڑھ گئی'' یہاں بے محل ہے۔ موصوف فرماتے ہیں ''یہاں کڑھ گئی کا مفہوم ہے اُبھر گئی، چمک اُٹھی، نمایاں ہو گئی۔ کڑھائی کے کام میں نقوش ابھرتے ہیں پھر دبنے کے ساتھ اس مفہوم کو جو مناسبت ہے یا مصرع میں جو صنعت تضاد ہے۔ معترض کے لیے ان باتوں کا سمجھنا نہ سمجھنا برابر ہوگا'' میں اب بھی نہ سمجھ سکا کہ دبنے اور کڑھنے میں صنعت تضاد کیسے ہے۔ دبنے کا متضاد اُبھرنا ہے نہ کہ کڑھنا اور یہ جو فراقؔ صاحب نے فرمایا ہے کہ کڑھ گئی میں اُبھرنے کا مفہوم ہے۔ اسی کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ صرف معنی کو پیشِ نظر رکھ کر اُردو میں الفاظ کا اس طرح استعمال قطعاً غیر مانوس ہے۔ کڑھ گئی کا تو صرف یہ مفہوم ہے کہ تصویر یا نقش کپڑے پر مرتسم کر دیا گیا اس کو دبنے کے مقابل میں اُبھرنے کے مفہوم میں استعمال کرنا صحت تضاد میں ایسے دو لفظ مقابل لائے جاتے ہیں جن میں تقابل ہو۔ مثلاً سیاہ و سفید۔ آنا جانا۔ عرش فرش وغیرہ۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ایسا لفظ جس کو مقابل کے لفظ سے کوئی تقابلی نسبت نہیں ہے صرف اس اعتبار سے لایا جائے کہ اس سے ایک خاص مفہوم میں تضاد کا پہلو نکلتا ہے۔ یہ انگریزی میں جائز ہو تو اُردو میں اس کو ''کج نغمگی'' ہی کہا جائے گا۔ شعر دفراقؔ ؎

کوئی رگِ دل افسردہ آج پھر اکساؤ
پھر آج غم کے شبستاں میں اک چراغ جلاؤ

میرا اعتراض تھا کہ ''رگ اُکسانا'' زبان کے خلاف ہے۔ فراقؔ صاحب فرماتے ہیں کہ رگ یہاں بتی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی دل کے چراغ کی بتی اکساؤ۔ حالاں کہ یہاں رگ سے اس کا استعارہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ طرفین میں ضروری تناسبات موجود نہیں ہیں۔ استعارہ بالکنایہ کے جو قاعدے ہیں پہلے جناب فراقؔ کو ان سے مکمل واقفیت حاصل کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ عام طور پر چراغ میں ایک بتی ہوتی ہے۔ لیکن ''کوئی رگ'' سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ متعدد رگیں ہیں۔ جن میں سے کوئی سی رگ اُکسانے کو کہا جا رہا ہے۔ اصل میں یہ قوتِ بیان کا عجز ہے جس کے لیے اتنے غلط سہارے تلاش کیے گئے ہیں۔

جو مہکی چھاؤں میں نغموں کی پنکھڑی سے ہے
وہی سنا ہے تیرے حسن کا نشیمن ہے
دھواں کہ برقِ حسن کا مہکتا شعلہ ہے کوئی
شبوں کے راز شبنموں کی نرمیاں لیے ہوئے

میرا اصل اعتراض یہ تھا کہ استعارے کے قاعدے سے چھاؤں کا مہکنا اور شعلے کا مہکنا محل نظر ہے۔ فراقؔ صاحب نے اس کا لمبا چوڑا جواب دیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ انگریزی کی صنعت TRANSRERRED EPITHET ان اشعار میں استعمال کی گئی ہے۔ اور چوں کہ معترض اس صنعت سے واقف نہیں... یا اس کا ذوق صحیح نہیں۔ اس لیے اس پر اعتراض کیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک اصولی بات کہنا چاہتا ہوں۔

ہرزبان کا مزاج، لہجہ، اقتصابات اورضابطے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ ایک زبان کے محاورات ومرکبات اورصنائع بدائع کو بجنسہ دوسری زبان میں منتقل کردیا جائے۔ ہرزبان دوسری زبان سے مسلسل استفادہ کرتی ہے۔لیکن اس ضمن میں زبان کا مزاج اوراس کے لہجے کی فنی ولسانی خصوصیات کا ضرور خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ غالبؔ کے تماشا کر'' اور'' نہ شنیدن'' جیسے فارسی مشمولات نامانوسیت کے الزام سے نہیں بچ سکے۔اور غالبؔ کی بھاری بھرکم شخصیت اور بلند آہنگ لہجے کے باوصف ان کو قبول عام کی سند نہیں حاصل ہوئی۔ حالاں کہ اُردو نے فارسی سے جتنا استفادہ کیا ہے وہ ظاہر ہے۔تشبیہ اوراستعارہ میں طرفین کے مناسبات کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ جب بھی ان تناسبات کو نظرانداز کیا جائے گا۔مفہوم چیستان بن جائے گا۔ پھر خواہ انگریزی یا کسی دوسری زبان کے ضابطوں کا سہارا لیا جائے اسی کا احتمال ختم نہیں ہوگا۔مندرجہ بالا اشعار کی یہی صورت ہے۔انگریزی کی مذکورہ بالا صنعت جس کو اُردو میں لفظی ترجمے کے اعتبار سے ''صنعت منتقلہ'' کہہ سکتے ہیں اور جس کا ذکر فراقؔ صاحب نے نہایت اہتمام کے ساتھ کیا ہے ۔اُردو سے براہ راست میل نہیں کھاتی۔مثلاً اسی TRANSFERRED EPITHET کے واسطے سے RESTLESS PILLOW کہا جا سکتا ہے اور RLACKEY PNESENTEORNOBSE QUID US CUP OF COFFEE بھی۔لیکن اُردو میں یہ استعمال بالکل غلط ہوگا کیوں کہ یہاں اس قبیل کی کوئی صنعت نہیں ہے۔بل کہ یہ کام استعارے سے لیا جاتا ہے اوراس کے ضابطہ کے لحاظ سے تکیہ اورآدمی اورقہوہ اورنوکر میں کوئی علاقہ نہیں ہے۔ چوں کہ مستعارلہ اورمستعارمنہ میں تشبیہی نسبت ضروری ہے اورآدمی اور تکیہ میں ایسا نہیں ہے۔اس لیے (بے چین تکیہ) کہنا اُردو میں قطعاً غیرصحیح ہوگا۔یہی حال مہکتی چھاؤں اورمہکتے شعلے کا ہے۔اس کے علاوہ ایک قابل غور بات یہ ہے کہ TRANSFERRED میں جوموصوف کی صفت دوسرے موصوف کو منتقل کی جاتی ہے۔ان دونوں میں کسی قسم کا خاص تعلق ضروری ہے۔مثلاً تکیہ اورآدمی کوان میں باہم خاص تعلق ہے اورخدمت گار۔قہوہ کہ ان میں بھی قہوے کا پیش کرنا خدمت گار سے متعلق ہے۔اس اعتبار سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ چھاؤں اورخوشبوؤں میں کون سا خصوصی تعلق ہے چھاؤں بالعموم بڑے درخت کے سایہ کے مفہوم میں آتا ہے۔خواہ وہ نیم کا ہو یا املی کا۔گلاب اور بیلے کے درخت کے سایہ کو اوّل تو چھاؤں کہتے ہیں۔اور اگر کہہ بھی لیں تو مطلق چھاؤں کا پھول سے اس کی خوشبو سے لازمی تعلق کیسے قائم ہوگا۔

فراقؔ صاحب نے اس ضمن میں انگریزی کی متعدد مثالیں دی ہیں اور بار باراس کے ضابطوں کا ذکر کیا ہے۔لیکن فراقؔ صاحب شاید یہ بھول گئے کہ انگریزی کا لفظی ترجمہ کردینا کمال کی بات ہے اور نہ قابلِ فخر۔ یہ تو ہرنوآموز ونارشیدہ شخص کرسکتا ہے۔یہی حال انگریزی کے ضابطوں کا ہے کہ وہ بعینہ اُردو میں صرف نہیں کیے جا سکتے۔ورنہ پھر انگریزی کی دوسری بہت سی صنعتیں بھی تو ہیں۔ان کو آخر کیوں چھوڑ دیا جائے۔تا کہ پھر زبان کے ''ستارۂ بابل'' بننے میں۔کوئی کسر باقی نہ رہے۔نیز اسی پر قیاس کر کے اُردو کی صنعتیں بھی انگریزی میں استعمال کی جائیں۔حالاں کہ اس کو کوئی گوارہ نہیں کرے گا۔

ہائے وہ پاؤں جو ٹوٹے سر منزل آکر

ہائے وہ ہاتھ جو آگے تیرے دلگیر رہے

میرا اعتراض تھا کہ ہاتھ کی صفت دلگیر نہیں ہوسکتی۔فراقؔ صاحب فرماتے ہیں ''میں نے ہاتھ کی صفت نہیں اس کا عمل یا حالت کا بیان کیا تھا۔یعنی وہ ہاتھ جو دل کو پکڑے ہوئے تھے۔میں نے دلگیر کے لفظ کا لغوی استعمال کیا تھا۔مجازاً عاشق کے معنوں میں یہ لفظ نہیں لایا تھا۔''

(رسالہ تحریک، بیس سالہ انتخاب نمبر، صفحہ 611-608)

ماہ نامہ رسالہ ''ادیب''، علی گڑھ کے، مارچ 1959 کے شمارے میں رشید حسن خاں کا دوصفحوں پر مشتمل ایک خط نما مضمون اڈیٹر کے نام شائع ہوا جس میں ماہ جنوری 1959 کے شمارے میں شائع ہوئی غزلوں اورنظموں کی بابت گفتگو کی گئی ہے، جو رشید حسن خاں کی نظر میں بے ''شعورانہ اظہار ہنر'' تھا۔ جب ہم اس خط کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جنوری 1959 کے شمارے کی تمام غزلوں اور نظموں پر رشید حسن خاں نے زبان وبیان کی وجہ سے گرفت کی ہے۔ میں خط کا کچھ حصہ یہاں نقل کررہا ہوں تا کہ رشید حسن خاں کے خیالات اور وسیع تنقیدی نقطۂ نظر کا ہم مشاہدہ کرسکیں:

''شاہ جہاں پور

16 جنوری، 1959

پرسوں ''ادیب'' کا شمارہ ماہ جنوری 59 ملا۔میں نے ازسرتاآخر پڑھا۔مضامین دل چسپ اوراچھے ہیں۔تمہارا اداریہ بھی خوب ہے۔اس وقت اس خط کے لکھنے کی وجہ ادیب کا حصۂ نظم ہے۔میری ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے کہ اچھا شعر وہ ہے جس میں خیال وطرزِ اظہار دونوں خوب سے خوب تر ہوں۔اگر کوئی ایسا خیال ہو جس کے ادا کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو کوئی بھی خوش ذوق مانع نہیں ہوسکتا۔نہ کوئی محل اعتراض ہوگا۔لیکن وہ سادہ اور مفرد خیالات جو اس سے پہلے بھی صحیح اور فصیح انداز سے ادا کیے جا چکے ہیں۔ان کو ادا کرنے کے لیے بے جا خام کارانہ کی ضرورت پڑے اوراس کی نمایش بے محابا بھی کی جائے تو

اس بات کو کوئی صاحبِ نظر اچھا نہیں کہہ سکتا۔ ہم ایک ایسے شاعر سے یہ توقع ضرور رکھتے ہیں کہ وہ ادائے خیال کے ان اسالیب پر ضرور نظر رکھے جن کے ناقص ہونے سے شعر ہی نہیں نفس مفہوم اور تاثیر کے رُخ تاریک ہو کر رہ جاتے ہیں۔ آج کل کچھ تو ناواقف اور فیشن اور اظہار ''دیدہ وری'' کے طور پر ایسے اجتہاد سے کام لیا جاتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ شاعر ذہنی طور پر نہایت نارسیدہ یا زیادہ صحیح الفاظ میں نابالغ ہے۔ اس سلسلے میں اڈیٹر صاحبان کی بڑی ذمہ داری ہے۔ وہ اگر ذرا دقت نظر سے کام لیں تو ایسے خام کارانہ نقوش کی نمائش بے جا میں کافی کمی ہو سکتی ہے۔ میں اس خط میں ادیب کے حصۂ نظم کے بعض ایسے مقامات کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس ''بے شعورانہ اظہار ہنر'' پر کچھ نہ کچھ احتساب ضرور کرنا چاہیے۔ کسی تفصیل کے بجائے صرف چند اشارات درج کرتا ہوں۔

جناب اختر انصاری کے قطعہ کے پہلے مصرعہ میں ''سرود انجمیں'' کی ترکیب محل نظر ہے۔ سرود انجم مرکب اضافی ہے اور اختر صاحب کے مفہوم کو ادا کر سکتا ہے لیکن سرود انجمیں مرکب توصیفی ہوگا۔ اور سرود کی صفت انجمیں بے معنی نہ سہی ادائے مفہوم سے عاری ضرور ہے۔''

(ماہ نامہ ادیب، جلد 3، علی گڑھ، مدیر قمر رئیس، مارچ 1959، صفحہ 45)

اس خط میں رشید حسن خاں نے ارشد صدیقی، زیدی بلگرامی، شاہد مہدی وغیرہ شاعروں کے کلام کو پر تنقید کی۔ طوالت کے خوف سے میں نے پورا خط نقل نہیں کیا، صرف آدھے صفحے پر اکتفا کیا۔ پورا خط ''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں'' جلد سوم میں ملاحظہ فرمائیں۔

رشید حسن خاں کی ادبی شہرت 1950 کے بعد شروع ہوتی ہے۔ ان کے علمی، ادبی تحقیق وتنقیدی مضامین کے کمال کا اثر تھا کہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے ان کے علمی صلاحیتوں کو پہچانا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ موصوف نے ڈاکٹر قمر رئیس کی وساطت سے انھیں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں اگست 1959 کو بطور ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے تقرری دی۔ اس وقت رشید حسن خاں کے پاس کسی اسکول، کالج یا یونی ورسٹی سطح یا مغربی طرز کی کوئی بھی ڈگری یا ڈپلومہ High School, Inter & BA نہ تھی۔ بس ان کے پاس مشرقی علوم پر مبنی ''دبیر کامل'' (فارسی میں ڈپلومہ، لکھنؤ یونی ورسٹی سے 1952 میں پاس) اور جامعہ اُردو علی گڑھ سے ''ادیب کامل'' (نومبر 1949 میں پاس) کی ہی ڈگریاں تھیں۔ دہلی یونی ورسٹی سے منسلک ہونے سے قبل رشید حسن خاں شاہ جہاں پور کے اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول میں بطور فارسی اُستاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان تمام باتوں کا احاطہ ''صدر اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول، شاہ جہاں پور'' کے نام 29 اکتوبر، 1964 کو لکھے خط میں کیا گیا ہے۔ یہ خط ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس خط میں رشید حسن خاں نے اپنی ادبی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم اور اولین درس گاہ سے والہانہ شغف، محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت ملنے اور یہاں پر پانچ سال کی مدت تک نوکری کرنے کے بعد مستقل تقرری ہونے کی خوش خبری بھی اس خط میں صدر اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول کو دی گئی ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنے خط میں اسکول لائبریری سے فیض حاصل کرنے اور علم وادب میں پختگی پیدا کرنے کے لیے اسکول کا شکریہ ادا کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے خط میں اس بات کا اشارہ بھی کیا کہ یہاں کی یادیں انھیں ہمیشہ ستاتی ہیں۔ اسی اسکول نے ان کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت کرنے کے بعد بھی ان کے دل ودماغ پر اس اسکول کے اثرات ہمیشہ مرتسم رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رشید حسن خاں اسکول سے آتے ہوئے شوقین بُک ڈپو (شاہ جہاں پور) ضرور جاتے اور وہاں سے ہندو پاک سے نکلنے والے اُردو رسائل وجرائد کا مطالعہ کرنے کے لیے گھر لاتے تھے۔ ساتھ ہی اُردو ادب کی تازہ ترین شائع کتابیں بھی شوقین بُک ڈپو سے خریدتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب رشید حسن خاں کے طویل مضامین شاعری، بالخصوص ترقی پسند شاعری کی زبان، بیان اور املائی اغلاط سے متعلق عالم گیر سطح پر شائع ہوئے۔ اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول کے صدر کے نام لکھا گیا خط خاصہ طویل ہے، مگر اسے یہاں پیش کرنا ناگزیر ہے۔ تاکہ رشید حسن خاں کے دلی جذبات واحساسات سے قارئین روبرو ہو سکیں:

''29 اکتوبر، 1964

جنابِ مکرم!

مینجنگ کمیٹی نے میری رخصتِ بلاتنخواہ 31 اکتوبر 64 تک کی منظوری کی تھی، اس کے ساتھ ہی اس سے بھی مطلع کیا تھا کہ اب اس میں توسیع ممکن نہیں۔ یہ مدت قریب الختم ہے۔ میں نے آپ سے زبانی عرض کیا تھا کہ جس وقت بھی میرے گریڈ کے متعلق فیصلہ ہو؛ میں اسکول کی ملازمت سے استعفا پیش کر دوں گا۔ یونی ورسٹی نے اب سے چند ماہ پہلے میرے لیے ایک مناسب گریڈ منظور کر لیا تھا؛ جس کی باضابطہ اطلاع مجھے اب ملی ہے، اس لیے اصولاً اب مجھے مستعفی ہو جانا چاہیے۔

براہ کرم یکم نومبر 64 سے میرا استعفا منظور فرمایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی بھی اجازت دی جائے کہ میں اپنے پروڈینٹ فنڈ کی رقم بھی حاصل کر سکوں۔

جناب صدر! میں نے اسلامیہ اسکول سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا، بلکہ صحیح معنوں میں اسی ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں۔ اچھے ماحول کے اثر سے، اچھے ساتھیوں کی ہمت افزائی سے اور اسکول کی چھوٹی سی لائبریری کے فیض سے، مطالعے کا شوق اور بڑھا۔ لائبریری کی اچھی کتابوں نے تنقید وتحقیق

کی طرف متوجہ کیا، اور آٹھ برس کی نسبتاً طویل مدت اس کی نشو و نما کے لیے بے حد سازگار ثابت ہوئی۔ لائبریری کی کتابوں نے، میرے بیش تر رفیقان کی ہمت افزائی نے اور اربابِ اختیار کی خاموش سرپرستی نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اعلا تحقیقی کاموں میں حصہ لینے کا اہل سمجھا جاؤں۔

میں نے جس وقت اسلامیہ اسکول میں ملازمت کے لیے درخواست دی تھی، اُس وقت میرے پاس کسی یونی ورسٹی، کسی کالج یا کسی اسکول کی کوئی ڈگری نہیں تھی؛ اس کے باوجود آپ نے ازراہِ التفاتِ خاص مجھے منتخب فرمایا تھا۔ آج جب کہ میں ہندوستان کی ایک اعلاترین یونی ورسٹی میں کام کر رہا ہوں، آج بھی کسی ایسی سند سے تہی دست ہوں۔ یہ اہمیت اسی اسکول کی بخشی ہوئی ہے، اور اس روایت کے موسس آپ ہیں۔

جس وقت میں نے دہلی یونی ورسٹی کی موجودہ ملازمت کے سلسلے میں، میں نے آپ سے رجوع کیا؛ آپ نے نہایت توجہ سے میری بات سنی، خلوص ہمدردی کے ساتھ مشورے دیے اور میرے مستقبل کی فلاح کے لیے، وہ ساری آسانیاں فراہم کیں جن کے بغیر، میں نہ موجودہ ملازمت کو قبول کرنے کی جرأت کر سکتا تھا، نہ اسے طویل عرصے تک اس سے متعلق رہ سکتا تھا۔ ان کرم ہائے بے پایاں کا شکریہ ادا کرنا زبان و قلم کے بس کی بات نہیں۔

میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مینجنگ کمیٹی کے معزز ممبروں کا بہ طورِ خاص شکریہ ادا کروں؛ جنھوں نے بے مثال وسیع القلبی کے ساتھ، اس قدر طویل مدت کی رخصت کو منظور فرمایا۔ اس مرحلۂ دشوار کا طے ہونا، بظاہر آسان نہ تھا۔

میں اپنے پرنسپل صاحب کا بھی شکر گزار ہوں۔ موصوف سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ غالبؔ کی نظم کی طرح اُن کی تہ دار گفتگو، حالؔی کی نثر کی طرح سادہ تحریر، اور ان سب سے زیادہ اُن کے طرزِ زندگی نے مجھے متاثر کیا جو آرایش و زیبایش سے اُسی قدر معرا ہے، جس قدر ہمارا اسکول پیڑ پودوں سے، پھولوں سے اور سبزے سے تہی داماں ہے۔ شروع میں مجھ سے بر بنائے تجربہ کاری اور کبھی بر بنائے شوریدہ سری (جو نوجوانی کا لازمہ ہے) بار ہا غلطیاں ہوئیں، اور موصوف نے ہر بار خوے درگزر سے کام لیا۔ میں نے اسکول کے بعض معاملات و مسائل میں موصوف سے اختلاف بھی کیا، اور عملی طور پر؛ لیکن اُنھوں نے کبھی تو اُسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اور کبھی اپنے اختیاراتِ خصوصی کو اس بروے کار لائے، کہ میں خود اپنے مسلمات کو، مفروضات بل کہ موہومات سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح عملی زندگی کے راستے کے نشیب و فراز سے آگاہی بخشی۔ میں ان امور کا ہمیشہ معترف رہوں گا اور اُن کا منّت پذیر۔

جنابِ صدر! میں اسکول سے محض ضابطے کے لحاظ سے ترکِ تعلق کر رہا ہوں، ذہنی و جذباتی تعلق ہمیشہ قائم رہے گا۔ اولین درس گاہ کو بھولتا بھی کون ہے؟ اُس کے نیم شکستہ دیواریں، اُس کے کھپریل پوش درجے (جو دھوپ اور پانی کو نیچے منتقل کرنے میں کبھی بُخل نہیں کرتے) اُس کا پیڑ پودوں سے معرا احاطہ، اُس کا پرشکوہ ہال، اُس کی لائبریری کا گرد آلودہ کمرہ (جہاں میں نے بہت کچھ سیکھا ہے) اُس کے غریب طلبہ اور محنتی اساتذہ، یہ سارے نقوش، ذہن کی کتاب میں ہمیشہ مرتسم اور تابناک رہیں گے۔ میں نے ہمیشہ تہہ دل سے اسکول کا بہی خواہ رہوں گا، ہمہ وقت میری خدمات اُس کے لیے حاضر رہیں گی، اور کوشش کرتا رہوں گا کہ اپنی نارسائی کے باوصف، اسکول کے فیوض کا حق ادا کرتا رہوں، دست بدعا ہوں کہ خداے قدوس مجھے اس کی توفیق بخشے، اور آپ کے پر خلوص مشوروں سے مستفیض ہونے کی سعادت حاصل رہے۔

نیازمند

رشید حسن خاں

پرشین ٹیچر اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول،

شاہ جہاں پور

(رشید حسن خاں کے خطوط، جلد دوم، مرتب ڈاکٹر ٹی آر رینا، اُردو بک ریویو، نئی دہلی، نومبر 2015، صفحہ 382-380)

رشید حسن خاں نے اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول میں ملازمت کرنے سے پہلے 1939 میں شاہ جہاں پور کی تاریخی آرڈیننس کلودنگ فیکٹری (عرفِ عام میں اس فیکٹری کو درزی خانہ کہا جاتا ہے) میں ملازمت کی۔ کیوں کہ ان کے والد امیر حسن خاں نے تحریک عدم تعاون کے دوران پولس کی نوکری سے قبل از وقت رٹائرمنٹ لے لیا تھا۔ اس وجہ سے ان کے گھر کی مالی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اور رشید حسن خاں مدرسہ بحر العلوم، شاہ جہاں پور سے درسِ نظامی کی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ درزی خانہ شاہ جہاں پور میں رشید حسن خاں نے 1939 سے 1945 تک کام کیا۔ اس کے بعد شاہ جہاں پور میں ہی متفرق کام کیے۔ ایک آٹا چکی پر منشی رہے، زمین دار کے کارندے کے طور پر ملازمت کی۔ ان سب کے درمیان خاں صاحب نے علم و ادب کا دامن نہ چھوڑا۔ درزی خانہ میں تین شفٹوں میں کام ہوتا تھا۔ جب بھی انھیں کام سے وقفہ ملتا وہیں پر طلسم ہوشربا اور آبِ حیات کا مطالعہ شروع کر دیتے۔ درزی خانہ کی ملازمت کے دوران انھوں نے ٹریڈ یونین میں سکریٹری کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ یونین کے لیڈروں نے جب درزی خانہ میں اسٹرائک کی تو رشید حسن خاں اس میں پیش پیش تھے۔ اسی ہڑتال کی پاداش میں انھیں نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ کلودنگ فیکٹری کی ملازمت کے دوران ان کے مراسم استرا کی نظریات کے حامی قومی لیڈروں سے ہوئے۔ لیکن ان لیڈروں کے دوہرے کردار اور ریوں سے رشید حسن خاں ہمیشہ نالاں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ عملی طور پر انھوں نے اُن تمام چیزوں کا مشاہدہ کیا جنھیں

ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر شاعروں نے اپنی شاعری میں پیش کیا۔ رشید حسن خاں کی تنقیدی توجہ بھی اپنے ابتدائی دور میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر شاعری کرنے والے شاعروں کے تئیں زیادہ تھی۔ دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت ملنے سے تین مہینے قبل یعنی اپریل 1959 میں علی گڑھ سے نکلنے والے رسالے ''ادیب'' میں ان کا مضمون ترقی پسند شاعری اور فن کاری کے عنوان سے صفحہ 15 تا 24 شائع ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد سے بحث کرتے ہوئے اپنے زمانے کے مشہور ترقی پسند شاعروں کی شاعری اور فن کاری کا محاکمہ اپنے مخصوص تنقیدی اصول وضوابط کے تحت قارئین کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مضمون میں تحریر کیا کہ ''ترقی پسند تحریک کا اصل مقصد سیاسی پروپگینڈہ تھا۔'' رشید حسن خاں کے مطابق اس تحریک نے شاعروں اور ادیبوں کے اذہان کو اپنی خاص فکر کے بھنور جال میں جکڑ لیا ہے۔ شاعروں کے پاس اپنا ذاتی نظریہ نہیں ہے بل کہ اشتراکی نظریات اور شریعت کو ہی انھوں نے اپنا نظریہ اور شریعت تسلیم کیا۔ رشید حسن خاں کے نقطۂ نظر کے مطابق دوسری زبانوں کے استعارات واسالیب بیان کو مذاقِ سلیم کی کسوٹی پر کسے بغیر نقل کر دینا فن کاری کے منافی ہے۔ ان کے مطابق نئے شاعر اس سلسلے میں دراز دستی سے کام لے رہے ہیں۔ صنعتوں کا یہ لوگ بے جا استعمال کر رہے ہیں۔ مارکسی نظریات اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو کر شاعری کرنے والے شعرا حضرات کے کلام کے معائب و محاسن پر اپنی بات کو مزید واضح کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے لکھا:

''اس سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ ابتدا میں شاعر کی تخیل کے اوراق سادہ ہوتے ہیں۔ فکر و شعور کی دولت میں جتنا اضافہ ہوتا ہے نہاں خانۂ دل میں خیالی موتیوں کی چمک اتنی ہی بڑھتی رہتی ہے اور کائنات کے پیچیدہ اسرار کی گرہیں، کھلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ لیکن ارتقائے خیال و بالیدگی شعور کے یہ مرحلے دنوں میں طے ہو پاتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ شاعرانہ رفعتیں گہوارے کی آغوش میں حاصل ہو جائیں اور طفلی و جوانی کے گلے ملنے سے پہلے ہی آسمان شاعری سے بارش الہام ہونے لگے۔ معجزۂ فن کی خونِ جگر سے نمود ہوتی ہے اور 'خونے بہ جگر جمع کن ورنگ بروں آر' کی منزل تک پہنچنے کے لیے عمرو شعور کی بہت سی دشوار منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔

ابتدا میں شاعر کی زندگی کی کتاب دل پُر اسرار تفسیروں سے مبرا ہوتی ہے۔ قلب کی گہرائیوں میں فکر وخیال کی پرچھائیاں چلتی پھرتی معلوم ہوتی ہیں، ذہن کے دھندلکے میں اشعار کی پریاں رقص کرتی ہوئی سی محسوس ہوتی ہیں لیکن الفاظ میں قدرت شاعرانہ کا وہ افسوں نہیں ہوتا جس کی مدد سے وہ ان کو اشعار کے شیشے میں اُتار لے اور ان پرچھائیوں کے خیالی پیکر میں جان ڈال دے۔ اس اعتبار سے یہ بات بہت ضروری ہے کہ ابتدا میں شاعر زبان و بیان اور اسلوب وطرز ادا کی ساحرانہ قدرت حاصل کرنے پر زورِ طبع صرف کرے اور طریق اظہار کے اس طلسمی عمل سے پورے طور پر واقفیت حاصل کر لے جس میں چند بولوں کی اُلٹ پھیر سے کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے لیکن اگر ترقی پسند نقطۂ نظر کے مطابق صرف مواد کی سماجیت پیش نظر رکھی جائے اور زبان و بیان کو جو اس کا سانچہ ہیں نظر انداز کر دیا جائے اس صورت میں شاعر کبھی اس قابل نہیں ہو سکے گا کہ اس کے تصورات اشعار کے 'آئینہ خانہ میں جلوہ گر ہو سکیں'۔

مارکسی نظریۂ ادب نے اسلوب واظہار کے اعتبار سے شاعری کو بے حد نقصان پہنچایا۔ وہ شاعر جن کے خمیر میں فطرت نے نہایت فیاضی کے ساتھ شعری عناصر شامل کیے تھے وہ محض ان مصروفیات کے فیض سے مشاعروں کے ہجوم میں شامل ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک خاص دور کے غزل گو شعرا کے پاس خیالات کے ذخیرے یا تو تھے نہیں یا الفاظ و ترتیب الفاظ کی رعایتوں کے بوجھ سے دب کر رہ گئے تھے۔ آج ہم ان تخلیقات کو کاغذی پھول سمجھ کر منہ پھیر لیتے ہیں لیکن ان دوسرے شعرا کے متعلق کیا کہا جائے گا جن کے دامن خیالات کے ہزار رنگ پھولوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن الفاظ واسلوب کا سر رشتہ ہاتھوں سے چھوٹ چکا ہے جس کے سبب سے خیالات کے خوش رنگ پھول زیب انجمن بننے سے محروم ہیں۔ نئے شعرا کا سب سے کمزور پہلو مناسب صفات کا استعمال اور استعارہ و تشبیہ کا صحیح صرف ہے۔ صفات و استعارات اور تناسب بیان پر نظر رکھنے کے نتیجے میں اچھا خاصا چیستان بن جاتا ہے یا اتنا بے جوڑ ہو جاتا ہے کہ شعر کی ساری دل بخشی ہوا ہوتی ہے۔ میں اس بات کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں۔''

(رسالہ ادیب، مدیر قمر رئیس، علی گڑھ، اپریل 1959، صفحہ 17 تا 18)

رشید حسن خاں جیسے ہی دہلی یونی ورسٹی میں ملازم ہوئے ویسے ہی انھوں نے اپنی علمی تگ و دو میں بھی اضافہ کیا۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے دہلی یونی ورسٹی کی لائبریری سے خوب استفادہ کیا۔ رشید حسن خاں نے مرزا غالبؔ کے کلام میں موجود مفرد و مرکب الفاظ کا گوشوارہ بنانے کا کام بھی اگست 1959 کے بعد کیا۔ دسمبر 2017 کو ان کی وفات کے 11 سال بعد ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کی شکل میں اس کی پہلی جلد 'انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی اور غالب انسٹی ٹیوٹ' کے باہمی اشتراک سے منصۂ شہود پر آئی۔

رشید حسن خاں دیوان غالبؔ کا ایک ایسا اشاریہ مرتب کرنا چاہتے تھے جس میں مرزا غالبؔ کے کلام میں در آئے الفاظ (مفرد اور مرکب) کو یکجا کر یہ معلوم کیا جا سکے کہ انھوں نے فلاں لفظ کو کتنی بار مرکب اور فلاں لفظ کو کتنی بار مفرد استعمال کیا ہے۔ رشید حسن خاں مرحوم نے دیوان غالبؔ کا کتنی عرق ریزی، گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہوگا یا یوں کہہ لیجیے کہ موصوف نے دیوان غالبؔ میں کتنی بار غوطہ زنی اور ورق گردانی کی ہوگی تب جا کر گوہر نایاب ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کی شکل میں دیوان غالبؔ کا اشاریہ تیار ہوا۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ دیوان غالبؔ کی شرح ان کی زندگی میں ہی شائع ہو جائے۔ لیکن رشید حسن خاں کا یہ خواب ان کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ موصوف یہ خواہش کو لیے

ہوئے اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور) کے نام خاں صاحب نے 8 جون 2005 کو لکھے خط میں گنجینۂ معنی کا طلسم کی کمپوزنگ اور اپنی زندگی میں اسے مکمل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ لکھتے ہیں:

''الفاظِ غالبؔ سے متعلق کتاب (گنجینۂ معنی کا طلسم) کی کمپوزنگ ایک صاحب دہلی میں کر رہے ہیں، اب تک صرف 109 صفحے ہو پائے ہیں، معلوم نہیں میری زندگی میں مکمل ہو گی بھی؟''

(رشید حسن خاں کے خطوط، جلد دوم، مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، اُردو بک ریویو، دہلی 2015 ص 319)

آخر کار رشید حسن خاں کی وفات کے ٹھیک 11 سال بعد غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے اس ضخیم کتاب کے پہلے حصے (451 صفحات) کا 22 دسمبر، 2017 کو بہ وقت شام 7:30 بجے تقسیم غالب ایوارڈ 2017 کے موقع پر غالب سمینار ہال میں جسٹس آفتاب عالم، ایس وائی قریشی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر رضا حیدر اور پروفیسر ہربنس مکھیا کے ہاتھوں رسم اجرا کرایا۔ خوش قسمتی سے راقم الحروف بھی کتاب کی رونمائی کے موقع پر موجود تھا۔ ڈاکٹر رضا حیدر (ڈائریکٹر، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی) نے سمینار ہال میں شرکا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصے کو بھی جلد ہی شائع کیا جائے گا۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ پہلے اس کام کو انجمن ترقی اُردو (ہند) شائع کرنا چاہتی تھی، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر انجمن اسے شائع نہ کر پائی۔ اب اس کتاب (گنجینۂ معنی کا طلسم) کو انجمن ترقی اُردو (ہند) اور غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے باہمی اشتراک سے منظرِ عام پر لایا جا رہا ہے۔ غور طلب ہے کہ رشید حسن خاں کی وفات کے بعد انجمن ترقی اُردو اس کام کو شائع کرانا چاہتی تھی۔ انجمن نے غالبؔ کے کلام کی شرح اور فرہنگ سے متعلق ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' نامی کتاب کو منظرِ عام پر لانے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا۔ 1700 سے زائد صفحات کی کمپوزنگ بھی ہو چکی تھی لیکن ڈاکٹر خلیق انجم کی علالت علمی اور ادبی مصروفیت اور دیگر مسائل کے سبب یہ کام ملتوی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب بھی اس دارِ فانی سے 2016 میں رخصت ہو گئے۔ انجمن کے نئے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی صاحب، جو رشید حسن خاں کے نیاز مندوں میں سے ہیں، نے اس اہم کام کی جانب توجہ مبذول کی۔ اس طرح ان کی ذاتی کاوشوں اور کمپوزر عبدالرشید کی سچی لگن اور محنت کے سبب یہ کام مکمل ہو کر اب منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس کتاب کے پروف پڑھنے کی ذمہ داری خاں صاحب کے بعد ان کی ایک اور نیاز مند ڈاکٹر ارجمند آرا (اُستانی، دہلی یونی ورسٹی) نے قبول کیں اور غالبؔ کے اشعار کی قرأت کا ذمہ ڈاکٹر سرور الہدیٰ (اُستاد، جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے سپرد تھا۔ ان دونوں حضرات نے اپنی ذمہ داریوں کو بہ حسن خوبی انجام دیا۔ اس کتاب کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کی روداد کو ڈاکٹر اطہر فاروقی نے مئی 2017 کو لکھے حرفِ آغاز میں دل چسپ انداز میں یوں بیان کیا:

''جب اس کتاب کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی تو میں نے غالب انسٹی ٹیوٹ سے درخواست کی تھی کہ وہ کسی طرح اس کتاب کو شائع کر دیں جسے انسٹی ٹیوٹ نے قبول فرما لیا تھا۔ اب یہ کتاب غالب انسٹی ٹیوٹ اور انجمن ترقی اُردو (ہند) کی مشترکہ اشاعت (تین جلدوں میں) ہے جس کے لیے میں خصوصاً انسٹی ٹیوٹ کے جواں سال ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر صاحب کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب تو انجمن کے صدر بھی ہیں اور رشید صاحب کے بے تکلف دوست بھی، اس لیے، ان کی فراخ دلی کا شکریہ ادا کرنا کس حد تک صحیح ہے، یہ تو رشید صاحب ہی بتا سکتے تھے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں شائع ہو گی۔''

(حرفِ آغاز، ڈاکٹر اطہر فاروقی، مشمولہ گنجینۂ معنی کا طلسم، مرب رشید حسن خاں، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2017، صفحہ 8)

رشید حسن خاں نے گنجینۂ معنی کا طلسم پر 22 صفحات پر محیط مبسوط، مربوط، عالمانہ اور ناقدانہ مقدمہ تحریر کیا۔ اس کتاب کا پورا متن 421 صفحات پر مشتمل ہے۔ رشید حسن خاں اس کتاب سے قبل دو کتابیں 'انشائے غالب (اشاعت 1994، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، کل صفحات 147) اور املائے غالبؔ (اشاعت 2000، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کل صفحات 216) مرتب کر چکے تھے۔ ان کے لیے کلام غالبؔ کا اشاریہ تیار کرنا زیادہ آسان تھا۔ کیوں کہ ان کے سامنے غالبؔ کے املا اور انشا کا مواد پہلے ہی سے موجود تھا۔ پھر بھی مرحوم نے ایک ایک لفظیات کی تدوین، تصحیح اور ترتیب پر اپنا تن، من اور دھن قربان کیا۔ اس صبر آزما کام کے لیے موصوف نے اپنی آنکھوں سے رات دن تن تنہا تیل ٹپکایا۔ یہی کام اگر کوئی ادبی ادارہ کرتا تو اس کے لیے پوری ٹیم کا انتخاب کیا جاتا اور لاکھوں روپیوں کا بجٹ بھی دیا جاتا۔ لیکن سلام ہو رشید حسن خاں کی ادبی تحقیقی اور تدوینی کاوش کو جنھوں نے بغیر سرکاری امداد کے غالبؔ کے کلام کی شرح مکمل کی کیوں کہ انھیں وہ سہولتیں دستیاب نہیں تھیں جنھیں استعمال کرنے کا انھیں حق تھا۔ شاہ جہاں پور جیسے چھوٹے شہر میں بیٹھ کر اتنا بڑا کارنامہ انجام دینا رشید حسن خاں جیسے تحقیقی سالار کے ہی بس میں تھا۔ اس کتاب کے منظرِ عام پر آ جانے کے بعد مرحوم رشید حسن خاں کا شمار شارحینِ غالب میں ضرور کیا جائے گا۔ یہ کتاب دیوانِ غالبؔ کو نئے تناظر میں دیکھنے، سمجھنے اور اس کی قرأت میں معاون و مددگار ثابت ہو گی۔ اس کتاب سے دیوان غالبؔ کی لفظیات کی جانب ناقدین اور محققین کی توجہ ضرور مبذول ہو گی۔ مرحوم خاں صاحب کی تدوینی خدمات کا بار اتنا زیادہ ہے کہ کوئی بھی دورِ حاضر کا مدون اس بار کو اُٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ ان کے تحقیقی مطالعے کا ہی یہ کمال ہے کہ انھوں نے گنجینۂ معنی کا طلسم کے لیے امتیاز علی خاں عرشی کے تدوین شدہ نسخے کو اپنے کام کی اساس بنایا۔ رشید حسن خاں مرحوم کے دیرینہ دوست اور غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے مرحوم کی علمی و تدوینی فتوحات کے علاوہ ادبی کارہائے نمایاں اور اس کتاب کی اشاعت پر اپنے دل کی بات کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے لکھا:

''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کو شائع کرتے ہوئے مجھے فخر کا احساس ہو رہا ہے۔ اس کتاب میں غالب کی شاعری کے الفاظ اور تراکیب کی ایک دنیا ہے جسے دیوان غالب سے الگ کر کے پڑھنا ایک نئے تجربے سے گزرنا ہے اور ان تراکیب کے ساتھ اشعار بھی درج کیے گئے ہیں جن میں یہ تراکیبیں آئی ہیں۔ رشید حسن خاں نے اس کتاب کی تیاری میں عمر کا عزیز ترین حصہ صرف کیا ہے اور انھیں آج کی طرح وہ سہولتیں بھی حاصل نہیں تھیں۔ اپنے وسائل کو استعمال کر کے انھوں نے جو یہ کارنامہ انجام دیا ہے وہ عملی ادبی کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ اس کتاب سے واضح ہے کہ رشید حسن خاں نے دیوان غالب کی ایک خاص انداز سے قرأت کی ہے اور قرأت کا یہ انداز عام تنقیدی مطالعے سے بہت مختلف ہے۔ اسے تنقیدی مطالعہ کے بجائے تحقیقی مطالعہ کہنا چاہیے۔ اندازہ کیجیے کہ تحقیقی مطالعہ تنقیدی مطالعے سے کبھی کس قدر اہم ہو جاتا ہے رشید حسن خاں نے دیوان غالب کا جتنی بار مطالعہ کیا ہے وہ ایک واقعہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت سے مطالعہ غالب ایک نئی منزل میں داخل ہو جاتی ہے جو غالب کے قارئین کو نئی سمتوں کی طرف لے جائے گی۔ رشید حسن خاں آج ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کی یہ کاوش ان کی موجودگی کا ہمیشہ احساس دلاتی رہے گی۔''

(پیش لفظ، صدیق الرحمٰن قدوائی، مشمولہ گنجینۂ معنی کا طلسم، مرتب رشید حسن خاں، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2017، صفحہ 7)

یہاں یہ بات واضح کر دوں کہ اس اشاریۂ دیوان غالب سے قبل رشید حسن خاں مرحوم ''کلاسیکی ادب کی فرہنگ، جلد اوّل'' مرتب کر چکے ہیں۔ یہ فرہنگ خاں صاحب کے مرتب کردہ کلاسیکی متون کی شرح ہے۔ اس فرہنگ کو انجمن ترقی اُردو ہند نے 2003 میں قارئین کے سامنے پیش کیا۔ اس فرہنگ کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ اس فرہنگ کی دوسری جلد پر کام شروع ہو چکا تھا لیکن خاں صاحب کی عمر نے ساتھ نہ دیا۔ خوشی کا مقام یہ ہے کہ خاں صاحب نے دیوان غالبؔ کا اشاریہ اپنی زندگی میں ہی ترتیب دے دیا تھا اور اس پر مقدمہ 16 اپریل 2005 کو رقم کیا تھا۔ خاں صاحب نے اس کتاب کو نیویارک، امریکہ میں مقیم اپنے عزیز دوست الحاج عبدالوہاب خاں سلیم کی فرمایش پر مرتب کیا تھا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ خاں صاحب نے اس کام سے دیگر علمی کاموں میں مصروفیت کی وجہ سے بے اعتنائی نہ برتی بل کہ اپنے مشن میں رات دن لگے رہے۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ دیوان غالبؔ کی لفظیات کی شرح کی تدوین کا کام بھی ہوتا رہا اور دوسری تدوینی کتابیں بھی یکے بعد دیگرے منظر عام پر آتی گئیں۔ رشید حسن خاں مرحوم کی عبدالوہاب خاں سلیم سے اس کام کے سلسلے میں جو اُنسیت اور محبت تھی وہ کسی سے چھپی نہیں تھی۔ اس لیے خاں صاحب گنجینۂ معنی کا طلسم کی کتابت اور پروف ریڈنگ کا کام کہاں تک مکمل ہو گیا ہے، کی اطلاع بہ ذریعہ خط سلیم صاحب کو وقتاً فوقتاً دیتے رہتے تھے۔ رشید حسن خاں نے 8 ستمبر 2005 کو عبدالوہاب خاں سلیم کے نام لکھے خط میں گنجینۂ معنی کا طلسم کے کام کی پوزیشن اور نوعیت کے بارے میں تحریر کیا:

''محبِّ مکرم!

غالبؔ سے متعلق میری کتاب گنجینۂ معنی کا طلسم کے شروع کے حصے کی کمپوزنگ مکمل ہو گئی ہے، کل ہی مجھے یہ پیکٹ ملا ہے تصحیحات بنانے کے لیے۔ میں اپنے مقدمے کے آخری صفحے کا عکس آپ کے ملاحظے کے لیے بھیج رہا ہوں یوں کہ پوری کتاب چھپنے میں تو سال ڈیڑھ سال لگ جائے گا۔ آپ کو یاد کرتا رہتا ہوں۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ٹی۔ آر۔ رینا، اُردو بک ریویو نئی دہلی، 2011، صفحہ 744 تا 745)

رشید حسن خاں نے اپنے مقدمے میں اس بات کا انکشاف بھی کیا ہے کہ اس کتاب کا نام ڈاکٹر اسلم پرویز کا تجویز کیا ہوا ہے۔ موصوف نے ڈاکٹر اسلم پرویز مرحوم (2017-1932) کا شکریہ اپنے مقدمے میں ادا کیا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ ڈاکٹر اسلم پرویز نے بھی ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جس میں کل مضامین کی تعداد 13 ہے۔ اس کتاب کو غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے 2014 میں شائع کیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ خاں صاحب سے قبل غالب صدی کے سلسلے میں 1970 میں شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی کی جانب سے بھی ایک کتاب ''اشاریۂ کلام غالب'' منظر عام پر آ چکی ہے۔ اس کتاب میں غالب کے اُردو فارسی کلام کے منتخب مرکبات کا یکجا کیا گیا تھا۔ لیکن یہ کام مکمل نہیں تھا۔ کیوں کہ رشید حسن خاں کا نام بھی اس کے مرتبین میں شامل تھا۔ بطور مرتب خاں صاحب اس نامکمل کام سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کی نظر میں اشاریۂ غالب کام سلیقے اور قرینے سے ہونا چاہیے تھا۔ اس کام کا خاکہ اُسی وقت سے ان کے ذہن میں گردش کر رہا تھا اور وہ فکرمند تھے کہ یہ کام غالب کی شایانِ شان ہونا چاہیے۔ اس بارے میں مزید تفصیلات دیتے ہوئے رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''میرے ذہن میں یہ خیال اُسی وقت بیٹھ گیا تھا کہ یہ کام بھی کرنے کا ہے لیکن دوسرے کاموں نے مہلت نہیں دی۔ اس پر تیس بتیس سال گزر گئے۔ زندگی کی محدود مدت میں سب ضروری کاموں کی تکمیل کون کر سکا ہے؛ یہ سوچ کر اب سے دو سال پہلے میں نے اس کام کا ڈول ڈالا۔ یہ بات عام ہے کہ ایسے کاموں میں بہت سی اُلجھنیں سامنے آتی رہتی ہیں، ایسا ہی ہوا۔ بہ ہر طور، زورقِ اندیشہ بہ ساحل رسید۔''

(مقدمہ، گنجینۂ معنی کا طلسم، مرتب رشید حسن خاں، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2017، صفحہ 12)

میں اس بات کو بھی عرض کر دوں کہ ایک زمانے سے خاں صاحب کلام غالب کی لفظیات سے متعلق خط و کتابت اپنے عزیز و اقارب سے کر رہے تھے۔ تا کہ کلام غالبؔ

سے متعلق ایک ایسی فرہنگ تیار کی جا سکے جو سنجیدہ قاری اور طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے بھی کام آئے۔ رشید حسن خاں نے کلام غالبؔ کی لفظیات پر اپنے جن ادب نواز ہم نواؤں سے بہ ذریعہ خطوط مشورہ کیا اُن میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر حنیف نقوی، ڈاکٹر صابر سنبھلی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، اسلم محمود، پروفیسر اصغر عباس، ڈاکٹر ٹی آر رینا، ڈاکٹر خلیق انجم، شاہد ماہلی، عبدالرزاق قریشی، پروفیسر علی احمد فاطمی پروفیسر سید عقیل احمد رضوی، مختار الدین احمد، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، یعقوب میرا مجتہدی، عبدالوہاب خاں سلیم وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان مایہ ناز ادبی شخصیات سے بہ ذریعہ قلم گفت وشنید سے ادب کے طالب علموں بالخصوص جہانِ غالبؔ میں غوطہ لگانے والے قارئین کو بہت سی کار آمد باتیں معلوم ہوئیں۔ رشید حسن خاں کلامِ غالبؔ کی فرہنگ پر دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت کے زمانے سے ہی کام کر رہے تھے۔ خاں صاحب غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی سے بہ حیثیت ایک رُکن اور ادبی کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ممبر کی حیثیت سے بھی وابستہ تھے۔ اس لحاظ سے غالبؔ پر ہونے والی ہر ادبی سرگرمیوں اور سمیناروں کے وہ گواہ تھے۔ غالبؔ نامہ کی طباعت اور اس میں شامل مضامین پر ان کی گہری نظر تھی۔ اپنے دوستوں کو وہ کلامِ غالبؔ کی تدوین کے لیے آمادہ کرتے تھے تا کہ غالبؔ شناسی میں مزید اضافہ ہو۔

کلامِ غالب کی طرح رشید حسن خاں نے اُردو کے کلاسیکل متون کی تدوین کے ساتھ ساتھ کلامِ اقبال کی تدوین کا بھی منصوبہ بنایا تھا۔ کلامِ اقبال کی تدوین کے سلسلے میں رشید حسن خاں نے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (صدر شعبۂ اُردو، پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج لاہور) سے مراسلت کی تھی۔ دراصل پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کی اقبال شناسی سے رشید حسن خاں متعارف اور مدّاح تو تھے ہی ساتھ متاثر بھی تھے۔ کلامِ اقبال کی تدوین ان دونوں مایہ ناز ادبی شخصیات کا مشترکہ منصوبہ تھا۔ رشید حسن خاں نے رفیع الدین ہاشمی صاحب کے نام تقریباً 50 خطوط تحریر کیے۔ یہ خطوط 3 کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ (مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتّب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، میں 50 خط، رشید حسن خاں کے خطوط جلد اوّل میں 12 خط، رشید حسن خاں کے خطوط جلد دوم میں 38 خط شامل ہیں۔ ان دونوں جلدوں کے مرتّب ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا ہیں۔) ان 50 خطوط میں سے 24 خط کلامِ اقبال کی تدوین کے متعلق تحریر کیے گئے ہیں۔ کئی خط بہت ہی طویل ہیں۔ اس مقدمے میں کلامِ اقبال کی تدوین سے متعلق بحث کو قارئین کے سامنے پیش کرنا ناگزیر ہے تا کہ قارئین رشید حسن خاں کی تدوینی خدمات کا خود جائزہ لے سکیں اور فیصلہ کر سکیں کہ رشید حسن خاں جس تدوینی کام کو اپنے ہاتھ میں لیتے تو اس کام میں وہ کس قدر منہمک اور یکسوئی سے کام کرتے، چاہے اس کے لیے انھیں برسوں برس ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑا ہو۔

رشید حسن خاں نے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام 17 جون 1993 کو ایک خط تحریر کیا۔ جس میں انھوں نے کلامِ اقبال کی موجودہ صورتِ حال اور اس کی از سرِ نو تدوین کی ضرورت اور اس پر کام کرنے کے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ لکھتے ہیں:

> ''ہاں صاحب! اس کلیات کو دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی، یوں کہ مقصد محض تجارت معلوم ہوتا ہے۔ غضب خدا کا تین چار طرح کا معمولی کاغذ لگایا گیا ہے، جو اوپر سے ہی صاف معلوم ہوتا ہے۔ حاشیوں کی کٹائی اِس بے دردی کے ساتھ کی گئی ہے کہ متعدد صفحات کی صورت بگڑ گئی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ارمغانِ حجاز کو دو مستقل حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ مرتّب کو اس کا حق کسی طور پر حاصل نہیں تھا۔ میرے پاس چودھری محمد حسین والا پُرانا اڈیشن ہے۔ (نویں اشاعت) اُس میں یہ تقسیم موجود نہیں۔ اِس میں مزید ستم یہ ہوا کہ ص 1028 کے بعد ارمغان حجاز- اُردو کا آغاز ہوتا ہے اور اِس صفحے سے نیا نمبر شمار 643 شروع ہوتا ہے جو ص 692 پر ختم ہوتا ہے اور اُس کے بعد پھر ص 1029 آ جاتا ہے۔ یہ تو ستم نہیں ستم ظریفی ہے۔
> میرا ارادہ ''کلامِ اقبال کی تدوین کی ضرورت'' لکھنے کا تھا اور ہے، مگر آپ نہیں چاہتے کہ لکھوں، ورنہ کچھ دُعا کرتے، تعویذ بھیجتے، عمل پڑھتے کہ طبیعت ٹھیک ہو جاتی۔ خیر، میرا یہ ارادہ ضرور ہے کہ طبیعت کے رُو بہ راہ ہوتے ہی اِس موضوع پر چند صفحات لکھوں اور آپ کے ملاحظے کے لیے بھیج دوں۔ یہ واقعتاً افسوس کا مقام ہے کہ آج تک کلیاتِ اقبال اصولِ تدوین کے مطابق مرتب نہیں کیا جا سکا، جس طرح مثلاً دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ہے۔''

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، صفحہ 71 تا 72، مرتب، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ادبیات، اُردو بازار، لاہور، جون 2009)

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کو لکھے خطوط کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں نے کلامِ اقبال کی تدوین سے متعلق پہلا خط 4 دسمبر، 1992 میں رقم کیا۔ اس خط کے مطابق رشید حسن خاں کلامِ اقبال کی تدوین کا مصمّم ارادہ کر چکے تھے اور وہ اس کام کو ایک مثالی کام کی شکل دینا چاہتے تھے۔ 4 دسمبر، 1992 والے خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں اس خط سے قبل بھی ایک خط پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام 'کلامِ اقبال' کی تدوین سے متعلق تحریر کیا تھا۔ (افسوس یہ خط اب دستیاب نہیں) رشید حسن خاں انڈو پاک میں اقبالیات پر شائع ہونے والے مضامین، اُردو اکادمیوں کے ساتھ ساتھ اُردو اداروں کے ذریعے منعقد ہونے والے اقبال سمیناروں، اور پروگراموں پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ رشید حسن خاں کلامِ اقبال کا مسودہ بنانے اور اسے ترتیب دینے میں زندگی کی آخری سانس تک ہمہ تن مصروف رہے۔ رشید حسن خاں کی اس بارے میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی سے قلمی گفتگو جاری تھی۔ لیکن رشید حسن خاں کی زندگی اس کام کے لیے ناکافی ثابت ہوئی اور کلامِ اقبال کی تدوین کی حسرت لیے رشید حسن خاں اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے اور یہ کام ادھورا ہی رہ گیا۔ البتہ رشید حسن خاں نے کلامِ اقبال کی تدوین کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے مسوّدے کے کئی صفحات پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کو ارسال کیے تھے۔ اگر کوئی ادبی شخص ان کی ورق گردانی کرنا چاہے تو اُسے رشید حسن خاں کے آبائی وطن شاہ جہاں پور کا سفر کرنا ہوگا، وہاں جا کر اُن کی بیٹھک میں میز پر رکھی فائلوں میں قید اِن مسوّدات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ راقم الحروف نے 2015 میں رشید حسن خاں کے پشتینی مکان شاہ جہاں پور میں اختر شاہ جہاں پوری کے ساتھ حاضری دی تھی۔ وہاں

آج بھی نادر مخطوطات، نایاب کتابیں اور مختلف لغات ان کی ذاتی لائبریری میں محفوظ ہیں۔کلامِ اقبال کی تدوین کے تئیں رشید حسن خاں کے جنون کے بارے میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے مزید تفصیلات اُردو دُنیا کے سامنے رکھتے ہوئے تحریر کیا:

''آخری زمانے میں انھوں نے امراؤ جان ادا اور عبدالواسع ہانسوی کی غرائب الغات مرتّب کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔موخرالذکر پر تو کام شروع کر دیا تھا۔39 صفحات کا مسودہ تیار ہو گیا تھا، پھر یہ کام 'مستقلاً ملتوی کر دیا'۔البتہ حیاتِ مستعار کے آخری برس (2005 میں) انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریک و تجویز پر کلیاتِ اقبال اُردو کی تحقیقی تدوین کا پختہ عزم کر لیا تھا اور مُعاونت کے لیے اس ناچیز کو شریکِ مدوّن نامزد کیا تھا۔ہم نے اس کام کا ایک نقشہ بنایا، طریق کار طے کیا اور میں نے انھیں ضروری کتابیں، کلامِ اقبال کی بعض بیاضیں اور متفرق لوازمہ بھیجا۔اس سلسلے میں خاں صاحب کے ایک مدّاح اور نیاز مند جناب عبدالوہاب خاں صاحب، ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے، مگر خرابیِ صحت کے سبب کام شروع کرنے میں تاخیر ہوتی رہی۔راقم کے نام ایک خط میں عیدالاضحیٰ کے بعد کام بالفعل شروع کر دینے کا عزم ظاہر کیا تھا، مگر صحت کا مسئلہ آڑے آتا رہا۔عارضۂ قلب اور بے خوابی۔ماقبل زمانے میں پھیپھڑوں کی خرابی میں مبتلا رہے تھے۔6 دسمبر، 2005 کے ایک خط (بنام راقم) میں لکّھا: ''سردی کا موسم مجھے راس نہیں آتا۔پچھلے مہینے کے اواخر سے احوال یہ ہے کہ سر جھکا کر ذرا دیر بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ریزش، چھینکیں اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔لکھنا پڑھنا بند ہے۔'' دراصل خاں صاحب کا لکھنا پڑھنا کئی ماہ سے معطّل چلا آ رہا تھا۔اپنی مخدوش صحت کے پیشِ نظر شاید انھیں دھڑ کا بھی لگا رہتا ہوگا۔کئی برس پہلے (غالباً اکتوبر 1997) میں عرشی زادہ کے اچانک انتقال پر خاں صاحب کا ''جی دہل کر رہ گیا۔'' انھوں نے نیّر مسعود کو لکھا: ''موت کا جھونکا پڑا تھا، اس کا عمل اب معلوم ہوا۔سچ ہے یہ دُنیا فانی ہے، مگر تدوین کا کام کرنے والوں کے لیے یہ سوچنا گناہ ہے، اس لیے میں یہ نہیں سوچتا۔'' سو، خرابیِ صحت کے باوجود عزم یہ تھا کہ ''میں اقبال والے کام کو مثالی کام کے طور پر مکمل کرنا چاہتا ہوں۔اس میں دو سال تو لگ جائیں گے۔''

راقم خوش تھا کہ خاں صاحب جیسے محقق اور نقّاد نے اقبالیات کی جانب اِعتنا کیا ہے، اسے میں نے اقبالیات کی خوش قسمتی جانا لیکن کیا خبر تھی کہ یہ خوشی عارضی ہوگی اور وہ، اقبالیات تو ایک طرف، دُنیائے فانی سے منہ موڑ کر، اُردو ادب خصوصاً دُنیائے تحقیق و تدوین اور اپنے مدّاحوں اور قدر دانوں کی سوگوار چھوڑ جائیں گے۔خدا اُن کی مغفرت کرے اور اُن کی روح کو آسودہ رکھے، آمین۔''

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، صفحہ 31، ادبیات، اُردو بازار لاہور، جون 2009)

جیسا کہ مترشح ہو چکا ہے کہ رشید حسن خاں کی دلی خواہش کلامِ اقبال کی تدوین کی تھی۔کیوں کہ ان کی نظروں میں اقبالؔ کی وفات کے بعد اقبالؔ کی اُردو فارسی شاعری کا کوئی ایسا مجموعہ اب تک مرتّب نہیں ہو سکا جسے اُصول تدوین کے لحاظ سے تحقیقی اڈیشن کہا جا سکے۔اقبال اکادمی پاکستان، لاہور نے 1990 میں کلامِ اقبال کو دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔یہ نسخہ حُسنِ طباعت کا اعلا نمونہ تھا اور ایسے دیدہ زیب اڈیشن اس سے قبل کبھی شائع نہیں ہوئے۔لیکن اس نسخے میں اغلاط کی بھرمار تھی۔رشید حسن خاں کہ مطابق یہ نسخہ تحقیق و تدوین کے اُصولوں پر پورا نہیں اُترتا تھا۔علامہ اقبالؔ کی زندگی میں جتنے بھی مجموعے شائع ہوئے وہ سب اغلاط سے پاک صاف ہوتے تھے، کیوں کہ علامہ اقبال خود ان پر نظرِ ثانی کرتے تھے۔مگر علامہ اقبالؔ کی وفات کے بعد کلیّاتِ اقبال کے جو بھی نسخے منظرِ عام پر آئے اُن سب میں اغلاط اور اضافوں کی بھرمار تھی۔جاوید اقبال والا مرتب کردہ کلیات بھی ان غلطیوں سے بچ نہ سکا۔اس میں بھی اغلاط اور اضافے دونوں تھے۔رشید حسن خاں نے بڑی عرق ریزی، گہرائی اور گیرائی سے ان نسخوں کا مطالعہ کیا اور ان میں در آئی غلطیوں کو حوالوں اور دلیلوں کے ساتھ اُردو دنیا کے سامنے پیش کیا۔رشید حسن خاں کا یہ مضمون پہلی مرتبہ رسالہ 'اقدار' کراچی اور دوسری مرتبہ رسالہ 'سیّارہ' لاہور میں شائع ہوا تھا۔بعد میں اس مضمون کو رشید حسن خاں نے اپنی کتاب 'تحقیق۔تدوین روایت میں شامل کیا۔جاوید اقبال نے کلیات اقبال کو مرتب کیا تھا، لیکن خاں صاحب اس اڈیشن سے خوش نہیں تھے۔ان کے مطابق یہ اڈیشن پشتارۂ اغلاط کا نمونہ بن گیا تھا۔

رشید حسن خاں کے مطابق اِملا سے متعلق جاوید اقبال کا اڈیشن اغلاط کا مجموعہ بن گیا ہے۔کیوں کہ اس اڈیشن کے فاضل مرتب نے منشائے مصنف کو درکنار کر اپنی مرضی سے اس نسخے میں الفاظ جمع کیے ہیں۔جاوید اقبال نے اس نسخے میں ہندوستانی املا کو ترجیح دی ہے۔اس کے برعکس اقبال اکادمی پاکستان، لاہور کی جانب سے شائع ہوئے فارسی کلیات میں جدید ایرانی اِملا کو ترجیح دی گئی۔رشید حسن خاں نے اپنے مضمون میں یہ ثابت کیا کہ اِملا کا یہ طریقہ اقبالؔ کے طریقِ نگارش کے خلاف ہے۔اقبال اکادمی پاکستان ،لاہور نے اپنے اُردو کلیات میں ایرانی املے کی بجائے ہندوستانی املا کی پابندی کی۔اس طرح اقبال کے کلام کی اشاعت کے لیے دو دو طریقۂ املا کو اختیار کیا گیا۔اس طریقے کی کوئی وضاحت پیش کرنا ادارے نے کلیات کے مقدّمے میں مناسب نہیں سمجھا۔یہ طریقۂ کار تدوینی اُصولوں کے خلاف مانا جاتا ہے۔اِملا کے اس دورنگے پن کی وجہ تب سمجھ میں آتی جب خود علامہ اقبالؔ نے اپنی زندگی میں اسے اپنایا ہوتا۔املا اور اشعار میں در آئی غلطیوں کو جب رشید حسن خاں نے دیکھا تو اُن کے دماغ میں کلامِ اقبال کی تدوین کا مکمل خاکا تیار ہو چکا تھا۔تقریباً 14 سال تک کلامِ اقبال سے متعلق مواد کو یکجا کیا۔پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے بھی ان کی خاطر خواہ مدد کی۔رشید حسن خاں کو لکھے مکتوبات میں ہاشمی صاحب نے اس بات کا اعتراف کیا کہ جاوید اقبال والے اڈیشن میں اغلاط کی بھرمار ہے۔4 دسمبر 1992 کو رشید حسن خاں نے رفیع الدین ہاشمی کے نام لکھے خط میں کلامِ اقبال کی جانب

توجہ مبذول کرائی تو ادبی حلقوں میں کلیاتِ اقبال (اُردو اور فارسی) کی تدوین کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اُردو دُنیا کو خوشی اس بات کی تھی کہ رشید حسن خاں جیسے چوٹی کے محقق و مدوّن نے اس کام کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ اس بات کو سبھی لوگوں نے تسلیم کیا کہ اس کام کے لیے ان سے بہتر مدوّن کون ہوسکتا تھا۔ کیوں کہ کلامِ اقبال کے جس ڈیلکس اڈیشن کی دھوم سارے زمانے میں مچی تھی، رشید حسن خاں نے اپنے تنقیدی مضمون میں اِس ڈیلکس اڈیشن کی خامیوں کو اُجاگر کیا تھا۔ جس پر مقدّمہ ڈاکٹر وحید قریشی کا تھا۔ اس اڈیشن میں زیادہ تر غلطیاں اِملا اور لفظوں کی بناوٹ کی تھیں۔ الغرض! جتنے بھی کلیاتِ اقبال کے نسخے بازار میں آئے وہ پہلے والے نسخے سے اضافی، ترمیم یا تخفیف کی شکل میں تھے۔ ان تمام نسخوں کے حوالے سے ایک طویل بحث ''اخبارِ اُردو'' میں مئی 1996 میں ہوچکی ہے۔ یاد رہے کہ اُردو اخبار، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان اسلام آباد کا ماہ نامہ ادبی ترجمان ہے۔

اس بحث سے قبل اُردو اخبار میں رشید حسن خاں کی کتاب 'اُردو اِملا' اور گوپی چند نارنگ کی کتاب 'اِملا نامہ' میں لفظوں کی بناوٹ اور شکل پر بھی اعتراض کیے گئے تھے۔ حالاں کہ اس بحث و مباحثے سے رشید حسن خاں کے کلامِ اقبال کی تدوین کے ارادے پر کوئی فرق نمایاں نہیں ہوا۔ جیسا کہ میں پہلے تحریر کر چکا ہوں کہ رشید حسن خاں کلامِ اقبال کی تدوین کا مکمل خاکا تیار کر چکے تھے۔ رشید حسن خاں نے کلامِ اقبال کے تحقیقی اڈیشن کو مرتب کرنے کے سلسلے میں، جن اُصول وضوابط کے تحت اس کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا جائے گا، تحقیق وتدوین کے کن طریقوں کو اپنایا جائے گا اور یہ کام کس نوعیت کا ہوگا، ان تمام امور کی وضاحت رشید حسن خاں نے اس طرح کی:

> ''کلامِ اقبال کا تحقیقی اڈیشن مرتّب کرنے کے سلسلے میں مناسب طریقۂ کار یہ ہوسکتا ہے کہ کلامِ اقبال کے جتنے مجموعے ہیں اُردو فارسی دونوں زبانوں کے، ان کو الگ الگ مرتّب کیا جائے۔ ہر جلد میں اس جلد سے متعلق آخر میں مفصل حواشی ہوں، (جو کئی ضمیموں میں منقسم ہوں گے) اور شروع میں مفصل مقدمہ ہو، ہر مجموعے کو الگ الگ مرتّب کرنا یوں ضروری ہے کہ بعض مجموعوں کے حواشی کی ضخامت کچھ زیادہ ہوگی۔ مثلاً بانگ درا میں شامل کلام سے متعلق تفصیلات بہت ہیں۔ حواشی میں ہر نظم کے حوالے سے اس کے زمانۂ تصنیف کا تعین کیا جائے۔ یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ یہ پہلی بار کہاں چھپی تھی۔ کیا اس کے متن میں ترمیم وتنسیخ کی گئی ہے۔ ایسے سارے تغیرات کی تفصیلات کو یکجا کیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ اس مجموعے کے جملہ مشتملات میں متن کی ہر طرح کی تبدیلیوں کو تفصیلات کو مع حوالہ درج کیا جائے گا۔ یہ تبدیلیاں خواہ بہ لحاظ مقدار کلام ہوں، خواہ بہ اعتبار تبدیلی متن۔ اسی طرح مقدمے میں اس مجموعے کے زمانۂ ترغیب وطباعت اور دوسرے متعلقات کی تفصیلات ہوگی۔ یہ بھی وضاحت کرنا ہوگی کہ اقبال کی زندگی میں یہ مجموعہ کتنی بار چھپا تھا۔ اسے مرتّب کس نے کیا تھا اور ایسی ہی دوسری باتیں۔ یہ بھی صراحت کی جائے گی کہ اس مجموعے میں جو کلام شامل ہے کیا وہ بہ خطِ اقبال موجود ہے تو وہ کہاں ہے۔ مطبوعہ اور خطی نسخوں یا مختلف تحریروں میں اختلاف تو نہیں۔ اگر ہے تو اس کی تفصیلات اور وجوہِ ترجیح کا تعین۔ مقدمے ہی میں اصولِ اِملا، رموزِ اوقاف اور نشانات کی تفصیل لکھی جائے گی اور ترتیب متن کے لیے جو طریقۂ کار اختیار کیا گیا ہے اس کی وضاحت کی جائے گی۔ آخر میں تلمیحات اور ضروری الفاظ پر مشتمل فرہنگ بھی ہوگی۔ اصولِ تخریج کے متعلقات کا اس سے پہلے ذکر آچکا ہے۔ ''تخریج لازمی حصہ ہے تدوین کا۔''

(تدوین، تحقیق، روایت: صفحہ 103 تا 104، رشید حسن خاں، ایس اے پبلی کیشنز، نئی دہلی، 1999)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ رشید حسن خاں نے کلامِ اقبال (اُردو اور فارسی) سے متعلق خاطر خواہ مواد اپنے پاس جمع کرلیا تھا۔ جب تک خاں صاحب دہلی یونی ورسٹی میں قیام پذیر رہے تب تک مواد کی فراہمی کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ لیکن ان کے اپنے آبائی وطن شاہ جہاں پور پہنچنے کے بعد کلامِ اقبال کی تدوین سے متعلق مواد کی فراہمی ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ انھیں جیسی سہولات دہلی یونی ورسٹی میں میسّر تھیں ویسی شاہ جہاں پور میں حاصل نہیں تھیں۔ لیکن ان کے دُنیا بھر میں موجود ادبی خیر خواہوں، حبیبوں اور رفیقوں نے اس کارِ خیر میں شامل ہونا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھا اور ان لوگوں کو کلامِ اقبال سے متعلق جہاں بھی مواد ملتا اسے فوراً رشید حسن خاں تک پہنچا دیتے۔ رشید حسن خاں نے ایسے لوگوں سے بھی مراسلت کی جو اُن کی نگاہ میں ماہرِ اقبالیات تھے یا اقبال اور اقبال کے کلام سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ مثنوی گلزارِ نسیم، کلامِ جعفر زٹلّی کی تدوین کے بعد مصطلحاتِ ٹھگی کے ساتھ رشید حسن خاں نے کلامِ اقبال پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے تمام عمر تحقیق، تدوین اور تنقید کی خدمت کے لیے وقف کی۔ ہندو پاک کے محققین اور مدوّنین میں ان کا مقام و مرتبہ منفرد و اعلا تھا۔ 23 سے زائد کتابوں کی ترتیب وتدوین دینے کے بعد بھی ان کی ہمّت اور جذبے میں کسی بھی طرح کی رُکاوٹ نہ آئی۔ یہ اپنے مشن میں دوگنے جوش و ولولے کے ساتھ لگے رہے۔ دل میں اقبالؔ، امراؤ جان ادا اور غرائب اللغات کے متون کی تمنّا تھی۔ غرائب اللغات کے مسوّدے کے 39 صفحات کی کتابت اُن کے سامنے ہوچکی تھی۔ غالبؔ کے کلام کی فرہنگ کی ترتیب دینے کا کام بھی ان کی عمر کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ اس فرہنگ کا نام انھوں نے ''گنجینۂ معنی کا طلسم رکھا تھا۔ عہدِ حاضر کے تمام ناقدین نے ان کے کام کو سراہا اور توصیف وتعریف بھی کی۔ دورِ حاضر میں، تحقیق وتدوین سے متعلق اگر کوئی کتاب مرتّب کی جاتی ہے تو رشید حسن خاں کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ دنیا کی کئی دانش گاہوں نے ان کی تحقیقی وتدوینی کتابوں کو اپنے نصاب میں شامل کیا ہوا ہے۔ کلاسکی ادب کی 5 کتابیں طلبہ واساتذہ کے لیے مشعلِ راہ بنی ہوئی ہیں۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے لیکن جس معیار کا کام رشید حسن خاں نے کیا ہے ویسا ان کا نہیں۔ رشید حسن خاں نے تحقیق وتدوین کے جو اصول بنائے ان پر وہ تاعمر جمے رہے اور دوسرے لوگوں کی ادبی کاوشوں کو انھیں اصول وضوابط کے تحت پرکھتے رہے۔ اصل مواد تک رسائی کرنا ان کا اولین فرض تھا۔ ثانوی مواد سے کام لینا ان کی ادبی شان کے خلاف تھا۔ اصل مواد تک پہنچنے کے لیے چاہے انھیں کتنا ہی انتظار کیوں نہ کیا ہو۔ دنیا کی کوئی بھی لائبریری جس میں ان کے مطلب کا مواد ہو، ان کی دسترس سے باہر نہ تھی۔ اگر خاں

صاحبِ اِن کُتب خانوں تک خود نہ پہنچ سکے تو اِن کے رفیق انھیں وہاں سے مواد کو لا کر دیتے تھے۔ مواد کی فراہمی کے لیے خط و کتابت ان کے لیے سب سے آسان طریقہ تھا۔ ان کی یہ تحقیقی و تدوینی کاوشیں ان کے ادبی کارناموں میں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے تحقیق و تدوین کو اوڑھنا بچھونا بنانے کے ساتھ ساتھ اپنا ادبی شعار بنا لیا تھا۔ پروفیسر گیان چند جین نے ایک محقق اور مدوّن کے جملہ اوصاف کی نشان دہی کرتے ہوئے کیا خوب لکھا ہے:

''تحقیق محض ایک ادبی مشغلہ ہی نہیں یہ ایک مسلک، ایک ذہنی رویّہ، ایک طرزِ زندگی ہے۔ یہ سچ کا کاروبار ہے۔ محقق کو تحریر میں، نیز روزانہ زندگی میں، سچ کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔ فریب، ریا، تشنہ، خفیف الحرکاتیاں تحقیقی مزاج کی منافی ہیں۔ مثلاً کسی دوسرے کی دریافت کو بغیر حوالے کے اپنا لینا، بالفاظِ دیگر سرقہ کر لینا ایک غیر محققانہ کردار کا غماز ہے۔''

(تحقیق کا فن، صفحہ 51 تا 52، گیان چند جین، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، 2008)

رشید حسن خاں نے تحقیق و تدوین کے اصولوں کو تاعمر نبھاتے ہوئے صبر و تحمّل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ کبھی عجلت اور تساہلی کو اپنا شیوہ نہیں بنایا۔ اسی صبر و تحمّل کا نتیجہ ہے کہ ان کی بعض کتابیں 20 اور 22 سالوں کی تحقیقی کاوشوں کے بعد منظرِ عام پر آئیں۔ اُردو اِملا، باغ و بہار، فسانۂ عجائب اس کی عمدہ مثال ہیں۔ ایک ایک مخطوطے کی تلاش اور بازیافت کے لیے انھوں نے اپنا قیمتی وقت اور سرمایہ صرف کیا۔ ''تحقیق'' کے متعلق خود رشید حسن خاں نے یوں تحریر کیا ہے:

''تحقیق بہت صبر آزما کام ہے، عجلت اور خفیف الحرکاتی اُس کو راس نہیں آتی اور بُل ہوسی سے اُسے بیر ہے۔ علمی اور تحقیقی کارنامے اس طرح عالمِ وجود میں نہیں آتے کہ کاتا اور لے دوڑی۔ فارسی کے معروف لُغت 'بہارِ عجم' کا نام سبھی نے سُنا ہوگا، اُس کے مولّف ٹیک چند بہارؔ نے عمرِ عزیز کے بیس سال صرف کیے تھے جمع و ترتیب پر۔ حقائق کی بازیافت اور صداقت کی تلاش بجائے خود مقصد ہے، جب بھی دوسرے مقاصد کے حصول کے لیے تحقیق کو استعمال کیا جائے گا اور آنکھیں ایمان داری کے نور سے محروم ہو جائیں گی۔''

(ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، صفحہ 52، رشید حسن خاں، اُتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ، 2005)

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے رشید حسن خاں کی تحقیقی، تدوینی اور تنقیدی کاوشوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جناب رشید حسن خاں کا بیش تر تحقیقی کام اصولِ تحقیق، زبان، قواعد، لغت اور اِملا پر ہے۔ اُردو زبان و ادب سے متعلق انھوں نے بہت سے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ اب اقبالیات کی طرف ان کی توجہ اور اعتنا میرے جیسے اقبالیات کے طالبِ علم کے لیے قلبی مسرّت کا باعث ہے۔ بل کہ ان کے اس اعتنا کو ''اقبالیات'' کی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ ضمناً یا جملہ معترضہ کے طور پر یہ عرض کرتا چلوں کہ میرے نزدیک انھوں نے اُردو زبان و ادب خصوصاً تدوین و تحقیق کے شعبے میں نہایت ہی قابل قدر اور نا قابل فراموش کام انجام دیے ہیں۔ ان کا مرتبہ کلاسیکی ادب کی تدوین کی تین کتابیں (باغ و بہار، فسانۂ عجائب اور مثنوی گلزارِ نسیم) اُردو میں تحقیق تدوین کا ایک معیاری نمونہ ہیں۔''

(تدوین، تحقیق، روایت، صفحہ 119، رشید حسن خاں، ایس۔ اے پبلی کیشنز، نئی دہلی، 1999)

اب میں اُن خطوط کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں جن میں رشید حسن خاں نے کلامِ اقبال کے بارے میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی سے قلمی گفتگو کے ساتھ ساتھ اپنے عزائم کی تجدید کی تھی۔ یہ بات قابلِ غور رہے کہ موصوف کو آخری وقت میں کئی طرح کی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ آنکھوں سے کم دکھائی دینے لگا تھا۔ لکھتے وقت ہاتھوں میں جنبش ہونے لگتی تھی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر اُن کا قلم اور تیز چلنے لگتا تھا۔ دن میں پانچ چھے گھنٹے کام کرنا ان کا معمول تھا۔ 23 جون، 2003 کو رفیع الدین ہاشمی کے نام لکھے خط میں ان تمام باتوں کا احاطہ اور محاکمہ کیا گیا ہے۔ خط ملاحظہ ہو:

''میری صحت اچھّی نہیں، ڈاکٹر نے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی ہے، چلنے کو منع کیا ہے۔ دل کی رفتار اچانک بگڑنے لگتی ہے۔ پیش میکر تجویز کیا گیا؛ مگر ایک ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ عُمر کی بنا پر کُچھ خطرہ بھی ہے اس میں۔ دوائیں کھا رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی آنکھوں میں بھی دم ہے اور ہاتھوں کو بھی جنبش ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قلم کی سیاہی خشک نہیں ہو پائی ہے۔ چاہتا یہ ہوں کہ دمِ آخر تک قلم کی حرمت اور اُس کی روانی، دونوں پر حرف نہ آنے پائے۔''

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، جون 2009 صفحہ 131، مرتب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ادبیات، اُردو بازار لاہور)

11 مئی، 1993 میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام لکھے گئے خط میں کلامِ اقبال کی تدوین کے متعلق رشید حسن خاں یوں رقم طراز ہیں:

''دو ہفتے قبل یہاں انجمن ترقی اُردو کی طرف سے اقبال سیمینار ہُوا تھا، میں نے بھی اُس میں ایک مختصر سا پرچہ پڑھا تھا؛ ''کلامِ اقبال کی تدوین جدید کی ضرورت''۔ آغاز کی سطر یہ تھی: ''ہم کو فراخ دلی کے ساتھ یہ بات مان لینا چاہیے کہ کلامِ اقبال کا کوئی ایسا مجموعہ اب تک مرتّب نہیں ہو سکا ہے جِسے اصولِ تدوین کے مطابق معیاری اور مثالی کہا جا سکے''۔ اِس کے بعد باقی بحثیں تھیں''۔

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، صفحہ 69)

رشید حسن خاں کا مضمون '' کلامِ اقبال کی تدوین'' کے عنوان سے پہلے 'اقدار' کراچی اور پھر 'سیّارہ' لاہور میں ستمبر 1994 میں شائع ہوا تھا۔ اس پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے رشید حسن خاں نے ایک خط 5 جولائی 1993 میں ہاشمی صاحب کے نام تحریر کیا۔ لکھتے ہیں:

''ہاں صاحب! آپ نے لکھا ہے کہ کلیّاتِ اقبال پر تبصرہ سیّارہ کے نمبر کے لیے لکھوں۔ میں تو آپ کا نیاز مند ہوں اور آپ کے حکم کی تعمیل کو فرض نہ سہی، واجب تو ضرور سمجھتا ہوں؛ مگر وہ خط بھی تو اُسی میں چھپے گا۔ کیا ایسی دو مختلف تحریروں کا ایک ساتھ چھپنا مناسب ہے؟ میری رائے میں تو مناسب نہیں۔''

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، صفحہ 73)

8 ستمبر، 1993 کو لکھے خط میں رشید حسن خاں نے ہاشمی صاحب سے کلیات اقبال پر اب تک کوئی تبصرہ یا مضمون نہیں لکھ پانے کا افسوس ظاہر کیا۔ لکھتے ہیں۔

''توقع کرتا ہوں کہ آپ بہ عافیت ہوں گے۔ کلیّاتِ اقبال کی تدوین والا مضمون بھی ادھورا پڑا ہے، اُسے مکمل کرنا ہے۔ کیا کروں، چاہتا بہت کچھ ہوں، مگر... اب گھر والے یاد آنے لگتے ہیں اکثر یہ بڑھاپے کی پہچان ہے۔''

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، صفحہ 76)

رشید حسن خاں دہلی یونی ورسٹی کی ملازمت سے سبکدوشی کو بعد دہلی میں صرف پانچ یا چھے برس تک مقیم رہے۔ اس کے بعد وہ اپنے آبائی وطن شاہ جہاں پور 1996 میں چلے گئے تھے۔ 21 دسمبر 1993 کو ہاشمی صاحب لکھے مکتوب میں کلیات اقبال پر مضمون نہ لکھنے پر شاعرانہ انداز میں سطریں تحریر کی ہے:

''کلیاتِ اقبال والا مضمون بھی لکھنا ہے، ذرا دم لوں تو قلم اُٹھاؤں۔ میرے عزیز دوست حسن نعیم تھے، اُن کا یہ شعر اب اکثر یاد آتا ہے؛

کون مجھ سے پوچھتا ہے روز اتنے پیار سے

کام کتنا ہو چکا ہے، وقت کتنا رہ گیا معلوم نہیں اس میں حسرت زیادہ ہے یا تمنّا۔

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، صفحہ 81)

جب رشید حسن خاں نے کلیاتِ اقبال فارسی پر مضمون تحریر کر لیا، تو اُسے شائع ہونے کے لیے پہلے 'سیّارہ' لاہور بھیجا۔ جب وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا تو اسی مضمون کو 'اقدار' کراچی میں چھپنے کے لیے بھیج دیا۔ اس مضمون میں رشید حسن خاں نے حوالے کے طور پر ہاشمی صاحب کی کتاب '' تصانیفِ اقبال'' کو پیشِ نظر رکھا تھا۔ خط میں کتاب کے حوالوں کا بھی تذکرہ ہے۔ اس بات کی تصدیق 4 جولائی 1994 کو پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام لکھے خط سے ہوتی ہے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''ہاں صاحب! میں نے جو خط آپ کے لکھا تھا کلیاتِ اقبال کے حصۂ فارسی کے بارے میں، اُس کے متعلق آپ نے لکھا تھا کہ وہ 'سیّارہ' میں چھپے گا؟ کیا چھپ گیا؟ نہیں، تو کب چھپے گا؟ اگر نہیں چھپے گا تو پھر اُسے میرے پاس فوری طور پر بھیج دیجیے، میں اُسے ذرا سا بدل کر یہاں چھپوا دوں گا۔ سیّارہ کے اربابِ نظر رسالہ مجھے بھیجتے تھے، اب معلوم ہوا کہ سال نامہ (کذا) چھپ گیا، مگر میں محروم رہا، ناراض ہیں شاید! خیر، یہ بھی سہی، مگر وہ خط تو مجھے واپس مل جانا چاہیے، یا پھر چھپ جانا چاہیے۔ اِس کے متعلق ضرور مطلع فرمائیے۔ سیّارہ کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا، تو پھر '' کلامِ اقبال کی تدوین'' کے موضوع پر میں نے جو کچھ لکھا تھا، اُسے اقدار (کراچی) کو بھیج دیا۔ یہ تحریر یہاں اقبال سیمنار میں پڑھی گئی تھی۔ یوں لکھ رہا ہوں کہ اقدار تو اُدھر آتا ہوگا، آپ کی نظر سے اِس گزرنا بس ضروری ہے۔ آپ کے حوالے جگہ جگہ آئے ہیں۔''

(ایضاً صفحہ 83 تا 84)

رشید حسن خاں، کلامِ اقبال کی تدوین والے مضمون کو سیّارہ میں شائع نہ ہونے کے لیے فکر مند تھے۔ موصوف نے ہاشمی صاحب کے نام 24 اپریل 1995 کو ایک اور خط تحریر کیا۔ جس میں ان کے مضمون کا سیّارہ میں شامل نہ ہونے کا مزاحیہ انداز میں ذکر ہے۔ لکھتے ہیں:

''سیّارہ کا اقبال نمبر حصّہ دوم بہ قولِ غالب ''چھپے گا بالفتح یا چھپے گا بالضّم''۔ اب کے سال نامہ میرے پاس نہیں آیا۔ خیر، میں کون سا تیز قلم ہوں، اُن کے لیے کچھ لکھا ہی نہیں، لیکن صدیقی صاحب محترم کی وضع داری پر اعتماد تھا اور ہے۔'' (ایضاً صفحہ 87)

7 دسمبر 1995 کو رشید حسن خاں نے ہاشمی صاحب کے نام خط لکھتے ہوئے تحریر کیا کہ وہ جنوری یا فروری 1996 میں دہلی سے شاہ جہاں پور چلے جائیں گے۔ خاں صاحب نے شاہ جہاں پور کا اپنا پتا خط کے درمیان میں لکھا۔ اس خط کے مطابق رشید حسن خاں کو کسی ادبی جلسے میں شرکت کرنے کے لیے لاہور جانا ہے لیکن ویزا ملنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی کلامِ اقبال کی تدوین پر لکھا گیا مضمون '' اُردو اکادمی، دہلی کے ماہ نامہ علمی و ادبی رسالہ 'ایوانِ اُردو' میں شائع ہونے کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس مضمون کے چرچے، پذیرائی، دل چسپی اور قارئین کی توجہ طلبی کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ لیکن رشید حسن خاں اس مضمون کو سیّارہ، لاہور میں شائع کرانا چاہتے تھے۔ وہ سیّارہ کے اقبال نمبر کا شدّت کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ 6 جنوری 1997 میں ہاشمی صاحب کے نام لکھے گئے خط کے مطابق سیّارہ میں خاں صاحب کا مضمون شائع تو ہو گیا لیکن ابھی تک سیّارہ کی کوئی

بھی جلد انھیں موصول نہیں ہوئی ہے۔اس تعلق سے رشید حسن خاں نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے شکایتی انداز اختیار کیا ہے۔خط کا ایک پیرا گراف ملاحظہ ہو:

''آپ نے لکھا ہے کہ کلّیاتِ اقبال کے دوسیٹ مجھے اکتوبر میں بھیجے گئے تھے اور سیّارہ کا اقبال نمبر بھیجا گیا ہے۔ یہ مان لیتا ہوں کہ یہ سب سچ ہے، ایسا ہی ہوا ہوگا، کیوں کہ آپ نے لکھا ہے: مگر بھائی! یہاں تو کچھ بھی نہیں پہنچا۔ نہ کلّیات، نہ سیّارہ، نہ نقوش کا خاص نمبر۔ معلوم نہیں کیا پیچ پڑا ہے۔ کلّیات کا اور سیّارہ کا شدید انتظار ہے۔ آپ میرے کرم فرما ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں اور لحاظ کرتے ہیں؛ اس لیے آپ ہی سے کہہ سکتا ہوں کہ ذرا بہ طورِ خود دیکھ لیجیے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ کس نے بھیجا، کب بھیجا اور کہاں بھیجا۔ میں پچھلے ہفتے دہلی میں تھا، گائڈ ہال کے اُسی کمرے میں قیام تھا، وہاں جو ڈاک آتی ہے، وہ محفوظ رہتی ہے۔ وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ 28 دسمبر کو میری واپسی ہوئی ہے ایک ہفتہ قیام کے بعد۔ غالب سمینار میں شرکت کرنا تھی۔ اگر بھیجا گیا ہوتا تو ضرور پہنچتا۔(ایضاً، صفحہ 93)

رشید حسن خاں کلیات اقبال اور سیارہ کی ڈاک کی راہ بے صبری سے تک رہے تھے۔ مذکورہ بالا خط کے 16 دن بعد انھوں نے ہاشمی صاحب کے نام ایک اور خط رقم کیا۔ اس خط کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک دونوں مطلوبہ ڈاک رشید حسن خاں کو موصول نہیں ہوئی ہیں۔ خط کی سطروں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کلام اقبال کی تدوین کے سلسلے میں ایک ایک مضمون رشید حسن خاں کے لیے کتنی اہمیت رکھتا تھا۔ 17 جنوری 1997 کو لکھا گیا خط ملاحظہ ہو:

''کلّیاتِ اقبال والا کوئی پیکٹ یہں نہیں پہنچا۔ میں وہاں کسی سے واقف نہیں، آپ ہی کے توسّط سے کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں۔ تو بھائی! کلّیات کو بھجوائیے۔ میں اُس کے لیے چشم بہ راہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا کہنا ضرور اثر کرے گا۔ سیّارہ کا نمبر اب تک نہیں ملا، حالاں کہ یہ تو مجھے سب سے پہلے ملنا چاہیے تھا۔ دراصل مجھے آپ کے استدراک کو دیکھنے کی جلدی ہے اور اشتیاقِ بے حد ہے۔ تو اب آپ کے خط، سیّارہ اور کلّیاتِ اقبال (دونوں قسم کا) اِن سب کی راہ دیکھوں گا۔''(ایضاً، صفحہ 95)

11 فروری 1997 میں رشید حسن خاں نے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کو بہ ذریعہ خط یہ اطلاع دی کہ 'کلیاتِ اقبال' کے ساتھ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور کا شش ماہی اُردو مجلّہ 'اقبالیات' اور اقبال اکادمی پاکستان کا شش ماہی انگریزی رسالہ 'اقبال ریویو' انھیں مل گئے ہیں۔ لیکن سیّارہ کا اقبال سے متعلق خاص نمبر ابھی تک موصول نہیں ہوسکا ہے۔ ساتھ ہی ہاشمی صاحب کو دریغ گوئی سے کام نہ لینے کا مشورہ بھی دیا۔ تقریباً ایک مہینہ بیس دن بعد رشید حسن خاں نے ہاشمی صاحب کو اطلاع دی کہ سیّارہ کا وہ خاص نمبر مل گیا ہے جس کے وہ منتظر تھے۔ ساتھ ہی ہاشمی صاحب کا شکریہ بھی ادا کیا کہ اُن کے مضمون پر اُنھوں نے تعریفی کلمات کے ساتھ تبصرہ بھی کیا اور افسوس اس بات پر ظاہر کیا کہ اب کلام اقبال کا تحقیقی اڈیشن مرتّب نہ ہو سکے گا کیوں اس دور میں علمی قحط جو پڑ گیا ہے۔ کلام اقبال کی تدوین صرف دو آدمیوں (رشید حسن خاں اور رفیع الدین ہاشمی) کا خواب بن کر نہ رہ جائے۔ 2 اپریل 1997 کا خط ملاحظہ کیجیے:

''سیّارہ کے دو شمارے ملے، ایک شمارے میں آپ کا استدراک بھی ہے، میری پریشان نگاری کے ساتھ۔ اِسے پڑھ کر جی خوش ہوگیا۔ میرے متعلق جو کلماتِ تحسین آپ نے لکھے ہیں، ہر چند میں اپنے تئیں اُن کا مصداق بننا دور کی بات سمجھتا ہوں، اس کے باوجود آپ کی دل سوزی اور تعلقِ خاطر کا معترف ہوں مگر ان سب کے باوصف میرا خیال یہی ہے کہ کلّیاتِ اقبال کا کوئی تحقیقی اڈیشن شاید مرتّب ہو نہیں سکے گا، اس کی شاید کسی کو ضرورت ہی نہیں۔ یہ ہم آپ جیسے چند شوریدہ سروں کا نعرۂ مستانہ ہے بس۔ حیرت ہوتی ہے اِس علمی قحط اور اِس ظاہر پسندی پر۔ شاید تدوین سے ابھی تک ذہن آشنا نہیں اور مزاجوں کو تحقیق سے مناسبت کم سے کم پیدا ہو پائی ہے۔ ہر طرف یہی احوال ہے۔ کہ نقش و نگارِ پردۂ در دیکھتے ہیں۔(ایضاً، صفحہ 98)

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے اکتوبر 1997 میں اورینٹل کالج لاہور کے ترجمان رسالے اورینٹل کالج میگزین کے ایک خاص نمبر 'اورینٹل کالج کے موجودہ اساتذہ: کوائف و مطبوعات'، مرتّب کیا۔ ہاشمی صاحب کے اس کام کو رشید حسن خاں نے پسند نہیں کیا۔ کیوں کہ خاں صاحب، ہاشمی صاحب سے کلام اقبال کی تدوین یا کوئی مجموعۂ تدوین کرانا چاہتے تھے۔ رشید حسن خاں کے نزدیک ہاشمی صاحب کا کلام اقبال کی تدوین کے علاوہ کسی اور کام کے بارے میں سوچنا، وقت ضائع کرنے کے برابر تھا۔ لیکن ہاشمی صاحب نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جسے اُردو دُنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔ ہاشمی صاحب نے ایم، اے اُردو کی طالبہ مسرّت انیس سے ایک مقالہ ''رشید حسن خاں؛ احوال و آثار'' تحریر کرایا۔ اس مقالے کو مکمّل کرنے کے لیے مسرّت انیس نے خاں صاحب کو ایک سوال نامہ بھیجا تھا۔ لیکن رشید حسن خاں نے اس خط میں اپنا بایوڈاٹا دینے سے معذرت کر لی تھی۔ 12 اپریل 1998 کو تحریر کیے گئے اس خط کا کلامِ اقبال کی تدوین سے متعلق حصّہ ملاحظہ ہو:

''اچھا کلّیات نہ سہی، آپ اقبال کا کوئی ایک مجموعہ تو بہ طورِ مثال و معیار مرتّب کر دیجیے، تا کہ بعد کو دوسرے لوگ اُسے سامنے رکھ کر کچھ کر سکیں (اگر چہ ''دوسرے لوگ'' جو ایسا کام کر سکیں، کم یاب ہیں) کسی مختصر مجموعے کو لے لیجیے۔ مثلاً بالِ جبریل سے آغاز کیجیے۔ ایک بار معلوم تو ہو یار لوگوں کو، کہ تدوین کا کام کیسے کرنا چاہیے۔ سب کچھ چھوڑ کر اب آپ اِسے پیشِ نظر رکھیے اور بس کام شروع کر دیجیے۔ جب کام شروع ہوگا، تو مکمّل بھی ہو جائے گا۔ یہ میری خواہش بھی ہے اور تمنّا بھی۔''ایضاً، صفحہ 104)

رشید حسن خاں نے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام 20 نومبر 1998 کو خط تحریر کرتے ہوئے لکھا کہ سحر البیان کی کتابت شروع ہو چکی ہے اور ان کا کلیات اقبال والا مضمون تحقیق، تدوین، روایت میں شامل ہو چکا ہے۔ ہاشمی صاحب کا 'استدراک' بھی انھیں کے نام سے شامل کتاب ہے۔ رشید حسن خاں نے 9 اپریل 2001 میں ہاشمی صاحب کے نام لکھے مکتوب میں اقبال کے شکوے کا اُردو سے عربی میں ترجمہ ہونے کی بات تحریر کی۔ یہ عربی نسخہ خاں صاحب کو پروفیسر لئیق صلاح (اب مرحوم) کے توسّط سے حاصل ہوا تھا۔ اس نسخے کو انھوں نے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کو ارسال کیا تا کہ کلام اقبال کی تدوین میں یہ نسخہ کام آ سکے۔ لکھتے ہیں:

> ''اس لفافے میں ایک اور چیز بھی بھیج رہا ہوں۔ حیدر آباد دکن کے ایک عربی النسل خان دان کے ایک عالم نے اقبال کے شکوے کا اُردو (سے عربی) میں ترجمہ کیا تھا۔ کمال یہ کیا کہ عربی میں بحر وہی رکھی ہے جو اُردو کی ہے۔ میرے لیے یہ نہایت دل چسپ چیز ہے۔ پروفیسر لئیق صلاح صاحب (سابق صدر شعبۂ اُردو گل برگا یونی ورسٹی، آندھرا پردیش) کے خان دان سے ناظم یا مترجم (جو بھی کہیے) تعلق رکھتے تھے۔ اُنھی سے یہ مجھے ملا ہے اور ضرورت پڑنے پر وہ ضروری معلومات فراہم کر سکتی ہیں۔ یہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ ایک اقبال شناس سے بڑھ کر اِس کا قدر دان اور کون ہوگا۔ اگر یہ وہاں کسی عربی یا اقبالیات سے متعلق کسی رسالے میں شائع ہو سکے تو خوب ہو، کہ اس طرح محفوظ ہو جائے گا۔''

(ایضاً، صفحہ 127 تا 129)

رشید حسن خاں نے اپنی عمر کے آخری دور میں کلیاتِ جعفر زٹلّی کے بعد تدوین کے تین کاموں (غرائب اللغات، گنجینۂ معنی کا طلسم اور کلام اقبال) کو مکمل کرنا چاہتے تھے۔ تینوں ہی کاموں کو وہ پورے انہماک اور مستعدی سے انجام دے رہے تھے۔ لیکن ان کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ خرابیِ صحت کے باوجود لفظیاتِ غالب اور کلام اقبال سے متعلق رشید حسن خاں نے بہت سے کارڈ بنا لیے تھے۔ 23 جون 2003 کو انھوں نے اس بارے میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کو مطّلع کرتے ہوئے لکھا:

> 'لفظیاتِ غالب زیرِ ترتیب ہے۔ اُس کے نئے انداز کو آپ ضرور پسند کریں گے۔ کام جاری ہے۔ اب تک تقریباً چودہ ہزار کارڈ بنا چکا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ یہ کام ضرور مکمل ہو جائے۔ اگر آپ نے سندِ پسندیدگی بھیج دی تو سمجھوں گا کہ محنت ٹھکانے لگی۔ خیال یہ ہے کہ اس کے بعد لفظیاتِ اقبال اسی انداز پر مرتّب کروں؛ مگر یہاں تو وہ چھپے گی نہیں، بس اِس لیے تامّل اور تکلّف رہا ہے۔ خیر، دیکھا جائے گا۔ کیا لفظیاتِ اقبال سے متعلق وہاں کوئی کام ہوا ہے اگر ہوا تو ضرور مطّلع فرمائیے، فرہنگ کی ابھی دو جلدیں اور مرتّب کرنا ہیں۔ غرض کہ؛ سامان... کل کی خبر نہیں۔'' (ایضاً، صفحہ 132)

رشید حسن خان نے ہاشمی صاحب کے نام 18 اپریل 2004 کو خط تحریر کرتے ہوئے لفظیات اقبال پر مفصل گفتگو کی۔ موصوف نے اس بات کو پھر دہرایا کہ لفظیات اقبال کو ہندوستان میں کون چھاپے گا، البتہ پاکستان میں اس کے شائع ہونے کے قوی امکان ہیں۔ کیوں کہ پاکستان میں ہندوستان کے مقابلے اقبالیات پر زیادہ کام ہوا ہے۔ تقریباً اسی طرح کی باتیں خاں صاحب نے 9 اگست 2004 کو لکھے گئے خط میں بھی تحریر کیں۔ لکھتے ہیں:

> ''ارادہ ہے کہ اگلا کام (اگر صحّت اجازت دے) اقبال یا نظیر سے متعلق ہو۔ یہ معلوم کرنا ہے کہ پاکستان میں کسی نے لفظیاتِ اقبال پر کام کیا ہے؟...دوسری بات: کیا وہاں یہ کتاب چھپ سکے گی (یہاں کون چھاپے گا)۔ ورنہ پھر قصائدِ سودا والا کام شروع کروں گا...آپ کی رائے کیا ہے؟ چشم بہ راہ ہوں۔ (ایضاً، صفحہ 143)

رشید حسن خاں نے ہاشمی صاحب کے نام 31 اکتوبر 2004 کو پانچ صفحات پر مشتمل خط تحریر کیا۔ رشید حسن خاں نے اس خط میں لفظیاتِ غالب اور لفظیاتِ اقبال کا موازنہ کرتے ہوئے اقبال اور غالب کے کلام کے معنوی فرق کو پیشِ نظر رکھنے کی بات ہاشمی صاحب سے کہی۔ کیوں کہ غالب اصولاً غزل گو شاعر ہیں اور اقبال نظم گو۔ اس لیے دونوں کے کلام کی لفظیات میں واضح فرق ہے۔ اس خط میں رشید حسن خاں نے غالب کی لفظیات سے متعلق ایک صفحہ ہاشمی صاحب کو بہ طور نمونہ ارسال کیا تھا تا کہ کلام اقبال کی تدوین اور لفظیات تیار کرنے کے واسطے طریقِ کار کا استعمال کرنے میں آسانی ہو۔ اس خط میں رشید حسن خاں کے ذریعے موجودہ لفظیاتِ اقبال کی کچھ تفصیل پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ کیوں کہ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی خود چاہتے تھے کہ خاں صاحب لفظیاتِ غالب کے بعد لفظیات اقبال کا کام شروع کریں۔ اگر یہ کام منظرِ عام پر آ جاتا تو یقیقاً اقبالیات کے میدان میں وقیع اضافے کا سبب ہوتا۔ رشید حسن خاں کلام اقبال کی تدوین اور لفظیات سے متعلق جس طریقہ کار کو اختیار کرنا چاہتے تھے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہمالہ	:	اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں! ص
فصیلِ کشورِ ہندوستاں	:	اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں! ص
کشورِ ہندوستاں	:	دیکھیے: فصیلِ کشورِ ہندوستاں
ہندوستاں	:	دیکھیے: فصیل کشور ہندوستاں (ایضاً صفحہ 148)

کلامِ اقبال کی تدوین کے سلسلے میں رشید حسن خاں نے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام 12 ستمبر 2005 کو دو صفحات پر مشتمل خط ارسال کیا۔ اس خط میں کلام اقبال کی تدوین سے متعلق اُن تمام امور کی جانب توجہ مبذول کی گئی جو اس کام کے لیے لازمی جُز تھے۔ کلامِ اقبال سے متعلق جو کام ہاشمی صاحب کو کرنے تھے اُن کا بھی تفصیل سے ذکر

کیا۔ خط ملاحظہ ہو:

''مجموعے کا آخری اڈیشن ہو یا اُن کے انتقال کے بعد پہلی بار شائع ہوا ہو، متن کی بنیاد اس کو بنایا جائے گا۔ مثلاً ضربِ کلیم کا 1936 والا اڈیشن اور ارمغانِ حجاز کا نومبر 1938 کا اڈیشن۔ کتابت کے دو پروف میں پڑھوں گا اور تیسرا پروف (فائنل پروف) آپ پڑھیں گے، اِس طرح اگر کوئی تصحیح طلب بات ہو گئی تو آپ اُس کی نشان دہی کر دیں گے اور یہاں اُس کی درستی ہو جائے گی۔ ہاں، یہ بتانا ہوگا کہ یہ نظم، غزل کس زمانے کی ہے اور پہلے اِس کا عنوان کیا تھا۔ اور اگر کوئی بڑی تبدیلی کی گئی ہو (مثلاً کسی نظم کو غزل بنا دیا گیا ہو، وغیرہ) اِس کی نشان دہی بھی کی جائے گی۔ باغ و بہار، فسانۂ عجائب کلاسکی متن ہیں، یوں اُن کے لسانی مسائل بھی بہت ہیں، کلامِ اقبال سے یہ مسائل غیر متعلق ہیں، اِس بنا پر جیسے ضمیمے اُن متون میں شامل کئے گئے، وہ ضمیمے یہاں نہیں ہوں گے، اُن کی نہ گُنجائش ہے نہ ضرورت۔ ہاں ضروری حواشی شامل کرنا ہوں گے، ایسے حواشی جو بہت ضروری ہوں۔ ہر شعر کی ابتدائی شکل بتانا ضروری نہیں، ہاں صرف اہم تبدیلیوں کو شامل کرنا مناسب ہوگا۔ ضروری مقامات پر آپ اپنے یا کسی کے کسی مضمون کا حوالہ دے سکتے ہیں کہ مزید تفصیل وہاں دیکھی جائے۔ اِس مجوّزہ کلیّات کی ضخامت بہت زیادہ نہ ہو، اِس کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا۔ چوں کہ شروعات ارمغانِ حجاز کے اُردو حصّے سے ہوگی اور وہ نسبتاً مختصر ہے، اِس لیے اِس متن کے حواشی سے دوسرے مجموعوں کے حواشی کے انداز کا بہ خوبی اندازہ ہو جائے گا اور فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ جو کلام، اقبال نے شامِل مجموعہ نہیں کیا، لیکن وہ اقبال میوزیم میں محفوظ ہے۔ ضمیمے میں اُسے ضرور شامل کیا جائے گا، غیر ضروری تفصیل کے بغیر۔

دیکھئے پیر جی مکرّم! صحّت میری بھی نا قابلِ اعتبار ہے، زیادہ وقت اور ضرورت میرے پاس بھی نہیں، معلوم نہیں کب بلاوہ آ جائے، اس لیے تدوین میں معیار کے ساتھ ساتھ عملی پہلو کو بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ یہ میری دلی خواہش ہے اور آپ اس میں شریکِ غالب کی حیثیت رکھتے ہیں کہ یہ کلیّات مرتّب ضرور ہو اور شائع بھی ہو؛ یہ گویا ہندوستان اور پاکستان، دونوں ملکوں کی طرف سے اعتراف نامہ ہوگا اور اس کی ایک طرح سے تاریخی حیثیت ہوگی، یوں اِس کام کو بہ ہر طور مکمل کرنا ہے۔ آپ اللہ کا نام لے کر شروع کر دیجیے کام کو، میں یہاں ارمغانِ حجاز (حصّہ اُردو) کا متن مکمّل کروں اور اُس کی کمپوزنگ ہو اور آپ اس کے حواشی لکھیں۔ مکمّل کام اس طرح جلدی ہوگا۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں، دو بار کا پیاں میں پڑھوں گا اور اُن کی تصحیح بنوا کر فائنل منظوری کے لیے اُنھیں آپ کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ جب آپ دیکھ لیں گے اور مطمئن ہوں گے، تب اُس حصّے کو مکمّل مانا جائے گا۔ اِسی طرح بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کی ترتیب و تصحیح ہوگی۔ ارمغانِ حجاز مختصر ہے یوں ہم دونوں کو عملی صورتِ حال کا شروع ہی میں اندازہ ہو جائے گا اور پھر اُسی کو مثال بنا کر دوسرے حصّے مکمّل کیے جائیں گے۔

ارمغانِ حجاز اشاعت 1936 کے عکس اور اُس کے متن سے متعلق کاغذات کا منتظر ہوں تاکہ جلد از جلد کام شروع کر سکوں۔ جب متن مکمّل کر لوں گا تو کمپوزنگ کے لیے بھیجنے سے پہلے آپ سے مشورہ کروں گا اور آپ کی منظوری اور اطمینان کے بعد یہاں کمپوزنگ شروع ہوگی۔

''ہاں صاحب! آپ نے 2004 کے کلیّاتِ اقبال (اقبال اکیڈمی) کا حوالہ دیا ہے۔ اُسے میں نے نہیں دیکھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ حصّۂ اُردو وہ لوگ اپنے صرف پر میرے نام بھیج دیں۔ آخر ''مجلسِ مشاورت'' کا ایک ممبر کا اتنا حق تو ہوتا ہے۔ آپ ایک بار کہہ تو دیکھئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ آپ کی بات مان لیں گے۔'' (ایضاً صفحہ 164 تا 165)

رشید حسن خاں نے 21 رمضان المبارک مطابق، 26 اکتوبر 2005 کو کلامِ اقبال کی تدوین سے متعلق ایک خط ہاشمی صاحب کے نام لکھا۔ اس خط میں میں ضربِ کلیم کی اشاعتِ اوّل کو بھیجنے کے لیے ہاشمی صاحب کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ ساتھ میں عید کی پیشگی مبارک باد بھی خاں صاحب نے انہیں دی ہے۔ ہاشمی صاحب سے عید کے بعد ارمغانِ حجاز کے حواشی لکھنے اور خود بھی کام پر باقاعدہ لگ جانے کا تذکرہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں ضربِ کلیم اشاعتِ اول کے سالِ اشاعت، ہاشمی صاحب کی کتاب ''تصانیفِ اقبال'' کے ساتھ ساتھ اقبال نامہ اور خطوطِ اقبال کا بھی ذکر اس خط میں کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اب میری درخواست یہ ہے کہ بعدِ عید آپ ارمغانِ حجاز کے حواشی لکھنا شروع کر دیجیے، میں بھی عید کے تیسرے دن سے باضابطہ آغازِ کار کروں گا۔ حواشی مختصر ہوں اور ضروری ہو (ہوں) اور بس۔ اشعار میں جو تلمیحات آئی ہیں اور نام آئے ہیں یا مصرعے یا شعر منقول ہیں، اُن کی تخریج میں کر لوں گا اور پھر آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ ایک فی الوقت غیر متعلق بات؛ ضربِ کلیم اشاعتِ اوّل میں سنہ اشاعت موجود نہیں۔ آپ نے اپنی کتاب تصنیفِ اقبال میں ص 35 پر اشاعتِ اوّل کے سنہ کے لیے حاشیے پر دو حوالے دیے ہیں؛ میری رائے میں اب جب اس کے حواشی لکھیں تو متعلقہ مقامات عبارتوں کو ضرور نقل کر دیجیے گا، کیوں کہ اقبال نامہ اور خطوطِ اقبال سب کے پاس تو ہوں گی نہیں (اوروں کی کیا بات کروں میرے پاس بھی نہیں)۔ یہ ضمنی بات ہوئی۔ جب آپ ارمغانِ حجاز (اُردو) کے حواشی لکھ لیں تو ان کی نقل میرے پاس بھیج دیجیے گا۔ تو اب یہ طے ہو گیا کہ عید کے تیسرے چوتھے دن سے کام شروع ہو جائے گا، یہاں بھی اور وہاں بھی۔ (ایضاً، صفحہ 169 تا 170)

الغرض! رشید حسن خاں کو نومبر 2005 کے پہلے ہفتے میں کلام اقبال پر کام کا آغاز کر دینا تھا۔ لیکن طبیعت علیل ہونے کے سبب دوسرے کاموں کے ساتھ اس کام کو بھی روکنا پڑا۔ کیوں کہ سردی کے موسم میں خاں صاحب زیادہ دیر تک ایک جگہ بیٹھ نہیں پاتے تھے۔ ان کی آنکھوں سے پانی آنے لگتا تھا۔ پیروں میں سوجن بھی ہونے لگتی تھی۔ 6 دسمبر 2005 کو رشید حسن خاں نے ہندوستانی موسمِ سرماں، اپنی صحت اور کام کی نوعیت کا احوال ہاشمی صاحب کو لکھا۔ ملاحظہ ہو:

''اقبال والا کام، دوسرے کاموں کے ساتھ رُکا ہوا ہے۔ یوں آپ ذرا بھی فکر نہ کریں۔ موسم سنبھل جائے گا تو کُچھ ہو سکے گا، فی الحال آرام۔ آپ 65 برس کے ہیں، دسمبر میں میں نے اسّی برس پورے کر لیے، اب جتنا بھی کام ہو سکے غنیمت ہے۔ زیادہ کی توقّع اب کرنا ہی نہیں چاہیے؛ بس ارادہ مضبوط رہنا چاہیے اور وہ ہے میرا بھی اور آپ کا بھی۔ پریشان ہونے کی مطلق ضرورت نہیں۔'' (ایضاً، صفحہ 171)

مذکورہ بالا خط کی سطروں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں اسّی برس کی عمر کے بعد بھی پوری مستعدی، ہمّت، لگن، جوش، جنون اور ولولے کے ساتھ تحقیق و تدوین کے کاموں میں لگے رہے۔ آخری وقت میں اُنھیں چھینکیں، ریزش اور آنکھوں سے پانی ٹپکنے کی بیماریاں ہوگئی تھیں۔ دل کے مریض وہ پہلے سے ہی تھے۔ انھیں دل کے کئی دورے پہلے کئی مرتبہ پڑ چکے تھے۔ رشید حسن خاں نے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے نام آخری خط 2 فروری 2006 کو تحریر کیا۔ یعنی اپنی وفات سے 24 دن قبل۔ یہ خط ہاشمی صاحب کو 15 فروری 2006 کو موصول ہوا تھا۔ اس آخری خط میں بھی لفظیات غالب کے ساتھ خرابیِ صحت کے علاوہ ادبی گفتگو بھی ہے۔ رشید حسن خاں کے اس دنیا سے 26 فروری 2006 میں رخصت ہو جانے کے بعد ان کے ادھورے تدوینی کام منظرِ عام پر نہیں آ سکے ہیں۔ اگر غرائب اللغات اور کلام اقبال کی تدوین وقت رہتے رشید حسن خاں مکمل کر جاتے تو یقیناً اُردو کے ادبی خزانے میں یہ کام مزید اضافہ کرتے۔ ممکن ہے کہ اِن کے ادھورے کاموں کو کوئی مردِ مجاہد یا کوئی بڑا ادبی ادارہ (انجمن ترقی اُردو (ہند) یا قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان) اپنے ہاتھ میں لے، اور رشید حسن خاں کے نامکمّل مشن کو مکمّل کرے۔

رشید حسن خاں نے تدوین کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے۔ انھوں نے سب سے پہلے باغ و بہار کو 1964 میں تدوین کیا۔ لیکن یہ طلبہ اڈیشن تھا۔ اسی سلسلے کو دراز کرتے ہوئے 1970 سے 1972 کے درمیان چھے کتابوں کی تدوین مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، کے لیے معیاری سیریز کے تحت کی۔ ان کتابوں میں (1) انتخابِ نظیر اکبر آبادی 1970 (2) انتخابِ شبلی 1971 (3) انتخابِ مراثی انیس و دبیر 1971 (4) دیوانِ خواجہ میر درد 1971 (5) انتخابِ سودا 1972 (6) انتخابِ ناسخ 1972۔ ان تدوینی کتب میں جس نسخے کا مقدمہ رشید حسن خاں کو سب سے عزیز تھا وہ انتخاب ناسخ کا مقدمہ تھا۔ دراصل رشید حسن خاں نے کلاسیکل متون کی جتنی بھی تدوینی خدمات انجام دیں ان سب پر گراں قدر مقدمے تحریر کیے۔ یہ مقدمے اصل متن کی ضخامت سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اپنے طویل اور عالمانہ مقدموں کی وجہ سے اُردو دنیا میں رشید حسن خاں کا قد اور اونچا ہوا۔ یہ مقدمے ہی ان کے تدوینی کارناموں کی اصل شناخت ہیں۔

رشید حسن خاں نے دو درجن سے زائد کتابوں کی ترتیب و تدوین کی۔ جن پر مقدمہ، تعارف، پیش لفظ اور ابتدائیہ کی شکل میں اپنے خیالات و نظریات کا اظہار کیا۔ ان مقدمات کے علاوہ کئی کتابوں میں ضمیمے بھی شامل کیے۔ ساتھ ہی مشکل الفاظ کی فرہنگ متن کے آخر میں شامل کی گئیں۔ رشید حسن خاں نے جن کتابوں پر مقدّمات، ضمیمے تعارف، پیش لفظ اور ابتدائیہ تحریر کیے اُن کی فہرست اور کُل صفحات کی تعداد درج ذیل ہے:

1. فسانۂ عجائب، مقدمہ 99 صفحات، ضمیمے 7، 194 رصفحات، فرہنگ 162 صفحات
2. باغ و بہار، مقدّمہ 124 صفحات، ضمیمے 3، 337 صفحات، فرہنگ 112 صفحات
3. گلزارِ نسیم، مقدمہ 141 صفحات، ضمیمے 2، صفحات 314، فرہنگ 150 صفحات
4. مثنویاتِ شوق، مقدمہ 156 صفحات، ضمیمے 4، 200 صفحات، فرہنگ 138 صفحات
5. مثنویاتِ سحر البیان، مقدمہ 131 صفحات، ضمیمے 5، 294 صفحات، فرہنگ 191 صفحات
6. مصطلحاتِ ٹھگی، مقدمہ 30 صفحات
7. زٹل نامہ (کلیّاتِ جعفر زٹلی) مقدمہ 40 صفحات
8. گذشتہ لکھنؤ، مقدمہ 26 صفحات
9. انتخابِ ناسخ، تعارف 126 صفحات
10. انتخابِ سودا، مقدمہ 37 صفحات
11. دیوانِ حالی، مقدمہ 21 صفحات
12. دہلی کی آخری شمع (1261ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ) پیش لفظ 7 صفحات
13. انتخابِ مراثی انیس و دبیر، تعارف 4 صفحات

14. انتخابِ مضامین شبلی، تعارف 12 صفحات

15. حیاتِ سعدی، تعارف 4 صفحات

16. موازنہ انیؔس و دبیؔر، تعارف 4 صفحات

17. انتخابِ نظیؔر اکبرآبادی، تعارف 4 صفحات

18. انتخابِ نظیؔر اکبرآبادی (ہندی) پیش لفظ 4 صفحات

19. دیوانِ دردؔ، تعارف 8 صفحات، ساتھ ہی دیوانِ دردؔ مرتّب ڈاکٹر نسیم احمد کے لیے دیباچہ، 4 صفحات کا لکھا۔

20. ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ اُن کی زبانی، مقدمہ 12 صفحات، فرہنگ 10 صفحات

21. مقدمہ شعر و شاعری، تعارف 4 صفحات

22. کلاسکی ادب کی فرہنگ، ابتدائیہ 8 صفحات

23. اُردو املا، ابتدائیہ 34 صفحات

24. غالب اور انقلاب ستاون، پیش لفظ، 4 صفحات

25. ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ابتدائیہ، 2 صفحات

26. زبان و قوعد، حرفِ آغاز 2 صفحات

27. تدوین تحقیق روایت، حرفِ آغاز 4 صفحات

28. املاے غالبؔ، ابتدائیہ، 20 صفحات

29. اُردو کیسے لکھیں، پیش لفظ، 3 صفحات

30. انشاے غالب، عرضِ مرتّب، 21 صفحات

31. عبارت کیسے لکھیں، پیش لفظ، 4 صفحات

32. انشا اور تلفظ، حرفِ آغاز 1 صفحہ

33. اُردو کہاوتیں اور ان کا سماجی و لسانی پہلو (ڈاکٹر یونس اگاسکر) پیش گفتار صفحہ 15 سے 18

34. گنجینۂ معنی کا طلسم (جلد اوّل) مقدمہ 22 صفحات

35. سفینۂ غزل، عروؔج زیدی کا مجموعۂ کلام، مقدمہ 7 صفحات

36. توضیحی اشاریۂ غالب نامہ، پیش لفظ 3 صفحات

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ابھی اور ایسی کتابیں بھی منظرِ عام پر آنا باقی ہیں جن پر رشید حسن خاں نے ابتدایہ اور مقدموں کی شکل میں اپنا اظہار خیال پیش کیا ہے۔ ان کتابوں کے مقدمات، حرفِ آغاز، تعارف، پیش لفظ، ابتدائیہ اور ضمیموں کے صفحات کی کُل تعداد 3279 ہے۔ اگر ان مقدمات کو کتابی جامہ دے دیا جائے تو ضخامت کافی زیادہ ہو جائے گی۔ رشید حسن خاں نے تمام عمر تحقیق اور تدوین کے لیے وقف کر دی تھی۔ دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت سے لے کر اپنے آبائی وطن شاہ جہاں پور میں بھی ان کا روزانہ کا معمول یہی رہا کہ قدیم اُردو نسخوں کے متون کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ کلاسیکل ادب کی اتنی کتابوں کی ترتیب و تدوین دینے کے بعد بھی ان کا تحقیقی و تدوینی مشن جاری و ساری رہا۔ رشید حسن خاں نے تدوین کے جو اصول بنائے ان کی پابندیاں انھوں نے تاعمر کی۔ اصل مواد کو دیکھ لینے اور اس کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ہی وہ اپنا کام شروع کرتے تھے۔ رشید حسن خاں نے ''فسانۂ عجائب''، ''باغ و بہار''، ''مثنوی گلزارِ نسیم''، ''مثنوی سحر البیان''، ''مثنویاتِ شوق''، ''زٹل نامہ''، ''مصطلحاتِ ٹھگی'' اور ''انتخابِ ناسخ'' کی جس طرح سے حقائق کی بازیافت کے ساتھ ان کے متن کی تدوین منشائے مصنف کے مطابق کی، ساتھ ہی ان کلاسیکل متون پر عالمانہ، محققانہ، مربوط و مبسوط مقدمات رقم کیے اُردو دُنیا میں ایسی مثال ملنا نایاب ہی نہیں کمیاب ہے۔

تحقیق و تدوین کے علاوہ رشید حسن خاں کو شہرتِ دوام بخشنے والا کارنامہ ان کی تبصرہ نگاری ہے۔ ان کے تبصرے تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے ہیں۔ ان کے زیادہ تر تبصرے کتابی شکل میں منظرِ عام پر آ کر دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ''تلاش و تعبیر''، ''تفہیم''، ''ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ'' اور ''تحقیق تدوین، روایت'' میں ہم ان تبصروں کا عمیق مطالعہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کے بہت سے تبصرے رسائل و جرائد میں قصہ پارینہ بنے ہوئے ہیں جنھیں منظرِ عام پر لانا ہر اُس قاری کا فرض ہے جسے ان تبصروں میں گہری دل چسپی ہے۔ حالاں کہ ان تبصروں کو کتابی شکل میں منظرِ عام پر لانے کی کاوشیں جاری ہیں۔ میری نظر میں یہ تبصراتی کتاب ایک ادبی شاہ کار کا درجہ حاصل ضرور کرے گی۔ جن تبصروں نے رشید حسن

خاں کو ادبی بامِ عروض پر پہنچایا ان میں فیضؔ کی شاعری کے چند پہلو، تاریخ ادب اُردو، ترقی اُردو بورڈ کا لغت، دیوانِ غالب (صدی اڈیشن)، اُردو شاعری کا انتخاب، عظیم باغی، فارسی کی دل کش داستانیں، علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو، حرفِ معتبر، تحریک سلور جبلی نمبر، فاعتبروا یااولی الابصار، تذکرۂ معاصرین، غزل مجروحؔ، دستِ صبا پر ایک نظر وغیرہ سرِ فہرست ہیں۔ رشید حسن خاں کے تبصرے زیادہ تر رسالہ تحریک، غالب نامہ، نیا دور، آجکل وغیرہ رسائل کے صفحۂ قرطاس کی زینت بنے۔ ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا نے رشید حسن خاں کی تبصرہ نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''خاں صاحب کے بعض خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے فرمائشی قسم کے تبصرے دوسروں کی کتابوں یا شعری مجموعوں پر لکھنا کبھی پسند نہیں کیا۔ ایسے کاموں کے لیے وہ ہمیشہ معذرت کرلیا کرتے تھے۔ البتہ کوئی ادبی یا علمی کتاب اُن کے سامنے آتی تو وہ اُس کا اچھی طرح پوسٹ مارٹم کرتے۔ اس کی زندہ مثال 'علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو' ہے۔ خاں صاحب کے تبصرے کے بعد وائس چانسلر علی گڑھ یونی ورسٹی نے اس کے سبھی نسخے مارکیٹ سے واپس منگوا کر جمع کر لیے تھے۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، جلد دوم، مرتّب ڈاکٹر ٹی. آر. رینا، صفحہ 34، نومبر 2015)

رشید حسن خاں نے جب فیضؔ کی شاعری پر تنقیدی تبصرہ کیا تو اُس وقت فیضؔ اور ترقی پسند تحریک دونوں کا جادو لوگوں کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ایسا اس لیے بھی تھا کہ فیضؔ اس تحریک کے نمایندہ شاعر تسلیم کیے جاتے تھے۔ ایسے میں ایک غیر معروف شخص کے ذریعے فیضؔ کی شاعری بالخصوص زبان و بیان پر مدلّل بحث و تبصرہ کرنا ادبی جرأت کی بات تھی۔ اس تبصرے کے بعد ادبی حلقوں میں رشید حسن خاں کی خوب پذیرائی ہوئی۔ انھوں نے فیضؔ کی شاعری کو بحر، وزن، زبان اور عروض کے اصول اور ضابطے کے تحت پرکھا۔ اس تبصرے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ رشید حسن خاں شاعری کے اوزان اور تقطیع سے بہ خوبی واقف تھے۔ فیضؔ کی شاعری کے متعلق رشید حسن خاں رقم طراز ہیں:

''مشہور شاعر اور ادیب فیض احمد فیضؔ کا جدید مجموعۂ کلام پیشِ نظر ہے۔ فیضؔ ترقی پسند گروپ کے بہترین شاعر سمجھے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کے یہاں جو شگفتگی ہے اس سے بہت سے شاعر محروم ہیں وہ دوسروں کی طرح غمِ دوراں کے دور سے تماشائی نہیں بل کہ اس کے آہنی شکنجے میں پابند ہیں۔ لیکن ان کے بیانِ غم میں ان کے ذاتی الم و تاثرِ غم کا کوئی شائبہ نہیں ملتا اور نہ اس میں وہ غم آفریں عناصر ملتے ہیں جن سے مصیبت کا طویل احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ مزید قابلِ قدر بات ہے کہ ان کے یہاں کسی موقع پر غیر قابو یافتہ جذباتیت اور لہجہ کی درشتی نہیں پیدا ہوتی۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جن سے اچھے اچھے شاعر محروم رہتے ہیں۔ آج کل غمِ دوراں کا بیان ایک شیوۂ عام ہوگیا ہے۔ ہر شخص اس کو صنعتِ شاعری سمجھ کر اونچی سے اونچی لے میں الاپتا ہے۔ لیکن ہوتا یہ کہ زندگی عموماً اس جوہرِ لطف سے خالی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ بیان اثر سے خالی رہتا ہے۔ صرف ہنگامہ آفرینی کا فرض ادا ہو جاتا ہے اور ترقی پسندی کی سند ہاتھ آ جاتی ہے۔

فیض کی خوبی یہ ہے کہ وہ قید و بند کی افتاد سے پہلے جس طرح شعلہ نوائی کرتے تھے اور ان کے یہاں جو رجائیت تھی وہی آج بھی قائم ہے۔ بل کہ اس حادثے نے ان کے کلام میں اجتماعی جدّ و جہد کا مسرّت آفریں پہلو اور زیادہ تابناک کر دیا ہے اور ان کے لہجے میں وہ تلخی نہیں پیدا ہوئی جس سے تاثیر دور بھاگتی ہے۔''

(تحریک، نئی دہلی، مئی 1954)

اس تبصرے میں رشید حسن خاں نے فیضؔ کی شاعری میں لفظی معائب بھی تلاش کیے۔ رشید حسن خاں کا یہ تبصرہ فیضؔ کی شاعری پر مضبوط گرفت کی بہترین مثال ہے۔ اسی طرح مجروحؔ سلطان پوری کے مجموعۂ کلام ''غزل'' پر بھی رشید حسن خاں نے محققانہ، عالمانہ، اور ناقدانہ تبصرہ کیا۔ خاں صاحب نے ''غزل'' کے حصۂ اوّل کو اغلاط کا مجموعہ قرار دیا۔ اُنھوں نے اپنے تبصرے میں مجروحؔ کے کلام کو غزل کے آہنگ سے عاری، اندازِ بیان اور مفہوم میں سنگلاخیت کا نہ ہونا ثابت کیا۔ رشید حسن خاں نے اپنے تبصرے کے ذریعے مجروحؔ کی شاعری میں ترقی پسند تحریک کے عناصر کو خوب سے خوب تر تلاش کیا۔ انھوں نے سردار جعفری کے لکھے پیش لفظ کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ کیوں کہ سردار جعفری کے مطابق شاعر سیاست سے متاثر ہوکر شاعری کرتا ہے اور خاں صاحب کے نزدیک یہ نظریہ غلط اور گمراہ کُن تھا۔ کیوں کہ اکثر شاعروں نے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر شاعری کی۔ مجروحؔ بھی اُس وقت کے حالات اور سیاست سے متاثر تھے۔ غور کرنے والی بات ہے کہ مجروحؔ نے اربابِ اختیار کا دامن چھوڑ کر محبّت اور امن کا دامن تھامے رکھا۔ رشید حسن خاں نے ''غزل'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''اس مجموعہ کے دوسرے پہلو یعنی زبان و بیان کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجروحؔ کے اچھے اشعار دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر شعر کہنے کی نہایت عمدہ صلاحیت ودیعت کی گئی ہے۔ یعنی وہ فطری شاعر ہیں۔ لیکن اُنھوں نے ترقی پسندی کے چکّر میں پڑ کر اپنی صلاحیت کو بُری طرح مجروح کرلیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں زبان و بیان کی فاش غلطیاں اتنی زیادہ ملتی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی تو ان کے کلام میں کبھی وہ بلندی اور حُسن نہیں پیدا ہوسکتا جس سے قبول عام کی سند ملتی ہے اور بقائے دوام کی ضمانت ہاتھ آتی ہے۔ کچھ نہ کچھ خامیاں ہر شخص کے یہاں ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت دوسری ہوتی ہے۔ مجروحؔ کے یہاں تو یہ عالم ہے جیسے شاعر جان بوجھ کر صحیح راستہ سے کترا کر چل رہا ہو۔ ترقی پسند

شعرا میں ایک مستقل برائی یہ بھی ہے کہ لوگ مواد پر ساری توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور طرز ادا کو بالکل نہیں دیکھتے۔ میں کچھ ایسے مقامات پیش کرتا ہوں۔

کہاں وہ شب کہ تیرے گیسوؤں کے سائے میں
خیال صبح سے پھر آستیں بھگو دیتے!

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لیے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

دونوں اشعار کی ردیف غلط ہے۔ پہلے شعر میں آستیں بھگو لیتے محل ہے اور دوسرے میں آرزو چھوڑ دیتے۔ کیوں کہ آرزو کھو دینا غلط ہی نہیں غیر فصیح بھی ہے۔''

(رسالہ تحریک، نئی دہلی، صفحہ 12، اکتوبر 1954)

رشید حسن خاں نے ماہر غالبیات اور نامور محقق مالک رام کے تذکرے ''تذکرۂ معاصرین'' کے سنین کی جانب بھی توجہ مبذول کی۔ اسی تبصرے میں خاں صاحب نے تذکروں کی اہمیت اور افادیت کو اُردو کی ترویج و اشاعت اور فروغ میں میل کا پتھر قرار دیا۔ انھوں نے مالک رام صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا 'محترمی مالک رام صاحب ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں کہ موصوف نے ایک مفید اور ضروری کام کا آغاز کر کے دوسروں کے لیے قابلِ تقلید مثال قائم کر دی ہے''۔ تعریف کے ساتھ ساتھ رشید حسن خاں نے اپنے تبصرے میں کئی سوال بھی قائم کیے۔ جن سے اس تذکرے کی اہمیت و افادیت پر اثر پڑتا ہے۔ مثلاً شعرا و ادبا کی وفات کے سنین میں جو غلطیاں در آ گئی ہیں اُن کی جانب اس تبصرے میں خاص توجہ دی گئی۔ تذکرۂ معاصرین پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے لکھا ہے:

'یہ کتاب 443 صفحات پر مشتمل ہے۔ اگر قاعدے سے انتخاب کیا جاتا تو بہ آسانی یہ اس سے آدھے صفحات میں سما سکتی تھی۔ اس صورت میں ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کی قیمت بھی کم ہو جاتی اور اس طرح زیادہ لوگوں کی اس تک رسائی ہو سکتی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ غیر ضروری طور پر شعرا کے انتخاب کلام کو جگہ دی گئی ہے۔ صورت یہ ہے کہ مرحومین میں سے جو شاعر تھے ان کے کلام کا انتخاب بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایسے لوگ ہیں جن کا کلام کتابی صورت میں چھپا ہی نہیں ہے۔ رسالوں میں بکھرا ہوا ہے۔ یا ان کے ورثا کے پاس محفوظ ہے۔ ایسے شعرا کے کلام کے انتخاب کا ایک حد تک جواز نکل سکتا ہے۔ مگر جن معروف شاعروں کے مجموعے چھپ چکے اور ملتے بھی ہیں ان کے کلام کا انتخاب غیر ضروری ہے۔ مثلاً روش صدیقی، پرویز شاہدی، اثر لکھنوی، سلیمان اریب، خورشید احمد جامی، شفا گوالیری، مخدوم محی الدین، شکیل بدایونی، نریش کمار شاد، جیسے شاعروں کے کلام کا انتخاب شامل کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کتاب کی ضخامت اور بڑھ گئی اور کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کتاب کا مقصد انتخاب کلام پیش کرنا نہیں تھا۔''

(تحریک، نئی دہلی، ستمبر 1972، صفحہ 46)

رشید حسن خاں نے مالک رام کے تذکرۂ معاصرین کے علاوہ دیوانِ غالب صدی اڈیشن پر 28 صفحات پر مشتمل طویل تبصرہ رسالہ تحریک کے غالب نمبر اپریل 1974 میں رقم کیا۔ اس تبصرے کے شائع ہونے کے بعد مالک رام اور خاں صاحب کے تعلقات ایک مدّت تک سرد مہری کا شکار رہے۔ مالک رام صاحب نے غالب صدی اڈیشن کو مرتب کرنے کے بعد یہ دعوا کیا تھا کہ اُنھوں نے حیدرآباد کی آصفیہ لائبریری میں رکھے ہوئے غالب کے ہاتھ کے تصحیح کردہ نسخے کو بہ چشم خود دیکھا ہے اور اسے صدی اڈیشن کی بنیاد بنایا ہے۔ لیکن رشید حسن خاں کی تحقیق کے مطابق حیدرآباد کی آصفیہ لائبریری میں ایسا کوئی نسخہ موجود نہیں جس کا دعوا مالک رام نے کیا تھا۔ اپنے اس تبصرے کو اور طوالت کے ساتھ رشید حسن خاں نے اپنی کتاب 'ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ' میں شامل کیا۔ الغرض! رشید حسن خاں نے مالک رام کے مرتب کردہ غالب صدی اڈیشن میں شامل غالب کے اشعار کو کلام غالب سے موازنہ کیا۔ تاکہ اشعار کی تحریفات کا پتا چل سکے۔ رشید حسن خاں نے اپنی تحقیق سے غالب صدی اڈیشن کو رد کیا۔ انھوں نے تحریف شدہ اشعار کو غالب کے اصل اشعار اور متن سے چھیڑ چھاڑ قرار دیا۔ اسی دوران ایک کتاب 'اُردو تحقیق اور مالک رام' از شاہد اعظمی ایم اے منظرِ عام پر آئی جس میں مالک رام کی تحقیقی خدمات کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جائزہ لیا گیا۔ اس کتاب میں بھی رشید حسن خاں کا تبصرہ من وعن شامل تھا۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر خالد علوی (سابق اُستاد ذاکر حسین کالج، دہلی) کی رائے ہے کہ یہ کتاب شاہد اعظمی نے مرتب نہیں کی بل کہ رشید حسن خاں نے ہی اسے فرضی نام سے مرتب کیا تھا۔ غالب صدی اڈیشن کے بارے میں رشید حسن خاں یوں رقم طراز ہیں:

''اس زمانے میں، قابلِ ذکر حضرات میں سے مخدومی عرشی صاحب اور محترمی مالک رام صاحب نے غالب کے اُردو دیوان کو مرتب کیا ہے۔ مالک رام صاحب نے نسخۂ نظامی کو متن کی بنیاد بنایا ہے۔ اس لیے کہ ان کی رائے میں مطبع نظامی کان پور کا چھپا ہوا دیوان، غالب کے اُردو کلام کا آخری مستند اڈیشن ہے، اور اب اسی کو متن کی بنیاد بنایا جانا چاہیے کیوں کہ 'جب غالب نے مطبع احمدی کا متن دیکھ کر اسے درست کرتے، دیوان مطبع نظامی میں چھپوایا، تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ انھوں نے متن ہمیشہ کے لیے خود طے کر دیا۔ اب اس سے پہلے کے اڈیشنوں کو، ہم نہ صرف متن میں استعمال نہیں کر سکتے بل کہ وہ شاید اختلافِ نسخ کے تحت بھی نہیں آئیں گے۔ (مقدمہ دیوانِ غالب، آزاد کتاب گھر، دہلی، ص 31)

اس کے برخلاف، عرشی صاحب نے مطبعِ نظامی والے اڈیشن کو آخری مستند اڈیشن کا درجہ نہیں دیا۔ اس کے بجائے اُنھوں نے متعدد خطی اور مطبوعہ نسخوں کو

رکھا ہے۔گویا صرف مالک رام صاحب، مطبع نظامی کے نسخے کو درست ترین اور مستند ترین مانتے ہیں۔اور اسی اعتبار کی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ مطبع نظامی کا چھاپا، اسی نسخے پر مبنی ہے جس کی تصحیح غالب نے ''دوراتِ دن کی محنت میں'' کی تھی، جس کے آخری صفحے کے حاشیے پر اپنے ہاتھ سے خط لکھا تھا، اور جو اتفاق سے حیدرآباد میں محفوظ ہے۔مگر یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اس اہمیت کے باوجود، اس نسخے کا مفصل تعارف نہیں کرایا گیا۔مالک رام صاحب کی تحریر سے قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ موصوف نے اس نسخے کو بہ چشم خود دیکھا ہے یا کسی کی رویت پر بھروسا کیا ہے۔''

(تحریک، نئی دہلی، غالب نمبر، صفحہ 26-25، اپریل 1976)

رشید حسن خاں کو جس تبصرے نے اُردو دنیا میں معتبر و محترم بنایا وہ تاریخ ادب اُردو علی گڑھ ہے۔تاریخ کے نام پر جو گمراہ کن باتیں اس کتاب میں درج ہیں ان پر رشید حسن خاں نے تحقیقی حوالوں اور شواہد سے گرفت کی۔رشید حسن خاں نے اپنے عزیز دوست پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام 16 اپریل 1964 کو لکھے مکتوب میں اس کتاب پہلی جلد کی اغلاط کی جانب متوجہ کیا۔لکھتے ہیں:

''یہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی پہلی جلد شائع ہوگئی۔بڑا شور سنتے تھے۔ایک قطرہ بھی نہیں نکلا۔اڈیٹوریل بورڈ میں سارے بزرگانِ ادب کے نام درج ہیں، لیکن کتاب، بلا مبالغہ گناہ گار کا نامۂ اعمال ہے۔میں نے اس پر ایک سرسری تبصرہ لکھا تھا، اتفاق یہ کہ وہ بے حد پسند کیا گیا اور آٹھ مختلف رسائل و اخبارات نے اسے طویل حواسی کے ساتھ نقل کیا۔بات اس حد تک بڑھی کہ آخر یونی ورسٹی کو اس کی فروخت باضابطہ روک دینا پڑی۔آپ یہاں ہوتے تو اس تبصرے کی داد آپ سے لیتا۔اب کتاب اسٹاک روم میں پڑی ہے۔میں نے اربابِ اختیار سے پوچھا کہ حضرت! غلط نامہ کتنی جلدوں میں ہوگا؟ جواب ندارد۔آپ آئیں گے تو وہ تبصرہ آپ کو دکھاؤں گا۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، جلد دوم، مرتب ڈاکٹر ٹی آر رینا، صفحہ 552، نومبر 2015 اُردو بک ریویو، نئی دہلی)

ادبی حلقوں میں تاریخ ادب اُردو علی گڑھ کا شدّت کے ساتھ انتظار ہو رہا تھا۔کیوں کہ اس پروجیکٹ میں آل احمد سرور اور مجنوں گورکھپوری جیسی مایہ ناز ادبی شخصیات شامل تھیں۔رشید حسن خاں کے تبصرے نے اس ادبی کام کی افادیت و اہمیت پر ہی سوال یہ نشان لگا دیا تھا۔مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے اس تبصرے کے منظرِ عام پر آنے کے بعد تصحیح کے لیے بازار سے واپس منگوالیں۔حالاں کہ یہ پروجیکٹ یونی ورسٹی گرانٹ کمیشن کا تھا۔رشید حسن خاں نے اپنا تحقیقی و تنقیدی تبصرہ باب در باب اور مضمون در مضمون عمیق مطالعہ کر کے تحریر کیا۔رشید حسن خاں نے اس کتاب (تاریخ ادب اُردو علی گڑھ) کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے لیے بدنما داغ اور اغلاط سے لبریز تاریخ قرار دیا۔لکھتے ہیں:

''موجودہ حالات کے پیشِ نظر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اب مدّت تک ہندوستان میں کسی اور ادارے سے ایسی کتاب کا شائع ہونا، ناممکن کی حد تک مشکل ہے۔بار بار اس قدر وسائل ہاتھ نہیں آتے۔اسی لحاظ سے اس کتاب کا اس قدر بے احتیاطی کی روشنی میں مرتّب کیا جانا اور زیادہ افسوس ناک ہے۔یہ کتاب علی گڑھ کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے اور طلبہ کو گُم راہ کرنے کی منظّم کوشش۔تاریخ ادب کی کتاب میں لکھے ہوئے کسی واقعے کا اگر حوالہ نہ دیا جاسکے۔اس میں درج شدہ تاریخوں پر اعتبار نہ کیا جاسکے اُس کے اقتباسات کی صحت مشکوک ہو، جن تحریروں سے زبان کے آغاز و ارتقا پر استدلال کیا گیا ہو، ان کا انتساب ہی محتاج ثبوت ہو اور تضاد بیان سے پوری کتاب بھری ہو تو آخر اُس کتاب کا مصرف کیا ہوگا۔ابھی اس کی باقی جلدیں نہیں چھپی ہیں۔میں اربابِ اختیار سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ طلبہ کی بے چارگی اور اُردو کی بے مائیگی پر رحم کھا کر ان جلدوں کو طومارِ اغلاط اور متضاد بیانات کا مجموعہ نہ بننے دیں۔اس کی صورت صرف یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو نظرِ ثانی کے لیے آمادہ کیا جائے جو واقعی اس کا اہل ہو۔تاریخ و تحقیق میں لفظوں کی طوطا مینا سے کام نہیں چلتا ہے۔''

(تحریک، نئی دہلی، صفحہ 24، اکتوبر 1963)

رشید حسن خاں کا ایک تبصرہ 1965 میں ذاکر حسین کالج دہلی کی اُردو میگزین ''فکرِ نو'' کے شمارہ نمبر 63 میں ایک تبصرہ نما مضمون ''تاریخ لطیف'' کے عنوان سے شائع ہوا۔رشید حسن خاں کے اس تبصرے کو بنیاد بنا کر اکبر علی خاں نے ایک مفصل مضمون ''رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں'' رسالہ نقوش، شمارہ 104، جنوری 1966 میں شائع ہوا۔اس مضمون میں اکبر علی خاں نے رشید حسن خاں کے اُن تبصروں کا بھی تذکرہ کیا جن کی وجہ سے انھیں شہرت دوام حاصل ہوئی۔خاص کر تاریخ ادب اُردو علی گڑھ کے حوالے سے ان کے تبصرے کی تعریف اکبر علی خاں نے کی۔ساتھ ہی اکبر علی خاں نے رشید حسن خاں کے تبصروں میں در آئی تاریخی اور تحقیقی غلطیوں کی جانب توجہ مبذول کی۔اکبر علی خاں کا ماننا تھا کہ ایک 'تاریخی غلطی' آنے والی نسلوں کے لیے بہت سی غلطیوں کے دروازے نہ کھول دے اور لکھنے سے پہلے اگر مصنف اپنا احتساب بھی کر لے تو بہتر ہوگا۔اپنے مضمون میں اکبر علی خاں نے رشید حسن خاں کو منفی سوچ رکھنے والا انسان قرار دیا۔اس کی وجہ اکبر علی خاں نے یہ بتائی کہ رشید حسن خاں کے تبصروں میں ہمیشہ طنز اور غصہ بھرا رہتا ہے؟ انھوں نے اپنی یونی ورسٹی یعنی دہلی یونی ورسٹی سے شائع ہونے والی کتابوں پر تحقیقی و تنقیدی نگاہ آج تک کیوں نہیں ڈالی؟ کیا دہلی یونی ورسٹی سے شائع ہونے والے ادبی کام اس لائق نہیں کہ رشید حسن خاں ان پر بھی زورِ قلم دکھائیں۔اکبر علی خاں کا یہ مضمون کافی دل چسپ ہے۔اس پورے مضمون کو قارئین 'رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں' جلد دوم میں ملاحظہ کر سکتے

ہیں۔ اس موقع پر میں مضمون کے کچھ اقتباسات پیش کر رہا ہوں تا کہ اندازہ لگایا جا سکے کہ بقول اکبر علی خاں، رشید حسن خاں سے کہاں اور کس مقام پر تاریخی و تحقیقی غلطیاں سرزد ہوئیں ہیں:

''ادھر کچھ عرصے سے رشید حسن خاں صاحب کا نام اُن مضامین کی وجہ سے ادبی حلقوں میں زیرِ بحث آتا رہتا ہے جن کے ذریعے اُنھوں نے ایک دوسرے سے مختلف لکھنے والوں کو سہل پسندوں اور بے پرواہیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان مضامین کو بہت سے رسالوں نے ایک دوسرے سے نقل کیا ہے اور اس طرح رشید حسن خاں صاحب کی اُس محنت کی داد ہے جو موصوف نے لکھنے والوں کی سہل پسندی اور موضوع سے بے توجہی ثابت کرنے میں صرف کی ہے۔

بلاشبہ ہمیں احتساب سے کام لینا چاہیے اور یہ کوشش کرنا چاہیے کہ ہمارے کام کرنے والے زیادہ سے زیادہ محطاط ہو کر قلم اُٹھائیں، خصوصیت سے تحقیق کے میدان میں احطیاط برتنا بھی ضروری ہے تا کہ کسی ایک کی غلطی آیندہ کی اور بہت سی غلطیوں کا دروازہ نہ کھول دے۔ لیکن اگر نقاد کا مطمع نظر صرف عیب جوئی بن جائے تو یہ امر نہ صرف تحقیقی کام کرنے والوں کی ہمت شکنی کا سبب بن جائے گا بل کہ معترض کی خود اپنی صلاحیتوں کا بھی کوئی اچھا مصرف نہ ہوگا۔

ابتدا میں رشید حسن خاں کے پیشِ نظر یہی بات رہی ہوگی کہ اُن کے احتساب کے بعد لکھنے والے اپنے کام کو شائع کرنے سے پہلے اچھی طرح پرکھ لیں اور اس طرح کاموں کو معیار بلند ہو جائے۔ لیکن یہ احتساب چند وجوہ کی بنا پر خود اُن کے لیے کسی طرح صحت مند ثابت نہیں ہوا چہ جائے کہ دوسروں کے لیے۔

ہوا یہ کہ ادھر اُنھوں نے جو مضامین لکھے ہیں اُن میں پڑھنے والوں کو وہ بے لوثی نظر نہیں آئی جس کی توقع اُن سے کی جاتی تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے اکثر و بیش تر ان مضامین میں طنز و تمسخر کے تیر و نشتر چلائے ہیں جس کا ردِ عمل خوش گوار ہو ہی نہیں سکتا اور اُنھوں نے بعض مواقع پر اپنے اعتراضات میں اُن معذرتوں کو بھی نظر انداز کر دیا جو لکھنے والوں نے اپنی مجبوریوں کے تحت کی تھیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوا جیسے ہم کسی کتاب کے غلط نامے کو نظر انداز کر کے ساری غلطیاں ایک بار پھر لکھنے والے کے حساب میں لگا دیں۔ چوں کہ یہ رویہ خلوص کے سراسر منافی ہے۔ اس لیے اُن مضامین سے کسی صالح اثر کا مرتب ہونا قطعاً نا ممکن ہو گیا اور کچھ کاموں میں جن کی ضرورت اور اہمیت کا ہم سب کو اعتراف ہے بے جا رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کام کرنا مشکل ہے اور اُس پر اعتراض عاید کر دینا اُتنا سہل ہے جتنا سہل ہو سکتا ہے۔ کسی نمایش میں ایک مصور نے اپنی تصویر کے ساتھ یہ نوٹ بھی لگا دیا تھا کہ اگر کوئی صاحب نظر اس تصویر میں غلطیاں پائیں تو اس پر نشان لگا دیں۔ چناں چہ اتنے صاحب نظر پیدا ہو گئے کہ نشانات کی زد میں تصویر ہی غائب ہو گئی۔ لیکن جب اُسی مصور نے دوسری تصویر کے ساتھ یہ درخواست کی کہ غلطی کو درست کر دیا جائے تو کوئی بھی تصویر کی عصمت پر انگشت نمائی کرنے والا نہیں تھا۔ یہی حال زبان و ادب کے معاملات میں بھی ہے۔

میری رائے میں جو اعتراض کے مشورے کی شکل میں آنا چاہیے تا کہ دوستانہ فضا میں بات کو سُنا بھی جا سکے۔ اور اُس کے زیرِ اثر آیندہ کوئی مثبت نتیجہ بھی نکل سکے۔ دوسری بات یہ بھی ضروری ہے کہ معترض یا محتسب کو اعتراض داغنے اور احتساب کرنے سے پہلے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جس قسم کی اغلاط پر وہ نہ صرف یہ کہ گرفت کر رہا ہے بل کہ لہجے اور زبان میں طنز و تمسخر کے نشتر بھی چبھا تا جا رہا ہے۔ کہیں اُس جیسی غلطیاں خود اُس کے کارناموں میں تو دخیل نہیں ہیں اور کیا اُس نے کوئی بے داغ کام بھی پیش کیا ہے۔

اِس قسم کے اعتراضات کرنے والوں ک بھی یہ نقصان ہوتا ہے اور زبان و ادب کو بھی کہ وہ پھر اپنے نام سے کوئی کتاب بازار میں لاتے ہوئے اس لیے ڈرتے ہیں کہ اگر اُن کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تو قامت کی درازی کا سارا بھرم کُھل جائے گا۔ اور یوں وہ ساری محنت جو تعمیری کاموں میں صرف ہونا چاہیے تھی منفی اوت تخریبی کاموں میں ضائع ہوتی رہتی ہے۔

یہ کسی بھی زبان کی کم نصیبی ہے کہ اُس کے باصلاحیت افراد یہ نہ طے کر پائے کہ آخر اُن کے کرنے کا کام کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے بھی اپنے تبصروں میں جن پر اُن کی شہرت کا دار و مدار ہے، منفی صلاحیتوں کو آزمایا ہے۔ اس معاملے کا افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ کہ اکثر حضرات جنھوں نے رشید حسن خاں کے یہ تبصرے پڑھے ہیں اُن کی نیت پر بھی شک کرتے ہیں اور یہ مسلمہ امر ہے کہ جس تحریر کا خلوص مشکوک ہو وہ چاہے سچ بھی کیوں نہ ہو محفلوں میں ذریعۂ آرایش گفتار تو کچھ مدت رہ سکتی ہے مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ رشید حسن خاں کی نیت پر شک کرنے والے کہتے ہیں:

ہم نے مان لیا یہ تبصرے تحقیق و تنقید میں پھیلی ہوئی بے راہ روی اور بے توجہی کو دور کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں لیکن...

(1) پہلی بات تو یہ سمجھ میں نہیں آتی کہ تبصرہ نگار کے لہجے میں طنز یہ انداز کیوں کارفرما رہتا ہے۔

(2) دوسرے یہ کہ اس سلسلۂ نقد و نظر میں رشید حسن خاں نے اُس ادارے سے متعلق مصنفین کی کتابوں کو کیوں شامل نہیں کیا جس ادارے سے وہ خود وابستہ ہیں یعنی شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی۔ اگر وہ اس ادارے کی مطبوعات اور اس سے متعلق حضرات کی کتابوں پر نہیں لکھتے تو اس کے وہی معنی ہو سکتے ہیں

یا تو یہ کہ:

(الف) ان کے نزدیک وہ سارے کام معیاری ہیں اور وہ ان سے مطمئن ہیں اور اُن کے خیال میں ان کاموں پر لکھنے کی گنجایش نہیں نکلتی، یا پھر یہ کہ:

(ب) رشید حسن خاں کے یہاں بھی مصلحتوں کا دخل ہے۔

ان حضرات کے مطالبوں میں شاید کوئی مطالبہ بھی بے جا نہیں اس لیے کہ اگر رشید حسن خاں کے نزدیک حکومتِ ہند پر شعبۂ اُردو علی گڑھ یونی ورسٹی کو امداد دینے سے غلط بخشی کا الزام آتا ہے تو دلّی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو نے بھی تا حالی حکومتِ ہند کی بڑی بڑی امدادوں کا کوئی ایسا مصرف نہیں کیا جو لائق داد ہو یا جس سے یہی ثابت ہوتا کہ اُس نے حکومت کی رقم کا ناجائز استعمال نہیں کیا۔ کیا کوئی شخص اس بات کا منکر ہو گا کہ اصلاح اور احتساب کا کام اپنے گھر سے شروع ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو کیا ایک شخص کو محتسب اور مصلح پر شک کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ عیب جوئی میں اپنا وقت برباد کرنے سے زیادہ افسوس ناک کیفیت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ آیندہ گفتگو میں جو مثالیں رشید حسن خاں کے صرف ایک مضمون سے پیش کرنے والا ہوں اُن کا مقصد صرف اتنا ہے کہ رشید حسن خاں جو باشعور آدمی ہیں۔ ان معروضات کی روشنی میں اپنے آپ کو مزید ''فضول خرچ'' سے بچائیں۔ اس مثال کو سامنے رکھ کر جو ان کے لکھے چند صفحوں کی بنیاد پر تیار کی گئی ہے، سچے دل سے غور کر فرمائیں۔

این گناہیست کہ در شہرِ شُما نیز کنند

(رسالہ نقوش، ادارہ فروغ اُردو لاہور، مدیر محمد طفیل، شمارہ 104، جنوری 1966، صفحہ 239 تا 241)

رشید حسن خاں کا شمار برصغیر کے ماہرین اُردو املا میں ہوتا ہے۔ ہندو پاک میں اُردو املا پر کسی بھی طرح کی گفت شنید کی جاتی ہے تو بلا شبہ اس گفت وشنید میں رشید حسن خاں مباحثے کا مرکز بن جاتے ہیں۔ ان کی کتاب ''اُردو املا'' (1974) نے اُردو املا کی اصلاح میں ایک انقلاب برپا کیا۔ ان کی دوسری کتاب ''زبان اور قواعد'' (1976) نے بھی اُردو الفاظ کی درجہ بندی میں اہم کردار ادا کیا۔ بچوں اور بڑوں کے لیے رشید حسن خاں نے مختصر مگر جامع کتابچے ''انشا اور تلفظ''، ''اُردو کیسے لکھیں''، ''عبارت کیسے لکھیں'' تحریر کیے۔ یہ کتابچے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے معاری ادب سیریز کے تحت شائع کیے۔ اُردو حلقوں میں مذکورہ کتابوں کی اس قدر مانگ ہے کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی وقتاً فوقتاً ان کے نئے اڈیشن شائع کر رہی ہے۔ لیکن یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ رشید حسن خاں کی کتاب ''اُردو املا'' اور ''زبان وقواعد'' کو کئی ماہرین نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان میں سرفہرست نام مولانا حفیظ الرحمٰن واصف، ڈاکٹر ابو محمد سحر، خورشید ملک، اطہر ہاشمی کا ہے۔ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے اُردو املا، زبان اور قواعد اور اُردو کیسے لکھیں کے خلاف 1979 میں باقاعدہ اُردو لسانیات پر مبنی ایک تنقیدی کتاب ''ادبی بھول بھلیاں'' تحریر کی۔ اس کتاب میں مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے گوپی چند نارنگ کی کتاب ''املا نامہ'' پر بھی سخت تنقید کی ہے۔ لیکن مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے رشید حسن خاں کی املائی غلطیوں اور قاموس الاغلاط کو مع سند وحوالہ کے تحت پرکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ واضح رہے کہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کے یہ لسانیاتی اور املائی تنقیدی مضامین ماہ نامہ ''برہان'' دہلی میں اگست 1978 سے جنوری 1979 تک 6 اقساط میں شائع ہوئے۔ ''ادبی بھول بھلیاں'' کے چند اقتباسات کو ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''آزادی کے بعد دہلی میں اُردو تحقیق''، ناشر دہلی اُردو اکادمی، سن اشاعت 2010 میں نمبر شمار 9 پر ''زبان اور قواعد ایک تنقیدی جائزہ'' از مولانا حفیظ الرحمٰن واصف، صفحہ 116 تا 128 تک شامل کیا ہے۔ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کتاب ''ادبی بھول بلیاں'' سے قبل ایک اور کتاب ''اُردو مصدر نامہ'' تحریر کر چکے تھے۔ جس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف اپنی کتاب ''ادبی بھول بھولیاں'' میں رشید حسن خاں کی کتاب 'زبان اور قواعد' کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''پانچ چھ برس قبل راقم الحروف کی ایک کتاب ''اُردو مصدر نامہ'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کی تھی۔ اس کے مقدمے میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ اُردو ایک زندہ اور توانا زبان ہے۔ دوسری زبانوں کے جو الفاظ اُردو نے اپنا لیے ہیں اور ان میں تصرف کر لیا ہے۔ خواہ وہ لغت کے لحاظ سے غلط ہوں، اگر فصحا و ادبا سے سند فصاحت حاصل کر چکے ہیں تو ان کو اصل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں اور اس کی کوشش کرنا ایک فعلِ عبث ہے وہ حضرات جو صحت الفاظ پر اصرار کرتے ہیں مجھے ان کی راے سے اختلاف تھا اور ہے۔

ناگاہ ایک کتاب جو ترقی اُردو بورڈ کی طرف سے شائع ہوئی ہے میری نظر سے گزری۔ کتاب کا نام ''زبان وقواعد'' ہے۔ مصنف رشید حسن خاں۔ اس کتاب کو دیکھ کر مصنف کی وسعت نظر، وسعتِ مطالعہ اور صلاحیت استقراء کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب بہت محنت اور تلاش وجستجو کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ مجھے مصنف کی راے سے اختلاف بھی ہے۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ فاضل مصنف بہت زیادہ احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ لکھتے ہیں:

''یہ بات قابل ذکر ہے کہ متعدد صاحب نظر حضرات ہر زمانے میں استعمالِ عام کو سند مانتے رہے ہیں اور اُردو الفاظ کے لیے صراح وقاموس سے سند لینے کو غلط طرز عمل سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔''

مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

''لفظ خواہ کسی قوم و ملک کے ہوں مگر جب وہ دوسری قوم اور ملک کی زبان میں چلے جاتے ہیں تو ان کی مثال اُن لوگوں کی سی ہے جو پیدا کہیں ہوں لیکن جب کسی دوسرے ملک کی رعایا بن جاتے ہیں تو اس دوسرے ملک کے قاعدے اور قانون ان پر چلا کرتے ہیں۔ اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان کی پیدائش کہاں کی ہے اور یہ پہلے کس کی رعایا تھے۔'' (نقوش سلیمانی)

لفظ متشکر کے ذیل میں لکھا ہے:

''عربی میں مشکور اس کو کہتے ہیں جس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ مگر ہماری زبان میں اس کو کہتے ہیں جو کسی کا شکریہ ادا کرے۔ اس لیے مشکور کی جگہ عربی بعض عربی کی قابلیت جتانے والے اس کو غلط سمجھ کر صحیح لفظ شاکر یا متشکر بولنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی یہ اصلاح شکریہ کے ساتھ واپس کرنا چاہیے۔'' (ایضاً)

پھر کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ایک صاحب نے لفظ عادی کو غلط بتایا تھا۔ اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا تھا:

''یہ ظلم آخر اُردو پر کب تک جاری رہے گا کہ جس لفظ کو وہ چاہے جتنا اپنا لے لیکن اسے بولتے ہوئے وہ پابند دوسری زبانوں کے رہے گی۔ اور اس کی تذکیر و تانیث میں، اس کے اعراب میں اس کی جمع بنانے میں اسے حالت ترکیب میں لانے میں اُردو والے بے بسی سے منہ دوسروں ہی کا دیکھتے رہیں گے۔ ذرا کسی دوسری زبان والے کے سامنے یہ اصول بیان کر کے تو دیکھیے کہ لفظ آپ کا لیکن اس کا املا، اس کا تلفظ، اس کی گرامر سب دوسروں کا۔'' (ماہ نامہ تحریک دہلی)

مذکورہ بالا اقتباسات سے فاضل مصنف نے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ الفاظ کا جو بھی تلفظ عوام میں اور جہلا میں رائج ہے وہ قابلِ قبول ہے اور ہماری زبان کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ خواہ وہ کیسا ہی غلط، بھونڈا اور مبتذل ہو۔ یعنی صحت و فصاحت کا کوئی معیار باقی نہیں رہا۔

صراح و قاموس سے فتوا لینا اگر جرم ہے تو ان کو اٹھا کر طاق نسیاں پر رکھ دیجیے لیکن سنسکرت اور ہندی کی ڈکشنریوں سے بھی چڑ ہے؟ اگر مندرجہ ذیل الفاظ کی تحقیق مقصود ہو تو کہاں دیکھیں گے؟ ان الفاظ کی اصل کیا ہے؟ کس طبقے میں کیا تلفظ رائج ہے۔ صحیح کون سا ہے اور غلط کون سا؟

چپک، چپس، الگنی، قسایہ، کسک، قنچہ، قبوتر، پھتر، تلپنا، اونچائی کے، سلوٹ ستانا، جکڑی وغیرہ۔

مولانا دریابادی کی خفگی سر آنکھوں پر، لیکن باادب گزارش ہے کہ مندرجہ ذیل جملوں میں:

'وہ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں۔ مخاطب کی طوے مکسور ہے یا مفتوح؟ منتظر کی ظوے۔ مذکورہ بالا اقتباسات سے فاضل مصنف نے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ الفاظ کا جو بھی تلفظ عوام میں اور جہلا میں رائج ہے وہ قابلِ قبول ہے اور ہماری زبان کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ خواہ وہ کیسا ہی غلط، بھونڈا اور مبتذل ہو۔ یعنی صحت و فصاحت کا کوئی معیار باقی نہیں رہا۔

صراح و قاموس سے فتوا لینا اگر جرم ہے تو ان کو اٹھا کر طاق نسیاں پر رکھ دیجیے لیکن سنسکرت اور ہندی کی ڈکشنری وئے مکسور ہے یا مفتوح؟ اور کیوں؟ صراح و علم الصیغہ کی مدد نہ لی جائے تو جواب کہاں سے حاصل کیا جائے گا؟

صحیح اور غلط کا امتیاز تو اُن الفاظ میں بھی کرنا ہوگا جو خاص اُردو کے ہیں یا سنسکرت اور برج بھاشا سے اُردو میں آئے ہیں۔ یہاں بھی منھ دوسروں کا ہی دیکھنا ہوگا۔ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اُردو گریمر کی اساس ہی عربی گریمر ہے۔ تذکیر و تانیث، اعراب جمع، حالتِ ترکیب، املا، تلفظ، گرامر وغیرہ یہ اصطلاحات مولانا دریابادی کہاں سے لائے؟ آگے چل کر صفحہ 19 پر لکھتے ہیں:

''سب سے اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ اب مکمل لغت کو کس انداز سے مرتب ہونا چاہیے اور اس میں کن کن باتوں کو نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ فصاحت اور معیار کے غیر منطقی تصورات نے کس قدر انتشار پھیلایا ہے۔''

مندرجۂ بالا عبارت کا مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ فصاحت کا منطقی تصور کیا ہے اور غیر منطقی کیا ہے؟ اگر لسانیات اور لغت میں منطق و فلسفہ کو مداخلت کا موقع دے دیا جائے تو سیکڑوں محاورے ترک کرنے پڑیں گے۔ مثلاً ہوا کھانا، غلط ہے۔ کیوں کہ ہوا منھ سے کھانے کی چیز نہیں ہے۔ دیوار میں پانی مر رہا ہے، غلط ہے۔ کیوں کہ موت حیوانات پر واقع ہوتی ہے۔ ٹھوکر کھانا، فریب کھانا، غلط ہے۔ کیوں کہ ٹھوکر اور فریب کوئی مٹھائی نہیں ہے۔ جام چھلک گیا غلط ہے۔ چھلکنے کی نسبت بجائے مظروف کے ظرف کی طرف غیر منطقی ہے۔ شہد کی مکھیوں نے کاٹ کاٹ کر سُجا دیا ہے، غیر منطقی ہے۔ کیوں کہ مکھیاں ڈنک چبھوتی ہیں۔ دانتوں سے نہیں کاٹتی۔ ایسے سیکڑوں محاورے ہماری اُردو زبان میں بل کہ دُنیا کی اور زبانوں میں بھی رائج ہیں جو منطق کی رو سے غلط ہیں۔ رہا معیار کا منطقی اور غیر منطقی تصور۔ تو کیا آپ نے کوئی معیار قائم کیا ہے؟ اگر قائم کیا ہے تو اس کے منطقی اور غیر منطقی تصور کی وضاحت کی جائے۔ آگے لکھتے ہیں:

''اصل مقصد یہ ہے کہ قاموس الاغلاط کو موضوع بنا کر اُردو لغت نگاری کے احوال و انداز کا اور غلطی و صحت اور فصیح و غیر فصیح کے ٹھپّا لگے ہوئے تصورات کا

کچھ بیان کیا جائے۔''

ایک طرف تو فاضل مصنف ہر ایک غلط اور عوامی لفظ کے بارے میں یہ حکم لگاتے ہیں کہ بہر حال یہ بھی ایک لفظ ہے۔ اس کو بھی لغت میں آنا چاہیے۔ اس کے اس تلفظ کو بھی مان لینا چاہیے۔ پھر وہ ٹھپا لگے ہوئے تصورات کہاں سے آئیں گے؟ آگے لکھتے ہیں:

''اس مضمون میں قاموس الاغلاط کے کچھ مندرجات پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کوشش کی گئی ہے کہ جن لفظوں کو مؤلفین قاموس الاغلاط نے غلط بتایا ہے یا جن کی مستعمل حرکات کو غلط لکھا ہے، ایسے الفاظ کے متعلق فارسی تصرفات کو یا اساتذۂ اُردو کے مختارات کو پیش کیا جائے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ایسی تالیفات کے اکثر مندرجات، مفروضات پر مبنی ہیں اور ایسی کتابوں کے مؤلفین نے زبان کے اصول ارتقا اور اس کے ناگزیر تقاضوں سے کم سے کم سروکار رکھا ہے۔''

فاضل مصنف جو کچھ لکھتے ہیں بڑے طمطراق سے فلسفیانہ انداز میں لکھتے ہیں۔۔ زبان بھی فاضلانہ اور ادیبانہ ہے۔ بدیسی الفاظ بھی بہت زیادہ استعمال کیے ہیں۔ ہم جیسے موٹی عقل والے ہندوستانیوں کی سمجھ میں نہیں آتا، کیا کہنا چاہتے ہیں۔ زبانوں کے اصول ارتقا و کمال اور اسباب تنزل و زوال کیا ہیں؟ اور اصول اور ارتقا کے ناگزیر تقاضے کیا ہیں؟ س اُردو میں کھول کر بیان کیا جائے اور ہماری معلومات میں اضافہ کیا جائے۔

زبان کی ہر قسم کی تبدیلی کا نام ارتقا رکھ دینا، یہ فلسفیانہ نظریہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ بہر حال ایسی کاروائیاں اصلاح و تہذیب کے دائرے میں نہیں آتیں بل کہ ادب کو فاسد کرتی ہیں یہ میرا ذاتی خیال ہے اختلاف رائے کا آپ کو اختیار ہے۔ میں نے سرسری طور پر کتاب کی ورق گردانی کی اور جہاں کہیں اظہارِ خیال ضروری سمجھا بے تکلف لکھ دیا۔''

(ادبی بھول بھلیاں، از مولانا حفیظ الرحمٰن واصف، طبع اول 1979، ناشر محمد قاسم ابن مصنف، صفحہ 11-7)

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف نے رشید حسن خاں کی کتاب ''اُردو املا پر بھی شدید نکتہ چینی کی۔ 'ادبی بھول بھلیاں' میں ہی صفحہ 60 پر موصوف نے اپنے اظہار خیال میں تحریر کیا کہ 'بعض احباب نے اصرار فرمایا کہ 'اُردو املا' کو بھی دیکھو۔'' تلاش و بسیار کے بعد حفیظ الرحمٰن واصف نے اُردو املا کے صفحہ در صفحہ اور لفظ بہ لفظ پرکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ مولانا واصف نے یہ بھی تحریر کیا کہ مصنف سلمہ، بہت سی جگہ اصل موضوع سے ہٹ گئے ہیں۔ بجائے اصلاح کے ایجاد و اختراع کی جھلک نمایاں ہے۔ مولانا واصف کی نظر میں رشید حسن خاں اُردو املا کا بھارتیہ کرن کرنا چاہتے تھے۔

اُردو املا، زبان و قواعد کے سلسلے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے رشید حسن خاں کی املا سے متعلق کتابوں پر اپنا نقطۂ نظر کئی کتابیں تحریر کر کے واضح کیا۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے 'زبان اور لغت'، 'اُردو املا اور اس کی اصلاح' اور 'اُردو رسم الخط اور املا ایک محاکمہ' جیسی کتابیں لکھیں جن میں رشید حسن خاں کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا گیا۔ دراصل ڈاکٹر ابو محمد سحر کی یہ کتابیں رشید حسن خاں کی کتابیں ''اُردو املا'' اور ''زبان اور قواعد'' کی ضد تھیں۔ یہاں میں یہ واضح کر دوں کہ اُردو ادب کے مایہ ناز املا شناسوں نے اس ضمن میں اختلاف کی بنیاد پر ہی سہی جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ قابل ستائش ہیں۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے رشید حسن خاں کی کتابوں پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''حکومت ہند کے ترقی اُردو بورڈ نے دو کتابیں اُردو املا از رشید حسن خاں اور املا نامہ از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شائع کی تھیں۔ 1975 میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے جناب رشید حسن خاں کی کتاب ''اُردو کیسے لکھیں'' شائع ہوئی۔ 1976 میں ترقی اُردو بورڈ نے ان کی کتاب ''زبان اور قواعد'' شائع کی۔ ان کتابوں کی اشاعت سے اُردو املا اور زبان کی اصلاح کے ذہنی پس منظر کا تفصیل سے علم ہوا اور اب اس پر وثوق کے ساتھ گفتگو کی جا سکتی تھی۔ چناں چہ میں نے دو کتابیں لکھنے کا ارادہ کیا۔ ایک ''اُردو املا اور اس کی اصلاح'' جو آج کل زیر طبع ہے اور دوسری یہ کتاب ''زبان اور لغت''...''.اُردو املا اور اس کی اصلاح'' کی تصنیف کا مقصد کسی کتاب کا جواب لکھنا نہ تھا لیکن اس میں کچھ کتابیں زیر بحث آ گئی تھیں۔ اس کتاب کا اصل مقصد صحت زبان اور تدوین لغت کے ان مسائل کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے جن پر غور و فکر کے بغیر ہماری موجودہ ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ جناب رشید حسن خاں نے ''زبان اور قواعد'' بھی اسی مقصد سے ترتیب دی ہے۔ چوں کہ ان کے طرز فکر اور فیصلوں سے مجھے اکثر و بیشتر اختلاف ہے اس لیے میں نے اسے خاص طور سے پیش نظر رکھا ہے۔

(دیباچہ زبان اور لغت، مصنف ڈاکٹر ابو محمد سحر، صفحہ 13 مکتبہ ادب، بھوپال 1983)

مشہور افسانہ نگار خورشید ملک (جو رشید حسن خاں کے ہم وطن تھے) نے بھی رشید حسن خاں کے تحقیق، تدوین، تنقید اور املا کی خدمات پر نکتہ چینی کی۔ خورشید ملک نے اپنے مضمون ''رشید حسن خاں کی تحقیق و تنقید معکوس'' میں رشید حسن خاں کی جملہ خدمات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مضمون میں رشید حسن خاں کی زندگی اور فن کے علاوہ نیز ہر پہلو پر گفتگو کی۔ خورشید ملک نے رشید حسن خاں کی تحقیق، تنقیدی اور املائی خدمات کے بارے میں لکھا:

''گذشتہ کئی دہائیوں سے رشید حسن خاں تحقیق، تنقید اور تدوین میں لگے ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی مرتب کردہ اور تصنیف کردہ کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ کافی تعداد میں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ماہ نامہ کتاب نما، نئی دہلی ان کا ایک گوشہ شائع کر چکا ہے اور ان کو کئی انعامات و اعزازات

سے نوازا جا چکا ہے گویا وہ دنیائے اُردو کی ایک معروف شخصیت بن چکے ہیں۔

چوں کہ اندھی تقلید اچھی روش نہیں ہے، خواہ وہ سیاست ہو، ادب ہو یا کوئی اور میدان، لہٰذا رشید حسن خاں کے کارناموں کو بھی بلا عذر اور بغیر سوچے سمجھے تسلیم کر لینا بھی دانش مندی کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ضروری ہے کہ جو کچھ انھوں نے کیا ہے، لکھا ہے یا معلوم کیا ہے اس کے بارے میں گہرائی و گیرائی سے غور کیا جائے کہ اس میں شک و شبہ یا تصحیح کی گنجایش ہے کہ نہیں۔

آیئے، ان کے چند کارناموں پر روشنی ڈالیں۔ ان کی ایک مشہور کتاب 'اُردو املا' ہے۔ اس کتاب کے بارے میں خود ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر اُردو کے املا کو آسان نہیں کیا بل کہ اس کی معیار بندی کی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ 'بالکل' اور 'عبدالعزیز' کو بغیر 'الف' کے لکھنے کے لیے اصرار نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ۔ دراصل انھوں نے 'اُردو املا' لکھ کر اُردو کے املا کو مزید پیچیدہ بنانے کی سعی کی ہے اور معیار بندی کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا ہے۔ اُردو کے بے شمار الفاظ کے املا کے بارے میں انھوں نے اپنی منفرد اور نا قابلِ قبول رائے دے کر شک و شبہات کی آہنی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔

انھوں نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ جب انھیں کوئی نئی بات بتاتا ہے تو وہ اس سے دریافت کرتے ہیں کہ اسے یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی۔ املا کے بارے میں بھی انھوں نے ایک نئے اصول کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا ان سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ ان کو یہ اصول کہاں سے دستیاب ہوا۔ اب تک اس پر عمل کیوں نہیں ہوا اور کیا اس اصول کا اطلاق حرف اور زبان پر ہی ہو سکتا ہے یا دیگر زبانوں پر بھی؟ چوں کہ وہ اُردو ہی سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ انھوں نے اُردو ہی کے لیے یہ بات کہی ہو۔ ان کے اس اصول کے مطابق لفظ کو اسی طرح لکھنا چاہیے، جس طرح اسے بولا جاتا ہے۔ ان کے اس اصول کے مطابق 'بالکل' اور 'عبدالعزیز' میں 'الف' زائد ہے کیوں کہ ان کو 'بلکل' اور 'عبدل عزیز' پڑھا یا بولا جاتا ہے۔ خود رشید حسن خاں ان الفاظ میں 'الف' استعمال کے حامی ہیں۔ یعنی وہ خود اس اصول کی نفی کرتے ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ صرف یہی دو الفاظ اس اصول کی نفی کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اُردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی اس اصول کا اطلاق ممکن نہیں۔ مثلاً انگریزی میں؛ BUT کو 'بَٹ' مگر، PUT کو 'پُٹ' پڑھتے اور بولتے ہیں۔ جب کہ دونوں سہ حرفی لفظ ہیں اور دونوں کے درمیان میں 'U' ہے۔ اسی طرح House Wife کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور ہر معنی کا تلفظ الگ ہے۔ لیکن، لکھا صرف ایک ہی طرح سے جاتا ہے۔ لہٰذا یہ قطعاً ضروری نہیں کہ کسی لفظ کو اسی طرح لکھا جائے جس طرح اسے بولا پڑھا جاتا ہے۔

اسی طرح رشید حسن خاں ایک اور اصول بتاتے ہیں کہ آخری لفظ سے پہلے والے حرف پر 'زبر' ہے تو 'ہمزہ' آئے گا۔ جیسے گئے، نئے وغیرہ اور اگر زیر ہے تو 'ی' کے نیچے دو نقطے لگیں گے جیسے لیے، پیے۔ اس اصول کی فراہمی کا انھوں نے حوالہ نہیں دیا ہے اگر خدانخواستہ ایسا کوئی اصول ہوتا تو کوئی نہ کوئی اس کی نشان دہی ضرور کرتا۔ کیا بابائے اُردو مولوی عبدالحق بھی اس اصول سے نا آشنا تھے؟ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ دو نقطے کس حروف کے لیے لگائے جائیں؟ 'ے' کے لیے نقطے لگانے کا سوال ہی نہیں۔ کیوں کہ اس کے نقطے اسی وقت لگتے ہیں جب یہ لفظ کے شروع میں آئے۔ جیسے یرقان، یقینی وغیرہ یا پھر جب درمیان میں آئے جیسے گیتا، پپیتا وغیرہ۔ حرف کے آخر میں 'ی' آنے پر اس کے نقطے نہیں لگتے جیسے گئی، آئے وغیرہ۔ اگر بقول رشید حسن خاں لیے پیے میں ایک اضافی 'ی' کے نقطے لگیں گے تو پھر ایک شوشہ بھی بڑھانا پڑے گا۔ یعنی لیئے پیئے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کوئی مشورہ نہیں دیا ہے۔ بس وہ تو ہمزہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے اس اصول کی پابندی نہ صرف دشوار طلب ہے بل کہ خواہ مخواہ کی پیچیدگیاں پیدا کرنا بھی ہے۔''

(رسالہ معلم اُردو، لکھنؤ، 2 اپریل 1993 صفحہ 14 تا 15)

قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ رشید حسن خاں کی ادبی زندگی کے ساتھ ہی ان کے معاصرین نے ان کی ذاتی زندگی کو بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ رشید حسن خاں جب دہلی یونی ورسٹی سے 31 دسمبر 1989 کو رٹائر ہو گئے تو ان کے ادبی مخالفین نے دہلی یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ اُردو اور وائس چانسلر سے یہ شکایت کہ کہ اب رشید حسن خاں دہلی یونی ورسٹی کے ملازم نہیں رہے، لہٰذا انھیں گائر ہال سے نکال دیا جائے۔ لیکن وائس چانسلر نے رشید حسن خاں کے علم اور فن کی قدر کرتے ہوئے مخالفین کو قرار دھچکہ دیا اور یہ حکم نامہ جاری کیا کہ رشید حسن خاں جب تک چاہیں گائر ہال میں رہ سکتے ہیں۔ ملازمت کے دوران خاں صاحب کا گریڈ تک نہیں لگایا گیا۔ جس کی وجہ سے انھیں مالی خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ رشید حسن خاں سے لوگوں نے ایک طرح سے منافقانہ رویہ رکھا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ خاں صاحب نے علم کے بتوں کے آگے کبھی سجدہ نہیں کیا، بل کہ اپنی سچی لگن اور دوٹوک تحقیق کی بنا پر ان نام نہاد علمی دیوتاؤں کے زعم کو زمین دوز کیا۔ میں مانتا ہوں کہ رشید حسن خاں کے پاس کسی بھی یونی ورسٹی یا کالج کی ڈگری نہیں تھی۔ پھر بھی انھوں نے اپنے مشرقی علم کے بوتے وہ کارنامے انجام دیے جو مغربی طرز کے نام نہاد محققین بھی انجام نہ دے سکے۔ بہت سے ادبی پروفیسران نے کبھی بھی ان کے علم کی قدر نہ کی۔ اُلٹے ان کے قد کو یہ کہہ کر چھوٹا کیا کہ یہ ہم جیسے پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ میں اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے انٹرویو سے ایک جواب نقل کرنا چاہوں گا۔ اس انٹرویو میں جب ڈاکٹر راشد عزیز نے ڈاکٹر تنویر احمد علوی سے سوال پوچھا کہ ''جناب رشید حسن خاں اور آپ دونوں ایک ہی میدان کے شہسوار ہیں اور ایک ادارے میں بھی رہے۔ ہم یہاں آپ دونوں کے آپسی مراسم کی بابت جاننا چاہیں گے کہ وہ کیسے رہے؟'' تو انھوں نے رشید حسن خاں کے علم کی قدر شناسی کرتے ہوئے ذاتی حملے بھی کیے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کہا؛

''اصل میں رشید حسن خاں سے میرے مراسم بہت اچھے رہے۔ میں ان کی قدر کرتا رہا۔لیکن وہ ہم لوگوں کی بے عزتی بہت کرتے تھے۔اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کم سے کم پڑھے لکھے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب گدھے ہیں۔ اچھا میں یہ کہتا تھا کہ بھائی ٹھیک ہے۔ قابل تعریف ہو کہ ان حالات میں تم نے کچھ کر لیا مگر بعض اعتبار سے تو ہم نے تم سے دس گنا زیدہ کیا اس کو تم کیوں نہیں جانتے۔ مثلاً وہ جتنی عربی جانتے تھے اتنی ہی میں بھی جانتا تھا۔ فارسی اتنی ہی جانتا تھا اور ہندی ان سے زیادہ جانتا تھا انگریزی، جغرافیہ اور تاریخ ان سے زیادہ جانتا تھا۔ تو وہ ہم لوگوں کی توہین پر آمادہ رہتے تھے۔ یہ بات مجھے ضرور ناگوار لگتی تھی۔ در اصل انھیں اپنی پست حیثیت کا احساس تھا کہ ہم لوگ لیکچرز، ریڈر اور پروفیسر ہیں اور وہ کچھ نہیں ہیں۔ کبھی میرے دل نے احساس برتری نے جنم نہیں لیا۔ میں ہمیشہ یہی سوچتا ہوں کہ جس کے لیے میں نے کچھ کیا نہیں وہ مرتبہ یا اعزاز مجھے کیسے مل سکتا ہے۔''

(ماہ نامہ ایوان اُردو، دہلی اُردو اکادمی، مکالمہ: تنویر احمد علوی سے، جون 2008، صفحہ 53)

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی طرح پروفیسر شار احمد فاروقی نے فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں کے بہانے رشید حسن خاں پر خوب ادبی حملے کیے۔لیکن ان ذاتی اعتراضات سے رشید حسن خاں کے پایۂ استقلال میں لغزش تک نہ آئی۔ نہ ہی ان کی تخلیقی و تدوینی کاوشوں پر کوئی نمایاں فرق پڑا۔

مذکورہ بالا گفتگو میں میں نے صرف رشید حسن خاں کی ادبی کوششوں کو ترجیح دی ہے تا کہ ان گوشوں پر گفت وشنید کی جا سکے جواب تک تشنہ پہلو تھے۔ ساتھ ہی ان کے جملہ ادبی کارناموں پر طائرانہ نگاہ بھی ڈالی ہے۔ اب میں اس کتاب ''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں'' جلد اول، دوم، سوم، چہارم اور پنجم میں شامل مضامین اور مضمون نگاروں کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے اس کتاب کو مرتب کرنا ایک بڑا چیلنج تھا۔ دراصل میں 2013 سے ہی مقالات رشید حسن خاں کو یکجا کر رہا تھا۔ اس تعلق سے میں نے خاطر خواہ مواد بھی اکٹھا کیا۔ لیکن 2015 میں ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا سے پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن پر ہوئی ایک ملاقات کے دوران میں نے مقالات رشید حسن خاں کو مرتب کرنے کی منشا کو ظاہر کیا۔ میرے منصوبوں اور ارمانوں کو دھچکہ اُس وقت لگا جب رینا صاحب نے بتایا کہ وہ خود مقالاتِ رشید حسن خاں کو ترتیب دینا چاہتے ہیں۔ مزید یہ بھی کہا کہ آپ اس کام کو ہاتھ میں نہ لیں اور جو تمہارے پاس مواد اکٹھا ہے وہ بھی مجھے فراہم کریں تا کہ کام جلد از جلد شروع کیا جا سکے۔ میں خاموش رہا۔ میری خاموشی کو رضامندی جان کر اور مان کر انھوں نے مجھ سے کہا کہ 'برخوردار آپ رشید حسن خاں پر لکھی گئی تحریروں کو اکٹھا کر مرتب کیجیے'۔ ان باتوں کو سُن کر میں خاموش ہو گیا۔ کئی سال کی محنت اور یہاں وہاں سے اکٹھا کیے گئے مقالاتِ رشید حسن خاں کے مواد کو میں نے بہ ذریعہ ڈاک ٹی۔ آر۔ رینا صاحب کے جموں کے پتے پر ارسال کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی رشید حسن خاں کے فن اور شخصیت پر لکھی گئی تحریروں کو تلاش کرنے لگا تا کہ وہ تمام باتیں منظر عام پر آ جائیں جو محبان ادب کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ اس کام میں میری مدد ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا نے بھی کی۔ ان کے پاس موجود ایسی تحریریں جو رشید حسن خاں کے ادبی کارنامون پر لکھی گئی تھیں کو انھوں نے مجھے ارسال کیا۔ ساتھ ہی ان کے دوستوں کے پاس خاں صاحب کے حوالے سے جو بھی مواد تھا وہ بھی مجھے ارسال کیا۔ اس طرح پورے تین سال تک میں مواد کو تلاش کرتا رہا۔ اس سلسلے میں میں نے پہلا رُخ اُردو اکادمی دہلی کی جانب کیا۔ وہاں پر میں نے رسالہ تحریک، کتاب نما اور ایوانِ اُردو کی پُرانی فائلوں کو کھنگالا۔ وہاں پر مجھے میری منزل مقصود نظر آئی۔ میں ہفتے میں اسکول سے چھٹیاں لے کر بھی اُردو اکادمی دہلی گیا۔ وہاں پر لائبریرین نزہت مہدی (اب رٹائر) نایاب زہرہ، زینت آپا کے علاوہ منور حسن کمال، محمد ہارون اور محمد امیر نے بھی رشید حسن خاں کی شخصیت فن اور ادبی کارناموں پر لکھی گئی تحریروں کو تلاش کرنے میں خاطر خواہ مدد کی۔ دہلی اُردو اکادمی کے بعد جس ادارے نے اس سلسلے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا وہ انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی ہے۔ اُردو گھر کی شبلی لائبریری کسی ادبی خزانے سے کم نہیں۔ اکثر میں وہاں صبح نو بجے پہنچ جاتا جہاں پر مجھے اختر الزماں ملتے اور بے روک ٹوک کتابوں اور رسائل کی الماریوں سے مجھے اپنی مطلوبہ شے کو ڈھونڈنے میں میری مدد کرتے۔ دس بجے کے بعد تنویر آپا آ جاتیں۔ بڑی ہی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کرتیں۔ تھوڑی ہی دیر میں گرما گرم چائے میز پر ہوتی۔ چائے کی چسکیوں کے درمیان میں رسائل کے پُرانے شماروں میں رشید حسن خاں پر لکھی گئی تحریریں تلاش کرتا۔ کبھی کبھی مایوسی بھی ہاتھ لگتی اور کبھی کبھی کامیابی۔ مجھے رشید حسن خاں پر لکھی گئی سب سے پُرانی تحریر اکبر علی خاں کی ملی جو محمد طفیل کے رسالے نقوش، جنوری 1966 میں شائع ہوئی تھی، عنوان تھا ''رشید حسن خاں کی تحقیقی غلطیاں''۔ اس زمانے تک رشید حسن خاں کے بیش تر مضامین، تبصرے، تجزیے برصغیر کے رسائل اور جرائد کے صفحات کی زینت بن رہے تھے۔ اب رشید حسن خاں کا نام گم نامی سے نکل کر ادبی دنیا میں اپنے منفرد تحقیقی کاموں کی وجہ سے ایک معتبر اور لائق احترام نام بن چکا تھا۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنا ہوگی کہ رشید حسن خاں کی اب تک کوئی بڑی اور علمی کتاب منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ حالاں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی کی معیاری سیریز کے تحت چند کتابیں منظر عام پر آ چکی تھیں۔

بہر کیف! انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کے تمام اہل کار اس بات سے واقف ہو چکے تھے کہ راقم الحروف رشید حسن خاں پر لکھی گئی تحریروں کو یکجا کر رہا ہے۔ انجمن کے سربراہ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے بھی اس معاملے میں میری حوصلہ افزائی اور ستائش کی۔ ہماری زبان کے نائب مدیر محمد عارف خاں اور انجمن کے کاتب عبدالرشید نے بھی میری خوب مدد کی۔ میں ان حضرات کا تاعمر شکر گزار رہوں گا۔ ان صاحبان نے دامے درمے اور سخنے غرض ہر اعتبار سے جو ممکن تھا میری مدد کی۔ ان دونوں حضرات کے علاوہ اُردو گھر کے سیلز منیجر ندیم احمد نے بھی رشید حسن خاں کی شخصیت پر مخمور سعیدی کے ہاتھ سے لکھی گئی ایک نظم میرے سپرد کی۔ یہ نظم کتاب نما کے گوشۂ رشید حسن خاں، اگست 1990 کے شمارے میں صفحہ 41 پر بہ عنوان 'نذرِ خاں صاحب' درج ہے۔ اُردو گھر کے تمام اہل کار رشید حسن خاں سے بالمشافہ ملاقات کر چکے تھے۔ اس لیے ان تمام لوگوں سے اکثر گفت وشنید کے

دوران خاں صاحب اور اُردو گھر کے رشتوں پر بھی تبادلۂ خیال ہو جاتا۔ میں نے اُردو گھر میں جن رسائل و جرائد کی فائلوں کی ورق گردانی کی ان میں کتاب نما، تحقیق، معیار پاکستان، اظہار، ادب و ثقافت، اُردو بک ریویو، ارمغان علمی، ہماری زبان، اخبار اُردو، اُردو معلٰی، رسالہ جامعہ، فنون، نقوش، نگار، اُردو ریسرچ جنرل، سب رس، فکر و نظر، تہذیب الاخلاق، قومی زبان (پاکستان)، انشا، قومی زبان (ہندوستان) فکر نو، اُردو ادب، فکر و تحقیق، فکر و نظر (پاکستان)، فکر و نظر (ہندوستان)، مژگاں، اُردو دنیا، پیش رفت، روشنائی، نیا دور، نوائے ادب، انشا، اقبال ریویو، زبان و ادب، مخزن، بازیافت، تکمیل، ترسیل، اُردو نامہ، علی گڑھ میگزین، آجکل (دہلی)، آجکل (کراچی)، ضیاء وجہی، نخلستان، اکادمی، خبر نامہ، کتاب، ادب، شاعر اور تحریک، شب خون، رہنمائے تعلیم، ماہِ نو، آمد، جمنا تٹ، شیرازہ، فن اور شخصیت وغیرہ وغیرہ۔

اُردو گھر کی لائبریری کے بعد میں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی لائبریری کا رُخ کرتا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے صدر ڈاکٹر رضا حیدر نے ''غالب نامہ'' کی اُن تحریروں کی فوٹو کاپی کرنے کی اجازت دی جن کا تعلق رشید حسن خاں سے تھا یا رشید حسن خاں پر جو تحریریں لکھی گئی تھیں۔ میرے کام کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے لائبریرین نے مجھے غالب نامہ کی اصل کا پیاں جو ان کی نظر میں زائد تھیں، تحفتاً دیں۔ اس طرح دو عظیم اداروں اُردو گھر اور غالب انسٹی ٹیوٹ سے مجھے رشید حسن خاں پر لکھی گئی تحریروں کا خاطر خواہ مواد حاصل ہوا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی کی جامع مسجد والی شاخ کے انچارج خسرو پرویز نے بھی اس تعلق سے میری خوب مدد کی۔ خسرو پرویز نے ہی حفیظ الرحمٰن واصف کی کتاب ''ادبی بھول بھلیاں'' میرے لیے خریدی۔ رشید حسن خاں پر لکھی ہوئی تحریروں پر ان کی نظر تھی۔ ڈاکٹر ظفر کمالی کی کتاب 'تحقیقی تبصرے' کی اطلاع بھی موصوف نے احقر کو دی۔ اکثر میں فرصت کے اوقات میں مکتبہ جامعہ جامع مسجد ضرور جاتا صرف یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کوئی ایسی کتاب بازار میں تو نہیں آئی جس میں رشید حسن خاں پر کچھ لکھا گیا ہو۔

اگر میں دہلی یونی ورسٹی کا ذکر اس موقع پر نہ کروں تو نا سپاسی ہوگی۔ میں کئی مرتبہ رشید حسن خاں کے ان مقامات (گائر ہال اور جبلی ہال) کو دیکھنے گیا جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے 30 سے زائد سال گزارے۔ یہاں میری مدد محترم نظام الدین (ریسرچ اسکالر شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی) نے کی۔ نظام الدین کے بعد عزیزی مدنی اشرف اور عادل احسان (دونوں ریسرچ اسکالر شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی) نے میری خوب مدد کی۔ یہاں تک کہ مدنی اشرف نے اپنے کارڈ پر کئی نادر کتابیں جن میں رشید حسن خاں پر مواد موجود تھا، میرے لیے اشیو کرائیں۔ وقت وقت پر مدنی اشرف نے دہلی یونی ورسٹی کی مرکزی لائبریری سے کئی کتابوں کی فوٹو کاپی کرا کر مجھے دی۔ اسی طرح عادل احسان نے میرے واٹس اپ اور میل پر کئی کتابوں اور رسائل کی پی ڈی ایف فائل بنا کر ارسال کیں۔ آج بھی اگر کوئی ایسی تحریر جس میں رشید خاں پر بات ہو وہ فوراً موبائل کیمرہ کی مدد سے مجھے ارسال کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں عادل احسان نے میرے استفسار پر دو مضمون رشید حسن خاں کے حوالے سے تحریر کیے۔ ساتھ ہی دہلی یونی ورسٹی شعبۂ اُردو کے اپنے ساتھی ڈاکٹر ظفر عالم (مؤ آئمہ، الہ آباد) سے بھی مضمون لکھوا کر مجھے ارسال کیا تاکہ میں اس مضمون کو مرتب شدہ کتاب میں شامل کرلوں۔

اس تحقیقی سلسلے کو دراز کرتے ہوئے میں کئی مرتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی بھی گیا۔ جہاں پر شعبۂ اُردو میں اُستاد ڈاکٹر خالد مبشر نے میری رہنمائی کے ساتھ رشید حسن خاں کے تعلق سے کئی باتیں ایسی بھی بتائیں جن سے میں نابلد تھا۔ اگر میں یہاں ڈاکٹر شاہ نواز فیاض کا ذکر نہ کروں تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ ڈاکٹر شاہ نواز فیاض نے نہ صرف میرے کہنے پر رشید حسن خاں کی املائی خدمات پر مضمون سپرد قلم کیا بل کہ اکثر و بیش تر جامعہ کی لائبریری سے کئی تبصرے (ان میں کئی تبصرے رشید حسن خاں نے کیے تھے اور کچھ رشید حسن خاں کی کتابوں پر تھے) بہ ذریعہ ای میل ارسال کیے۔ دراصل ڈاکٹر شاہ نواز فیاض نے اپنا تحقیقی مقالہ گیان چند جین کے حوالے سے رقم کیا ہے۔ اس نسبت سے بھی انھیں رشید حسن خاں سے شغف ہے۔ میری اکثر ان سے گھنٹوں موبائل پر ادبی اور علمی باتیں ہوتی ہیں۔ واقعی میں نے محترم کو ان کے نام کے اسم با مسمیٰ پایا۔ یہیں پر یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ میرے ٹیچرس ساتھیوں میں ڈاکٹر سلمان فیصل ابنِ سہیل انجم نے بھی میری رہنمائی کی۔ ڈاکٹر سلمان فیصل کے کہنے پر ہی ڈاکٹر انوار الحق (گیسٹ فیکلٹی شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) نے ڈاکٹر رؤف پاریکھ کے انگریزی مضمون "Urdu orthography, research and Rasheed Hasan Khan" جو پاکستان کے انگریزی روز نامہ DAWN میں شائع ہوا تھا، کا اُردو ترجمہ ''اُردو املا، تحقیق اور رشید حسن خاں'' کے عنوان سے کیا۔

اگر یہاں پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا ذکر نہ کروں تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ توصیف بریلوی اور ظہیر حسن ظہیر (دونوں ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) نے نہ صرف میرے استفسار پر مضمون قلم بند کیے بل کہ ان حضرات نے رشید حسن خاں پر لکھے گئے چند مضامین کی نشان دہی بھی کی۔ وقتاً فوقتاً انھوں نے مسلم یونی ورسٹی کی لائبریری سے کچھ مضامین کی تصاویر بھی ارسال کیں۔

میرٹھ کے جن ساتھیوں نے اس کام میں میری مدد کی ان میں سرفہرست میرے مخلص ادبی کرم فرما انیس احمد حسینی انیسؔ میرٹھی ہیں۔ انھیں رشید حسن خاں کی تحریروں اور ان پر لکھی گئی ادبی سطور سے والہانہ محبت اور عقیدت ہے۔ انیسؔ میرٹھی صاحب نے رشید حسن خاں کی تحقیقی کاوشوں سے متاثر ہو کر ایک تحقیقی و تنقیدی مضمون ''شہنشاہِ تحقیق رشید حسن خاں کا اسلوب نقد و تبصرہ'' سپرد قلم کر کے مجھے دیا، ساتھ ہی ''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں'' پر ایک مفصل، مدلل اور پُر مغز تقریظ بھی لکھی۔ اس تقریظ میں انیسؔ میرٹھی صاحب نے ایک توشیحی نظم بھی لکھی۔ انیسؔ میرٹھی صاحب کے اس ادبی خلوص کا میں تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ اسی کڑی میں میری ایم فل کے ساتھی ڈاکٹر خالد ظہیر (جامعہ ملیہ

اسلامیہ، نئی دہلی سے اُردو اور ہندی ادب میں بچوں کا ادب پر پی ایچ ڈی تفویض) نے رشید حسن خاں کی اُردو اور املا نوازی کے حوالے سے ایک مضمون تحریر کیا۔ قدم قدم پر ڈاکٹر خالد ظہیر نے میری رہ نمائی بھی کی۔ میرٹھ کالج میرٹھ کے سابق صدر شعبہ اُردو اور اُستادِ محترم ڈاکٹر خالد حسین خاں نے اپنی کتابیں ''ادبی تحریریں اور دل کش تحریریں'' راقم الحروف کو تحفے میں دیں۔ ان کتابوں میں رشید حسن خاں سے متعلق مواد تھا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر خالد حسین خاں نے خورشید ملک کا مضمون ''رشید حسن خاں کی تحقیق و تنقید معکوس'' کی ایک کاپی بھی دی۔ دراصل ڈاکٹر خالد حسین خاں کا تعلق بھی شاہ جہاں پور سے ہے۔ موصوف نے ڈاکٹر قمر رئیس اور رشید حسن خاں سے علمی و ادبی فیض حاصل کیا ہے۔

اس موقع پر ڈاکٹر الف ناظم (اسسٹنٹ پروفیسر دیوبند گورنمنٹ ڈگری کالج، سہارن پور) کا بھی شکریہ کرادا کرنا چاہوں گا۔ جنھوں نے رشید حسن خاں سے کی گئی باتوں، یادوں اور ملاقاتوں کا ایک قلمی مضمون میرے کہنے پر تحریر کیا۔ یاد رہے کے ڈاکٹر الف ناظم پہلے سائنس کے طالب علم تھے لیکن رشید حسن خاں کے کہنے پر ہی انھوں نے اُردو کی تعلیم حاصل کی اور آج دیوبند گورنمنٹ ڈگری کالج میں اُردو اُستاد کے عہدے پر فائز ہیں۔

میں رشید حسن خاں کے اہل خانہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنھوں نے میری ہر اعتبار سے رہ نمائی کی۔ خاص کر خاں صاحب کے دونوں صاحب زادوں خورشید حسن خاں اوالدحسن خاں نے اپنے والدِ محترم سے وابستہ ہر چیز کے فوٹو گراف مہیا کرائے۔ خورشید حسن خاں نے تو اپنے والد محترم کی یادوں کو ایک مضمون میں پیش کیا، جسے انھوں نے میرے کہنے پہ ذریعہ ای میل روانہ کیا۔ ماسٹر سہیل صاحب کا بھی میں شکریہ ادا کرتا ہوں جو راقم الحروف کو اُن مقامات پر لے گئے جہاں پر رشید حسن خاں کی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ شوقین بک ڈپو، مدرسہ بحرالعلوم، گاندھی فیض عام کالج کے ساتھ رشید حسن خاں کی آخری آرام گاہ کے دیدار میں نے انھیں کی وساطت سے کیے۔ اگر اس موقع پر میں اختر شاہ جہاں پوری کا ذکر نہ کروں تو یہ میری نا اہلی ہوگی۔ اختر شاہ جہاں پوری نے اپنی ذاتی لائبریری سے ایک کتاب ''رشید حسن خاں کے خطوط بنام رفیع الدین ہاشمی'' تحفے میں دی۔ ساتھ ہی آرڈیننس کلودنگ فیکٹری شاہ جہاں پور کی تاریخی اہمیت کے بارے میں بھی انھوں نے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا (اختر شاہ جہاں پوری نے بھی اپنی عمر کا بیشتر حصہ اسی فیکٹری میں گزارا ہے)۔ افسانہ نگار حنیف سید (آگرہ) کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے اپنی ذاتی فوٹو البم سے رشید حسن خاں کی چار نادر و نایاب تصاویر احقر کے سپرد کیں۔ رشید حسن خاں کے بچپن کے دوست رباب رشید نے مجھے لکھنؤ کے سفر کے دوران یوسف ناظم کا تحریر کردہ خاکہ نما مضمون ''دانش محل، لکھنؤ'' سے منگوا کر دیا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کی دو کتابیں ''دھوپ چھاؤں چہرے اور دیدہ وشنیدہ'' تحفتاً دیں۔ ان کتابوں میں رشید حسن خاں کے قلمی خاکے موجود ہیں۔

آخر میں، میں اپنے والدین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنی دعاؤں سے مجھے نوازا تا کہ میرا یہ مشکل کام آسان ہو سکے۔ میں اپنی شریک حیات یاسمین بیگم کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جس نے اپنی خانگی زندگی کے عدم الفرصت لمحات کو اس کام کے لیے قربان کیا۔

مجھے اپنی کم علمی کا پورا احساس ہے۔ رشید حسن خاں جیسی علمی و ادبی شخصیت پر لکھے گئے مقالات کو یکجا کرنا میرے لیے ایک چیلنج کے ساتھ مشکلات سے پُر امر تھا۔ میں اپنے مشن میں کہاں تک کامیاب ہوا یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ البتہ میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ پانچ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب ''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں'' رشید حسن خاں کی تحقیقی، تدوینی، تنقیدی، تبصراتی، تجزیاتی، املائی اور مخطوطہ شناسی کے حوالے سے کسی ادبی تحفے سے کم نہیں۔ خاص طور پر ان طلبہ کے لیے یہ کتاب ضرور سود مند ہوگی جو رشید حسن خاں پر تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں یا ان کے فن، شخصیت، علم و ادب پر دوسرے اکابرین ادب کی آرا سے مستفیض ہونا چاہتے ہیں۔

اس موقع پر میں مخمور سعیدی کی نظم ''نذرِ خاں صاحب'' قارئین کی نذر رہا ہوں تا کہ اس نظم کو پڑھ کر رشید حسن خاں کی علمی و ادبی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے:

مجمع علم و فضل ذات تری
تجھ سے مشتق ہیں سب صفات تری
درسِ فن تجھ سے گفتگو کرنا
ادب آموز بات بات تری
ہیں طلوعِ شعور دن ترے
آ گہی کا فروغ رات تری
سب سے ممتاز ہمسروں میں تو
مختلف سب سے کائنات تری

(ماہ نامہ کتاب نما، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اگست 1990، جلد 30 شمارہ 8، صفحہ 41)

مخمور سعیدی کی نظم کے بعد نثر میں ڈاکٹر شمس الحق عثمانی کی آرا ''خاں صاحب کون؟'' کے نام سے ملاحظہ فرمائیں۔ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی کی آرا کو اس لیے بھی پیش کیا جا رہا ہے کہ جب آپ حضرات اس کتاب کا مطالعہ کریں تو اس آرا کو اپنے اپنے ذہنوں میں ضرور محفوظ رکھیں؛ تا کہ رشید حسن خاں سے ''خاں صاحب'' بننے تک کے سفر کی روداد واضح اور مترشح ہو:

’’نام ونمود اور مال ومنال کی عامی دنیا سے الگ تھلگ، من چاہی بستیاں بسانے کا چلن بیسویں صدی کے آخری عشرے تک تو باقی ہے۔اس دعوے کی دلیل: جناب رشید حسن خاں۔

دامی دُنیا سے دور، من چاہی بستیاں بسانے والوں کو بھی ہم نفس اور درد ضرور ملتے ہیں؛اس دعوے کی دلیل: گوشۂ رشید حسن خاں میں شامل تحریریں۔
آج بالعموم نشیب ہی نشیب سے دو چار، اُردو معاشرے نے اپنے زمانۂ نشیب وفراز ہی سے خاں صاحب کو ٹالنے اور نظر انداز کرنے کی بھر پور کوشش کی۔اس کوشش کا نتیجہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ خاں صاحب کسی قصۂ پارینہ کی طرح فراموش کر دیے جاتے مگر وہ آج اپنے ہم عمروں، اپنے سے کم عمروں اور اپنے خوردوں سے خراجِ تحسین وصول کرتے رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ صورتِ حال کچھ لوگوں کے لیے حیرت (چوہا دوڑ کے)اس دور میں بھی معیار و اقدار کی کھیتیاں شاداب رہ سکتی ہیں۔شرط ؛وہی پُرانی والی: بس، شہ رگ کا لہو۔اور حاصل بھی وہی پُرانا: دائمی عزت (کہ منصب کے ساتھ ساقط نہیں ہوتی)

گویا خاں صاحب معیار واقدار کی لہورنگ ڈگر پہ چلنے والوں کے لیے اک ڈھارس ہیں۔آخر کار فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں شائع ہو ہی گئی اور باغ و بہار بھی منڈھے چڑھنے ہی والی ہیں۔مطلب یہ کہ بندے کو ڈٹے رہنا چاہیے؛ جوڈٹا رہے وہی خاں صاحب اور سُرخ رو۔
(ماہ نامہ کتاب نما، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جلد 30، شمارہ 8، اگست 1990، صفحہ 42)

یہ تھی رشید حسن خاں سے’’ خاں صاحب بننے تک کی روداد۔اس مقدمہ میں، میں نے رشید حسن خاں کے حالاتِ زندگی کو شامل اس لیے نہیں کیا گیا کیوں کہ پانچوں جلدوں میں کئی کئی مضامین ان کی سوانح اور شخصیت کے حوالے سے شامل ہیں۔ میں نے رشید حسن خاں کے دو مضمون، جوانھوں نے’’ کچھ اپنے بارے میں‘ ‘نام سے تحریر کیے تھے (ایک رسالہ اظہار ممبئی، 1984 کے لیے اور دوسرا بازیافت، لاہور 1998 کے لیے)اس وجہ سے شامل کیے ہیں تاکہ خود اپنے بارے میں رشید حسن خاں کا نقطۂ نظر واضح ہو جائے۔ان دونوں مضامین میں رشید حسن خاں نے اپنی Life History کو انوکھے انداز میں بیان کیا ہے۔ڈاکٹر اطہر فاروقی اور ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کے مضامین بھی ان جلدوں میں شامل ہیں، جن میں رشید حسن خاں کی سوانح حیات کو قلم بند کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں راقم الحروف اور منور حسن کمال کے مضامین میں بھی رشید حسن خاں کی سوانح حیات کے علاوہ ان کی عادات اور خصائل کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔توصیف بریلوی کے مضمون میں رشید حسن خاں کے کھیلوں سے لگاؤ کا بیان دل چسپ ہے۔الغرض پہلی جلد میں رشید حسن خاں کی شخصیت اور سوانح کا مکمل احاطہ پیش کیا گیا ہے دوسری جلد میں رشید حسن خاں کی تحقیق، تدوین پر مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔تیسری جلد میں رشید حسن خاں کی املائی خدمات پر مضامین شامل ہیں۔املا پر دوسرے لوگوں کو ان سے ہمیشہ اختلاف رہا ہے، کچھ مضامین اس تعلق سے بھی آپ تیسری جلد میں پڑھنے کو ملیں گے۔ چوتھی جلد میں تدوین وتنقید کے حوالے سے مضامین شامل ہیں اور پانچویں جلد میں رشید حسن خاں کے علمی وادبی کارناموں پر اصحاب قلم کے تاثراتی وتبصراتی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ میں نے اس مقدمے میں رشید حسن خاں کے اُن ادبی پہلوؤں کو شامل کیا ہے،جن پر گفت وشنید کے علاوہ صحت مند بحث ومباحثے کا منظر عام پر لانا لازمی ہے۔تاکہ قارئین حضرات کے سامنے وہ ادبی مباحث اور نکات بھی نکل کر سامنے آئیں جواب تک نظروں سے اوجھل تھے۔بات چاہے کلام اقبال کی تدوین کی ہو یا کلام غالب کا اشاریہ تیار کرنے کی، چاہے بات فراقؔ گورکھپوری کے خط کی ہو یا رشید حسن خاں کی فکشن تنقید کی۔رشید حسن خاں کے حوالے سے یہ ایسے امور اور نکات تھے جن پر میری نظر میں اب تک کوئی محاسبہ اور محاکمہ اُردو ادب میں نہیں کیا گیا تھا۔ان پانچوں جلدوں میں زیادہ تر مضامین ہند و پاک کے رسائل وجرائد کے صفحۂ قرطاس کی زینت بن چکے ہیں۔لیکن کچھ مضامین بالکل تازہ ہیں۔جواب تک کہیں پر بھی شائع نہیں ہوئے ہیں۔

قارئین حضرات سے گزارش ہے کہ اگر آپ کو کہیں اس کتاب میں کتابت یا املا کی غلطی نظر آئے تو اسے فوراً نوٹ کر احقر کو بتایا جائے تاکہ آیندہ اڈیشن میں ان غلطیوں کی اصلاح کی جاسکے۔

آپ کی دعاؤں کا طالب

—ابراھیم افسر

6 رمضان المبارک 1439ھ

مطابق 22 مئی 2018 بروز منگل

(سِوال خاص، ضلع میرٹھ، یوپی)

☆☆☆

تقریظ

تلاش و تحقیق کا فن بعض افراد تعلیم کے آخری مراحل میں حاصل کرتے ہیں اور بعض بہ طور رسم اس میں دل چسپی لیتے ہیں صرف ڈگری کی حد تک؟ اس دنیا میں بعض، تحقیق کے جویاں وہ ہوتے ہیں جو تحقیق و تلاش کا مادہ اپنی فطرت و جبلت میں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں تحقیق دو قسم کی ہے۔ تحقیقِ اصلی اور تحقیقِ نقلی۔ جو زمانہ گزر گیا وہ سراسر معنوی اعتبار سے تحقیقِ اصلی کا زمانہ تھا۔ جب کہ اُس دور میں راہِ تحقیق آسان نہ تھی۔ کسی بھی موضوع پر تحقیق کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ جو وسائل آج فراہم ہیں اُس دور میں مفقود تھے۔ آج کے مشینی دور میں انٹرنیٹ نے بہت آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ یہ الگ موضوع ہے کہ انٹرنیٹ کا جائز استعمال بہت کم ہو رہا ہے۔ تحقیق کے دشوار گزار مرحلے کو آسانی سے حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر؟ جذبۂ تحقیق اتنا خالص اور اتنا مستحکم ہوتا تھا کہ پہاڑوں کا سینہ چیر کر راستہ بنا لیا جاتا تھا۔ لیکن 1947 کے بعد سیاسی سطح پر زبان و ادب پر جو زوال پذیر اثر ہوا ہے وہ قطعی افسوس ناک ہے۔

زبان و ادب کے معیار میں گراوٹ انتہائی افسوس ناک ہی نہیں خطرناک بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریسرچ اسکالروں کے ذریعے لکھے گئے تحقیقی مقالے، خواہ وہ ایم۔ فل کے ہوں یا پھر پی۔ ایچ۔ ڈی کے، لسانی و ادبی اعتبار سے معنویت کی آن بان اور شان و شوکت سے محروم نظر آتے ہیں۔ حالاں کہ یہ کلیہ نہیں ہے مگر، اکثر ایسا ہی ہے۔ احقر کے سامنے ایک تحقیقی مقالہ رکھا ہے جو پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے تحریر کیا گیا ہے۔ اِس مقالے پر 2008 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی تفویض ہو چکی ہے اس کے ص 309 پر جملہ ہے:

''شہر... کی انفرادیت آج بھی باقی ہے۔ جب کہ الیکٹرانک میڈیا کے زبردست عروج نے پرنٹ میڈیا کو طشت از بام کر کے رکھ دیا ہے۔''

یہاں مقالہ نگار نے اُردو کا محاورہ ''طشت از بام ہونا'' کو استعمال کیا ہے۔ مگر موصوف کو یہ نہیں معلوم کہ اس محاورے کا مطلب کیا ہے؟ انھوں نے اسے چھپانے کے معنی میں لیا ہے۔ جب کہ اس محاورے کے معنی ہیں ''ظاہر ہونا''۔ ''مشہور ہونا''، ''عام ہونا''، ''عیاں ہونا'' وغیرہ: پی ایچ ڈی کے مقالے میں محاورے کا غلط استعمال کیا اُردو زبان و ادب کی موت نہیں ہے؟ یہ تو تھی زبان و ادب کی بات۔ اب ذرا ایک مثال تحقیق کی بھی دیکھ لیں۔ اس مقالے کے ص 240 پر جملہ ہے:

''کیوں کہ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے شاگردوں میں حضرتِ بیاںؔ میرٹھی اپنے زمانے کے بڑے معروف اساتذۂ سخن میں سے تھے۔''

جو افراد حضرت علامہ سید محمد مرتضٰی رضوی مرحوم کی سیرت و شخصیت پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ حضرت علامہ اُردو میں بیاںؔ میرٹھی اور فارسی میں یزدانیؔ میرٹھی تخلص فرماتے تھے۔ اور غیر منقسم ہندوستان کے مشہور و معروف صاحبِ طرز ادیب اور استاذ حضرت علامہ سید احمد حسن مرحوم کے خاص شاگرد اور بھانجے تھے اور حضرت علامہ سید احمد حسن غزلیہ شاعری میں شاکیؔ میرٹھی، رثائی شاعری میں باکیؔ میرٹھی اور فارسی شعر و ادب میں فرقانیؔ میرٹھی تخلص فرماتے تھے۔ اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مقالہ نگار تحقیق اور اُردو زبان و ادب میں اتنے کم زور ہیں؟ اس مقالے میں ان دو مثالوں کے علاوہ اور بھی بہت سی خامیاں ہیں۔ ان تمام خامیوں کے باوجود مقالہ جمع ہوا اور ڈاکٹریٹ کی عظیم المرتب ڈگری حاصل ہو گئی۔ یہ سوال یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بل کہ اپنے انتہائی کمال کو پہنچ کر اپنے تحقیقی نگراں کی علمی و ادبی شخصیت کو شکوک و شبہات کے حصار میں مقید کر لیتا ہے اور یہ چھوٹا سا سوال مزید دو بڑے سوالوں کو جنم دیتا ہے ایک یہ کہ کیا نگراں صاحب پڑھے لکھے نہیں ہیں؟ دوسرے کیا نگراں صاحب نے مقالے پر نظرِ ثانی نہیں کی؟

پہلا سوال تو اس لیے رد کرنا پڑے گا کہ صاحبِ علم و کمال کو ہی یونی ورسٹیاں نگراں مقرر کرتی ہیں۔ اب دوسرا سوال باقی رہ جاتا ہے کہ نگراں صاحب نے کیا مقالے پر نظرِ ثانی نہیں کی؟ جب خامیاں ہیں تو یہی کہا جائے گا کہ نظرِ ثانی نہیں کی گئی۔ جب بات یہاں تک پہنچ جائے گی تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ آخر گائڈ یا نگراں نے تصحیح کیوں نہیں کی؟ اب نگراں اس کا کیا جواب دیں گے، احقر کو نہیں معلوم۔ البتہ یہ تساہلی اور لاپروائی زبان و ادب کے تئیں خلوص و وفاداری نہیں ہے۔ اگر خامیوں سمیت یہ مقالہ شائع ہو کر کتابی شکل اختیار کر لے گا تو آنے والی نسل کو ان فاش غلطیوں کی نشان دہی کون کرائے گا؟ آج زبان و ادب کی تنزلی اور زبوں حالی خادمانِ زبان و ادب کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس سنگین صورتِ حال کو لے کر بے لوث اور مخلص خادمانِ زبان و ادب حیران و پریشان ہیں۔ اُدھر سیاسی سطح پر زبان و ادب کے لیے روز بہ روز ناہمواری پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ جو اُردو زبان و ادب کی تحقیق کے لیے مثبت رویہ نہیں ہے۔ سبزی منڈی، اناج منڈی، دال منڈی، گڑ منڈی، فروٹ منڈی وغیرہ کی طرح آج ایک ''ادب منڈی'' بھی تشکیل پا چکی ہے۔ جس میں بڑے بڑے ٹھیکے ادب کے چھوٹتے ہیں۔ ایسے گائیڈوں یا سپروائزروں کی کمی نہیں ہے جو ادب منڈی کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ اور ایسے ریسرچ اسکالروں کی بھی

بنے گھوم رہے ہیں۔ایسے گائیڈ اور ایسے ریسرچ اسکالرس، زبان وادب کے وہ شاطر مجرم ہیں جنھیں کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔اِس طرح کے جتنے افراد بھی اُردو سے وابستہ ہیں وہ اُردو زبان وادب کی خدمت ظاہر میں کررہے ہیں مگر، درپردہ وہ اُردو سے خراج وصول کررہے ہیں۔ایسے گروہ کو ہی محترم پروفیسر ساجدہ زیدی مرحومہ میرٹھی نے اپنی خودنوشت سوانح ''نوائے زندگی'' میں ''ادب مافیا'' تحریر کیا ہے جو صد فی صد حق بہ جانب ہے۔افسوس صد افسوس ہائے اُردو زبان وادب کے فن کی قسمت!!

شکوہ انیس آپ کو جاہل سے ہے مگر؟
فن کا لہو بہایا ہے تیغ ادیب نے

خواہ ایم فل کے ہوں'پی ایچ ڈی' کے طالب علم۔اکثر اُن میں ایسے ہوتے ہیں جو اُردو نہیں کے برابر جانتے ہیں۔گھریلو زبان میں جب وہ ادب کی باتیں کرتے ہیں تو بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے۔دیہاتی لہجہ، گھر کی زبان، اب جو لوگ اُردو بول نہیں سکتے وہ اصل ادبی اُردو زبان لکھ کیسے سکتے ہیں؟ دوسرے نگراں حضرات کی تساہلی۔ان حالات میں تحقیقی مقالوں کا معیار پست ہوگا ہی۔اِس طرح مقالے تو وجود میں آئیں گے مگر وہ زبان وادب کی حقیقی خدمت نہ ہوگی اور نہ معنوی ادب تخلیق ہو پائے گا۔ضلع مراد آباد کے ایک گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا۔وہاں ایک ایسے نوجوان سے ملاقات ہوئی جو'ایم اے' اُردو سال دوم کا طالب علم تھا۔جب اُس نے نصاب کی بات کی تو اُس نے کتاب کا نام لیا''گبارِکھاتر''تب اُسے سمجھایا گیا کہ اس کتاب کا اصل نام''غبارِخاطر''ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے جیل میں بیٹھ کر اپنے دوست حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام رقم کیے تھے۔تب اُس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ ہمیں کسی ٹیچر نے آج تک یہ سب نہیں بتایا۔بس ایم۔اے کا اس نوعیت کا طالب علم'ایم فل'اور'پی ایچ ڈی' کرے گا تو ادب یقیناً بے کفن در گور ہو جائے گا۔مجرم کون؟ ٹیچر۔احقر نے ادب کے ایسے اُستاد بھی دیکھے ہیں جو اُردو کے الفاظ ہی غلط بولتے ہیں۔مثلاً اُردو کا ایک مذکر لفظ ہے پرخچّے۔یعنی''پُرزے''،''ٹکڑے''۔اِسی ایک لفظ سے ہماری زبان میں دو محاورے ہیں''پرخچّے اُڑانا''یعنی''پُرزے پُرزے کرنا۔''دھجیاں کرنا''۔دوسرا محاورہ ہے''پرخچّے اُڑنا''یعنی پُرزے پُرزے ہو جانا''وغیرہ۔اس اصل لفظ کو باقاعدہ''پرنچے''بولتے ہوئے سنا جاتا ہے۔ایسے اساتذہ کے شاگرد کیسے ہوں گے؟ایسی بہت سی مثالیں جمع کر کے پیش کی جاسکتی ہیں۔نہ زبان ہے نہ لہجہ ہے نہ اسلوب ہے سب ملیامیٹ ہے۔

مگر؟اس کے ساتھ ہزار ہا سلام ہو اُن گائیڈ حضرات پر جو حقیقی ادیب، ادب وادیب نواز، مخلص محنتی، ایمان دار اور زبان وادب کے بے لوث خادم ہیں۔مرحبا و تحسین وصد آفریں ہے اُن ریسرچ اسکالروں کے لیے جو راہِ تحقیق میں صبر آزما مراحل سے گزر کر مشکلات وزحمات برداشت کرتے ہیں اور تحقیق وتلاش کا حقیقی جذبہ رکھ کر مایہ ناز مقالے تحریر کررہے ہیں اور زبان وادب کی مخلصانہ خدمات انجام دے کر اپنی محنت ولگن اور تحقیق سے اُردو زبان وادب کو سربلند اور سُرخ رو کررہے ہیں۔ماشاءاللہ ایسے گائیڈوں کے کے تیار کرائے ہوئے اور ایسے ریسرچ اسکالروں کے تحریر کردہ مقالے زبان وادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔یقیناً ایسے مقالے آنے والے محققین کے لیے میل کا پتھر اور مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

تحقیق کی دنیا کا ایک اور اُبھرتا ہوا نام عزیزم ابراہیم افسر کا ہے۔آپ کا آبائی تعلق قصبہ سِوال خاص ضلع میرٹھ سے ہے۔آپ نے اپنی تعلیم برصغیر اور ہندوستان کی مشہور دانش گاہ''میرٹھ کالج میرٹھ''سے حاصل کی ہے۔آپ شریف النفس، نیک سیرت، مسلم صورت، باوضع مخلص مہمان نواز، ادیب دوست، زبان وادب کے قدرداں، اور تحقیق وتلاش کے جویا ہیں۔آپ کے اندر گوناگوں صلاحیتیں موجود ہیں۔علم وفن کے میدان میں آگے بڑھنے کی چاہ میں غرق رہتے ہیں۔آپ نے میرٹھی یونی ورسٹی سے ایم۔فل کی ڈگری عالمی شہرت یافتہ شاعر احمد فراز پر'احمد فراز کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ: خوابِ گُل پریشاں ہے'کے حوالے سے'2009 میں مقالہ تحریر کر کے حاصل کی ہے۔موصوف کو جلد ہی'پی ایچ ڈی' کی ڈگری بھی تفویض ہونے والی ہے۔ڈاکٹر خالد حسین خاں سابق صدر شعبۂ اُردو، میرٹھ کالج میرٹھ، بہت بڑے شکریے کے مستحق ہیں کہ محترم نے عزیزم ابراہیم افسر سے محقق یگانہ رشید حسن خاں مرحوم کی شخصیت اور علمی خدمات پر تحقیقی مقالہ تحریر کرایا ہے۔اُردو زبان وادب میں رشید حسن خاں کا نام نامی اسمِ گرامی سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔مرحوم ایک صاحب طرز ادیب، نقاد، مبصر، مرتب، مدون، محقق، مصلح زبان واملا تھے۔اسی لیے تحقیقی مقالے کا عنوان''رشید حسن خاں کی ادبی جہات''مقرر کیا گیا ہے۔پانچ سو بارہ صفحات کے اس ضخیم مقالے میں سات ابواب قائم کیے گئے ہیں۔اس کی تیاری کا آغاز 2012 میں ہوا تھا۔ماشاءاللہ یہ تحقیقی مقالہ شرح وبسط کے ساتھ 2017 میں پایۂ تکمیل ہو کر یونی ورسٹی میں جمع ہو گیا ہے۔مقالہ تیار کرنے میں عزیزم ابراہیم افسر نے جاں فشانی اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ان کے لیے ادب کی منڈی میں صارفینِ ادب سے مقالہ لکھوالینا بہت آسان تھا، لیکن موصوف نے اپنے جذبۂ تحقیق وتلاش، کھوج بین، ان تھک کوشش، دماغ سوزی اور عرق ریزی کر کے یہ مقالہ مکمل کیا، یہ مرحلہ دشوار گزار تھا مگر انھوں نے محنت، لگن اور تگ وتاز کر کے اس مرحلے کو آسان بنایا۔یہ بات یقینی ہے کہ جب یہ مقالہ اشاعت کے مرحلے سے گزر کر حلقۂ علم وادب میں روشناس ہوگا تو ادیبوں کے درمیان میں آپ کو اہم مقام دیا جائے گا۔ادبی شاہ راہ پر آپ کی یہ سعیِ پیہم اور جہدِ مسلسل جہاں تعریف کے قابل ہے وہاں لائقِ مبارک باد بھی ہے۔جب بات یہاں تک آ گئی ہے تو اختصاص کے ساتھ یہ حقیقت بھی بیان کردوں کہ زبان وادب کی تحصیل میں اگر موصوف مکمل راہ نمائی ہوگئی ہوتی تو موصوف کی زبان دانی اور اسلوب نگارش کچھ اور ہی ہوتا۔بہر حال! جہاں تک تحقیق وتلاش کا معاملہ ہے اس میں آپ نے کما حقہ کاوش کی ہے اور سعیِ بلیغ میں آپ صد فی صد کامیاب وکامران ہوئے ہیں۔اس سلسلے میں آپ کی بھاگ دوڑ لائقِ ستائش ہے۔رشید حسن خاں مرحوم سے متعلق آپ نے زرِ کثیر صرف کر کے جہاں سے جو کتاب ملی خرید لی۔رسائل خریدے، اخبارات خریدے اور دور دراز کے سفر سے بھی دریغ نہ کیا یہاں تک کہ مرحوم کے آبائی وطن شاہ جہاں پور کے علاوہ دہلی، آگرہ، لکھنؤ، علی گڑھ، بریلی اور الہٰ آباد تک کی خاک چھانی اور اپنے تحقیقی مقصد میں کامیاب ہو کر لوٹے۔

آپ فطری طور پر تحقیقی رجحان ک مالک ہیں اس لیے ان دشواریوں کو آپ نے آسان بنایا۔ اس سلسلے میں جہاں آپ کی تگ ودو ثمر آور ہوئی وہیں خداوندِ متعال نے اپنی رحمتِ بے پایاں سے آپ کی ذات کے لیے وسائل کی فراوانیاں فراہم کی ہیں وہ قابل رشک ہیں۔ کیوں کہ اس وجہ سے مسائل سدِ راہ نہیں ہیں، بس یہی آپ کی سب سے بڑی جیت ہے جو آپ کو فرحت وانبساط عطا کرتی ہے۔ اس لیے سیوال خاص (میرٹھ) میں آپ کی ذاتی لائبریری بہت اہم اور نایاب ہے جس میں بہت سے ادبا وشعرا ونقادانِ فن کے مجموعوں کے علاوہ محترم رشید حسن خاں مرحوم سے متعلق بہت کچھ مواد موجود ہے۔ ہندوستان بھر کے سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری رسائل وجرائد واخبارات وغیرہ بھی آپ ہر ماہ، یومیہ منگاتے ہیں۔ اس بنیاد پر آپ ادبی حلقے میں روشناس ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے تنقیدی وتبصراتی وتاثراتی وتربیتی مضامین نگاری کا سلسلہ شروع کیا ہے جو ماشاءاللہ لا متناہی ہے۔ آپ کے مضامین کی اشاعت تسلسل کے دائرے میں آ گئی ہے جو رفتہ رفتہ ادبی حلقے میں آپ کی معتبر شناخت کا ذریعہ ہے۔ وہ دن دور نہیں جب شہرت عامّہ بڑھ کر آپ کی قدم بوسی کرے گی اور آپ حلقۂ اربابِ ادب میں ایک بلند مقام حاصل کریں گے۔

میں کچھ روشنی میرٹھ کی علمی وادبی اہمیت پر بھی ڈالنا چاہتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا جب میرٹھ کالج کی شہرت علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی تک تھی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے مایہ ناز طالب علم اور پنجاب کے پہلے افسانہ نگار محترم حکیم احمد شجاع لاہوری علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے میرٹھ آ کر میرٹھ کالج میں داخل ہوئے تھے۔ اُس دور کے میرٹھ کالج میرٹھ اور شہر میرٹھ کی تعریف مرحوم نے اپنی خودنوشت میں کی تھی۔ اسی کالج میں اختر الایمان، انتظار حسین، پروفیسر شوکت سبزواری، پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین، بشیر بدر، پروفیسر فاروق بخشی، حفیظ میرٹھی، ڈاکٹر کنور محمود علی، ڈاکٹر نواز دیوبندی، ڈاکٹر یوسف قریشی، ڈاکٹر وسیم راشد جیسی باکمال شخصیات نے حیاتِ جاودانی بخشی۔ عزیزم ابراہیم افسر نے بھی اسی ادارے سے سال 2000 میں ایم اے اُردو اول درجے سے پاس کیا ہے۔

ابراہیم افسر میں جذبۂ تحقیق بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ یہ نہ خوشامد پسندی ہے اور نہ عقیدت کیشی ہے بل کہ بہ بانگ دُہل یہ کہنے کی ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ عزیزم ابراہیم افسر صاحب نے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھتے لکھتے مضامین نگاری شروع کی اور مضمون لکھتے لکھتے ایک اور کارنامہ دیا۔ یعنی محترم رشید حسن خاں پر ایک ضخیم کتاب ترتیب دے دی، اب ایک محقق، مرتب بھی ہو گیا۔ رشید حسن خاں مرحوم پر جو کتاب ترتیب دی ہے اُس کا عنوان ''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں'' ہے۔ اس کتاب میں وہ تحریریں شامل کی گئی ہیں جو رشید حسن خاں کی زندگی میں یا اُن کی وفات کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ اُردو دنیاے ادب میں رشید حسن خاں کی علمی خدمات کے اعتراف یا اعتراض کی شکل میں لکھی گئیں۔ تین ہزار صفحات سے زائد کی یہ ضخیم کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں تنقید، تحقیق اور تدوین کے موضوعات کے ساتھ مرحوم کی شخصیت وسیرت پر بھی گفتگو ہے۔ دوسری جلد میں املا، رسمِ خط، اُردو زبان اور خطوط وغیرہ ہیں۔ تیسری جلد میں رشید حسن خاں کی کتابوں پر کیے گئے تبصرے اور تجزیے وغیرہ شامل ہیں۔ علم وادب کا یہ دستاویزی شاہ کار وہ گہرا سمندر ہے جس میں انواع واقسام کے نادر ونایاب موتی، مونگے اور بے بہا لعل وجواہر کا انمول خزانہ ہے۔ جس سے تحقیق وتنقید کے جویا ادیب ومحققین فیض یاب ہوں گے۔ ابراہیم صاحب نے اس کتاب میں بھی فنِ تحقیق وتنقید کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ اس ادبی دستاویز میں محترم رشید حسن خاں مرحوم کی زندگی، شخصیت اور سیرت کے علاوہ مرحوم کی علمی خدمات کا ہمہ جہت احاطہ کیا گیا ہے۔ اس میں بعض مضامین مرحوم کے تحریر کردہ ہیں اور زیادہ تر مضامین دیگر اربابِ نقد ونظر حضرات نے مرحوم کی شخصیت و سیرت وفن پر تحریر کیے ہیں۔

اس کتاب میں ایسے مضامین بھی شامل ہیں جن میں مرحوم کی تنقیدی وتبصراتی آرا سے اختلاف کیا گیا ہے اور اس حد تک کہ رشید حسن خاں کی فنی وعلمی بحثوں پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔ جن میں بعض کی حقیقت بس اعتراض برائے اعتراض ہے۔ ان اعتراضات کی نوعیت مختلف قسم کی ہیں، زیادہ تر معترضین کی تحریروں میں حسد وانتقام کے نشتر پوشیدہ ہیں۔ اور تنقید کے نام پر تنقیص روا رکھی گئی ہے جو کم از کم زبان وادب کا خاصہ نہیں ہے۔ مرحوم رشید حسن خاں بھی بشر تھے اور کوئی بھی بشر ''بشری کمزوریوں'' سے عاری نہیں ہو سکتا اسی لیے مرحوم سے بھی خطا ونسیان، بھول چوک وغیرہ کا امکان ہے، مگر؟ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مرحوم کی تنقید وتبصرے کو تضحیک وتنقیص کا نشانہ بنایا جائے۔ اگر مرحوم کو قصوروار ٹھہرایا جائے تو بس اتنا کہ مرحوم نے ادیبوں اور شاعروں کی لسانی، ادبی، فنی، علمی، شعوری کوتاہیوں اور خامیوں کی گرفت نام بہ نام کی ہے۔ اگر تنقید کے معنوی وفنی اصول کو دیکھا جائے تو خاں صاحب نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ اگر خاں صاحب کی تنقید کے دائرے میں وہ افراد آ گئے جو خامیوں اور کوتاہیوں بھرا ادب تخلیق کر رہے تھے تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟ وہ ادب کیسے ادب کہلانے کا حق دار ہو سکتا ہے؟ جو اغلاط سے آلودہ ہو؟ رشید حسن خاں نے زبان وادب کی حقیقی خدمت کرتے ہوئے اُن خامیوں، کوتاہیوں اور لاپروائیوں کو اُجاگر کیا۔ اس عملِ خیر کو اُن لوگوں نے جرمِ عظیم سمجھا جو خامیوں بھرا ادب تخلیق کر کے شہرت کی بلندی پر تھے۔ اسی لیے وہ خاں صاحب کے درپے آزار ہوئے اور خود بھی خاں صاحب کو تنقیص کا نشانہ بنایا اور دوسروں سے بھی بنوایا۔ درپردہ ایسے لوگوں سے خاں صاحب کے خلاف قلم اٹھایا جن کے علم وشعور سے زبان وادب کی نزاکتیں بالاتر تھیں۔

جب کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ایسے افراد اپنی اصلاح کر کے صاف ستھرا ادب تخلیق کرتے۔ رشید حسن خاں کے خلاف ایسی تحریریں بھی سامنے آئیں جن میں ناروا اعتراضات تنقیص کی وادی میں شُترِ بے مہار کی طرح بھٹک رہے تھے۔ اگر انا پرستی، تنگ نظری، تنگ ذہنی، کج فکری کے عفریت کو کچل دیا جائے تو یقیناً ہم کامیابی وکامرانی کی شاہ راہ پر بڑھتے چلے جائیں گے۔ تنقید کی صرف یہاں ایک مثال پیش ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کا مشہور شعر:

کبھی اے حقیقت منتظر، نظر آلباسِ مجاز میں

کہ ہزار سجدے تڑپ رہے، ہیں مری جبیں نیاز میں

اپنے دور کے ناقد اور ماہرِ علم وعروض حضرت علامہ اخلاق حسین دہلوی اس مشہور ومعروف شعر کی تنقید میں رقم طراز ہیں:

''اس شعر میں 'شکست ناروا' کا عیب پایا جاتا ہے۔عبارت کا نامناسب ٹکڑوں میں تقسیم ہونا۔بعض فارسی اور اُردو کی خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے میں ہر مصرعے کے دو ٹکڑے ہو جایا کرتے ہیں۔ایسے اشعار میں اگر کسی لفظ یا فقرے کا ایک حصہ ایک ٹکڑے میں اور دوسرا حصہ دوسرے ٹکڑے میں آئے تو معیوب سمجھا جاتا ہے۔''تڑپ رہے ہیں'' کا پہلا حصہ یعنی ''تڑپ رہے'' پہلے ٹکڑے میں اور دوسرا ٹکڑا یعنی ''ہیں'' دوسرے ٹکڑے میں آتا ہے جو معیوب ہے۔''

(میزانِ سخن، صفحہ 58، جدید ایڈیشن 2012، مطبوعہ دہلی)

اب اگر ہم شور مچانے لگیں کہ علامہ اقبالؔ کے شعر میں کمی نکال دی، یہ غلط کیا۔تو یہ درست نہ ہوا۔کیوں کہ عیب عیب ہے خواہ کسی سے سرزد ہو۔ادبی نثر اور ادبی شاعری ہر عیب سے پاک ہونی چاہیے۔ادب کا یہی مقصد ہے اور رشید حسن خاں مرحوم نے یہی کیا ہے۔

ابراہیم افسر نے اس ادبی دستاویز میں یہ خاص اہتمام کیا ہے کہ جو مضمون جس عنوان کے تحت جس جگہ سے جس رسالے میں جب شائع ہوا تھا اُسی حوالے کے ساتھ شامل کیا ہے۔اگر ایک مضمون تین جگہ شائع ہوا ہے تو وہ تینوں حوالے مکمل طور پر موجود ہیں۔موصوف کا یہ عمل تعریف کے قابل ہے اور یہ طریقہ کار نیک نیتی، پاکیزہ نفسی، جذبۂ صداقت، تحقیقی رجحان اور ادبی ایمان داری کی بہترین مثال ہے۔احقر، موصوف کے جذبۂ تحقیق سے متاثر ہے۔جب اگست 2014 میں احقر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ صوبہ بہار گیا تو ابراہیم صاحب کا جذبۂ تحقیق پیشِ نظر تھا۔اس لیے تحقیق و تلاش کے بعد لائبریری کے خزانے سے مندرجہ ذیل گوہر یک دانہ تھے، کی شکل میں موصوف لے آیا تھا۔

(1) رشید حسن خاں کا مضمون ''منشائے مصنف کا تعین'' مطبوعہ 1981

(2) رشید حسن خاں کا مضمون ''کچھ بہار لغت کے بارے میں'' مطبوعہ 1985

(3) رشید حسن خاں کا مضمون ''تدوین متن کے مسائل کے بارے میں'' مطبوعہ 1981

(4) سید مشہود جمال کا مضمون ''رشید حسن خاں: کچھ یادیں کچھ باتیں'' مطبوعہ جولائی 2014

جب یہ دستاویز زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئے گی تو انشاءاللہ تعالیٰ احقر کو یقین ہے کہ خوب پذیرائی حاصل کرے گی۔

احقر نے اپنے تاریخی مقالے ''وقف منصبیہ میرٹھ کے آدمِ ثانی: حضرت شوقؔ سہارن پوری'' کے لیے پیش لفظ تحریر کیا تو ایک جگہ اس میں ضرورتاً مندرجہ ذیل شعر بھی تحریر کیا:

فانوس بن کر جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے ؟ جسے روشن خدا کرے

یہ شعر علامہ اقبالؔ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔احقر نے بھی کبھی اس شعر کے کسی دوسرے خالق کی طرف غور نہیں کیا۔جب پیش لفظ ابراہیم صاحب نے پڑھا تو فوراً بولے ''یہ شعر علامہ اقبالؔ کا نہیں ہے''۔احقر کو حیرت ہوئی۔پھر موصوف نے اپنی ذاتی لائبریری سے خلیق الزماں نصرت صاحب کی کتاب ''برمحل اشعار اور اُن کے ماخذ'' نکال کر میرے سامنے رکھی۔کتاب میں یہ مشہور ومعروف شعر بزرگ شاعر محترم سید محمد نوح شہیرؔ مچھلی شہری مرحوم کا ہے۔خداوندِ عالم موصوف کے اس جذبۂ تحقیق کو مزید پروان چڑھائے اور توفیقات میں اضافہ فرمائے۔آمین ثم آمین۔

اس دستاویز کو تیار کرنے میں موصوف نے بڑی دیدہ وری سے عرق ریزی کی ہے۔جب یہ علمی و ادبی دستاویز منظرِ عام پر آ کر قارئین کرام کے ہاتھوں کی زینت بنے گی تب باشعور و بافہم ادبی حلقے میں قبولیت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔خداوندِ عالم ابراہیم افسر اور ان جیسے جذبۂ تحقیق رکھنے والے محنتی، ایمان دار، زبان وادب سے حقیقی محبت کرنے والے اور ادب کی سچی خدمت کرنے والے ریسرچ اسکالروں اور ان کے مخلص گائیڈوں کو ''ادب مافیہ گروہ'' کے ممبران کی حاسدانہ نظروں سے محفوظ رکھے، آمین۔آخرِ کلام میں احقر ایک نظم پیش کر رہا ہے جسے ''نظمِ توشیح'' کہا جاتا ہے۔''توشیح'' کے لغوی معنی ''آرایش کرنے'' اور ''سجانے'' کے ہیں مگر؟ علمِ بیان میں ''توشیح'' وہ صنف ہے، جس میں اشعار کا پہلا حرف یا مصرعوں کے شروع کا ایک ایک لفظ لینے سے کوئی عبارت تشکیل پاتی ہے۔احقر کی ''نظمِ توشیح'' میں 26 اشعار ہیں۔اس نظم کے تمام اشعار کے پہلے تمام مصرعوں کے پہلے حروف جوڑنے سے ''رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں'' جملہ بن جائے گا۔''آئینے'' لفظ کی رعایت سے ہی اس نظم توشیح کی ردیف ''آئینہ'' اختیار کی گئی ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

نظمِ توشیح

راہِ رشید علمی صداقت کا آئینہ
کارِ رشید خدمتِ ملّت کا آئینہ

تھے پاسبانِ علم بھی شہرِ ادب کے وہ
اُن کا قلم تھا علمی امانت کا آئینہ

یہ بات بھی ہر ایک نے مانی ہے جا بجا
فن میں رشید کا تھا قیادت کا آئینہ

درکار اُن کے علم کو حقانیت رہی
روشن اِسی سبب سے ہے خدمت کا آئینہ

حاذق تھے اپنے دور کے علم وشعور میں
اُن کو دکھائے کون؟ خجالت کا آئینہ

سادہ تھی اُن کی زیست یوں سادہ مزاج تھے
کردار تھا جہاں میں شرافت کا آئینہ

نادم ہمیشہ اُن سے رہے پیکرِ ریا
توڑا ہمیشہ کبر و جہالت کا آئینہ

خاروں میں بھی کھلائے ہیں علم وعمل کے گُل
گلشن ہوا ادب کا ،بشاشت کا آئینہ

افسر،ادب کے حلقے نے تسلیم کر لیا
تنقید آپ کی ہے قیادت کا آئینہ

نقد ونظر میں واقعی اِک چھاپ چھوڑ دی
ہے ذات اِس کمال میں وحدت کا آئینہ

ہے ہر سخن میں آپ کی تحریر لا جواب
ہر ایک دستاویز متانت کا آئینہ

حالت خراب ہو گئی کمتر ادب کی آج
دیکھا جو اُس نے علمی جلالت کا آئینہ

رہنا پڑا ہر ایک کو اپنی حدود میں
ٹھہرا جو اُن کے سامنے جدّت کا آئینہ

یہ بھی ہوا کہ علم کا ہم سر ہوا ہے جہل
دیکھا پھر اُس نے اپنی ندامت کا آئینہ

رفعت رشید کی عیاں علم وعمل سے ہے
تحریر بن گئی ہے حقیقت کا آئینہ

وارفتگی غرور کو اُس دم ہوئی بہت
جب علم نے دکھایا مذمّت کا آئینہ

نادانیاں معاف کیں،اہلِ کمال کی
ہر ایک کو دکھا یا محبت کا آئینہ

کس بل نکالے جہل کے،علمی شعور کے
اہلِ ہُنر نے پایا اعانت کا آئینہ

یک جانہ ہوں گے گوہر وسنگ اس جہان میں
قائم ہوا ہے علمی نجاست کا آئینہ

آزادیِ ضمیر کا سودا نہیں کیا
ظلمت کدے میں ایسا تھا ہمت کا آئینہ

یہ علم وفن میں پختگی آئی ہے اِس لیے
دیکھا رشیدِ حق نے ریاضت کا آئینہ

نام ونشان رہتا ہے اُس کا جہان میں
رکھتا ہے جو بھی علمی طہارت کا آئینہ

یکتائے روزگار تھے اہلِ شعور میں دیکھا
دیکھانہ علم وفن میں خیانت کا آئینہ

ماحصل،یہ رشید کے فن کا کمال ہے
رکھا ہمیشہ سامنے عزت کا آئینہ

یلغار کو بھی سہہ گئے، اہل فنون کی
تھی شخصیت کمالِ ذہانت کا آئینہ

ناسخ،رشید علم کے میدان میں رہے
یوں ہیں انیسؔ آج بھی صولت کا آئینہ

— انیس احمد حسینی انیسؔ میرٹھی

17اکتوبر2017،بہ روز سہ شنبہ

کیفیت

خان صاحب رشید کی رحلت
دے گئی دائمی غمِ فرقت
دل کو تسکیں نہیں کسی صورت
کس قدر ہے جاں گُسل ہے ہر ساعت
اُن کے جیسا کہاں سے پائیں گے
ہم نواؤں کی ہے عجب حالت
اُن کا سب احترام کرتے تھے
سب کی نظروں میں تھی اہمیت
اپنی نکتہ شناسیوں کے سبب
ان کو حاصل تھی عالمی شہرت
وہ محقق بھی تھے مدون بھی
فخرِ ہندوستاں تھی شخصیت
اہل دانش پہ خوب روشن ہے
''اُردو املا'' سے ان کی علمیت
کچھ ستائش، نہ کچھ صلہ چاہا
بے نیاز انہ پائی تھی فطرت

(ساغؔر وارثی شاہ جہاں پوری ماہ نامہ نیادور، لکھنؤ، جلد:62، نمبر:9، دسمبر 2007، صفحہ 7)

شخصیت

کچھ اپنے بارے میں

رشید حسن خاں

میرے اُستادوں میں قابل ذکر نام مفتی مجتبٰی حسن خاں صاحب (شاہ جہاں آبادی) مغفور و مرحوم کا ہے، جن سے میں نے عربی پڑھی تھی اور میری تربیت میں نمایاں حصہ انھی کا رہا ہے۔ اساتذۂ معنوی کی حیثیت سے شیرانی مرحوم، قاضی عبدالودود صاحب، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم اور مولانا عرشی مرحوم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی تحریروں سے میں نے صحیح معنوں میں تحقیق اور تدوین کے آداب سیکھے۔ لیکن ان سب سے مقدم نام نیاز فتح پوری کا ہے۔ جن کی تحریروں سے ابتدا ہی میں بہت کچھ سیکھا، تشکیک اور خطائے بزرگان سمجھنے کا سبق پہلے سے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب تحقیق کے باضابطہ طالب علم کی حیثیت سے شیرانی صاحب اور قاضی صاحب کی تحریروں سے استفادہ کیا تو نیاز صاحب کا طلسم ٹوٹ گیا لیکن جو ابتدائی نقوش مرتسم ہو گئے تھے وہ اب تک کچھ نہ کچھ نمایاں ہیں۔ روایت سے بغاوت اور تشکیک ان میں خاص کر شامل ہیں اسی لیے میں نیاز صاحب کا بہت قائل رہا ہوں۔ کچھ دنوں تک تو معتقدانہ انداز رہا، لیکن پھر وہ بات تو نہیں رہی، رہ بھی نہیں سکتی تھی، لیکن قائل آج بھی ہوں۔ ناقدین میں (بعض اختلافات کے باوجود) میں کلیم الدین احمد کی بہت عزت کرتا ہوں اور ان کی تحریروں کو بہت توجہ سے پڑھتا ہوں۔ سرور صاحب کے مطالعے اور ذہانت کا میں قائل ہوں لیکن ان سے بس شکایت یہ ہے کہ انھوں نے تنقید کو انشائیے سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ تنقید کا رنگ دب سا گیا ہے اور منافقانہ انداز بیان کے لیے بڑی گنجایش پیدا ہو گئی ہے۔ احتشام صاحب سے بہ حیثیت انسان میں بہت متاثر تھا، ایسے شریف انسان بہت کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی تنقیدی نگارشات سے کبھی متاثر نہیں ہو سکا۔ خواجہ احمد عباس کی فلموں کی طرح وہ مجھے بے اثر محسوس ہوتی رہیں۔ البتہ مجنوں صاحب کے ذوق اور کلاسیکی ادب کے مطالعے سے ہمیشہ متاثر رہا۔ ناقدین میں کم لوگ شعر کے معاملہ میں مجنوں صاحب کی طرح خوش ذوق ہوں گے۔ ایسا رچا ہوا شعری ذوق کم ملتا ہے۔

❖ ❖ ❖

مقدمہ انتخاب ناسخ بھی ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں پہلی بار یہ کہا گیا ہے کہ ناسخ سے اصلاح زبان کی جس تحریک کو منسوب کیا جاتا ہے وہ درست نہیں۔ یہ دراصل ان کے تلامذہ کے کارنامے ہیں جن کو محض سلسلۂ نسب درست کرنے کے لیے ان سے منسوب کر دیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا کہ ناسخ کا جو کلیات چھپا ہے، اس میں مرتبِ کلیات اور تلمیذ ناسخ میر علی اوسط رشکؔ نے بہت کچھ ترمیم اور اصلاح کی ہے۔

فسانۂ عجائب کی تدوین، یہ کتاب 700 صفحات پر مشتمل ہے۔ نصابی متن کی تدوین نو کی مثال کے طور پر اس کو مرتب کیا گیا ہے اس میں اعراب کا خاص طور پر التزام کیا گیا ہے اور ضمیموں میں اعراب اور دوسرے متعلقات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ ضمیمے کم و بیش چار سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس متن کی تیاری میں تین سال سے زیادہ عرصہ لگا ہے۔ یہ کتاب شعبۂ اُردو کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔

مشاغل میں سرِ فہرست اسپورٹس کو رکھنا چاہیے، [illegible] کو خود کھیلی ہے اس لیے وہ میرا پسندیدہ ترین کھیل ہے اس کھیل میں جو فن کارانہ دقت پسندی ہوتی ہے میں اس کا

عاشق ہوں۔اس کے باسکٹ بال، والی بال اور فٹ بال کا نمبر ہے۔ میں اپنے وقت کا زیادہ حصہ ان کھیلوں کو دیکھنے میں صرف کرتا ہوں۔

ابتدائی تعلیم عربی مدرسے میں ہوئی تھی۔اور درسِ نظامی کے طالب علم کی حیثیت سے شعور نے بالیدگی پائی تھی۔اچانک 1941 میں ٹریڈ یونین کے دائرے میں آ گیا۔میرے شہر شاہ جہاں پور میں اس زمانے کی بہت بڑی آرڈیننس فیکٹری تھی۔جس میں تیس ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے۔اس فیکٹری میں پہلی بار چھپ چھپا کر مزدوروں کی یونین بنالی گئی اور پھر 33 دن کی ہڑتال ہوئی۔یہ 1945 کی بات ہے۔میں اس یونین کا جوائنٹ سکریٹری تھا۔اس دوران میں یوپی کے بیش تر لیڈروں اور کمیونسٹ پارٹی کے ذمہ داروں کو قریب ہو کر دیکھنے کا موقع ملا۔اور جس قدر ان سے قریب ہوتا گیا اسی قدر ذہنی طور پر ان سے دور ہوتا گیا کیوں کہ ان سب کے دہرے کردار کا بازی گر پایا۔چھل، فریب سے ناآشنا اور جوڑتوڑ سے بیگانہ جی توڑ کر کام کرتے تھے اور سب کچھ لٹا دینے پر تُلے ہوئے تھے۔دوسری طرف ہم کو جو ملے تھے وہ اپنے سے اوپر والے لیڈروں کے کٹھ پتلی تھے اور دنیاداری، دنیا طلبی، مفاد پرستی اور پُر فریب باتیں کرنے میں ماہر تھے۔اب محسوس ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ورکر تو نچلے درجے سے نکل کر آیا تھا، لیکن اس کا لیڈر اوپر کے طبقے سے نکل کر آیا تھا اور اپنے ساتھ اپنے طبقے کے سارے تضاد لے کر آیا تھا۔

عرض کہ جس قدر حقیقت کھلتی گئی اسی قدر ورکروں میں اور لیڈروں میں خلیج بڑھتی گئی اور آخر کار مجھ جیسے، ناآشنائے مکرِ سیاست بالکل الگ ہو گئے۔ان دنوں ایسے تلخ تجربے ان رہنماؤں کے ہوئے تھے کہ آج تک ان کی یاد باقی ہے۔میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ صورت حال رونما نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں بھی آج ترقی پسندی کا لیبل لگائے ہوئے ہوتا۔ترقی پسند تحریک سے بچنے کی ایک وجہ یہ بھی پیدا ہو گئی کہ میں نے تنقیدی کتابیں پڑھنے سے پہلے وہ ادب پڑھا تھا اور اسی نے مجھے محفوظ رکھا۔دوسری بات یہ تھی کہ فارسی شاعری اور کلاسیکی اُردو ادب کی مطالعے نے ذہن میں ذوق اور معیار کا ایک تصور ضرور پیدا کر دیا تھا، جس نے صحافت، نعرے بازی اور ادب میں فرق کرنا سکھایا تھا اور فرد کی حیثیت اور شخصیت کے دائرے کی وسعت سے آشنا کیا تھا۔

میں 22-23 سال سے دہلی میں ہوں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہاں کس شخص کی اصلی رائے کیا ہے۔اس کے برخلاف آپ میرے چھوٹے سے شہر میں چلیے۔پانچ منٹ میں معلوم ہو جائے گا کہ کس شخص کی اصلی رائے کیا ہے۔خاندانی روایت، نسلی اثرات اور مقامی خصوصیات نے شروع ہی سے صاف گوئی کا عادی بنا دیا تھا۔اسی نے تحقیق کی طرف متوجہ کیا اور اس میدان میں آ کر مجھے طبعی مناسبت کا اندازہ ہوا۔لغت، زبان کے مسائل، عروض اور قواعد زبان جیسے موضوعات شروع میں میرے پسندیدہ موضوع تھے۔ادبی تحقیق سے بھی تعلق خاطر تھا لیکن کچھ کم۔1960 سے اس طرف زیادہ توجہ مبذول ہوئی۔شیرانی مرحوم کی تحریریں اولین رہنما کی حیثیت سے پیش نظر رہیں۔اور پھر قاضی عبدالودود صاحب کی تحریروں نے متاثر کیا۔ان دونوں کے یہاں سچ کو جھوٹ سے الگ کرنے کا جو انداز تھا، اس نے مجھے متاثر کیا۔اسی طرح ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کی تحریروں نے بھی عرفان کی نئی روشنی بخشی۔

ادبی تحقیق اب میرا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔میں اُس تنقید کا قطعاً قائل نہیں۔جس میں انشائیہ نگاری کا انداز ہو اور وہ اسلوب ہو جو منافق کی سخن آرائی کا ہوتا ہے۔اس طرح میں اس تحقیق کو مکر شاعرانہ کا بدل سمجھتا ہوں جس میں صاف گوئی کے بجائے لیپنے پوتنے کا انداز ہو۔چوں کہ حالات نے اب بیش تر افراد کو دنیاداری کے پھیر میں مبتلا کر رکھا ہے۔اس لیے تحقیق کا یہ سادہ اور صاف انداز اُن کو پسند نہیں آتا اور اس کے لیے ان حضرات نے منفی انداز نظر کی ایک اصلاح وضع کی ہے۔مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جھوٹ کو جھوٹ کہیں اور دوٹوک انداز میں رائے ظاہر کریں وہ تو منفی انداز والے ہوئے۔اور جو لوگ ادب کے نام پر تجارت کو اور جہالت کو فروغ دیں، وہ مثبت انداز نظر والے ہوئے۔آپ چور کو چور کہیں تو وہ بہت واویلا مچائے گا۔یہی حال ان تاجرانِ ادب کا ہے۔

میں صاف، سادہ اور واضح اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دل چسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں گے یا منفی۔ایسی فضول اصطلاحوں سے میں بہت دور رہنا چاہتا ہوں۔مجھے سچ کی تلاش ہے۔مجھے شخص سے دل چسپی نہیں۔اس نے جو کچھ کہا ہے یا لکھا ہے، اُس سے دل چسپی ہے۔جھوٹ کوئی بھی بولے، وہ جھوٹ ہے۔میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں۔آج کل علم و ادب کو جس اسیری کے جال سمجھائے ہیں، گروپ بندی نے جس طرح دائرے بنائے ہیں اور دانش گاہوں میں جس انداز سے تحقیقی مقالوں کے نام پر کم سوادی کے اعلاترین نمونے تیار کیے جا رہے ہیں۔ان کا تقاضا ہے کہ تحقیق اپنی صاف گوئی اور صاف بیانی کے دائرے کو وسیع کرے۔سچ واقعتاً کڑوا ہوتا ہے، اور تحقیق کا مقصد سچ کی تلاش ہے اس صورت میں اگر تحقیق نگارشات میں سچ کی تلخی شامل ہو تو اس کی شکایت نہیں کی جانا چاہیے۔اگر علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کے نام سے، ایک کثیر رقم صرف کرنے کے بعد اور بہت دھوم دھڑکے کے ساتھ ایک ایسی کتاب پیش کی جائے جس کو پشتارۂ اغلاط کہنا مناسب ہو گا اور کوئی شخص یہ بتائے کہ یہ کتاب مقالہ نگاروں اور مرتبین کی آسان پسندی اور بے پروائی کا شاہ کار ہے اور اس کے اندراجات اس قابل نہیں کہ انھیں معتبر قرار دیا جا سکے، تو اس میں شکایت کی بات کیا ہے؟ یہ عجیب بات ہے کہ ہم بے ایمانی کرنے والے کو تو کچھ نہیں کہنا چاہتے اور اگر کوئی شخص اس بے ایمانی کا پردہ فاش کرے تو اسے منفی انداز نظر کی نمائش قرار دینا چاہتے ہیں۔

تحقیق کو سچ کی تلاش رہتی ہے۔جھوٹ کس نے بولا، یہ بھی ایک بات ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ جھوٹ کیوں بولا گیا، اور کیسے بولا گیا، اور کیسے بولا گیا۔اس 'کیوں'' اور ''کیسے'' کی تلاش اور وضاحت تحقیق کا اصل مقصد ہے اور یہی میرا مشغلہ ہے۔

(رسالہ اظہار 5، بمبئی، پانچویں کتاب، ترتیب باقر مہدی، جنوری 1984، صفحہ 19 تا 23)

☆☆☆

ابراہیم افسر

رشید حسن خاں کی سوانح و شخصیت

شاہ جہاں پور کا تاریخی پس منظر

شہیدوں کی نگری، سرفروشوں کی دھرتی، عالموں فاضلوں کی بستی، شاعروں کی سرزمیں اور ادیبوں کی آماج گاہ شاہ جہاں پور ہے۔ یہی وہ شہر ہے جسے تہذیبی، سیاسی اور ثقافتی اور ادبی وقار اور افتخار کا مرتبہ حاصل ہے۔ اس خطۂ ارض میں تہذیبیں پروان چڑھیں، علم و عرفان کے چراغ روشن ہوئے، شعر و ادب کے اساتذہ نے اس شہر میں آنکھیں کھولیں۔

شاہ جہاں پور اُتر پردیش کا ایک اہم اور تاریخی ضلع ہے۔ شاہ جہاں پور دو ندیوں گرّہ اور کھنوت کے درمیان آباد ہے۔ یہ ایک زرعی علاقہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ شہر قالین سازی کے لیے بھی مشہور ہے۔ اس کے باوصف یوپی کا یہ ضلع اپنے علمی، تحقیقی اور تنقیدی کارناموں کے لیے بھی پورے ہندوستان میں منفرد شناخت اور شہرت رکھتا ہے۔ آزادیٔ ہند سے پہلے یہاں انگریزی حکومت نے آرڈینینس کلودنگ فیکٹری (Ordinance clothing factory) یا ''درزی خانہ'' کے نام سے ایک فیکٹری قائم کی تھی جس میں فوجیوں کے لباس تیار کیے جاتے تھے۔ یہ فیکٹری آج بھی اسی شہر میں قائم ہے۔

اس درزی خانہ کی بھی اپنی ایک منفرد تاریخ ہے۔ 1879 میں بنگال کے انگریز گورنر ایشلے ایڈن نے ایک حکم نامہ کے ذریعہ 3 درزی خانے بمبئی، مدراس اور علی پور میں قائم کیے تھے۔ 1914 میں علی پور کے درزی خانہ کی ایک شاخ تجربہ کے طور پر ایک سال کی مدّت کے لیے شاہ جہاں پور میں قائم کی گئی اور اس کا نام Army Clothing Factory, Shahjahanpur رکھا گیا، لیکن 1925 میں علی پور کے درزی خانہ کو مکمل طور پر بند کر کے اس کے دفاتر اور ملازمین کو شاہ جہاں پور مستقل طور پر منتقل کر دیا گیا۔

شاہ جہاں پور کی علمی حیثیت اس واقعہ سے واضح ہو جاتی ہے کہ اس شہر میں سرسید احمد خاں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دسواں اجلاس 1895 میں منعقد کیا جس میں یہاں کے عوام نے سرسید کی تعلیمی پالیسیوں سے والہانہ محبت کا نہ صرف اظہار کیا بل کہ ان تعلیمی پالیسیوں کی خوب حمایت بھی کی۔ اس تاریخی جلسہ میں ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی نظم پڑھی جس کا ایک بند اس طرح سے ہے:

نچا مارا ہے یکسر کیا عرب اور کیا عجم سب کو
خدا غارت کرے اس اختلاف دین و مذہب کو
عجب بد عقل ہے انساں کہ بایں دعویِ دانش
ہزاروں سال سیکھا پر نہ سمجھا اصل مطلب کو
زمانے نے بہت سفاکیاں مذہب کی دیکھی ہیں
اگر شک ہو تو تم بھی آزما دیکھو مجرّب کو

(اُردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، ڈاکٹر منظر اعظمی، صفحہ 232، اُردو اکادمی لکھنو، 2009)

شاہ جہاں پور کو شہرت، مقبولیت اور اہمیت اس وقت حاصل ہوئی جب آزادیٔ وطن کی چنگاری شعلۂ جوّالہ کی صورت اختیار کر گئی۔ جنگِ آزادی میں انگریزوں کی نیندیں حرام کرنے والوں میں اشفاق اللہ خاں، حسرتؔ وارثی، پنڈت رام پرساد بسمل، ٹھاکر روشن سنگھ، پریم کرشن کھنہ، بنواری لال اور جگدیش بنارسی کا تعلق اسی سرزمیں سے ہے۔

اُتر پردیش میں شاہ جہاں پور کو یوں بھی افتخار حاصل ہے کہ یہاں اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی کے بہت سے قلم کاروں نے جنم لیا۔ مثلاً ہندی کے ڈرامہ نگار بھوتیشور، ہندی ناول نگار ہردیش اور انقلابی شاعر دورو ہیؔ وغیرہ نے اسی سرزمین کو اپنا کارزار بنایا۔

بنانے کے لیےاس کا نام''شاہ جہاں پور'' رکھا تھا۔اس ضلع کی تحصیلیں کانٹھ، کٹرا،تلہر، جلال آباداور پوایاں ہیں۔شاہ جہاں پور کی تاریخ کے حوالے سےفہیم بسمل نے اپنی کتاب ''نظریات''میں جو بات لکھی ہے وہ اس طرح ہے:

''شاہ جہاں بادشاہ کے جواں سال سپہ سالار عمدۃ الملک نواب ابدال خاں المخاطب بہ نواب بہادر خاں چغتہ کی کاوشوں سے شاہ جہاں پور وجود میں آیا۔ بہادر خاں ایک دلیر سپہ سالار تھا اور اس علاقہ کی آب و ہوا سے متاثر ہوکر اسے آباد کرنے کا ارادہ بنایا۔ اس نے اپنے وطن افغانستان سے 52 قبیلے یہاں لاکر آباد کیے۔ ہر قبیلےکوالگ الگ آباد کیااور ہر قبیلے کے نام پر محلے منسوب کیے۔مثال کےطور پر ایمن زئی، باڑوزئی،نصرزئی،محمدزئی،علی زئی وغیرہ۔''

(نظریات،صفحہ 25،فہیم بسمل،تخلیق کار پبلشرز،لکشمی نگر، دہلی، 2012)

علم وادب کا چرچا اورشعروشاعری کا غلغلہ یہاں 1857 کے''غدر'' کے بعد بھی قائم رہااور آج بھی اس شہر میں شعروشاعری کے علاوہ ادب، تاریخ، تحقیق، تنقید کا بازار گرم ہے۔شاعری کے علاوہ شاہ جہاں پور کو پوری اُردو دنیا سے متعارف کرانے والوں میں رشید حسن خاں کا نام اور کام بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔رشید حسن خاں ایک منفرد محقق، مایہ ناز نقاد اور صفِ اوّل کے مدوّن تھے۔

خاندانی پس منظر

رشید حسن خاں کے دادا علی حسن خاں انگریزی فوج میں ملازم تھے۔ان کا تعلق پٹھانوں کے مشہور خاندان یوسف زئی سے تھا۔آپ کے والد محترم کا نام امیر حسن خاں تھا۔ یہ انگریزی پولس میں سب انسپکٹر تھے۔تحریک آزادی کے دوران گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک اور عالموں اور مولویوں کی تقاریر سے متاثر ہوکر وہ محکمۂ پولس سے نوکری چھوڑنے پر آمادہ ہوگئے۔لیکن دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کے سمجھانے اور بجھانے پر استعفیٰ کے بجائے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لیا۔امیر حسن خاں ایک کٹر قوم پرست آدمی تھے۔ان کو انگریزی تعلیم سے سخت نفرت تھی۔ساتھ ہی ان کے اندر مذہبی کٹر پن بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔اس کی وضاحت پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے اپنے مضمون''رشید حسن خاں تحقیق وتدوین کا مردمیداں''میں اس طرح سے کی ہے:

''امیر حسن خاں طبیعت کے بہت سخت تھے۔دل کے بہت صاف اور سخی تھے۔مگر نرمی کا اظہار بہت کم ہوتا تھا۔وہ کٹر دیوبند کے مخالف تھے۔جب رشید حسن خاں نے قرآن پاک ختم کیا تو ان کے اُستاد نے اپنا باترجمہ ذاتی نسخہ بطورانعام انھیں دیا۔ یہ مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمۂ قرآن تھا۔خوشی خوشی گھر آکر بتایا کہ مولوی صاحب نے یہ قرآن شریف انعام میں دیا ہے۔امیر حسن خاں نے جو کھول کر دیکھا تو بقول رشید حسن خاں:''چہرے کارنگ بدل گیا''بل کہ بگڑ گیا۔انتہائے غضب میں کہنے لگے اس وہابڑے کا ترجمہ میرے گھر میں بھیجا گیا ہے۔مگر کیا کرتے قرآن شریف کی بے ادبی نہیں کرسکتے تھے۔کچھ دیر بل کھاتے اور بڑبڑاتے رہے پھر والدہ کو آواز دی۔قینچی لاؤ۔وہ لے آئیں۔میری آنکھوں کے سامنے سارے حاشیے کاٹ کر چولھے میں جلا دیے اور اس پر بل کھاتے رہے کہ ترجمہ تو باقی رہ گیا اس میں کچھ نہیں کرسکتے تھے۔''

(مجلّہ بازیافت، رفیع الدین ہاشمی،صفحہ 3، لاہور، 2002)

امیر حسن خاں کی 6 اولادیں ہوئیں جن میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔بیٹوں میں بشیر حسن خاں، رشید حسن خاں اور سعید حسن خاں اور بیٹیوں میں ابین بیگم، حمیدن بیگم اور رضین بیگم تھیں۔

ولادت

میرٹھ کالج میرٹھ کے سابق صدر شعبۂ اُردو اور شاہ جہاں پور سے ہی تعلق رکھنے والے ڈاکٹر خالد حسین خاں نے رشید حسن خاں کا خاکہ تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''چمپئی رنگ جو عالم شباب میں سرخ اور سفید رہی ہوگی، بھرا بھرا جسم، کشیدہ قامت، چوڑا چکلا سینہ، اونچی ستواں ناک (جو پورے شاہ جہاں پور کی ناک ہے) کشیدہ جبیں، سر پر سلیقہ سے سنورے بال، جن پر بیتے موسموں کی برف نمایاں ہے۔دبیز شیشوں والوں چشمے کے شیشے غور وفکر اور خلوص سب مزین عقابی آنکھیں، پروقار متبسم کتابی چہرہ، صحتِ تلفظ کا وہ عالم گویا لفظوں کو ہمہ وقت پرکھتے رہتے ہوں۔زبان و بیان کی کلاسیکی روایت کے امین، تحقیق و تدوین کے مردِ میداں، تہذیب وشائستگی اور شاہ جہاں پور کے افغانی جلال و جمال کی جو شخصیت ہمارے روبرو آتی ہے وہ ہے جناب رشید حسن خاں۔''

(ادبی تحریریں، ڈاکٹر خالد حسین خاں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2011، صفحہ 57)

رشید حسن خاں کی ولادت تعلیمی اسناد کے مطابق، 10 جنوری 1930 کو شاہ جہاں پور(اُترپردیش) میں پٹھان خاندان میں ہوئی۔ان کے محلے کا نام باڑوزئی ہے ،لیکن ان کی تاریخ ولادت جو کاغذی اسناد میں درج ہے غیر معتبر ہے۔کیوں کہ ان کی اصل تاریخ ولادت 25 دسمبر 1925 ہے۔اس بات کی تصدیق کئی رسائل وکتب سے ہوتی ہے جن میں رشید حسن خاں کی اصل تاریخ ولادت 25 دسمبر 1925 ہی درج ہے۔ چوں کہ خود رشید حسن خاں بھی کئی مواقع پر اس بات کی تردید زبانی وتحریری کرچکے ہیں۔زبانی تردید کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کے مضمون''ممتاز محقق اور متنی نقاد، رشید حسن خاں'' کا یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

''آگے بڑھنے سے پہلے میں خاں صاحب کی ابتدائی زندگی کے حالات بیان کردوں۔ شاہ جہاں پور میں ایک صاحب تھے امیر حسن خان، یہ خاں صاحب کے والد تھے۔ تعلیمی اسناد کے مطابق خاں صاحب 10 جنوری 1930 کو پیدا ہوئے مگر انھوں نے ہمیں بتایا تھا کہ ان کی تاریخ ولادت میں سنہ غلط لکھا گیا ہے۔ یہ سنہ 1930 نہیں، 1925 تھا۔''

(ہماری زبان، رشید حسن خاں نمبر یکم تا 28 دسمبر، 2006، صفحہ 3، شمارہ نمبر 36, 35, 34, 33 جلد نمبر 65)

رشید حسن خاں کی تاریخ ولادت کے متعلق ڈاکٹر ٹی آر رینا (جموں) اپنی کتاب رشید حسن خاں کے خطوط (جلد اول) میں یوں رقم طراز ہیں:

''رشید حسن خاں کی ولادت شاہ جہاں پور کے پشتینی مکان میں ہوئی۔ تعلیمی اسناد میں ان کی تاریخ ولادت 1930 ہے۔ اس کی تصدیق ان کے سوانحی کوائف سے ہوتی ہے جو ''شاعر'' ممبئی کے ہم عصر اُردو ادب نمبر جلد۔1، 98-1997 کے ضمیمے کے صفحہ 194 پر درج ہیں، جسے ڈاکٹر شمس بدایونی نے اپنے مضمون ''رشید حسن خاں کی یاد میں ہفت روزہ'' ہماری زبان دہلی کے ''رشید حسن خاں نمبر یکم تا 28 ستمبر 2006 کے شمارہ نمبر 36, 35, 34, 33 جلد نمبر 65 کے صفحہ 31 میں درج کیا ہے۔

''جموں یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں خاں صاحب تین بار تشریف لائے۔ ایک ملاقات کے دوران راقم نے ان سے تاریخ ولادت کے بارے میں پوچھا تھا تو انھوں نے پروفیسر شیام لال کالڑا، عابد پیشاوری اور ڈاکٹر ایم ایل پروآنہ کی موجودگی میں یونی ورسٹی گیسٹ ہاؤس کے اپنے کمرے میں اپنی تاریخ پیدائش 25 دسمبر 1925 بتائی تھی۔ راقم اور پروآنہ ہر سال انھیں اسی تاریخ پر مبارک باد کے خط لکھا کرتے تھے۔ راقم کبھی کبھی بذریعہ تار بھی مبارک باد کا پیغام بھیج دیا کرتا تھا۔ ہاں پروآنہ صاحب انھیں کبھی کبھی جنم دن مبارک کا کارڈ بھیج دیا کرتے تھے۔ اگر ان کے ہاں سے خطوط ضائع نہ ہوئے ہوں تو اس بات کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ راقم نے ان کے فرزند خورشید حسن خاں سے بذریعہ خط دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ خاں صاحب کو خط محفوظ کرنے کا شوق نہیں تھا۔ مگر مجھے یقین نہیں۔ ان کے پاس مشاہیر ادب اور نئے اسکالروں کے مکتوبات کا ایک بڑا ذخیرہ ہونا چاہئے۔ جن پر الگ سے کام کیا جا سکتا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے راقم انھیں بذریعہ ٹیلی فون جنم دن کی مبارک باد بھیج دیا کرتا تھا ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا حضور آج کرسمس بھی ہے اس کی مبارک باد بھی قبول کیجئے۔ تو آپ ہنس کے جواب دیتے کہ ہاں میاں ہمیں قبول ہے اور خوش ہوتے، ہمیں بہت سی دعائیں دیتے۔'' (قلم سے ''اصلاً'' دسمبر 1925 لکھا ہے)

(رشید حسن خاں کے خطوط مرتب ڈاکٹر ٹی آر رینا، اُردو بک ریویو، نئی دہلی، 2011، صفحہ 21)

اُردو کے اس مایہ ناز محقق، نقاد اور مدون کی تاریخ ولادت کے بارے میں پورے پانچ سال کا امتیاز ہے۔ یہ امتیاز اس لیے بھی آیا کیوں کہ اُس وقت معلم بچے کی قد و قامت کے حساب سے رجسٹر میں نام، پتا اور عمر کا اندراج کر لیتے تھے۔ لیکن خود رشید حسن خاں نے اپنی عمر کی صحیح تاریخ ولادت مشہور عالمی ادبی رسالے ''بازیافت'' مسرت انیس سے قلمی گفتگو کرتے ہوئے یوں بیان کی ہے:

''تعلیمی کاغذات میں تاریخ ولادت 10 جنوری 1930 لکھی ہوئی ہے۔ یہ تاریخ کس نے لکھائی تھی مجھے نہیں معلوم۔ صحیح سال ولادت 1925 ہے۔ دسمبر کا مہینہ، تاریخ کا علم نہیں۔''

(مجلّہ بازیافت، رفیع الدین ہاشمی، صفحہ 157، لاہور، 2002)

تاریخ ولادت کے متعلق خود رشید حسن خاں کے فرزند اکبر خورشید حسن خاں بھی اپنے والد کے قول کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ رشید حسن خاں نے اپنی عمر کے بارے میں کبھی کسی سے طویل گفتگو نہیں کی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ خود رشید حسن خاں کے انٹرویو، ہندوستان اور ہندوستان کے باہر اخبار و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ رشید حسن خاں کی زندگی میں ہی کتاب نما کے دو خصوصی شمارے گوشۂ رشید حسن خاں 1990 اور ''رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات'' جولائی 2002 میں شائع ہو چکے تھے۔ آخر الذکر رسالہ ان کے اسٹڈی ٹیبل پر رکھا رہتا۔ لاہور اورینٹل کالج شعبۂ اُردو کے تحقیقی مجلّہ ''بازیافت'' شمارہ ایک 2002 میں ''کچھ اپنے بارے میں'' مسرّت انیس سے خصوصی گفتگو ان کے سامنے منظر عام پر آ چکا تھا۔

رشید حسن خاں کی عمر کے متعلق ایک اور چونکا دینے والا دعوا ان کے قریبی دوست شبیر عباسی (52، خلیل غربی، شاہ جہاں پور) نے بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ان کے والدین بھی اتنے تعلیم یافتہ نہ تھے کہ میونسپل بورڈ آفس میں اندراج کرایا ہوتا لہٰذا اندازاً 10 جنوری، 1930 درج کر دی گئی جو ہر جگہ یہی لکھی جاتی رہی۔ میرے دریافت کرنے پر صحیح تاریخِ پیدائش 10 جنوری 1925 بتائی تھی۔''

(رسالہ نیا دور، لکھنؤ، جلد 62، نمبر 9، صفحہ 45 تا 46، دسمبر، 2007)

تعلیم

رشید حسن خاں کی ابتدائی تعلیم محلّے کے مولوی صاحب کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ یہ مولوی صاحب ان کے والد محترم امیر حسن خاں کے بھی اُستاد تھے۔ امیر حسن خاں سرکاری اسکولوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔ کیوں کہ وہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔ قرآن پاک مکمل ہونے کے بعد رشید حسن خاں کو شاہ جہاں پور کے مدرسہ بحرالعلوم (قائم 1346ھ) میں داخل کرایا گیا۔ ان دنوں اس مدرسہ کی شہرت عالم گیر سطح پر تھی۔ دور دراز سے طلبہ یہاں حصولِ تعلیم کے لیے آتے تھے۔ مدرسہ کے اُستاد مولوی مجتبیٰ حسین نامور اور جیّد عالم و بزرگ تھے۔ اپنے اُستاد کی شخصیت کا اثر رشید حسن خاں کی ادبی زندگی میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ پانچ برس تک (1934 تا 1939) زیر تعلیم رہے۔ رشید حسن خاں درس نظامی کی تکمیل نہ کر سکے چوں کہ گھر کے مالی حالات اچھے نہ تھے۔ ان کے والد نے پولس کی نوکری سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لیا تھا اور اب ان کو 15 روپے 2 آنے ماہانہ بطور پنشن ملتے تھے۔ جو گھریلو اخراجات کے لیے ناکافی تھے۔ مگر رشید حسن خاں کے اندر تعلیم کا ذوق وشوق پیدا ہو چکا تھا۔ کتابیں خرید کر پڑھنے کی استطاعت ان کے اندر نہ تھی۔ بہادر گنج (خاں صاحب کے گھر سے آدھا کلومیٹر دور) میں واقع شوقین بک ڈپو سے کتابیں کرایے پر لا کر پڑھتے تھے لیکن شوقین بک ڈپو کے مالک صغیر احمد نے ان کے بچپن کے دوست شفیق احمد کے نسبتی برادر ہونے کے سبب ان سے کتابوں کا کرایہ نہیں لیتے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے دوسرے طریقۂ کار پر رشید حسن خاں نے زیادہ زور دیا۔ اسی دوران کچھ دوستوں نے فاضل اور دبیر کامل کے امتحانات پاس کرنے کا مشورہ دیا۔ حکیم سلیم صاحب نے رشید حسن خاں کے فارم بھروائے۔ رشید حسن خاں نے ذاتی طور پر اُردو عربی فارسی بورڈ کے امتحان پاس کیے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر کامل (1949 میں اوّل درجے سے پاس) اور عربی فارسی بورڈ الٰہ آباد (اب اس کا مرکز لکھنؤ میں قائم ہے) سے مولوی کا اُمتحان امتیازی نمبرات سے پاس کیا۔ رشید حسن خاں کے حصولِ تعلیم کے ذوق، شوق اور جنون پر تبصرہ کرتے ہوئے شبیر عباسی لکھتے ہیں:

> ''ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ لؤ، دھوپ کی جلتی دوپہر میں مدرسہ سے پیدل آنا ان کا روز کا معمول تھا۔ اس زمانے میں شاہ جہاں پور میں آمد ورفت کے لیے نہ تو کسی سواری کا چلن ہوا تھا اور نہ ہی بجلی وغیرہ کا کوئی معقول بندوبست تھا۔ سڑکوں پر روشنی کے لیے میونسپل بورڈ کی جانب سے لالٹینیں لگی ہوئی تھیں۔ گھر میں روشنی کے لیے مناسب انتظام نہیں تھا۔ ان کی والدہ پڑھائی کے شوق کو دیکھتے ہوئے کڑوے تیل کے چراغ میں موٹی سی بتی ڈال کر جلا دیتی تھیں۔ دورانِ گفتگو رشید صاحب نے بتایا کہ مجھے جلدی سارے سبق یاد کر لینا پڑتے تھے کہ مبادا چراغ کا تیل ختم نہ ہو جائے۔''

(نیا دور لکھنؤ، جلد 62، نمبر 9، صفحہ 45، دسمبر، 2007)

اس کے بعد رشید حسن خاں نے مدرسہ فیض عام شاہ جہاں پور کے طالب علم کے طور پر جامعہ اُردو علی گڑھ سے ادیب کامل (منعقدہ امتحان ماہ نومبر 1949) اوّل درجے سے پاس کیا۔

ملازمت

گھر میں ذمہ دار فرد ہونے کے سبب گھریلو ذمہ داریاں ان پر سب سے زیادہ تھیں۔ اس لیے دوسری عالمی جنگ کے دوران شاہ جہاں پور کی آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں بڑے پیمانے پر مزدوروں کی بھرتی شروع ہوئی تو رشید حسن خاں بھی محض 14 برس کی عمر میں 1939 میں اس درزی خانہ میں بحیثیت مزدور بھرتی ہو گئے۔ فیکٹری میں تین شفٹوں میں کام ہوتا تھا۔ رشید حسن خاں کو رات کی شفٹ میں کام کرنا پڑتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق شروع سے ہی تھا لہٰذا انٹرول میں جب تمام مزدور آرام کرتے تھے تو رشید حسن خاں ''آبِ حیات'' اور ''طلسمِ ہوش رُبا'' کا مطالعہ کرتے تھے۔ فیکٹری کے مزدور صاحبانِ اختیار کے ظلم وزیادتی اور استحصال کے شکار تھے۔ اس فیکٹری میں رشید حسن خاں کی ٹریڈ یونین سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ یہیں پر ان کو ''کامریڈ'' کے لقب سے نوازا گیا۔ خاں صاحب اور ان کے چند ہم خیال ساتھیوں نے مل کر خاموشی سے ٹریڈ یونین قائم کر لی۔ آرڈیننس فیکٹری میں ایسی سرگرمیوں کی کلی طور پر ممانعت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ بڑی جرأت کی بات تھی۔ رشید حسن خاں اس ٹریڈ یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ شروع شروع میں یونین کے اجلاس گھروں میں میلاد اور کیرتن کے بہانے ہوتے تھے۔ بعد میں ان کی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہونے لگیں۔ 1945 میں اس یونین نے مزدوروں کی حالت زار کے خلاف ہڑتال کرا دی۔ یہ ہڑتال مسلسل 33 دن چلی۔ چوں کہ رشید حسن خاں اس ہڑتال میں پیش پیش تھے اس لیے انھیں اس کی پاداش میں 1946 میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس کی وضاحت خود رشید حسن خاں نے باقر مہدی کے رسالے ''اظہار'' کے شمارہ 50، جنوری 1984 میں یوں کی ہے:

> ''ابتدائی تعلیم عربی مدرسے میں ہوئی تھی اور درس نظامی کے طالب علم کی حیثیت سے شعور نے بالیدگی پائی تھی۔ اچانک 1941 میں ٹریڈ یونین کے دائرے میں آ گیا۔ میرے شہر شاہ جہاں پور میں اس زمانے میں بہت بڑی آرڈیننس فیکٹری تھی جس میں 30 ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے۔ اس فیکٹری میں پہلی بار چھپ چھپا کر مزدوروں کی یونین بنائی گئی۔ اور پھر 34 دن تک ہڑتال ہوئی۔ یہ 1945 کی بات ہے۔ اس فیکٹری میں 1939 میں مزدور کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا اور اب یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھا۔''

(خصوصی شمارہ ''کتاب نما'' مرتبہ اطہر فاروقی، صفحہ 12، مکتبہ جامعہ، جولائی، 2002)

ٹریڈ یونین کے دوران رشید حسن خاں کا رابطہ یوپی کے بعض کمیونسٹ لیڈروں سے ہوا۔ رشید حسن خاں کو ان کا طرز عمل بالکل پسند نہ تھا۔ کیوں کہ یہ لیڈر اپر کلاس (اعلا درجہ) سے تھے اور مزدور نچلے طبقے سے تھے۔ ان دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا۔ رشید حسن خاں نے ان کی کتھنی اور کرنی میں فرق محسوس کیا۔ ان کا نعرہ تھا کہ ''دنیا کے

مزدور ایک ہو جاؤ'' رشید حسن خاں کو اس نعرہ میں کھوکھلا پن اور سیاسی ہتھکنڈہ نظر آتا تھا۔ کیوں کہ ان کی نظر میں ہر ملک اور ہر کارخانے کے اور مزدوروں کے مسائل یکساں نہیں ہوتے۔ پھر وہ سب ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ آخر کار رشید حسن خاں ان لیڈران کے طرزِ عمل سے بد دل ہو گئے۔ اس کی وجہ رشید حسن خاں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اپر کلاس سے آئے تھے۔ ان کی توجہ مزدوروں کے مسائل حل کرنے سے زیادہ پارٹی کی آئیڈیالوجی پھیلانے پر زیادہ ہوتی تھی۔ رشید حسن خاں یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ یونین 1945 کے آخر میں فیکٹری میں ہڑتال کرائی جو کسی بھی آرڈیننس فیکٹری میں پہلی باضابطہ اسٹرائک تھی۔ یہ ہڑتال مسلسل 33 روز تک چلی۔ رشید حسن خاں ہڑتال کرانے والوں میں پیش پیش تھے۔ اس لیے انھیں اس کی پاداش میں ملازمت سے نکال دیا گیا۔ یہ 1946 کی بات ہے۔''

(ہماری زبان خصوصی شمارہ، رشید حسن خاں، تحقیق و تدوین کا مردِ میداں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، صفحہ 36، یکم تا 28 ستمبر، 2006)

ملازمت سے برخاست ہونے کے بعد رشید حسن خاں نے تین چار برس تک متفرق ملازمتیں کیں۔ یہ دور رشید حسن خاں کے لیے مشکلوں سے بھرا تھا۔ خاں صاحب ایک چکی پر منشی رہے، پھر ایک زمین دار کے کارندے کے طور پر دیہی زندگی کا عملی مشاہدہ کیا۔ راشن کی دکان پر منشی گری بھی کی۔ جیسا کہ میں پہلے ہی تحریر کر چکا ہوں کہ رشید حسن خاں میں تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ تھا۔ اس مالی خلفشار کے زمانے میں بھی انھوں نے ''مولوی'' اور ''دبیر کامل'' کے امتحانات پاس کیے۔ اسی دوران خاں صاحب کو 1949 میں مدرسہ ''فیض عام، شاہ جہاں پور'' میں مدرس کا عہدہ حاصل ہو گیا مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ کیوں کہ رشید حسن خاں درسِ نظامی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی اسلامی شعار کا اہتمام نہ کرتے تھے۔ مدرسہ کے مہتمم نے کہا ''آپ کو ڈاڑھی رکھنا پڑے گی۔'' خاں صاحب نے ''رشوت کی ڈاڑھی'' رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ خود رشید حسن خاں نے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''طلبہ نے مہتمم مدرسہ سے یہ کہا کہ اُستادِ محترم تو داڑھی منڈاتے ہیں، بھلا ہم ان سے کیسے پڑھ سکتے ہیں؟ مہتمم صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ داڑھی تو رکھنا پڑے گی ورنہ مخالفت زیادہ ہو گی۔ بات ان کی بجائے خود درست تھی مگر میں نے یہ کہا کہ یہ رشوت کی داڑھی ہو جائے گی کہ نوکری کرنا ہے تو داڑھی رکھاؤ۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں داڑھی کی شرعی حیثیت کا معترف تھا اور ہوں لیکن اس وقت گویا ضد کی بات آ پڑی تھی۔''

(رشید حسن خاں ایک عبقری شخصیت، ڈاکٹر محمد وسیم رضا، صفحہ 18، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013)

مدرسہ فیض عام شاہ جہاں پور میں ہی ان کو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے لیے دوسری جماعت میں بھیج دیا گیا۔ 1953 میں اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول (موجودہ وقت میں انٹر کالج) میں فارسی عربی کے اُستاد کی جگہ خالی ہوئی اور اسی اُسامی پر شہر کے معزز عالم دین مولوی یوسف صاحب بھی اُمیدوار تھے جو اسلامی شعار کی وجہ سے موزوں اور مناسب تھے۔ انھوں نے رشید حسن خاں کی کامریڈ پرستی کا خوب چرچا اور پروپیگنڈا کیا لیکن اللہ کے فضل اور اسکول انتظامیہ کی حمایت سے رشید حسن خاں کی تقرری عمل میں آئی۔ اس ملازمت کے بارے میں اطہر فاروقی نے ایک دل چسپ واقعہ بیان کیا ہے جو اس طرح ہے:

> ''اس ملازمت کے سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ یہ ہے کہ اسلامیہ اسکول کی اس جگہ کے لیے ایک عالم اور مرشد بھی اُمیدوار تھے۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ ایک ایسے شخص کو ملازمت ملنے کا امکان ہے جو کمیونسٹوں کے ساتھ برسوں تک کام کر چکا ہے۔ کمیونسٹ دہریے ہوتے ہیں۔ لازماً یہ شخص بھی بے دین ہو گا۔ شہر کی ایک بڑی مسجد میں انھوں نے بعد نماز جمعہ یہ اعلان کیا کہ یہ شخص جو بے دینوں کے ساتھ رہا ہے اور خود بھی بے دین ہے، اسلامیہ اسکول میں اس کو جگہ نہیں ملنا چاہئے۔ مگر ان کی مشکل یہ تھی کہ شہر کے سب سے معروف عالم مولوی محمد مجتبیٰ خاں (مرحوم و مغفور) جو رشید صاحب کے اُستاد بھی تھے وہ رشید صاحب کے لیے کوشاں تھے۔ یوں مرشد موصوف کی آہ و فغاں بے کار گئی۔ البتہ ان کے اس ''اعلان'' کا اثر یہ ضرور ہوا کہ میجنگ کمیٹی میں جب یہ معاملہ پیش ہوا اور رائے لی گئی تو صرف ایک ووٹ کی بڑھت سے رشید صاحب کو اسکول کی ملازمت مل سکتی تھی۔ مولوی محمد مجتبیٰ خاں صاحب کی کوشش کے نتیجے میں میجنگ کمیٹی کے چیئر مین خان بہادر فضل الرحمان خاں صاحب غیر جانب دار رہے تھے ورنہ صورت حال مختلف ہو جاتی۔''

(خصوصی شمارہ کتاب نما، رشید حسن خاں مرتبہ اطہر فاروقی، صفحہ 10 مکتبہ جامعہ دہلی، جولائی، 2002)

رشید حسن خاں نے بریلی آ کر ہفتہ وار ''ندرت'' میں بھی نوکری کی۔ ہفتہ وار ندرت کے مالک و مدیر سید ابراہیم حسن رسؔا تلمیذ دلؔ شاہ جہاں پوری تھے۔ ان دونوں حضرات نے 1948 کو ہفتہ وار ''ندرت'' کا اجرا کیا تھا۔ خاں صاحب بریلی میں ہونے والے مشاعروں میں اکثر شاعروں کا کلام سننے جاتے تھے لیکن انھوں نے ''ندرت'' سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور واپس شاہ جہاں پور آ گئے۔ رشید حسن خاں بریلی میں 1959 کے وسط تک رہے۔

رشید حسن خاں کی دہلی یونیورسٹی میں تقرری 6 راگست، 1959 کو شعبۂ اُردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کے عہدے پر ہوئی۔ میں یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ اُردو دنیا کی مایہ ناز شخصیت پروفیسر خواجہ احمد فاروقی جو بڑے مردم شناس تھے وہ رشید حسن خاں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بھانپ گئے اور انھیں شاہ جہاں پور کے پرسکون ماحول سے اپنے شعبۂ اُردو کے ساتھی ڈاکٹر قمر رئیس، متوطن شاہ جہاں پور کی وساطت سے دہلی لانے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن وہ درس و تدریس اور شعبۂ اُردو سے وابستہ اس لیے نہ ہو سکے

کیوں کہ ان کے پاس کاغذی اسناد نہ تھیں۔ اس لیے ان کو یونی ورسٹی کی لائبریری میں تحقیق کے شعبۂ میں جگہ ملی۔ یہاں پر رشید حسن خاں عربی اور فارسی کے مخطوطوں کو پڑھتے اور ان کا ترجمہ اُردو میں کرتے تھے۔ اسی شعبہ سے رشید حسن خاں کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ یہیں پر انھوں نے شعبہ کے تحقیقی مجلّے ''اُردوئے معلیٰ'' کی ترتیب وطباعت کا کام بھی کیا۔ اسی مجلّے میں 1961 میں غالبؔ کی فارسی کتاب ''دستنبو'' کا اُردو ترجمہ رشید حسن خاں کا کیا ہوا شائع ہوا۔ شعبہ سے شائع ہونے والی بیش تر کتابوں کی ترتیب کا کام رشید حسن خاں کیا کرتے تھے۔ صدر شعبۂ اُردو خواجہ احمد فاروقی نے ان کو تحقیقی کام کرنے کے لیے تمام طرح کی سہولتیں فراہم کر رکھی تھیں۔ پہلے یہ عہدہ جز وقتی تھا لیکن 1966 میں اسے کل وقتی منظوری حاصل ہوگئی۔ یہاں رہ کر رشید حسن خاں نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جن کے سبب اُردو تحقیق و تدوین کی دنیا میں وہ نہایت مشہور اور محترم ہو گئے اور پوری اُردو دنیا میں ان کی تحقیقی اور تدوینی کارناموں کی دھوم مچ گئی۔

ادبی زندگی کا آغاز

رشید حسن خاں کو رسائل میں لکھنے کا شوق شروع سے ہی تھا۔ ان کی ادبی زندگی کو بام عروض بخشنے والوں میں ان کے مدرسے کے اُستاد مفتی مجتبیٰ حسین خاں کا اہم کردار رہا ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنے ابتدائی زمانے میں نیاز فتح پوری کی تنقیدی تحریروں سے بہت متاثر تھے۔ نیاز فتح پوری کے بعد انھوں نے حافظ محمود خاں شیرانی اور قاضی عبدالودود کے تحقیقی مضامین کا بغور مطالعہ کیا۔ رشید حسن خاں کے اندر تدوینی صلاحیت امتیاز علی خاں عرشی کی تدوینات کو دیکھنے کے بعد پیدا ہوئیں۔ خاں صاحب کو اُردو نقادوں میں کلیم الدین احمد سب سے عزیز تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ کلیم الدین احمد کی دوٹوک باتیں انھیں پسند تھیں۔ کلیم الدین احمد کے بعد موصوف آل احمد سرور کی تنقید کے بھی مداح تھے لیکن ان کی تنقید میں انھیں انشائیہ کا رنگ نظر آتا تھا۔ سید احتشام حسین کی شخصیت سے بھی خاں صاحب بہت متاثر تھے، لیکن ان کی تنقید نے انھیں مایوس کیا۔ مجنوں گورکھپوری کی کلاسکی تنقید کی انھوں نے خوب تعریف کی۔ ان تمام باتوں کا احاطہ خود رشید حسن خاں نے اپنے مضمون ''کچھ اپنے بارے میں'' کیا جو رسالہ اظہار، ممبئی میں شائع ہوا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''میرے اُستادوں میں قابل ذکر نام مفتی مجتبیٰ حسن خاں صاحب (شاہ جہاں آبادی) مغفور و مرحوم کا ہے، جن سے میں نے عربی پڑھی تھی اور میری تربیت میں نمایاں حصہ انہی کا رہا ہے۔ اساتذۂ معنوی کی حیثیت سے شیرانی مرحوم، قاضی عبدالودود صاحب، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم اور مولانا عرشی مرحوم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی تحریروں سے میں نے صحیح معنوں میں تحقیق اور تدوین کے آداب سیکھے۔ لیکن ان سب سے مقدم نام نیاز فتح پوری کا ہے۔ جن کی تحریروں سے ابتدا ہی میں بہت کچھ سیکھا، تشکیک اور خطائے بزرگان سمجھنے کا سبق پہلے سے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب تحقیق کے باضابطہ طالب علم کی حیثیت سے شیرانی صاحب اور قاضی صاحب کی تحریروں سے استفادہ کیا تو نیاز صاحب کا طلسم ٹوٹ گیا لیکن جو ابتدائی نقوش مرتسم ہو گئے تھے وہ اب تک کچھ نہ کچھ نمایاں ہیں۔ روایت سے بغاوت اور تشکیک ان میں خاص کر شامل ہیں اسی لیے میں نیاز صاحب کا بہت قائل رہا ہوں۔ کچھ دنوں تک تو معتقدانہ انداز رہا، لیکن پھر وہ بات تو نہیں رہی، رہ بھی نہیں سکتی تھی، لیکن قائل آج بھی ہوں۔ ناقدین میں (بعض اختلافات کے باوجود) میں کلیم الدین احمد کی بہت عزت کرتا ہوں اور ان کی تحریروں کو بہت توجہ سے پڑھتا ہوں۔ سرور صاحب کے مطالعے اور ذہانت کا میں قائل ہوں لیکن ان سے بس شکایت یہ ہے کہ انھوں نے تنقید کو انشائیے سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ تنقید کا رنگ دب سا گیا ہے اور منافقانہ انداز بیان کے لیے بڑی گنجایش پیدا ہوگئی ہے۔ احتشام صاحب سے بہ حیثیت انسان میں بہت متاثر تھا، ایسے شریف انسان بہت کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی تنقید نگارشات سے کبھی متاثر نہیں ہو سکا۔ خواجہ احمد عباس کی فلموں کی طرح وہ مجھے بے اثر محسوس ہوتی رہیں۔ البتہ مجنوں صاحب کے ذوق اور کلاسیکی ادب کے مطالعے سے ہمیشہ متاثر رہا۔ ناقدین میں کم لوگ شعر کے معاملہ میں مجنوں صاحب کی طرح خوش ذوق ہوں گے۔ ایسا رچا ہوا شعری ذوق کم ملتا ہے۔''

(رسالہ اظہار، شمارہ 5، جنوری، 1984، صفحہ 19 تا 20)

رشید حسن خاں مدرسے میں ملازم تھے تب بھی انھوں نے اعلا درجے کے مضامین تحریر کیے تھے۔ اس بات کی تائید خود پروفیسر قمر رئیس نے ''اُردو دنیا'' میں یوں کی ہے:

> ''58-1957 میں جب میں علی گڑھ میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا اور جامعہ اُردو کا ماہنامہ ''ادیب'' ترتیب دے رہا تھا تو رشید صاحب سے لکھوا کر میں نے کئی مضامین ''ادیب'' میں شائع کیے۔ ان میں ایک مضمون 1857 کی بغاوت پر تھا۔ اسی زمانے میں رشید صاحب نے ''اغلاط اللغات'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون انجمن ترقی ہند کے جریدے ''اُردو ادب'' میں اشاعت کی غرض سے مجھے بھیجا۔ میں نے مضمون آل احمد سرور صاحب مدیر رسالہ کو اس اُمید کے ساتھ دیا کہ وہ اسے ضرور شامل کریں گے لیکن چار پانچ مہینے تک پاس رکھ کر سرور صاحب نے مضمون پڑھنے کی زحمت نہیں کی۔ کیوں کہ ان کے نام سے بھی وہ آشنا نہیں تھے۔ میں مضمون لے کر اپنے اُستاد معظم رشید احمد صدیقی کے پاس گیا۔ ان سے التجا کی کہ وہ اسے ضرور پڑھیں اور پسند آئے تو سرور صاحب کو ''اُردو ادب'' میں اشاعت کے لیے بھیج دیں۔ وہ انجمن کی مجلس معاملہ کے رکن تھے۔ انھوں نے مضمون پڑھ کر اپنی سفارش کے ساتھ سرور صاحب کو بھجوا دیا اور اس طرح اس طویل تحقیقی مضمون کی پانچ چھ قسطیں ''اُردو ادب'' میں شائع ہوئیں۔ میرا خیال ہے کہ رشید صاحب کا یہ پہلا عالمانہ مضمون تھا جس نے اُردو اہل نظر

کو متاثر کیا۔''

(ماہ نامہ اُردو دنیا، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، اپریل 2006، صفحہ 11 تا 12)

رشید حسن خاں کی تحریریں جب ملک کے دیگر رسائل میں شائع ہونے لگیں تو ان کی شہرت چہار سو ہونے لگی۔ ان کی تحریروں کے سبب ہی ان کو خواجہ احمد فاروقی جیسا قدر شناس انسان ملا۔ دہلی یونی ورسٹی میں رشید حسن خاں کی تقرری کی بھی ایک دل چسپ کہانی ہے جسے ان کے دوست قمر رئیس اپنی تحریر میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''1959 میں میرا تقرر دہلی یونی ورسٹی میں ہو گیا تو صدر شعبہ خواجہ احمد فاروقی نے ایک دن مجھ سے کہا کہ انھیں شعبے کے تحقیقی پروجیکٹ کے لیے ایک ایسے اسکالر کی ضرورت ہے جو عربی اور فارسی سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ میں نے فوراً رشید صاحب کا نام لیا اور ان کے تجربہ علمی کی تعریف کی۔ شاید ''اُردو ادب'' میں انھوں نے ان کا مقالہ پڑھا تھا۔ چند منٹ سوچ کر انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ابھی تار گھر جایئے اور رشید صاحب کو تار دیجیے کہ اگر ڈیڑھ سو ماہانہ (جہاں تک یاد پڑتا ہے یہی رقم تھی) مشاہرے پر انھیں یونی ورسٹی کی یہ ملازمت منظور ہو تو فوراً آ جائیں۔ تار رشید صاحب کو ملا اور وہ دوسرے ہی دن صبح کو دہلی پہنچ کر دریا گنج میں میری قیام گاہ پر آ گئے۔ میں انھیں فاروقی صاحب کے پاس لے کر گیا اور چند روز بعد آ کر انھوں نے ریسرچ اسسٹنٹ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔''

(رشید حسن خاں: رفیق اور دوست، اُردو دنیا NCPUL دہلی، صفحہ 12، اپریل 2006)

رشید حسن خاں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز فکشن کی تنقید کے علاوہ عروض وقواعد پر مضامین لکھ کر کیا۔ یہ مضامین اپنے زمانے کے معیاری اور مشہور ادبی رسالوں میں شائع ہوئے۔ جامعہ اُردو علی گڑھ کے رسالہ ''ادیب'' کے علاوہ ''نگار''، ''الحمرا''، ''نیا دور'' اور ''ایوانِ اُردو'' میں بھی ان کے کئی مضامین شائع ہوئے۔ ان رسائل کے علاوہ گوپال متّل کے رسالے ''تحریک'' میں بھی رشید حسن خاں کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ دہلی آنے کے بعد رشید حسن خاں اور گوپال متّل میں دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ لیکن تحقیق طلب بات یہ ہے کہ ان کا کون سا مضمون کب اور کس رسالے میں شائع ہوا۔ رشید حسن خاں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1944 سے بتایا ہے۔ رشید حسن خاں کے ابتدائی مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں۔ اس بات کی تصدیق انھوں نے خود ایک انٹرویو میں اس طرح کی ہے:

''بھئی یہ تو مجھے اچھی طرح یاد نہیں، لیکن یہ بات خوب یاد ہے کہ میرے لکھنے کا آغاز شاعری کی تنقید سے ہوا تھا۔ شاعری آج بھی مجھے پسند ہے اور تنہائی کے لمحوں میں میں شعری مجموعہ ضرور پڑھتا ہوں۔ وہ میرا بہترین رفیق ہوتا ہے۔ مجھے اپنا ایک پرانا مضمون یاد آتا ہے۔ جو غالباً 1950 میں نگار میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کا عنوان تھا ''شبلی کی فارسی شاعری''۔ اسی زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں ایک مضمون احمد ندیم قاسمی کی قطعات نگاری پر میں نے لکھا تھا۔ تو میرے لکھنے کا آغاز شاعری کی تنقید سے ہوا اور اس سے مجھے اپنے ذوق کی تربیت میں بہت مدد ملی۔''

(ہماری زبان انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، رشید حسن خاں نمبر صفحہ 20، یکم تا 28 ستمبر 2006)

ازدواجی زندگی

رشید حسن خاں نے اپنی ملازمت کے چند سال بعد دہلی کو چھوڑا تو ان کا دل اداس تھا اور آنکھیں نم تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بیش تر وقت دہلی یونی ورسٹی کے جبلی ہال اور گائر ہال میں گزارا تھا۔ البتہ درمیان میں وہ اپنے گھر شاہ جہاں پور جاتے رہتے تھے۔ لیکن زندگی کے موڑ بہت ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں اور ان پُر خار راہوں پر چلنے کے لیے ایک عدد جیون ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ رشید حسن خاں کا نکاح نفیس بیگم سے 1944 میں 19 برس کی عمر میں ہوا تھا۔ ان کی شریکِ حیات نے زندگی کے آخری پڑاؤ تک ان کا ساتھ دیا۔ رشید حسن خاں اکثر ملازمت کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتے تھے۔ گھر کی تمام ذمہ داریاں ان کی اہلیہ ہی نبھاتی تھیں۔ خاص طور پر اپنے بچّوں کی پرورش کی ذمہ داری۔ اس طرف سے خاں صاحب بے فکر تھے اور اپنے علمی و ادبی کاموں کو بہ خوبی انجام دیتے رہے۔ ایک بار رشید حسن خاں اپنی اہلیہ کو دہلی لے گئے تھے لیکن نفیس بیگم کو دہلی کی آب و ہوا راس نہ آئی اور 1965 میں واپس شاہ جہاں پور آ گئی۔ 59 برس تک نفیس بیگم ان کے ساتھ رہیں اور 29 مارچ 2003 کو اپنے حقیقی رب سے جا ملیں۔ اپنی شریکِ حیات کے دارِ فانی سے کوچ کرنے کے واقعے کا ذکر رشید حسن خاں نے کسی سے نہیں کیا بالخصوص اپنے ادبی رفقا اور قریبی ساتھیوں سے۔ اس درد کو انھوں نے اکیلے ہی برداشت کیا۔ ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا اس واقعہ کو یوں قلم بند کرتے ہیں:

''ساری زندگی ہم نے اپنی شریک حیات کی طرف توجہ نہیں دی عمر کا بیش تر حصہ دہلی میں گزار دیا۔ اب اس عمر میں ان کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتا ہوں۔ میری عادت ہے کہ دن غروب ہونے کے بعد کام نہیں کرتا۔ اس وقت اکیلا پن محسوس ہوتا ہے۔ کس سے گفتگو کی جائے؟ میں نے ان کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا تاثر دیکھا جسے میں اندر ہی اندر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ان سے شکایت کی ''خاں صاحب! نہ تو آپ نے کسی خط میں اس المناک واقعہ کا ذکر کیا اور نہ ہی کسی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی۔ کم از کم ہفت روزہ ''ہماری زبان'' دہلی میں تو یہ خبر چھپ ہی جانی چاہئے تھی۔'' کہا، رینا صاحب کس لیے؟ جانے والا تو چلا گیا اب میں لوگوں کے خطوط کا کہاں تک جواب دیتا۔''

(ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، صفحہ 19 رشید حسن خاں نمبر یکم تا 28 ستمبر، 2006)

اولادیں

رشید حسن خاں کے یہاں چار اولادیں ہوئیں۔ پہلی اولاد جولڑ کی تھی پیدائش کے آٹھ۔ نو مہینے تک حیات رہی۔ اس کے بعد دو لڑکے؛ خورشید حسن خاں اور خالد حسن خاں کی ولادت ہوئی۔ سب سے آخر میں ایک لڑکی نادرہ کی ولادت ہوئی۔ خورشید حسن خاں اس وقت اتر پردیش حکومت کے بیسک ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے جونیر ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ خالد حسن خاں شاہ جہاں پور کے مدرسہ نور العلوم دلازاک میں مدرسہ جدید کاری اسکیم کے تحت ریاضی کے اُستاد ہیں۔ خالد حسن خاں کے روزگار کی جانب سے رشید حسن خاں تا عمر پریشان رہے۔ انہیں کبھی کپڑے کی دوکان تو کبھی آئس کریم فیکٹری لگوائی گئی، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ مدرسہ میں ریاضی کی اُستادی کے ساتھ ساتھ انھوں نے گھر پر ایک چھوٹا سا برف خانہ بھی لگا رکھا ہے۔ ساتھ ہی خالد حسن خاں اپنے والد محترم کی تمام چیزوں کو سلیقے سے اسی بیٹھک میں سجا رکھا ہے، جس بیٹھک میں رشید حسن خاں تحقیقی و تدوینی کام کیا کرتے تھے (جیسا راقم الحروف نے شاہ جہاں پور جا کر دیکھا)۔ ان کے تمام بچے شادی شدہ زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کی چھوٹی لڑکی نادرہ بیگم کا نکاحِ مسنون ڈرافٹ انجینئر مقصود حسن خاں سے 17 اکتوبر 1990 کو ہوئی۔

ریٹائرمنٹ

رشید حسن خاں دہلی یونی ورسٹی میں تقریباً 30 سال ملازم رہے اور یہاں سے 31 دسمبر 1989 کو ریٹائر ہوئے۔ رشید حسن خاں دہلی آئے تو ان کے سامنے مکان اور رہنے کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ یونی ورسٹی نے ان کو کوئی کمرہ الاٹ نہیں کیا تھا۔ یونی ورسٹی نے بعد میں ان کو گائر ہال کے دو کمرے TC-9 الاٹ کیے تھے۔ اس سے پہلے رشید حسن خاں کچھ دن دہلی یونی ورسٹی کے جبلی ہال ہاسٹل بھی رہے۔ ان کے کمرے میں کتابوں کے شیلف، لکھنے پڑھنے کی ایک میز کرسی، ملاقاتیوں کے لیے لائن سے لگی چند کرسیاں موجود رہتی تھیں۔ حسن اتفاق کہ دہلی میں رشید حسن خاں کچھ دنوں کے لیے سالارِ تعلیم اور معمارِ قوم سرسید احمد خاں کے گھر میں رہے۔ اس کی وضاحت ڈاکٹر اسلم پرویز نے خوب صورت انداز میں یوں کی:

> ''رشید حسن خاں جب دلّی آئے تو پہلے پہل کچھ دنوں ان کا قیام سرسید روڈ پر سرسید کے مکان میں رہا۔ جامع مسجد کے اطراف میں اس وقت ڈی ڈی اے کا وہ بل ڈوزر نہیں چلا تھا جو اور چیزوں کے ساتھ جامع مسجد کے ادبی ٹھکانوں کو بھی ڈھاتا ہوا نکل گیا تھا۔ چناں چہ روزانہ شام کو دہلی کی بیش تر ادبی شخصیتیں اُردو بازار میں مولوی سمیع اللہ قاسمی کے کتب خانہ عزیزیہ، فلورا ہوٹل، میر مشتاق کے ارونا ہال اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر قائم بھائی ظہیر کے فرینڈز ٹی اسٹال المعروف بہ چنڈو خانہ پر جمع ہوتی تھیں۔''

(رشید حسن خاں، کچھ یادیں کچھ جائزے، صفحہ 93، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب، اشرف جاوید رحمانی در بھنگا بہار، 2008)

وفات

رشید حسن خاں 1944 سے لے کر 25 فروری 2006 تک ادبی کاوشوں میں ہمہ تن مصروف رہے۔ مطالعہ کی عرق ریزی سے ان کی آنکھوں کی بینائی کمزور ہو گئی تھی۔ مسلسل بیماریوں نے انہیں تا عمر پریشان کیا۔ رشید حسن خاں کو پہلا ہارٹ اٹیک 1991 میں اور دوسرا ہارٹ اٹیک 27 اپریل 2002 کو ہوا تھا، اس وجہ سے ان کا باہر کا سفر کرنا ناممکن تھا۔ ہارٹ اٹیک کی وجہ سے ان کی انگلیوں پر زیادہ اثر ہوا۔ نتیجتاً تحریری کام متاثر ہوا، گھٹنوں کے درد سے یہ پریشان رہتے تھے۔ لیکن موصوف کا حوصلہ علم و ادب کے تئیں بلند تھا۔ یہ چراغ کے بجھنے سے پہلے کی تیز روشنی تھی، بستر جو ایک بار پکڑا تو اٹھ نہ سکے۔ اپنے حقیقی رب سے ملنے کا وقت قریب سے قریب آ گیا۔ انتقال سے ایک دن پہلے (25 فروری 2006) اپنے چھوٹے بیٹے خالد حسن خاں سے مچھلی کھانے کی فرمائش کی لیکن افسوس صد افسوس! کہ وہ دن نہ آ سکا۔ 26 فروری بروز اتوار 2006 کی شب 2:40 بجے پر انھیں دل کا دورہ پڑا اور روح پرواز کر گئی۔ رشید حسن خاں نے اس دارِ فانی میں 80 سال، دو مہینے اور ایک دن کی زندگی گزاری۔ 26 فروری 2006 کی شام 5:00 بجے باڑوزئی پٹھاوری قبرستان شاہ جہاں پور میں (رشید حسن خاں کے مکان سے بمشکل 100 قدم کا فاصلہ) ان کی تدفین ہوئی۔ ان کے انتقال پر ملک اور بیرون ملک میں تعزیتی پروگرام منعقد ہوئے۔ کئی ادبی رسائل اور جرائد نے خصوصی شمارے نکال کر انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ رشید حسن خاں کے مقرب شعرا حضرات نے ان کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مولانا عبدالہادی خاں کاوش رامپوری نے ان کی وفات کو ایک قطعہ میں قلم بند کیا ہے:

قطعۂ تاریخِ وفاتِ نیک مرد

2006

رشید حسن خاں بلند ایواں

1427ھ

محقق ادیب اور نقادِ فن

گئے سوئے جنت رشید حسن

جو فکر کی تاریخ آئی ندا
پسندیدہ سیرت رشید حسن

1427ھ

ایک اور قطعۂ تاریخِ وصال طارق سلطان پوری نے قلم بند کیا ہے۔

''جامع کمالات شخصیات''

2006

اسے صبحِ ازل، دستِ عطا نے
عنایت کی قبائے علم و تحقیق
عطا اُس صاحبِ ذہن رسا کو
ہوئی زیب و ضیاے علم تحقیق
بلند، اس دور میں لاریب تھا وہ
نشانِ ارتقاے علم و تحقیق
ہوا دستِ اجل سے سرنگوں، حیف!
لواے اعتلاے علم و تحقیق
کہیں تاریخِ رحلت اس کی طارق
''وہ خورشیدِ سماے علم و تحقیق''

2006

شخصیت

رشید حسن خاں جس کام کو کرتے اس میں ان کی مردم شناسی کا عکس نظر آتا تھا۔ وہ ہر کام کے لیے کوئی نہ کوئی وقت مقرر کرتے پھر اس کو اسی طے شدہ وقت پر انجام دیتے تھے۔ کام کی مصروفیت کی وجہ سے ان کا ملنا جلنا دوسرے لوگوں سے کم ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے رشید حسن خاں پر یہ اعتراض کیا جاتا رہا کہ یہ روکھے انسان ہیں کبھی کسی سے نہیں ملتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان سب باتوں سے بے پروا رشید حسن خاں لوگوں سے فراخ دلی سے ملتے۔ ان کے پاس ملک اور بیرون ملک سے جو خطوط آتے ان کا بھی جواب دیتے اور اپنی تدوینی و تحقیقی کاوشوں میں بھی مصروف رہتے۔ لوگ عام طور پر رشید حسن خاں کی پر وقار شخصیت سے گھبرا جاتے تھے۔ حالاں کہ رشید حسن خاں نرم گفتار اور شائستہ طبیعت پسند انسان تھے۔ جب کوئی ریسرچ اسکالر ان سے ملنے گائڑ ہال میں آتا تو اس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتے اور اس کے مطمئن ہونے تک اس سے نرم لہجے میں گفت وشنید کرتے۔ ان تمام باتوں اور جامع کمالات شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا محاکمہ خود رشید حسن خاں کے فرزند اکبر خورشید حسن خاں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''والد محترم نے ہر اس شخص کے لیے دروازے کھول رکھے جو ادبی کام کے لیے ان کے پاس آیا۔ چاہے کوئی وہ اسکالر یا طالب علم۔ طالب علموں کے والد محترم نے صبح کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔ کئی لوگ ان سے اُردو پڑھنے گھر پر آتے تھے اور وہ ان کو وقت دیتے تھے۔ ان کو بے کار وقت برباد کرنے سے سخت نفرت تھی۔ وہ کہتے تھے کہ وقت بہت قیمتی ہے اور بہت کم ہے اور کام زیادہ ہے۔ والد محترم جنھوں نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ دلی میں گزارا اور وہاں پر بھی انھوں نے بہتوں کو علمی و ادبی تعاون دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے لوگوں کی مالی امداد بھی کی، پریشانی وہ کسی کی دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ دہلی میں وہ یونی ورسٹی کے ہاسٹل میں رہتے تھے۔ وہاں طالب علموں کی خاص طور پر مدد کرتے تھے اور ان سے بیٹھ کر بات چیت بھی کرتے تھے۔ دہلی میں ان سے ملنے والوں میں ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر تنویر احمد علوی خاص لوگوں میں سے تھے۔

(ہماری زبان یکم تا 28 دسمبر 2006، صفحہ 11،)

رشید حسن خاں اپنی میز پر اچھی خاصی ریز گاری رکھتے تھے تا کہ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد کنڈکٹر سے ہونے والی چک چک سے بچا جا سکے اور سفر آرام سے طے ہو جائے۔

رشید حسن خاں نے ہمیشہ طالب علموں اور علم کے دیداوروں کی خوب مدد و ستایش کی۔ انھیں صرف ادبی لوگوں اور ریسرچ اسکالروں سے ملنا پسند تھا۔ ان کے مطابق یہ لوگ اپنا کام سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں ان کو کتابوں کے حوالے دیتے اور ان کے مسائل کو حل کرتے تھے۔ طلبہ سے ان کی قربتوں کا ان کے ادبی دشمنوں نے یہ کہہ کر

یاروں کے یار اور مددگار رہتے۔ ان کے ادبی دشمنوں نے کبھی بھی ان کو اپنے ہم پلّہ نہیں مانا۔ اس کی وجہ ایک یہ تھی کہ ان کے پاس باضابطہ طور پر یونی ورسٹی کی کوئی اسناد نہ تھیں۔ اس کے باوجود بھی وہ کتنی ہی یونی ورسٹیوں میں ایم فل اور ڈی فل کے ممتحن بنائے گئے اور کتنی ہی ادبی انجمنوں، اُردو اداروں، اکادمیوں نے ان کو انعامات و اعزازات سے نوازا۔ ملک اور بیرون ملک زبان اور قواعد کے مسائل کو اپنے عالمانہ خطبوں سے آسان بنایا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ انھوں نے اپنا وقت کبھی برباد نہیں کیا اور اس کی تلقین انھوں نے اپنے تمام ملنے والوں کو بھی کی۔ اس بات کو ڈاکٹر اسلم پرویز نے اس انداز میں تحریر کیا ہے:

''رشید حسن خاں یاروں کے یار ہیں۔ منافقت سے انھیں سخت نفرت ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ ان کے بے تکلفی ہے ان سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ لیکن عام طور پر وہ کم آمیز ہیں۔ اس لیے کس و ناکس کے ساتھ ہنسی مذاق تو کیا بات بھی احتیاط سے مختصر کرتے ہیں۔ بعض دوستوں کے ساتھ گاہے گاہے جا کر خود ملاقات کرنا بھی ان کی وضع میں شامل ہے۔ ایک تو ان میں غلام ربانی تاباں مرحوم تھے ان کے علاوہ بیگم ممتاز اور مخمور سعدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چوں کہ خاں صاحب ادب کے قدیم سرمائے پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تنہا اس سمندر کے تمام موتی نہیں چن سکتے۔ اس لیے وہ اپنے ذہن میں طرح طرح کے موضوعات سوچتے رہتے ہیں۔''

(رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، صفحہ 99، دربھنگہ بہار 2008)

آپ کی نفاست پسندی، آپ کی ہمہ گیر شخصیت کا آئینہ تھی۔ ہر مرحلہ میں محتاط رہتے تھے۔ عمدہ اور سادہ لباس پسند کرتے تھے۔ موسمِ گرما میں بُش شرٹ، پتلون کے ساتھ چمڑے کے براؤن سینڈل پہنتے تھے۔ موسمِ سرما میں پوری آستین کی قمیص، پتلون کے ساتھ براؤن لیس والے جوتے پہنتے تھے۔ قمیص ہو یا شرٹ ہمیشہ چیک کی ہی ہوتی تھی اور مضبوط مردانہ کلائی پر ویسٹ اینڈ واچ کمپنی کی گھڑی بندی ہوتی تھی۔ آپ روشنائی قلم سے لکھا کرتے تھے جو اعلا کمپنیوں کے اقواع و اقسام کے ہوتے تھے۔ آپ کی تحریر بہت عمدہ خوش خطی کا اعلا نمونہ تھی۔ آپ کے احباب وغیرہ بھی آپ کی پسند کے قلم آپ کی خدمت میں تحفتاً پیش کرتے رہتے تھے۔ کالی روشنائی سے لکھنا آپ کو بہت مرغوب تھا۔ آپ کی تحریر بہ آسانی پڑھی جاسکتی تھی۔ اسی لیے لاتعداد افراد آپ کی خوش خط تحریر سے محظوظ ہوتے تھے۔

رشید حسن خاں 31 دسمبر 1989 کو دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے ریٹائر ہوئے۔ دہلی میں قیام کے دوران انھوں نے یہاں کی علمی و ادبی فضا میں عالمانہ روایت کو جنم دیا۔ بزرگوں کا احترام، بچّوں سے پیار، لوگوں کی بے لوث خدمت وغیرہ دیگر پہلوان کی شخصیت کو اور پرکشش بناتے ہیں۔ ان کے مزاج کے کھرے پن کی مثال ہر ملنے والے کی زباں پر تھی۔ اسی کھرے پن کو کئی لوگوں نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ مگر اس کے برعکس یہ اپنے کاموں میں اتنے غرق ہوئے کہ انھیں فضول باتیں سننے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ ان کے مخالفین نے ملازمت سے سے ریٹائرمنٹ کے بعد گائر ہال خالی کرانے کی سازش بھی کی اور صدر شعبہ اُردو کے طرح طرح سے کان بھی بھرے لیکن اعتدال پسند صدر شعبہ اُردو نے رشید حسن خاں کو گائر ہال میں رہنے کی اجازت شیخ الجامعہ سے دلا دی۔ البتہ رشید حسن خاں دہلی سے مستقل طور پر 2 فروری 1996 کو واپس اپنے آبائی وطن شہر شاہ جہاں پور چلے گئے۔ لوگوں کی بد دلی اور دوہرے کردار کے بارے میں ان کی رائے صاف تھی:

''میں 23-22 سالوں سے دہلی میں ہوں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کسی شخص کی اصل رائے کیا ہے اس کے خلاف آپ میرے چھوٹے سے شہر میں چلیے۔ پانچ منٹ میں معلوم ہو جائے گا کہ کسی شخص کی اصلی رائے کیا ہے۔''

(کتاب نما، رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات، صفحہ 13 مرتب اطہر فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2002)

رشید حسن خاں نے جب دہلی کو خیر باد کہا تو تمام عمر کی رقابتیں ایک پل میں ان سے دور ہوگئیں اور شاہ جہاں پور جیسے چھوٹے شہر میں وہ سہولیات میسر نہ ہو سکتی تھیں جو قومی راج دھانی دہلی میں فراہم تھیں۔ ان کی بیماری نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا بلکہ روز بہ روز اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ بیماری کی وجہ سے ان کا وزن کم ہونے لگا شاہ جہاں پور سے ممبئی علاج کرانے جاتے تھے۔ ممبئی میں پروفیسر عبدالستار دلوی کے گھر پر ٹھہرنے کا انتظام ہوتا تھا، وہیں پر ادبی لوگوں سے ملنا اور ان کو نیک صلاح و مشورہ دینا رشید حسن خاں کا معمول تھا۔ انھوں نے اپنی بیماری اور گھریلو مشکلات کا کبھی کسی سے ذکر نہ کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اس بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''عمر کے ساتھ ان کی بیماریاں بڑھتی رہیں۔ علاج کے وسائل کم ہوتے رہے۔ دہلی سے شاہ جہاں پور منتقل ہوئے اور بستر سے لگ گئے۔ میرے خیال میں دہلی کا چھوٹنا ان کی زندگی کا سب سے المناک واقعہ تھا۔ دہلی ان کے دل و دماغ میں سما چکا تھا۔ یہاں کی صحبتیں ان کی زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔ حالات نے انھیں دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ بیوی بچوں میں یقیناً خوش رہے مگر پھر بیوی کا انتقال اور ان کی اپنی بیماری کی بڑھتی ہوئی شدت نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔''

(ہماری زبان رشید حسن خاں نمبر یکم تا 28 ستمبر 2006، صفحہ 2)

عمر کے آخری پڑاؤ پر رشید حسن خاں نے لوگوں سے خط و کتابت کم کر دی تھی۔ چوں کہ اب ادبی رفیق ان سے زیادہ تر فون پر باتیں کرنے لگے تھے۔ شاہ جہاں پور کی گرمی اور رشید حسن خاں مچھّروں سے بہت پریشان تھے۔ اس کا ذکر انھوں نے ارجمند آرا سے کئی بار کیا۔ انھیں جتنی بھی پنشن ملتی تھی وہ سب گھریلو ضروریات پر خرچ ہو جاتی

تھی۔ان کے اکاؤنٹ میں کبھی بھی زیادہ رقم جمع نہیں ہو پائی۔خاں صاحب نے بینک کا ATM بھی زیادہ استعمال نہیں کیا۔ATM کارڈ خود ڈاکٹر ارجمند آرا کے کہنے پر ہی بنوایا جس کی جان کاری ہمیں 17 فروری، 2006 کے اس خط سے ہوتی ہے جو رشید حسن خاں نے ارجمند آرا کو رقم کیا تھا:

''عزیزہ ارجمند! بہت سی دعائیں۔

ATM کے کاغذ اور کارڈ بھیج رہا ہوں۔احتیاطاً انھیں متعلقہ فرد کو دے دینا۔بینک کی پاس بک اکتوبر میں بھیجوں گا۔اسی وقت ''ابھی زندہ ہوں'' والا فارم بھی بھیجوں گا۔مگر وہ فارم میرے پاس نہیں۔جلدی نہیں۔اکتوبر تک کسی وقت بھیج دینا۔ہاں بس یہ ضرور کرنا کہ بیلنس معلوم کرکے مجھے فون پر بتا دینا۔ D.A. کی کوئی زائد قسط شاید ملی ہو مجھے۔اگر ملی ہوگی تو کام آجائے گی۔کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم وہاں نہ ہوتیں تو میرا کیا احوال ہوتا۔کبھی ماننا ہی پڑتا ہے کہ کوئی ان دیکھی طاقت کہیں ہے ضرور جو مجھ جیسے ناکارہ لوگوں کے کام بنانے کے لیے ایسے وسیلے پیدا کر دیتی ہے۔ہائے بگانا کیا بات کہی ہے۔

شش جہت میں ہے ترے جلوۂ بے فیض کی دھوم
کان مجرم ہیں مگر آنکھ گنہ گار نہیں

جیتی رہو اور شاد کام رہو...رشید حسن خاں۔''

(رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے، صفحہ 129، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، دربھنگہ بہار، 2008)

مذکورہ بالا خط سے معلوم ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں کو پیسوں کی سخت ضرورت تھی اور وہ بینک کھاتے کو ATM سے منسلک کرانے کے خواہش مند تھے۔''ابھی زندہ ہوں'' والا فارم سال میں تمام پنشنرز کو پُر کرنا لازمی ہوتا ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس خط کو ڈاکٹر ٹی.آر. رینا نے ''رشید حسن خاں کے خطوط'' میں شامل نہیں کیا ہے (ممکن ہے جلد دوم میں شامل کیا جائے)۔شاید اس کی کاپی رینا صاحب کو دستیاب نہ ہو سکی ہو۔ارجمند آرا کے نام آخری خط رینا صاحب نے 14 جنوری 2003 کو شامل کیا ہے۔جب خاں صاحب کو DA کی قسط مل گئی اور ان کے کھاتے میں 13 ہزار سے زائد رقم ہوگئی تو انھوں نے ارجمند آرا کو فون کرکے یہ معلوم کیا کہ کہیں بینک کی غلطی سے کسی دوسرے کی رقم ان کے کھاتے میں ٹرانسفر تو نہیں ہوگئی ہے۔رشید حسن خاں کی اس سادگی اور بے تکلفی کو ارجمند آرا نے یوں تحریر کیا ہے:

''پاس بک جب پُر کرا کے بھیجی تو گھبرا کر انھوں نے فون کیا کہ شاید کوئی غلط اینٹری ہوگئی ہے۔اس میں تقریباً 13 ہزار روپے زیادہ جمع ہوگئے ہیں اور اتنے روپے تو میرے کھاتے میں کبھی جمع نہیں رہے۔مجھے ہنسی بھی آئی اور دکھ بھی ہوا۔تیرہ ہزار روپے کیا واقعی اتنی بڑی رقم ہے کہ یک مشت ان کے ہاتھ میں نہ رہے۔میں نے یونی ورسٹی جا کر معلوم کیا تو پتا چلا کہ Arriars جمع ہوگئے تھے۔خاں صاحب کو بتایا تو بڑے خوش ہوئے کہ روپوں کی بڑی ضرورت تھی اور یہ غیبی مدد کی طرح پہنچے۔''

(رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے، صفحہ 129 مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف۔جاوید رحمانی، دربھنگہ، بہار، 2008)

کھیلوں سے دل چسپی

رشید حسن خاں ہاکی کے کھیل کو ترجیح دیتے تھے کیوں کہ وہ خود بھی ہاکی کے اچھے کھلاڑی رہے ہیں۔شیواجی اسٹیڈیم دہلی میں ہونے والے ہاکی میچوں کو وہ اکثر دیکھنے جاتے تھے۔ہاکی میچوں میں ان کو اتنی دل چسپی تھی کہ ان کو اس کھیل کی باریکیاں تک معلوم تھیں۔اس کھیل کو رشید حسن خاں قوتِ ارادی کا کھیل تسلیم کرتے تھے۔اس کے علاوہ موصوف اپنے کمرے میں عمدہ ریڈیو سیٹ اور ٹیپ ریکارڈر کا استعمال غزل سننے کے لیے کرتے تھے۔موڈ کو بدلنے کے لیے کبھی کبھی مشاعرہ بھی سن لیا کرتے تھے۔ان باتوں کا تذکرہ ٹی.آر. رینا نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''رشید حسن خاں کے خطوط'' میں کچھ اس طرح کیا ہے:

''خاں صاحب کو کھیل کود کا بھی شوق تھا۔ہاکی ان کا پسندیدہ کھیل تھا۔شاہ جہاں پور میں یہ کھیل کافی مقبول رہا۔قومی سطح کے اچھے کھلاڑی یہاں سے منظر عام پر آئے۔خاں صاحب نے خود یہاں کی ہاکی ٹیم میں دس سال کھیلا۔گو کوئی زیادہ نام نہیں کما سکے۔شاہ جہاں پور سے جب دہلی آئے اور یہاں یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں انھیں ملازمت ملی تو انھیں یہاں بڑے ٹورنامنٹ دیکھنے کا موقع ملا۔اب ان کا زیادہ وقت یہ کھیل دیکھنے میں صرف ہونے لگا۔ان کے دوسرے پسندیدہ کھیل فٹ بال، والی وال، باسکٹ بال اور کبڈی تھے۔ان میں انھوں نے خود بھی حصہ لیا۔کرکٹ سے انھیں کوئی شغف نہیں تھا۔فٹ بال کا ورلڈ کپ جب شروع ہوتا تو خاں صاحب اسے شوق سے ٹی وی پر دیکھتے۔اس کا انھیں انتظار رہتا۔ان کھیلوں کے دیکھنے سے ان کے ادبی کاموں پر کبھی کوئی اثر نہیں پڑا۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ٹی آر رینا، صفحہ 26، اُردو بک ریویو، دہلی 2011)

خود رشید حسن خاں نے باقر مہدی کے رسالے ''اظہار'' کے شمارہ 5 جنوری 1984 میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ وہ کھیلوں کی باریکیوں سے نہ صرف واقف ہیں بل کہ وہ خود اسپورٹس مین بھی رہے ہیں:

''مشاغل میں سرفہرست اسپورٹس کو رکھنا چاہئے۔ ہاکی خود کھیلی ہے۔اس لیے وہ میرا پسندیدہ کھیل ہے۔اس کھیل میں جوفن کارانہ دقت پسندی ہوتی ہے اس کا میں عاشق ہوں۔اس کے بعد باسکٹ بال، والی بال اور فٹ بال کا نمبر ہے۔ میں ابھی اپنے وقت کا اچھا خاصا حصہ ان کھیلوں میں صرف کرتا ہوں۔''

(کتاب نما خصوصی شمارہ رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات، مرتب اطہر فاروقی، صفحہ 12، مکتبہ جامعہ، جولائی، 2002)

معمولاتِ زندگی

رشید حسن خاں وقت کی پابندی ہمیشہ کرتے تھے۔ وقت کی پابندی ان کے معمول کا ایک لازمی حصہ تھی۔ علی الصبح 5:00 بجے بستر چھوڑ دینا ان کا معمول تھا۔ ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد چاہے موسم کیسا بھی ہو نہانا لازمی تھا۔ چاے اور ناشتے کا وقت 8 بجے مقرر تھا۔ چاے بغیر دودھ اور شکر کے پیتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت 1 بجے مقرر تھا۔ جوانی میں تو وہ ہر قسم کا کھانا کھالیا کرتے تھے لیکن 1983 کے بعد سے ہلکا کھانا لینے لگے تھے۔ اس کی خاص وجہ دل کا مرض اور شوگر کی بیماری تھی۔ انڈا، مکھن، مسالے اور روغنی اشیا انھوں نے ترک کر دی تھیں۔ البتہ گوشت میں مچھلی انھیں خوب پسند تھی۔

شوق

رشید حسن خاں چاے پینے کے بے حد شوقین تھے۔ پہلی چاے بہت سویرے لیمن والی، پھر سادہ چاے۔ اکثر ہوٹلوں اور دوسروں کے گھروں کی چاے پینا وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ جو چاے دودھ اور شکّر ملا کر جوش دے کر تیار کی جاتی تھی، رشید حسن خاں اسے اونٹا ہوا کاڑھا یا جوشاندہ کہتے تھے۔ چاے سے متعلق ایک واقعہ مجھے احسن قدوائی (اُردو اکادمی، لکھنؤ میں ملازم) نے بتایا کہ رشید حسن خاں اکادمی کے ممبر ہونے کی وجہ سے اکثر لکھنؤ آتے تھے۔ پروفیسر محمود الٰہی صاحب سے رشید حسن خاں عمدہ چاے پلانے کا مطالبہ ہمیشہ کرتے تھے لیکن چاے بازار سے منگوا کر پلا دی جاتی تھی۔ اس حرکت پر رشید حسن خاں اُردو اکادمی لکھنؤ کے اہل کاروں پر بہت ناراض ہوتے۔ رشید حسن خاں نے اکادمی میں آیندہ آنے کے لیے عمدہ چاے پیش کرنے کی شرط رکھی۔ ان کی شرط مان لی گئی اور احسن قدوائی کو اس خدمت پر معمور کیا گیا۔ احسن قدوائی اپنے گھر سے کیتلی میں عمدہ چاے بنوا کر لے آئے۔ جب میٹنگ میں رشید حسن خاں کے سامنے چاے پیش کی گئی تو انھوں نے برجستہ کہا، ''محمود صاحب! اب جب بھی آپ مجھے یاد کریں گے میں حاضر ہو جاؤں گا'' اور احسن قدوائی کو عمدہ چاے پلانے کا شکریہ ادا کیا۔ چاے کے علاوہ انہیں کافی پینا بھی پسند تھا۔ اس کے لیے دو جگہیں مقرر تھیں۔ ایک کناٹ پلیس والا کافی ہاؤس اور دوسرا دہلی یونی ورسٹی کا کافی ہاؤس۔ یونی ورسٹی کے کافی ہاؤس کے بیرے ان کی طبیعت سے خوف واقف تھے۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں بیرے نے کبھی بھی بل رشید حسن خاں کو لاکر نہیں دیا۔ ان کے پاس اگر پیسے ہوئے تو ادا کر دیے نہیں تو اُٹھ کر چلے آتے۔ رشید حسن خاں بل کی ادائیگی اگلے مہینے کی تاریخوں میں کرتے۔ کافی ہاؤس کا ایک بیرا ان کا خاص خیال اور احترام کرتا۔ جتنے پیسے اس نے کہے رشید حسن خاں نے فوراً ادا کر دیے اور حساب کتاب کبھی معلوم نہیں کیا۔ کافی ہاؤس میں اکثر اکیلے بیٹھتے۔ انھیں لوگوں کے ساتھ بیٹھنا اور فضول باتیں کرنا ناپسند تھا۔ تنہائی میں ان کے ذہن میں ہمیشہ ادبی کام ہی گردش کرتے رہتے تھے۔ ان کی سوچ اسی حالت میں پروان چڑھتی۔ کافی کی ہلکی چسکیاں ان کے چودہ طباق کو اور روشن کر دیتی اور طرح طرح کے ادبی پلان ایسے ہی موقعوں پر عمل میں آتے۔ چاے اور کافی کے علاوہ رشید حسن خاں کو ایک ایسا شوق اور بھی تھا جس کا انکشاف حیران کن ہے۔ دراصل رشید حسن خاں کبھی کبھار عمدہ اور اعلا درجے کی وہسکی پینے کا شوق رکھتے تھے۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ میں رشید حسن خاں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہیں کر رہا ہوں بل کہ ان کے معمولاتِ زندگی کے چند اوراق قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اس حیرت انگیز باب کا انکشاف ڈاکٹر ٹی. آر. رینا نے دل چسپ انداز میں یوں کیا:

> ''خاں صاحب کا ایک اور عزیز شوق تھا۔ بڑھیا کوالٹی کی وہسکی۔ راقم نے انھیں جموں یونی ورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں یہ شوق فرماتے ہوئے دیکھا۔ شام کے وقت جب ہم تینوں (پروفیسر شیام لال کالڑا، ڈاکٹر ایم ایل پرواؔنہ اور راقم) کے علاوہ کوئی نہ ہوتا تو گیسٹ ہاؤس کا خان ساماں ان کے کمرے میں برف کے پیس، پانی سلاد وغیرہ رکھ دیتا۔ خاں صاحب اپنے ہاتھ سے خود اپنا پیگ بناتے، گلاس میں وہسکی، پانی اور برف ڈال کر اسے بھر لیتے۔ دھیرے۔ دھیرے ایک ایک گھونٹ لیتے اور باتیں کرتے جاتے۔ گفتگو صرف ادبی ہوتی یا کبھی کبھار سیاسی معاملات پر بھی بات چیت کر لیتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جس طرح صبح چاے پیتے ہوئے ایک گھونٹ سے دوسرے گھونٹ تک زیادہ وقفہ لیتے تھے ٹھیک اسی طرح خاں صاحب کا وقفہ ایک گھونٹ سے دوسرے گھونٹ تک کافی طویل ہوتا۔ تین پیگ سے زیادہ میں نے انھیں کبھی پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس دوران وہ کسی دوسرے شخص سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ گیسٹ ہاؤس کے چوکی دار یا خان ساماں کو خاص ہدایت ہوتی تھی۔ پروفیسر عابؔد اور پرواؔنہ صاحب دونوں اس کا شوق رکھتے تھے۔ مگر احتراماً انھوں نے اس معاملے میں خاں صاحب کا کبھی ساتھ نہیں دیا۔''

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتب ڈاکٹر ٹی۔ آر رینا، صفحہ 26، اُردو بک ریویو، فروری 2011)

ادبی کاوشیں

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ علالت کے دوران بھی آپ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہے اور تمام حضرات سے یہی کہتے کہ ابھی کئی اور کام کرنے باقی ہیں۔ زندگی کے

آخری دنوں میں وہ ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' نامی کتاب مرتب کر رہے تھے۔ گنجینۂ معنی کا طلسم ایک نوع کی ''دیوانِ غالب کی فرہنگ'' ہے۔ اس کتاب کے تقریباً 750 صفحات ''انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی'' کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کمپوزنگ بھی کرا چکے ہیں اور اس کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے۔ رشید حسن خاں کے بڑے صاحب زادے خورشید حسن خاں سے معلوم ہوا کہ ''انجمن ترقی اُردو ہند'' والے اس کا صحیح معاوضہ دینے میں آنا کانی کر رہے ہیں۔ لیکن خورشید حسن خاں نے راقم الحروف سے دوران گفتگو کہا کہ والد محترم کے انتقال کے بعد 1750 صفحات (اصل مسودہ) ہم نے انجمن کو دیا تھا۔ بار بار اصرار کرنے کے باوجود بھی انجمن کوئی جواب نہیں دے رہی ہے۔ اب تو انجمن کے ملازمین اور رشید حسن خاں کے شناساؤں نے ہم سے بات کرنی بھی بند کر دی ہے۔ اب یہ کتاب (جلد اول) انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے باہمی اشتراک سے دسمبر 2017 کو منظر عام پر آ چکی ہے۔ اس کی دوسری جلد دسمبر 2018 کو اسی ادارے سے شائع ہوئی ہے اور اُمید ہے کہ تیسری اور آخری جلد بھی 2019 تک منظر عام پر آ جائے گی۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب ''غرائب اللغات'' (تدوین) بھی زیر ترتیب تھی جو مکمل نہ ہو سکی۔ رشید حسن خاں ''امراؤ جان ادا'' کی بھی تدوین کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ خاں صاحب کی دلی خواہش علامہ اقبال کے کلام کی صحیح ترتیب و تدوین کرنے کی تھی۔ اس بارے میں انھوں نے مواد بھی اکٹھا کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں آپ اپنے پاکستانی ادب نواز دوستوں سے مشورہ بھی کرتے رہتے تھے۔ اس کا ذکر خود لاہور یونی ورسٹی کے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے اپنی تحریر میں کیا ہے:

> ''البتہ حیات مستعار کے آخری برس (2005 میں) انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریک و تجویز پر کلیات اقبال اُردو کی تدوین کا پختہ عزم کر لیا تھا اور معاونت کے لیے خاں صاحب نے اس ناچیز کو شریک تدوین کیا تھا۔ ہم نے اس کام کا ایک نقشہ بنایا۔ طریق کار طے کیا۔ میں نے انھیں ضروری کتابیں، کلام اقبال کی بعض بیاضیں اور متفرق لوازمہ بھیجا۔ خاں صاحب کے ایک مداح اور نیاز مند جناب عبدالوہاب خاں سلیم ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ مگر خرابیِ صحت کے سبب یہ کام شروع کرنے میں تاخیر ہوتی رہی۔ راقم کے نام ایک خط میں عید الاضحیٰ کے بعد یہ کام بالفصل شروع کر دینے کا عزم ظاہر کیا تھا۔ (ممکن ہے آغاز کر بھی دیا ہو) وہ طویل عرصے سے متعدد عوارض کا شکار چلے آ رہے تھے۔ ذیابیطس، عارضۂ قلب اور بے خوابی ایک زمانے میں پھیپھڑوں کی خرابی میں بھی مبتلا رہے۔ 16 دسمبر 2005 کے ایک خط میں لکھا ''سردی کا موسم مجھے راس نہیں آتا۔ اب پچھلے مہینے کے اواخر سے احوال یہ ہے کہ سر جھکا کر ذرا دیر بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ ریزش، چھینکیں اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ لکھنا پڑھنا بند ہے۔'' اس کے باوجود عزم یہ تھا کہ میں اقبال والے کام کو مثالی کام کے طور پر مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں دو سال تو لگ جائیں گے۔ راقم خوش تھا کہ خاں صاحب جیسے محقق اور نقاد نے اقبالیات کی جانب اعتنا کیا ہے۔ اسے میں نے اقبالیات کی خوش قسمتی جانا لیکن کیا خبر تھی کہ یہ خوشی عارضی ہوگی اور وہ اقبالیات تو ایک طرف دنیائے فانی ہی سے منھ موڑ کر، اُردو ادب خصوصاً دنیائے تحقیق و تدوین اور اپنے مداحوں اور قدر دانوں کو سوگوار کر جائیں گے۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور ان کی روح کو آسودہ رکھے۔ آمین۔''

(ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو ہند، یکم تا 28 ستمبر، 2006، صفحہ 35 شمارہ نمبر 36, 35, 34, 33 جلد نمبر 65)

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رشید حسن خاں ادبی مصروفیات میں منہمک رہتے تھے۔ وہ کسی بھی کام کی تہہ تک جانے کے بعد ہی اس کو اپنے ہاتھ میں لیتے تھے۔ خواہ اس کے لیے انھیں برسوں انتظار ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ تحقیق ہو یا تدوین یا تنقید پوری عرق ریزی سے کام کرنا ان کا دل چسپ اور محبوب ترین مشغلہ تھا۔ کسی بھی کتاب کا اول عکس دیکھنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ اسی لیے ان کی شہرت ایک تحقیقی و تدوینی Legend کی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے ان کی تدوینی صلاحیتوں کے مدنظر انہیں ''خدائے تدوین'' کے لقب سے یاد کیا۔ کیوں کہ خاں صاحب کا ماننا تھا کہ ہم سے پہلے جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کو از سرِ نو زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی جائے اور اگر کوئی نیا پہلو نظر آئے تو اس کو بھی سامنے لایا جائے۔ یہی نہیں پہلے جو کچھ سچ سمجھا جاتا رہا ہے اگر وہ غلط ثابت ہو جائے تو اسے سب کے سامنے لایا جائے۔

رشید حسن خاں کی تحقیقی، تدوینی اور تنقیدی کارناموں اور کارگزاریوں کے سبب حافظ محمود خاں شیرانی، امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود کے بعد ان کا شمار سب سے اہم اور ممتاز محقق و مدون کے طور پر ہوتا ہے۔ خاں صاحب نے تحقیق میں حافظ محمود خاں شیرانی کو معلم اول قرار دیا ہے۔ تدوین میں وہ خود کو امتیاز علی خاں کا تلمیذ معنوی سمجھتے تھے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحریروں میں تحقیق کے آداب سیکھے اس لیے ان چاروں حضرات کو میں اپنا معنوی اُستاد مانتا ہوں۔

رشید حسن خاں کو اُردو زبان اور قواعد پر عبور حاصل تھا۔ ملک اور بیرون ملک کی مختلف یونی ورسٹیوں میں وہ اُردو زبان، املا و قواعد کی سیریز پر خطبہ دینے جاتے تھے۔ کئی یونی ورسٹیوں میں وہ ویزیٹنگ فیلو بھی رہے۔ جس سے ان کی شہرت بام عروج کو پہنچی۔ اُردو اِملا کے موضوع پر رشید حسن خاں کی کتابیں ''اُردو اِملا''، ''زبان و قواعد''، ''انشاء اور تلفظ''، ''اُردو کیسے لکھیں''، ''عبارت کیسے لکھیں''، وغیرہ اہمت کی حامل ہیں۔ انھوں نے صرف بڑوں کے لیے ہی نہیں نوجوانوں اور بچوں کے لیے بھی کئی کتابیں لکھیں۔ مثلاً ''اُردو کیسے لکھیں''، ''عبارت کیسے لکھیں''، وغیرہ۔ بہ حیثیت محقق املا شناس ان کی یہ کتابیں ان کے نقطۂ نظر کی بخوبی وضاحت کرتی ہیں۔

رشید حسن خاں ایک خوش گفتار، سلیقہ شعار اور نفیس انسان تھے۔ اصول پرست، صاف گو اپنے مقاصد اور اہداف علمی میں یکسوئی، ہر طرح کی مصلحتوں، منافقتوں،

ریاکاریوں اور کج روی سے بے زار، ان کی باتیں بہت کھری کھری اور اسلوب واضح اور دوٹوک ہوتا تھا۔ خشک سے خشک موضوع اور مسئلہ کو بھی اپنے سلیس اور سادہ مگر علمی انداز اور انہماک سے اس طرح واضح کرتے کہ زیرِ بحث نکتہ قاری کے ذہن نشیں ہو جاتا۔ چوں کہ باقاعدہ درس اور تدریس کا اولین موقع انہیں اپنی ابتدائی دورِ زندگی میں صرف شاہ جہاں پور میں ملا۔ لیکن اس کے بعد دہلی یونی ورسٹی کی ملازمت کے دوران انھیں متعدد سیمناروں میں لیکچر دینے کے لیے اور ادبی جلسوں میں تقریر کرنے کے بہت مواقع ملے۔

رشید حسن خاں تحقیق کرتے کرتے تدوین کے میدان میں بھی جوہر دکھانے لگے۔ انھوں نے متنی تنقید کے بنیادی مسائل پر اہم کتابوں کا بڑی عرق ریزی سے مطالعہ کیا اور اس میدان میں ان کی پہلی کتاب ''فسانۂ عجائب'' ہے۔ اس کے علاوہ رشید حسن خاں نے ''باغ و بہار''، ''مثنوی گلزارِ نسیم''، ''مثنوی سحر البیان''، ''مثنویاتِ شوق'' جیسی اہم کلاسیکی ادب کی کتابوں کے تنقیدی اڈیشن بھی تیار کیے۔ یہ تمام کتابیں مولوی عبدالحق سیریز کے تحت ''انجمن ترقی اُردو ہند'' سے شائع ہوئیں۔ ان کتابوں کے علاوہ رشید حسن خاں نے ''انتخاب ناسخ''، ''انتخاب سودا''، ''انتخاب شبلی''، ''انتخاب نظیرا کبرآبادی''، ''انتخاب مراثی انیس و دبیر'' وغیرہ بھی مرتب کر کے شائع کیں۔ ان کتابوں کے علاوہ رشید حسن خاں نے دو اور اہم کتابیں بھی مرتب کیں۔ جو ''مصطلحات ٹھگی'' اور ''زٹل نامہ'' ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' ''تلاش و تعبیر'' اور ''تفہیم'' جیسی معرکہ کی کتابیں بھی لکھیں۔ یہ کتابیں ہمیں رشید حسن خاں کے تحقیقی، تدوینی اور تنقیدی نظریات کو سمجھنے میں آسانی پیدا کرتی ہیں، اب میں رشید حسن خاں کی تخلیقی و تدوینی کاوشیں اور ان کو ملے اعزاز و انعامات، وزیٹنگ فیلو اور ادبی تقاریر کا محاسبہ کرنے کی سعی کروں گا۔ رشید حسن خاں کی مطبوعات کی فہرست درج ذیل ہے۔

تصنیفات/ تالیفات/ تدوینات

1. انتخاب نظیر اکبرآبادی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1970
2. انتخاب مضامین شبلی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1971
3. انتخاب مراثی انیس و دبیر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1971
4. دیوان درد مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1971
5. دستۂ گل (پیش لفظ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شنکر لال مرلی دھر میموریل سوسائٹی، نئی دہلی، 1972
6. انتخاب سودا مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1972
7. انتخاب ناسخ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1972
8. اُردو اِملا ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی، 1974
9. اُردو کیسے لکھیں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1975
10. زبان اور قواعد (لغت، تلفظ، اور قواعد شاعری) ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی، 1976
    اشاعت اول 1976، اشاعت ثانی 1983
11. ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ ایجوکیشن بک ہاؤس، اشاعت اوّل، 1978
12. دیوان حالی (تدوین) اُردو اکادمی دہلی، کشمیری گیٹ، دہلی، 1987
13. تلاش و تعبیر (تنقیدی مضامین) دہلی اُردو اکادمی کی اعانت سے 1988
14. فسانۂ عجائب (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی 1990
    انجمن ترقی اُردو، لاہور، 1990
    دہلی اشاعت ثانی 1996
    اشاعت سوم، 2002
15. باغ و بہار (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 1992
    انجمن ترقی اُردو، لاہور، 1992
16. حیاتِ سعدی (تعارف) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1992
17. تفہیم (تنقیدی اور تحقیقی مضامین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1993
18. انشاء اور تلفظ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994
19. عبارت کیسے لکھیں؟ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994

20. انشاء غالبؔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994

21. مثنوی گلزارِنسیم (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 1995

22. انتخاب کلام ناسخؔ کراچی، پاکستان، 1996

23. مثنویات شوقؔ (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 1998

24. تدوین، تحقیق، روایت ایس۔اے۔پبلی کیشنز، دہلی، 1999

25. مثنوی سحرالبیان (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2000

26. اِملائے غالبؔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2000

27. انتخاب نظیرا کبرآبادی (ہندی) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2001

28. مصطلحات ٹھگی (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2002

29. کلیات جعفرزٹلی (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2003

30. کلاسیکی ادب کی فرہنگ (جلداول) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2003

31. ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری کچھ ان کی زبانی انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2009

32. دہلی کی آخری شمع (پیش لفظ) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2009

33. گذشتہ لکھنؤ (مقدمہ) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 2011

34. مقدمہ شعروشاعری مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 2013

35. گنجینۂ معنی کا طلسم (جلداول) غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 2017

36. گنجینۂ معنی کا طلسم (جلددوم) غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 2018

37. گنجینۂ معنی کا طلسم (جلدسوم) غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 2019

رشید حسن خاں تقریباً 37 برس تک دہلی میں رہے۔ اس لحاظ سے انھوں نے ایک طویل ادبی زندگی یہاں گزاری۔ برِصغیر کے ادبی حلقوں میں ان کو انتہائی عزت و احترام حاصل تھا۔ اس لیے برِّصغیر کی مختلف یونی ورسٹیاں اپنے یہاں رشید حسن خاں کو لیکچر دینے کے لیے مدعو کرتی تھیں۔ جن اداروں، شعبوں اور سیمناروں میں رشید حسن خاں نے صحتِ املا، اصول تحقیق، زبان وقواعد، مشرقی شعریات اور قواعد شاعری کے علاوہ دوسرے موضوعات پر خطبہ دیے ان کی ترتیبِ فہرست درج ذیل ہے۔

1. انٹرنیشنل نیاز سیمنار کراچی، پاکستان، 1984

2. اصول تحقیق (5 لیکچر) شعبۂ اُردو، ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی 24 تا 28 فروری، 1986

3. مولانا آزاد سیمنار ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی، 1989

4. مشرقی شعریات (6 لیکچر) شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی نومبر، 1991

5. مشرقی شعریات (3 لیکچر) جواہرلال نہرو یونی ورسٹی، دہلی

6. اصول تحقیق (3 لیکچر) جواہرلال نہرو یونی ورسٹی، دہلی

7. اصول تدوین پر (3 لیکچر) جواہرلال نہرو یونی ورسٹی، دہلی

8. نیاز لیکچر کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے کراچی، پاکستان 29 نومبر 1991 سے آگے

9. تصوف اور تحقیق (ا لیکچر) اورینٹل کالج، لاہور پاکستان 1992

10. اخلاقیات تحقیق (1 لیکچر) خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ 24 جولائی 1993

11. مشرقی شعریات پر (3 لیکچر) شعبہ اُردو، ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی ستمبر 1995

12. کلاسیکی ادب کی تفہیم (3 لیکچر) شعبہ اُردو، ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی ستمبر 1995

13. تین سو سالہ جشن یادگار اورنگ آباد مہاراشٹر شاہ سراج اورنگ آبادی

14. شیرانی سیمنار خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ

15. اصول تدوین سیمنار خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ

16. چکبستؔ سیمنار رمہاراشٹر اُردو اکادمی، ممبئی

17. دکنی ادب سیمنار ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی

18. عوامی ادب سیمنار شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی

19. نصابِ تعلیم سیمنار دہلی اُردو اکادمی، دہلی

20. اصنافِ ادب سیمنار دہلی اُردو اکادمی، دہلی

21. دلّی والے، دہلی اُردو اکادمی، دہلی

22. فانیؔ سیمنار رالٰہ آباد

23. نیازؔ سیمنار یوپی اُردو اکادمی، لکھنؤ

24. سیمابؔ سیمنار سینٹ جانس کالج، آگرہ

25. جوشؔ سیمنار شیعہ کالج، لکھنؤ

26. جوشؔ سیمنار یوپی اُردو اکادمی، لکھنؤ

27. انٹرنیشنل غالبؔ سیمنار، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی

28. دکنی ادب سیمنار، شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی

29. انٹرنیشنل اِملا سیمنار، شعبۂ اُردو ممبئی یونی ورسٹی، ممبئی

30. مولانا آزاد صدی تقریبات سیمنار، یوپی اُردو اکادمی، لکھنؤ

31. سوسالہ جشن اورینٹل کالج، لاہور، پاکستان، دسمبر، 1995

32. دوسوسالہ جشن رضا لائبریری، رام پور، اتر پردیش 27/جولائی، 1998

33. سالانہ جلسہ راجستھان اُردو اکادمی، راجستھان، اپریل، 2000

34. نیاز فتح پوری سیمنار کراچی پاکستان، دسمبر، 2001

اِملا ورک شاپ کا انعقاد

ہندوستان کے مختلف صوبوں کے شعبۂ تعلیم نے پرائمری، انٹر کالج، ڈگری کالج اور یونی ورسٹیوں میں درس وتدریس کے فرائض کو انجام دینے والے اُردو اساتذہ کے لیے مختلف اوقات میں تربیتی پروگرام کنڈکٹ کیے جن میں رشید حسن خاں کو اِملا، زبان وقواعد کے مسائل پر لکچر دینے کے لیے خاص طور پر مدعو کیا جاتا رہا۔ جن ورک شاپ میں خاں صاحب نے حصہ لیا ان کی ترتیب اس طرح ہے:

1. یونی ورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے 3 ہفتے کا تربیتی کورس شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی، جموں۔ یکم جنوری سے 21 جنوری 1981 تک
2. ہائر سیکنڈری اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے دس دن کا تربیتی کورس (صحتِ اِملا)
3. پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے صحتِ اِملا کا تربیتی کورس، علامہ اقبال ایجوکیشنل سوسائٹی، ہبلی، کرناٹک۔ 27 مئی سے 3 جون 1983 تک
4. پرائمری اور ہائر سیکنڈری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے صحت اِملا کا پانچ دن کا تربیتی کیمپ ''کارواں'' زیر اہتمام کرناٹک اُردو اکادمی، بنگلور، 1985
5. اُردو اِملا کی معیار بندی پر تین روزہ سیمنار۔ اُردو ٹیچنگ ریسرچ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز (حکومت ہند) لکھنؤ، 28 دسمبر سے 30 دسمبر 1987 تک
6. پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے اِملا ورک شاپ، 17 اکتوبر سے 24/اکتوبر 1989، احمد آباد، گجرات
7. ممبئی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں 5 دن کی ورکشاپ منعقد ہوئی۔ 11 جنوری سے 15 جنوری 1990 تک

وزیٹنگ فیلو

رشید حسن خاں کو ملک کی کچھ یونی ورسٹیوں نے اپنے یہاں وزیٹنگ فیلو بھی مقرر کیا۔ وزیٹنگ فیلو کی حیثیت سے انھوں نے مختلف موضوعات پر لکچر دیے جن کی ترتیب حسب ذیل ہے:

1. شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی، تین ہفتے کے لیے بحیثیت وزیٹنگ فیلو، اصول تحقیق، قواعد زبان اور مشرقی شعریات پر لکچر دیے۔ اپریل 1983

2. شعبۂ اُردو ممبئی یونی ورسٹی میں بحیثیت وزیٹنگ فیلو دو ماہ کے لیے۔ اصول تحقیق، قواعد زبان، قواعد شاعری اور علوم بلاغت پر لکچر دیے۔ فروری، مارچ 1992

3. شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی میں بحیثیت وزیٹنگ فیلو 4 ہفتے کے لیے۔ متن کی قرأت، کلاسیکی ادب کی تفہیم، علوم بلاغت اور اصول اِملا پر لکچر دیے۔ دسمبر 1995

4. شاعری اور علوم بلاغت پر لکچر دیے۔ دو ماہ کے لیے۔ فروری، مارچ 1992

5. شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی میں بحیثیت وزیٹنگ فیلو، 3 ہفتے کے لیے۔ 26 جنوری سے 14 فروری 1990 تک

انعامات واعزازات

رشید حسن خاں کی علمی وادبی خدمات کے مدِّ نظر ہندو پاک کے مختلف اُردو اداروں اور انجمنوں نے انھیں مختلف ادبی انعامات واعزازات سے نوازا۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

1. دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ 1977
2. یو پی اُردو اکادمی ایوارڈ 1978
3. غالب ایوارڈ 1979
4. امتیاز میر اعزاز (آل انڈیا میر اکادمی، لکھنؤ، 1980
5. نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی) 1989
6. نیشنل ایوارڈ، مہاراشٹر اُردو اکادمی 1990
7. محمد طفیل ادبی ایوارڈ (لاہور، پاکستان) 1990
8. نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی) 1991
9. کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (دہلی اُردو اکادمی) 1991
10. نیشنل حالی ایوارڈ (ہریانہ اُردو اکادمی) 1992
11. نوائے میر ایوارڈ (آل انڈیا میر اکادمی، لکھنؤ) 1993
12. یو پی اُردو اکادمی انعام 1994
13. پرویز شاہدی ایوارڈ (مغربی بنگال) 1996
14. یو پی اُردو اکیڈمی ایوارڈ 1996
15. افتخار میر (آل انڈیا میر اکادمی لکھنؤ) 1997
16. مولانا ابوالکلام آزاد (یو پی اُردو اکادمی لکھنؤ) 1998
17. مدھیہ پردیش اُردو اکادمی ایوارڈ 2004

☆☆☆

رشید حسن خاں: چند جھلکیاں

نیّر مسعود

''میرا ارادہ ہے کہ دو سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھوں ''ادبی تحقیق کے اصول اور طریق کار'' کے نام سے۔ خاکہ بھی بنالیا ہے لیکن کام کب شروع ہوگا، اس کی خبر نہیں۔ بات یہ ہے کہ اب جی نہیں لگتا۔ کبھی کبھی تو سارا کاروبار فضول ہونے لگتا ہے اور ساری بحث ''غریب اکبر کی پردے کی بحث'' معلوم ہوتی ہے اچھے اچھے اساتذہ بے ایمانی اور دُنیا داری میں لگے ہوئے ہیں اور ان کے شاگرد بھی اُستاد کے نقشِ قدم پر چلنا سیکھ رہے ہیں۔ ایسے میں اصول وضوابط کی کسی کو ضرورت نہیں۔ اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم لوگ لکھنے کے متعدی مرض میں مبتلا ہیں۔ اس احساس کے ساتھ کوئی مربوط کام کیسے ہوگا؟''

❖ ❖ ❖

''دیکھیے صاحب! میرا اصل میدان تھا ٹریڈ یونین کا کام۔ زندگی کے چھ سات سال اس کی نذر کیے۔ یہ سلسلہ 1946 میں ٹوٹ گیا۔ دوسرا ذوق تھا اسپورٹس کا، ہاکی، فٹ بال، والی بال ٹیبل ٹینس اور باسکٹ بال۔ 15، 20 سال خود بھی ہاکی کھیلی ہے۔ اب آج کل میرا زیادہ وقت اسی کھیل میں کود کی نذر ہوجاتا ہے۔

مزاجِ من از حالِ طفلی نہ گشت

...اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح وقت کو صرف کرنا چاہیے تھا۔''

❖ ❖ ❖

''صاحب! میں تو دعا گو ہوں اور جو کچھ ملے اس پر شکر گزار، لہٰذا میری ناخوشی یا ناراضی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پٹھان اب شیخ جی بن چکا ہے۔''

❖ ❖ ❖

''...جلسہ سات بجے ہے۔ اگر آپ کچھ پہلے آجائیں تو خوب ہو... خدا جانے کیسے کیسے ہونقوں کا وہاں دیدار ہوگا اور کون کون غلام صورت بقّال سیرت براجمان ہوگا! ابھی سے گھبرا رہا ہوں... شام کو ذرا جلد جائیے گا۔ میر صاحب کے صفر اور بنیے کے ساتھ والی حکایت تو یاد ہوگی! وہی حال ہوگا وہاں۔''

❖ ❖ ❖

''سچی بات تو یہ ہے اس متن نے مجھے تھکا مارا ہے۔ اس قدر صبر آزما کام سے کام سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ معلوم نہیں یار لوگوں نے کس طرح اب تک اسے نپٹایا ہے اور اساتذہ نے پڑھایا ہے۔''

❖ ❖ ❖

''تحریک کے خاص نمبر میں ''غیر معتبر حوالے'' کے عنوان سے میرا ایک مضمون چھپا ہے۔ کیا آپ کی نظر سے گزرا۔''

❖ ❖ ❖

''ہاں برادر! 8 جولائی کو (7:45 بجے سے 8:15 بجے شام) ایک تقریر ہے ''ادب کا مقصد اخلاقی قدروں کا فروغ''۔ میں نے اپنی بات کہی ہے اور جی چاہتا ہے کہ اُسے آپ ضرور سُن لیں۔ میں نے عنوان کے آگے سوالیہ نشان بنالیا ہے۔ اور اسی کی تشریح کی ہے کہ یہ سب چوتیاپے کی باتیں ہیں۔''

(مکاتیبِ رشید حسن خاں بہ نام نیّر مسعود)

''بھئی رشید حسن خاں سے ضرور ملنا ہے''، میں نے شمس الرحمٰن فاروقی سے کہا۔ وہ بولے۔ ''ہاں ہاں چلیے۔ میری بھی عرصے سے ملاقات نہیں ہو پائی ہے۔''

دہلی یونی ورسٹی کے گائر ہال میں کئی غلط کمروں پر دستک دینے کے بعد آخر ایک دانائے راز نے صحیح کمرے کی نشان دہی کی۔ دستک دی گئی۔ کمرے کے اندر سے جواب ملا۔ اور ہم لوگوں کو اطمینان ہوا کہ نئی دہلی سے پُرانی دہلی کی لمبی دوڑ بے کار نہیں گئی۔

❖ ❖ ❖

بیس پچیس برس پہلے مرحوم اختر تلہری میرے والد صاحب سے ملنے آئے تو ان کے ساتھ ایک سنجیدہ صورت جوان بھی تھے۔ بعد میں والد صاحب نے بتایا کہ ان

صاحب کا نام رشید حسن خاں ہے۔ پھر انھوں نے ان کی لیاقت اور ذہن کی رسائی کی تعریف کی اور ادبی قحط الرجال میں انھیں ایک استثنا قرار دیا۔اس طرح رشید حسن خاں کا نام میرے ذہن میں پڑا رہ گیا۔اس کے بعد وقتاً فوقتاً ان کی تحریریں نظر سے گزرتی رہیں۔

بعض کتابوں کے متعلق سُننے میں آیا کہ یہ دراصل رشید حسن خاں کا ثمرہ ہیں۔اگر چہ ان کتابوں مرتب یا مولف کی حیثیت سے ان کا نام درج نہیں ہوتا تھا۔ پھر علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو کی پہلی جلد پر اُن کے طویل تبصرے کا غلغلہ ہوا اور یہاں تک مشہور ہوا کہ اس تبصرے کی وجہ سے تاریخ ادب کا وہ پورا منصوبہ ہی ختم ہو گیا۔اسی کے ساتھ ایک احتسابی نقاد اور محقق کی حیثیت سے رشید حسن خاں کی شہرت ہوگئی۔اور اسی کے ساتھ یہ اندیشہ بھی پیدا ہوا کہ اب ان کا قلم نکتہ چینی ہی کے میدان میں دوڑ سکے گا۔لیکن ''اُردو املا'' جیسی ضخیم تصنیف پیش کر کے انھوں نے اس اندیشے کو دور کر دیا۔

78 تک رشید حسن سے میری کوئی خاص واقف کاری نہیں تھی البتہ 75 میں انھوں نے والد محترم کی تعزیت میں مجھے خط لکھا تھا اور 77 میں جب وہ کسی کام سے لکھنؤ آئے تو زبانی تعزیت کے لیے میرے مکان پر بھی آئے تھے لیکن میں موجود نہیں تھا اس لیے ملاقات نہیں ہوسکی۔78 میں انھوں نے مجھے رجب علی بیگ سرورؔ کی کتاب ''سرورِ سلطانی'' جو توکل بیگ حسینی کے خلاصۂ شاہنامہ ''شمشیر خانی'' کا ترجمہ ہے، اس کی طلب میں خط لکھا۔رشید حسن خاں غالباً اس زمانے میں ''شمشیر خانی'' کو مرتب کرنے کا ارادہ کر رہے تھے اس سلسلے میں انھوں نے اُن سے میری خط و کتابت ہوئی۔ پھر انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ وہ رجب علی بیگ سرورؔ کی داستان ''فسانۂ عجائب'' کی تدوین کر رہے ہیں اور اس کتاب کے بعض لفظوں کے متعلق دریافت کیا کہ اہلِ لکھنؤ انھیں کس طرح بولتے ہیں۔اس دوران انھوں نے مجھے اپنی کتاب ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' بھیجی۔ میں نے کتاب پڑھ کر ان کا شکریہ ادا کیا اور انھوں نے جواب میں شکریہ ادا کیا کہ میں نے کتاب پڑھی:

> ''اُردو کے (مجھ جیسے) مصنف کی مشکل یہ نہیں کہ کتاب چھپ تو جاتی ہے، کسی طرح سہی، مثلاً یہی کتاب چھپ گئی (بس یہ ہوا کہ ناشر نے معاوضہ نہیں دیا، ایک نیا پیسہ بھی نہیں، چھاپنے کی شرط ہی یہ تھی) لیکن اس کی سب سے بڑی مشکل ہے پڑھنے والے کی تلاش۔دانش گاہوں میں مشکل سے چار فی صد یا تین فی صد اساتذہ ایسے ہوں گے جو مطالعہ فرماتے ہیں، باقی سب ترقی کے بجّے کرتے رہتے ہیں۔ایسے قحط کے عالم میں جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص نے کتاب پڑھی ہے تو کس قدر مسرت ہوتی ہے، اس کو صحیح طور پر بیان کرنا مشکل ہے۔آپ نے کتاب پڑھی اس کا شکریہ....ناشر سے طے یہ ہوا تھا کہ وہ معاوضے کے بدلے کچھ جلدیں گے اور انھوں اپنا وعدہ وفا کیا۔ میں نے یہ کیا کہ ان سب جلدوں کو ایسے لوگوں کے نام روانہ کر دیا جن کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ اس طرح کی تحریروں کو پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔''

ان سطروں میں مجھے وہی ہمہ نا اُمیدی ہمہ بدگمانی والی کیفیت محسوس ہوئی جو رشید حسن خاں کے بیش تر مضامین میں محسوس ہوئی تھی۔ان مضامین نے میرے ذہن ایک آزردہ اور برافروختہ نقاد کا نقش بنایا تھا۔ان کے چبھتے ہوئے تنقیدی جملوں کی زہر آلودگی مجھے دل چسپ معلوم ہوئی تھی۔لیکن اس اندازِ تحریر کی وجہ سے یہ خیال ہوتا تھا کہ ان کی شخصیت زیادہ خوش گوار نہ ہوگی۔''فسانۂ عجائب'' کے سلسلے کی خط و کتابت آگے بڑھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اُردو میں پہلی بار نثری متن کی تدوین کا حق ادا ہو رہا ہے۔ ہر دوسرے خط میں رشید حسن خاں سرورؔ کی چیرہ دستیوں کی شکایت کرتے (''صاحب اس متن نے تو مجھے ناچ نچا دیا'') لیکن ساتھ ہی فسانۂ عجائب کے کسی لاَنحیل مقام کے حل ہو جانے کا مژدہ بھی دیتے۔غرض ایسا معلوم ہوتا کہ دن رات مرزا رجب علی بیگ اور رشید حسن خاں میں جنگ ہو رہی ہے جس میں کبھی مرزا کے لیے مغفور غالب رہتے ہیں، کبھی خان موصوف، اور یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ آخر مرزا صاحب کو میدان چھوڑنا پڑے گا۔خطوں میں اس محاذ جنگ کی تازہ ترین خبروں کے علاوہ رشید حسن خاں خود بھی بہ تدریج نشتر ہو رہے تھے جس سے خیال ہونے لگا کہ وہ دل چسپ آدمی ہیں۔اور میں نے سوچا کہ ان سے ملنا چاہیے چناں چہ 1980 کی گرمیوں میں دہلی جانے سے پہلے میں نے انھیں خط لکھ دیا کہ دہلی آ رہا ہوں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے یہاں قیام ہوگا اور آپ سے بھی ملاقات کروں گا۔

❖ ❖ ❖

کمرا حسبِ توقع ویسا ہی تھا جیسا رشید حسن خاں کے کمرے کو ہونا چاہیے، یعنی کتابوں سے بھرا ہوا، خود رشید حسن خاں البتہ خلافِ توقع کچھ بزرگ نما نظر آئے۔لیکن کسی بھی شخص سے لمبے عرصے کے بعد دیکھیے تو سب سے پہلے اس پر جمی ہوئی ماہ و سال کی گرد نظر آتی ہے جو ذرا دیر میں چھٹ جاتی ہے۔مزاج پُرسیوں کے بعد اِدھر اُدھر کی گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے ''فسانۂ عجائب'' کی پیش رفت کے بارے میں دریافت کیا۔

''جی ہاں! کام ہو رہا ہے۔''انھوں نے بے دلی سے جواب دیا تھا۔اور موضوع بدل دیا۔کچھ دیر بعد میں نے پھر انھیں ''فسانۂ عجائب'' کی راہ پر لانا چاہا۔اور انھوں نے پھر سرسری جواب دے کر کوئی اور ذکر چھیڑ دیا۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس گفتگو سے گریز کیوں کر رہے ہیں۔یہ ادائیں تو پی۔ایچ۔ڈی کرنے والوں کی ہوتی ہیں۔اتنے میں فاروقی صاحب نے کسی سلسلے میں میرا نام لیتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا۔رشید حسن خاں چونک کر بولے:''اچھا آپ نیّر صاحب ہیں؟''فاروقی صاحب نے قہقہہ لگایا اور میں نے پوچھا''میرا خط آپ کو نہیں ملا؟''

''نہیں، ارے بھائی آپ سے تو بہت سی باتیں کرنی ہیں۔خوب، کب آئے؟ صاحب اس فسانۂ عجائب نے تو...''

لیکن اس دن ''فسانۂ عجائب'' کے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں ہوئی۔ طے ہوا کہ خاں صاحب فاروقی صاحب کے یہاں آئیں گے اور وہاں تفصیل کے ساتھ گفتگو ہوگی۔

مقررہ دن مقررہ وقت سے خاصی دیر کے بعد خاں صاحب تشریف لائے۔ سبب یہ تھا کہ انھیں کالونی کا نام تو یاد تھا لیکن فاروقی صاحب کے مکان نمبر کا خیال نہیں رہا تھا گویا حوالے میں کتاب کا نام تھا صفحہ نمبر غائب تھا۔

''پھر آپ یہاں کس طرح پہنچے؟'' میں نے پوچھا ''اتنی بڑی کالونی میں کوئی مکان تلاش کرنا...؟

''بھائی ہر کالونی میں ایک مارکیٹ ضرور ہوتی ہے۔ بس میں سیدھا مارکیٹ پہنچا۔ وہاں جنرل مرچینٹ کی دکان پر بیٹھے ہوئے سردار جی سے ترقی اُردو بورڈ کے ڈائریکٹر فاروقی صاحب کا مکان پوچھا۔ انھوں نے کھٹ سے بتا دیا کہ پچاسی نمبر ہے۔'' اس طرح ان کی تحقیقی مہارت کام آ گئی کہ انھوں نے مستند ماخذ تک پہنچ کر معتبر حوالہ ڈھونڈ نکالا۔

فاروقی صاحب معذرت کر کے دفتر چلے گئے تو ہم لوگوں نے فسانۂ عجائب چھیڑا۔ ''بھائی متن مکمل کر چکا ہوں۔ کاتب کو سامنے بٹھا کر کتابت کرا رہا ہوں۔'' رشید حسن خاں نے چند کتابت شدہ صفحے دکھائے۔ آفسیٹ کتابت میں اعراب اور علامتِ اوقاف سے درست عبارتیں دیکھ کر آنکھیں روشن ہوئیں۔

''اساس نسخہ آپ نے کسے قرار دیا۔'' ''افضل المطابع کان پور کا 1276ھ والا اڈیشن۔''

''لیکن وہ تو متداول اڈیشن سے خاصا مختلف ہے۔ منشی نول کشور نے 'فسانۂ عجائب' کا حقِ اشاعت خرید کر جو اڈیشن 1282ھ میں...''

''جی ہاں! متداول اڈیشن تو اسی پر مبنی ہیں۔ لیکن نول کشوری اڈیشن دراصل 'فسانۂ عجائب' کی اولین اشاعتوں کے مطابق ہے۔ سرورؔ عرصے تک اس کتاب میں ردو بدل کرتے رہے۔ اسی متن اصولاً اس کو ہونا چاہیے جس میں مصنف نے آخری بار ردوبدل کیا ہو۔ اور وہ یہی 1276ھ والے اڈیشن کا متن ہے۔ مگر بھائی، پوچھیے مت اس متن کی تیاری میں کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں۔''

میں نے انھیں متن کے معرکہ سر کر لینے کی مبارک باد دی اور اس پر خوشی ظاہر کی کہ متن کی کتابت بھی نہایت صحت کے ساتھ ہو رہی ہے۔ چند ماہ بعد پٹنہ کے ایک سمینار میں رشید حسن خاں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُن کی اور ''فسانۂ عجائب'' کی خیریت دریافت کی تو بولے:

''ارے صاحب عجب حادثہ گزرا۔ سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔''

مجھے خیال ہوا کہ شاید کتابت شدہ اوراق تک بارش کی سیلن پہنچ گئی۔ لیکن خاں صاحب نے بتایا کہ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں انھیں اسی افضل المطابع کا چھپا ہوا ''فسانۂ عجائب'' کا ایک بعد کا اڈیشن ملا ہے۔ ''اور اس میں ظالم نے بہت سی تبدیلیاں کر دی ہیں۔''

''انا للّٰہ! پھر؟''

''ساری کتابت اور محنت بے کار ہو گئی۔ اب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ نئے سرے سے متن تیار کیجیے اور کتابت کرائیے۔ اس لیے کہ اساسی متن اصولاً اس کو ہونا چاہیے جس میں مصنف نے آخری بار ردوبدل...''

''درست... خدا کرے جب اس متن کو تیار کر کے آپ کتابت مکمل کرا لیں تو ''فسانۂ عجائب'' کا ایک اڈیشن اس کے بھی بعد دست یاب ہو جس میں سرورؔ نے ایک بار پھر ردوبدل...''

''ارے صاحب ایسی بددُعا نہ دیجیے... کیا بتاؤں اس دریافت سے جو کوفت ہوئی ہے، لیکن خوشی بھی ہوئی ہے۔ اگر کتاب چھپنے کے بعد یہ اڈیشن دریافت ہوتا تو میں کہیں کا نہ رہتا۔ پٹنہ آنے کا یہ بڑا فائدہ ہوا۔'' پٹنہ کا وہ سمینار محمود شیرانی کی یاد میں اور تحقیق کے مسائل پر تھا۔ سمینار میں ایک مقالہ پڑھا جا رہا تھا۔ رشید حسن خاں نے ایک پرچے پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس پر کچھ لکھ کر ان کی طرف اور انھوں نے کچھ لکھ کر پھر میری طرف بڑھا دیا۔ جو صاحب مقالہ پڑھ رہے تھے انھوں نے تھوڑا اُرک کر تشویش بھری نظروں سے نامہ و پیام کی اس کاروائی کو دیکھا اور پھر مقالہ پڑھنے لگے۔ انھیں شاید یہ خیال ہوا کہ ان کے مقالے پر کوئی زبردست اعتراض وارد ہونے والا ہے۔ لیکن دراصل خاں صاحب نے اس پرچے پر اپنے محقق دوست کی شان میں ایک نیم فحش رباعی موزوں کر کے مجھ سے دادطلب کی تھی۔

سمینار کے ایک وقفے میں انھوں نے مجھ سے کہا: ''بھئی عمدہ چائے کو جی چاہ رہا ہے۔ چلیے شہر کے کسی اچھے ہوٹل میں چل کر چائے پی جائے۔'' ''مگر معلوم نہیں اس اچھے ہوٹل میں چائے بھی اچھی ملے گی یا نہیں۔''

''ضرور ملے گی صاحب، رہبری کے لیے فرشتۂ رحمت موجود ہے۔'' تب میری نظر قریب کھڑے فرشتۂ رحمت پر پڑی۔ خاں صاحب نے معلوم نہیں کیوں کہاں سے ایک خوب رو نوجوان ڈھونڈھ نکالا تھا۔ یہ نوجوان ہمیں ایک صاف ستھرے ہوٹل میں لے گیا۔ چائے آئی۔ اس وقت سمینار کے اس اجلاس پر گفتگو ہو رہی تھی جس میں ایک مقالے پر اعتراض کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے کہا تھا کہ صوفیانہ مزاج تحقیق کے لیے مضر ہے۔ اس کا مطلب بعضوں نے یہ نکالا کہ وہ عمومی حیثیت سے تصوف پر معترض ہیں۔ میں نے

اعتراض کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ تحقیق کی بنیاد شک پر ہوتی ہے اور تصوف کی بنیاد یقین پر۔ تحقیقی مسائل کے حل کے لیے وہی مزاج زیادہ سودمند ہے جو...وغیرہ وغیرہ۔

ہم سمینار ہال کی طرف واپس جارہے تھے کہ دیکھا آگے آگے کچھ فاصلے پر پروفیسر سید حسن صاحب بھی اسی طرف جارہے ہیں۔ سید صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور انھوں نے اُس دن سمینار میں شرکت سے معذوری ظاہر کرکے ہم لوگوں کو گھر پر آنے کی دعوت دی تھی۔

''دیکھیے بالکل خیال نہیں رہا۔'' رشید حسن خاں نے سید صاحب پر نظر پڑتے ہی کہا۔ سوچا تھا واپسی میں سید صاحب کے یہاں چلیں گے۔ بڑی محبت سے بلایا تھا انھوں نے۔''

''لیکن وہ تو یہاں آگئے ہیں گھر پر ملتے ہی کب؟'' میں نے کہا اور خاں صاحب کے ذہن میں ایک تازہ مضمون آگیا۔ ''دیکھیے برادر اس وقت دو بج کر دس منٹ ہوئے ہیں سید صاحب یہاں آنے کے کوئی پندرہ منٹ پہلے گھر سے چلے ہوں گے۔ یعنی دو بجے سے کچھ پہلے۔ اور ہم لوگ دو بجے اُن کے یہاں پہنچے تھے۔ ٹھیک۔''

''ٹھیک'' میں نے کہا۔ کچھ دیر باہر رُک کر ہم ہال میں داخل ہوئے اور سید صاحب کو دیکھ کر چونک پڑے۔

''قبلہ آپ یہاں ہیں؟'' رشید حسن خاں نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''اور ہم لوگ سمینار چھوڑ کر آپ کے یہاں حاضر ہوئے تھے۔''

''ہیں، ارے کب؟''

''آپ ہی کے یہاں سے آرہے ہیں صاحب۔ ہم لوگ دو بجے پہنچے تو معلوم ہوا...؟

''دو بجے، ہائے! بس تھوڑی دیر پہلے میں گھر سے نکلا ہوں گا۔''

''جی ہاں، یہی معلوم ہوا کہ آپ ابھی ابھی تشریف لے گئے ہیں۔''

سید صاحب دیر تک متاسف اور شرمندہ رہے۔ لوگ یکے بعد دیگرے اُن کی مزاج پُرسی اور سمینار میں تشریف آوری پر خوشی کا اظہار کررہے تھے اور وہ ہر ایک کے جواب میں ہم لوگوں کی طرف اشارہ کرکے یہ ضرور کہتے:

''دیکھیے یہ بے چارے مجھ سے ملنے میرے گھر گئے لیکن میں یہاں چلا آیا۔''

پروفیسر نذیر احمد صاحب کا مقالہ تحقیق میں مستند اور غیر مستند شہادت کے مسئلے پر تھا۔ رشید حسن خاں کو خیال آیا اس سلسلے میں سید صاحب کے یہاں ہم لوگوں کی حاضری کے مسئلے کو بحث کا موضوع بنایا جائے۔ ظاہر ہے سید صاحب اور ان کے حوالے سے بہت سے دوسرے مستند حضرات یہ شہادت دیں گے کہ آج دو نیاز مند سید صاحب کے گھر گئے تھے۔ لیکن کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ اس مسئلے کو نہ چھیڑا جائے۔

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی جنرل کونسل میں نامزدگی اور اکاڈمی کی کچھ سب کمیٹیوں کی رکنیت کے بعد سے رشید حسن خاں کی لکھنؤ آنے کا اکثر موقع ملتا ہے۔ جنرل کونسل کے اجلاس (اپریل 1981) میں ان کی شرکت کا خاصا چرچا تھا اور توقع تھی کہ وہ اجلاس میں بھی سخت گیر نقاد کے فرائض بہ حسنِ وجوہ انجام دیں گے اور انھوں نے حسبِ توفیق اس توقع کو پورا بھی کیا۔ اسی اجلاس میں کونسل کے ایک رُکن نے خاں صاحب کو اپنی تازہ تصنیف پیش کی۔ جسے انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے، ان کی نظر انتساب کے صفحہ پر پڑ گئی۔ کتاب اُردو کے ایک نقاد کے نام معنون تھی جو خاں صاحب کے معیارِ حسن پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ انھوں نے فوراً قلم نکال کر نقاد کے نام پر خط کھینچا۔ لکھا، ''خدا غلام بنائے، غلام صورت نہ بنائے۔'' اور کتاب میری طرف بڑھا دی۔ مصنفِ کتاب میری برابر والی کرسی پر بیٹھے تھے اور اگرچہ میں نے کتاب فوراً بند کردی لیکن تاثراتی تنقید کے اس قولِ فیصل پر ان کی نظر پڑ ہی گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے خاں صاحب سے سرگوشی میں کہا:

''آپ نے غضب کردیا، انھوں نے پڑھ لیا۔''

''یہی تو میں چاہتا تھا۔'' خاں صاحب نے بڑی آسودہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کے بعد انھوں نے سرگوشی میں دورِ حاضر کے ادبی کاروبار پر ایک ہوش افزا اور ہوش ربا تقریر کی اور الحمدللہ کہ جوش میں آنے کے باوجود ان کی آواز بلند نہیں ہونے پائی اور مجمعِ سامعین کے فرائض میں تنہا انجام دیتا رہا۔ رشید حسن خاں کی احتسابی تنقید میں جو التہاب و اشتعال نظر آتا ہے وہ دراصل اسی تقریر کے چند نسبتاً کمزور اور دوستانہ فقروں کی بدولت ہے۔ تقریر میں انھوں نے نام بہ نام کئی مشاہیرِ ادب کے کارنامے بیان کیے جنھیں سن کر حیرت ہوئی کہ اپنی خاکستر میں ایسی چنگاریاں بھی موجود ہیں۔ یہ رشید حسن خاں کی محبوب تقریر ہے جو صرف بے تکلف صحبتوں کے لیے مخصوص ہے۔ تقریر میں ان مشاہیر کا تذکرہ تمام کرنے کے بعد وہ اپنی تحقیق و تنقید کا خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں:

''میں ان سب کو حرام زدگانِ ادب کہتا ہوں۔''

اور سننے والوں کو بھی ان غریبوں کی ولدیت مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔

❖ ❖ ❖

اسی موقع پر رشید حسن خاں میرے گھر تشریف لائے۔ آتے ہی انھوں نے میری چھوٹی بچی صائمہ سے دوستی کرلی اور بچی بھی فوراً ان سے مانوس ہوگئی۔ اس سے دیر تک

باتیں کرنے کے بعد انھوں نے جیب سے ایک نوٹ نکالا۔ میں نے احتجاج کیا تو بولے: ''آپ براہِ کرم اس معاملے میں دخل نہ دیں یہ کوئی تحقیقی مسئلہ نہیں۔ میرا اور صائمہ کا حساب کتاب ہے۔'' اس کے بعد سے وہ تقریباً ہر خط میں صائمہ کو ضرور یاد کرتے ہیں۔

''ارے بھئی آپ کہاں تھیں۔ ہم اتنی دیر سے آپ کو پوچھ رہے تھے۔ آیئے ہمارے پاس بیٹھیے، یہ بات ہوئی۔ ہاں تو برادر فسانۂ عجائب کا متن تین سو صفحوں میں آیا ہے اور ملحقات چار سو صفحوں میں۔ اس صورت میں...''

(اظہار 5 (پانچویں کتاب جنوری 1984 ممبئی) ناشرین باقر مہدی اور یعقوب راہی، صفحہ 53 تا 63)

☆☆☆

رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ

اطہر فاروقی

نام	:	رشید حسن خاں
والد کا نام	:	امیر حسن خاں
تاریخ ولادت	:	تعلیمی اسناد کے مطابق، 10 رجنوری، 1930
مقام پیدائش	:	شاہ جہاں پور (یوپی)
مستقل پتا	:	167- بارُوی زئی دوم۔ شاہ جہاں پور (اتر پردیش) 242001
ملازمت	:	آرڈیننس کلودنگ فیکٹری، شاہ جہاں پور
		مدرسہ فیض عام شاہ جہاں پور
		اسلامیہ ہائر سکینڈری اسکول، شاہ جہاں پور
		شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی
		31 دسمبر 1989 کو دہلی یونی ورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

رشید صاحب کے والد امیر حسن خاں صاحب ان پُرانے لوگوں میں سے تھے جو انگریزی تعلیم کو بُرا سمجھتے تھے۔ وہ پولیس میں ملازم تھے اور سب انسپکٹر تھے۔ تحریک عدم تعاون کے زمانے میں اس تحریک سے متاثر ہو کر انھوں نے سرکاری ملازمت سے سبک دوشی حاصل کر لی تھی۔

انھوں نے رشید صاحب کو شاہ جہاں پور کے عربی مدرسہ بحرالعلوم میں داخل کرایا، جہاں 1939 تک وہ زیرِ تعلیم رہے مگر درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کر سکے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی اور شاہ جہاں پور کی آرڈیننس فیکٹری میں کارکنوں کی بھرتی زور شور سے ہو رہی تھی۔ گھر کے معاشی حالات اچھے نہیں تھے، یوں وہ 1939 کے اواخر میں اس فیکٹری میں ایک معمولی ورکر کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے۔ اس فیکٹری میں 1941 کے آخر میں چھپ چھپا کر پہلی مزدور یونین بنائی گئی۔ شروع میں یونین کے جلسے گھروں میں میلاد شریف یا کیرتن کے بہانے سے ہوتے تھے۔ ایک سال کے بعد باقاعدہ سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ چند سال کے بعد اس فیکٹری میں یونین کی طرف سے ہڑتال کی گئی۔ یہ پہلی ہڑتال تھی جو اس آرڈیننس فیکٹری میں ہوئی تھی۔ یہ 34 دن تک چلتی رہی۔ رشید صاحب اس وقت مزدور یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے دو سال بعد فیکٹری میں چھٹنی ہوئی۔ نکالے جانے والوں کی فہرست میں ان لوگوں کے نام تھے جو یونین کے سرگرم رکن تھے، ان میں رشید حسن صاحب بھی تھے۔ ان کے بعد وہ شہر کے عربی مدرسہ فیضِ عام میں عربی اور فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لیے رکھ لیے گئے۔ چوں کہ داڑھی نہیں تھی اور دوسرے شعائر کی بھی پوری طرح پابند نہیں تھے، یوں عربی مدرسے کے طلبہ نے ان سے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد رشید صاحب کو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے لیے دوسری جماعت میں بھیج دیا گیا۔ اسی زمانے میں اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں فارسی، عربی کے اُستاد کی جگہ خالی ہوئی اور ان کو وہاں ملازمت مل گئی۔

اس ملازمت کے سلسلے کا ایک دل چسپ واقعہ یہ ہے کہ اسلامیہ اسکول کی اس جگہ کے لیے شہر کے ایک عالم اور مرشد بھی اُمیدوار تھے۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ ایک ایسے شخص کو ملازمت ملنے کا امکان ہے جو کمیونسٹوں کے ساتھ برسوں تک کام کر چکا ہے۔ کمیونسٹ تو دہریے ہوتے ہیں، لازماً یہ شخص بھی بے دین ہوگا۔ شہر کی ایک بڑی مسجد میں انھوں نے بعد نمازِ جمعہ یہ اعلان کیا کہ یہ شخص جو بے دینوں کے ساتھ رہا ہے اور خود بھی بے دین ہے، اسلامیہ اسکول میں اس کو جگہ نہیں ملنا چاہیے۔ مگر ان کی مشکل یہ تھی کہ شہر کے سب سے معروف عالم دین مولوی مجتبیٰ خاں (مرحوم و مغفور) جو رشید صاحب کے اُستاد بھی تھے، وہ رشید صاحب کے لیے کوشاں تھے۔ یوں مرشد موصوف کی آہ و فغاں بے کار گئی۔ البتہ ان کے اس 'اعلان' کا اثر یہ ضرور ہوا کہ مینجنگ کمیٹی میں جب یہ معاملہ پیش ہوا اور رائے لی گئی تو صرف ایک ووٹ کی بڑھت سے رشید صاحب کو اسکول کی ملازمت مل سکی تھی۔ مولوی محمد مجتبیٰ خاں صاحب کی کوشش کے نتیجے میں مینجنگ کمیٹی کے چیرمین خان بہادر فضل الرحمٰن خاں صاحب غیر جانب دار رہے تھے، ورنہ صورتِ حال مختلف ہو جاتی۔

فیکٹری کی ملازمت کے زمانے کے بہت سے واقعات رشید صاحب نے مجھے سنائے تھے۔ ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ اس فیکٹری میں اُس زمانے میں تین شفٹیں آٹھ آٹھ گھنٹے کی ہوتی تھیں۔ چوبیس گھنٹے کام ہوتا تھا۔ تیسری شفٹ میں جو صبح چھے بجے ختم ہوتی تھی، درمیان میں آدھ گھنٹے سے کچھ زیادہ کا وقفہ ہوتا تھا۔ لوگ ذرا آرام کر لیا کرتے تھے۔ رشید صاحب طلسم ہوش ربا کی جلد ساتھ لے کر جایا کرتے تھے اور اسے پڑھا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے طلسم ہوش ربا کی دسویں جلدیں (آٹھ اصل جلدیں اور دو بقیہ طلسم ہوش ربا) دو بار مکمل طور پر اسی زمانے میں پڑھی تھیں۔

باقر مہدی کے رسالے اظہار کے شمارہ 5 (جنوری 1984) میں پہلی بار گوشۂ رشید حسن خاں شامل ہوا تھا۔ اس میں رشید صاحب نے باقر مہدی صاحب کی فرمایش پر اپنے بارے میں لکھا تھا:

> ''میرے اُستادوں میں قابلِ ذکر نام مفتی مجتبیٰ حسن خاں صاحب (شاہ جہاں آبادی) مغفور و مرحوم کا ہے، جن سے میں نے عربی پڑھی تھی اور میری تربیت میں نمایاں حصہ انھی کا رہا ہے۔ اساتذۂ معنوی کی حیثیت سے شیرانی مرحوم، قاضی عبدالودود صاحب، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم اور مولانا عرشی مرحوم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات کی تحریروں سے میں نے صحیح معنوں میں تحقیق اور تدوین کے آداب سیکھے۔ لیکن ان سب سے مقدم نام نیاز فتح پوری کا ہے۔ جن کی تحریروں سے ابتدا ہی میں بہت کچھ سیکھا، تشکیک اور خطائے بزرگاں سمجھنے کا سبق پہلے سے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب تحقیق کے باضابطہ طالب علم کی حیثیت سے شیرانی صاحب اور قاضی صاحب کی تحریروں سے استفادہ کیا تو نیاز صاحب کا طلسم ٹوٹ گیا لیکن جو ابتدائی نقوش مرتسم ہو گئے تھے وہ اب تک کچھ نہ کچھ نمایاں ہیں۔ روایت سے بغاوت اور تشکیک ان میں خاص کر شامل ہیں اسی لیے میں نیاز صاحب کا بہت قائل رہا ہوں۔ کچھ دنوں تک تو معتقدانہ انداز رہا، لیکن پھر وہ بات تو نہیں رہی، رہ بھی نہیں سکتی تھی، لیکن قائل آج بھی ہوں۔ ناقدین میں (بعض اختلافات کے باوجود) میں کلیم الدین احمد کی بہت عزت کرتا ہوں اور ان کی تحریروں کو بہت توجہ سے پڑھتا ہوں۔ سرور صاحب کے مطالعے اور ذہانت کا میں قائل ہوں لیکن ان سے بس شکایت یہ ہے کہ انھوں نے تنقید کو انشائیے سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ تنقید کا رنگ دب سا گیا ہے اور منافقانہ اندازِ بیان کے لیے بڑی گنجایش پیدا ہو گئی ہے۔ احتشام صاحب سے بہ حیثیت انسان میں بہت متاثر تھا، ایسے شریف انسان بہت کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی تنقید نگارشات سے کبھی متاثر نہیں ہو سکا۔ خواجہ احمد عباس کی فلموں کی طرح وہ مجھے بے اثر محسوس ہوتی رہیں۔ البتہ مجنوں صاحب کے ذوق اور کلاسیکی ادب کے مطالعے سے ہمیشہ متاثر رہا۔ ناقدین میں کم لوگ شعر کے معاملہ میں مجنوں صاحب کی طرح خوش ذوق ہوں گے۔ ایسا رچا ہوا شعری ذوق کم ملتا ہے۔

مقدمہ انتخاب ناسخ بھی ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں پہلی بار یہ کہا گیا ہے کہ ناسخ سے اصلاحِ زبان کی جس تحریک کو منسوب کیا جاتا ہے وہ درست نہیں۔ یہ دراصل ان کے تلامذہ کے کارنامے ہیں جن کو محض سلسلۂ نسب درست کرنے کے لیے ان سے منسوب کر دیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا کہ ناسخ کا جو کلیات

چھپا ہے، اس میں مرتبِ کلیات اور تلمیذ ناسخ میر علی اوسط رشک نے بہت کچھ ترمیم اور اصلاح کی ہے۔
فسانۂ عجائب کی تدوین، یہ کتاب 700 صفحات پر مشتمل ہے۔ نصابی متن کی تدوینِ نو کی مثال کے طور پر اس کو مرتب کیا گیا ہے اس میں اعراب کا خاص طور پر التزام کیا گیا ہے اور ضمیموں میں اعراب اور دوسرے متعلقات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ ضمیمے کم وبیش چار سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس متن کی تیاری میں تین سال سے زیادہ عرصہ لگا ہے۔ یہ کتاب شعبۂ اُردو کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔
مشاغل میں سرِ فہرست اسپورٹس کو رکھنا چاہیے۔ ہاکی خود کھیلی ہے۔ اس لیے وہ میرا پسندیدہ ترین کھیل ہے۔ اس کھیل میں جو فن کارانہ دقت پسندی ہوتی ہے، میں اس کا عاشق ہوں۔ اس کے باسکٹ بال، والی بال اور فٹ بال کا نمبر ہے۔ میں اپنے وقت کا زیادہ حصہ ان کھیلوں کو دیکھنے میں صرف کرتا ہوں۔
ابتدائی تعلیم عربی مدرسے میں ہوئی تھی۔ اور درسِ نظامی کے طالب علم کی حیثیت سے شعور نے بالیدگی پائی تھی۔ اچانک 1941 میں ٹریڈ یونین کے دائرے میں آ گیا۔ میرے شہر شاہ جہاں پور میں اس زمانے کی بہت بڑی آرڈیننس فیکٹری تھی۔ جس میں تیس ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے۔ اس فیکٹری میں پہلی بار چھپ چھپا کر مزدوروں کی یونین بنالی گئی اور پھر 33 دن کی ہڑتال ہوئی۔ یہ 1945 کی بات ہے۔ میں اس یونین کا جوائنٹ سکریٹری تھا۔ اس دوران میں یوپی کے بیش تر لیڈروں اور کمیونسٹ پارٹی کے ذمہ داروں کو قریب ہو کر دیکھنے کا موقع ملا۔ اور جس قدر ان سے قریب ہوتا گیا اسی قدر ذہنی طور پر ان سے دور ہوتا گیا کیوں کہ ان سب کے دہرے کردار کا بازی گر پایا۔ چھل، فریب سے نا آشنا اور جوڑ توڑ سے بیگانہ جی توڑ کر کام کرتے تھے اور سب کچھ لُٹا دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ہم کو جو ملے تھے وہ اپنے سے اوپر والے لیڈروں کے کٹھ پتلی تھے اور دنیا داری، دنیا طلبی، مفاد پرستی اور پُر فریب باتیں کرنے میں ماہر تھے۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ورکر تو نچلے درجے سے نکل کر آیا تھا، لیکن اس کا لیڈر اوپر کے طبقے سے نکل کر آیا تھا اور اپنے ساتھ اپنے طبقے کے سارے تضاد لے کر آیا تھا۔ عرض کہ جس قدر حقیقت کھلتی گئی اسی قدر ورکروں میں اور لیڈروں میں خلیج بڑھتی گئی اور آخر کار مجھ جیسے، نا آشنائے مکرِ سیاست بالکل الگ ہو گئے۔ ان دنوں ایسے تلخ تجربے ان رہنماؤں کے ہوئے تھے کہ آج تک ان کی یاد باقی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ صورت حال رونما نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں بھی آج ترقی پسندی کا لیبل لگائے ہوئے ہوتا۔ ترقی پسند تحریک سے بچنے کی ایک وجہ یہ بھی پیدا ہو گئی کہ میں نے تنقیدی کتابیں پڑھنے سے پہلے وہ ادب پڑھا تھا اور اسی نے مجھے محفوظ رکھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ فارسی شاعری اور کلاسیکی اُردو ادب کی مطالعے نے ذہن میں ذوق اور معیار کا ایک تصور ضرور پیدا کر دیا تھا، جس نے صحافت، نعرے بازی اور ادب میں فرق کرنا سکھایا تھا اور فرد کی حیثیت اور شخصیت کے دائرے کی وسعت سے آشنا کیا تھا۔
میں 22، 23 سال سے دہلی میں ہوں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہاں کس شخص کی اصلی رائے کیا ہے۔ اس کے برخلاف آپ میرے چھوٹے سے شہر میں چلیے۔ پانچ منٹ میں معلوم ہو جائے گا کہ کس شخص کی اصلی رائے کیا ہے۔ خاندانی روایت، نسلی اثرات اور مقامی خصوصیات نے شروع ہی سے صاف گوئی کا عادی بنا دیا تھا۔ اسی نے تحقیق کی طرف متوجہ کیا اور اس میدان میں آ کر مجھے طبعی مناسبت کا اندازہ ہوا۔ لغت، زبان کے مسائل، عروض اور قواعد زبان جیسے موضوعات شروع میں میرے پسندیدہ موضوع تھے۔ ادبی تحقیق سے بھی تعلق خاطر تھا لیکن کچھ کم۔ 1960 سے اس طرف زیادہ توجہ مبذول ہوئی۔ شیرانی مرحوم کی تحریریں اولین رہنما کی حیثیت سے پیش نظر رہیں۔ اور پھر قاضی عبدالودود صاحب کی تحریروں نے متاثر کیا۔ ان دونوں کے یہاں سچ کو جھوٹ سے الگ کرنے کا جو انداز تھا، اس نے مجھے متاثر کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کی تحریروں نے بھی عرفان کی نئی روشنی بخشی۔

ادبی تحقیق اب میرا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔ میں اُس تنقید کا قطعاً قائل نہیں۔ جس میں انشائیہ نگاری کا اندازہ ہوا اور وہ اسلوب ہو جو منافق کی سخن آرائی کا ہوتا ہے۔ اس طرح میں اس تحقیق کو مکر شاعرانہ کا بدل سمجھتا ہوں جس میں صاف گوئی کے بجائے لیپنے پوتنے کا انداز ہو۔ چوں کہ حالات نے اب بیش تر افراد کو دنیا داری کے پھیر میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس لیے تحقیق کا یہ سادہ اور صاف انداز اُن کو پسند نہیں آتا اور اس کے لیے ان حضرات نے منفی اندازِ نظر کی ایک اصلاح وضع کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جھوٹ کو جھوٹ کہیں اور دوٹوک انداز میں رائے ظاہر کریں وہ تو منفی انداز والے ہوئے۔ اور جو لوگ ادب کے نام پر تجارت کو اور جہالت کو فروغ دیں، وہ مثبت اندازِ نظر والے ہوئے۔ آپ چور کو چور کہیں تو وہ بہت واویلا مچائے گا۔ یہی حال ان تاجرانِ ادب کا ہے۔
میں صاف، سادہ اور واضح اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دل چسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں گے یا منفی۔ ایسی فضول اصطلاحوں سے میں بہت دور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سچ کی تلاش ہے۔ مجھے شخص سے دل چسپی نہیں۔ اس نے جو کچھ کہا ہے یا لکھا ہے، اُس سے دل چسپی ہے۔ جھوٹ کوئی بھی بولے، وہ جھوٹ ہے۔ میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں۔

آج کل علم و ادب کو جس اسیری کے جال سمجھائے ہیں، گروپ بندی نے جس طرح دائرے بنائے ہیں اور دانش گاہوں میں جس انداز سے تحقیقی مقالوں کے نام پر کم سوادی کے اعلاترین نمونے تیار کیے جا رہے ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ تحقیق اپنی صاف گوئی اور صاف بیانی کے دائرے کو وسیع کرے۔ سچ واقعتاً کڑوا ہوتا ہے، اور تحقیق کا مقصد سچ کی تلاش ہے اس صورت میں اگر تحقیق نگارشات میں سچ کی تلخی شامل ہو تو اس کی شکایت نہیں کی جانا چاہیے۔ اگر علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کے نام سے، ایک کثیر رقم صرف کرنے کے بعد اور بہت دھوم دھڑ کے ے ساتھ ایک ایسی کتاب پیش کی جائے جس کو پشتارۂ اغلاط کہنا مناسب ہوگا اور کوئی شخص یہ بتائے کہ یہ کتاب مقالہ نگاروں اور مرتبین کی آسان پسندی اور بے پروائی کا شاہ کار ہے اور اس کے اندراجات اس قابل نہیں کہ انھیں معتبر قرار دیا جا سکے، تو اس میں شکایت کی بات کیا ہے؟ یہ عجیب بات ہے کہ ہم بے ایمانی کرنے والے کو تو کچھ نہیں کہنا چاہتے اور اگر کوئی شخص اس بے ایمانی کا پردہ فاش کرے تو اسے منفی اندازِ نظر کی نمائش قرار دینا چاہتے ہیں۔

تحقیق کو سچ کی تلاش رہتی ہے۔ جھوٹ کس نے بولا، یہ بھی ایک بات ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ جھوٹ کیوں بولا گیا، اور کیسے بولا گیا، اور کیسے بولا گیا۔ اس 'کیوں' اور 'کیسے' کی تلاش اور وضاحت تحقیق کا اصل مقصد ہے اور یہی میرا مشغلہ ہے۔''

میں ان حضرات کا خاص طور سے شکر گزار ہوں جنھوں نے میری درخواست پر مضامین لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ سب سے زیادہ شکر گزار ہوں شاہد علی خاں صاحب کا جنھوں نے یہ بہت اچھی روایت قائم کی ہے کہ اُردو زبان و ادب کے مشاہیر پر کتاب نما کے خاص نمبر مرتب کرائے جائیں اور پھر انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ شاہد صاحب نے اس خاص نمبر کی ترتیب کی ذمے داری میرے سپرد کی تھی۔ اس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

میں توقع کرتا ہوں کہ اس خاص نمبر میں شامل تحریروں سے رشید صاحب کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملے گ۔ ویسے تو کسی مصنف کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس مصنف کی تحریروں کو شروع سے آخر تک پڑھا جائے مگر یہ بھی درست ہے کہ مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے اہلِ قلم کے مضامین سے بہت روشنی ملتی ہے اور مصنف کی کچھ خوبیوں کو اور خصوصیتوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہی اس خاص نمبر کا مقصد ہے۔

مطبوعات

1. اُردو املا: ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی 1974
2. اُردو کیسے لکھیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1975
3. زبان اور قواعد (لغت، تلفظ اور قواعد شاعری): ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی
4. ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ: اشاعت اول، ایجوکیشن بک ہاؤس 1978۔ اشاعت ثانی اتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ۔ تیسری اشاعت: لاہور 1989
5. تلاش و تعبیر (تنقیدی مضامین)؛ (دہلی اُردو اکادمی کی اعانت سے) 1988
6. تفہیم: (تنقیدی اور تحقیقی مضامین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1993
7. انشا اور تلفظ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1994
8. عبارت کیسے لکھیں: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1994
9. انشائے غالب: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1994
10. فسانۂ عجائب (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1990۔ انجمن ترقی لاہور، 1990
11. باغ و بہار: (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1992۔ انجمن ترقی اُردو لاہور، 1992
12. مثنوی گلزارِ نسیم: انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1995
13. انتخاب ناسخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1972
14. انتخابِ سودا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1972
15. انتخابِ شبلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1971
16. انتخابِ نظیر اکبر آبادی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1970
17. انتخابِ مراثی انیس و دبیر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1971
18. دیوان خواجہ میر درد: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 1971
19. مثنویاتِ شوق لکھنوی (تدوین) انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی

20. غرائب اللغات (تدوین) زیر ترتیب

انعامات و اعزازات

1. دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ 1977
2. یو پی اُردو اکیڈمی انعام 1978
3. غالب ایوارڈ 1979
4. امتیازِ میر اعزاز (میر اکیڈمی لکھنؤ) 1980
5. نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی) 1989
6. نیشنل ایوارڈ، مہاراشٹر اُردو اکادمی 1990
7. محمد طفیل ادبی ایوارڈ 1990
8. کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (دہلی اُردو اکادمی) 1991
9. نیشنل حالی ایوارڈ (ہریانہ اُردو اکادمی) 1992
10. یو۔پ اُردو اکادمی ایوارڈ 1994

مختلف اداروں میں اصول تحقیق، صحت املا: مشرق شعریات، قواعد زبان اور قواعد شاعری پر بہت سے لکچر دیے

- اصول تحقیق پر پانچ لکچر، شعبۂ اُردو، بمبئی یونی ورسٹی (24/فروری سے 28/فروری، 1986)
- مشرقی شعریات پر چھے لکچر، شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی
- مشرقی شعریات پر تین لکچر، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی
- اصول تحقیق پر تین لکچر، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی
- اصول تدوین پر تین لکچر، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی
- مشرقی شعریات پر تین لکچر، شعبۂ اُردو، بمبئی یونی ورسٹی
- کلاسیکی ادب کی تفہیم پر تین لکچر، شعبۂ اُردو، بمبئی یونی ورسٹی
- تصوف اور تحقیق پر ایک لکچر، اورینٹل کالج، لاہور 1992
- انٹرنیشنل نیاز سمینار (کراچی) 1984
- تین سو سالہ جشن یادگار شاہ سراج اورنگ آبادی (اورنگ آباد)
- شیرانی سمینار، خدا بخش اورینٹل لائبریری (پٹنہ)
- اصول تدوین سمینار، خدا بخش اورینٹل لائبریری (پٹنہ)
- چکبست سمینار، مہاراشٹر اُردو اکیڈمی (بمبئی)
- دکنی ادب سمینار، بمبئی یونی ورسٹی، بمبئی
- نصابِ تعلیم سمینار، دہلی اُردو اکادمی، دہلی
- عوامی ادب سمینار، شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی
- اصناف ادب سمینار، دہلی اُردو اکادمی، دہلی
- دلّی والے، دہلی اُردو اکادمی، دہلی
- فانی سمینار، الٰہ آباد
- نیاز سمینار، یو پی اُردو اکادمی، لکھنؤ
- سیماب سمینار، سینٹ کالج، آگرہ

- جوش سمینار، شیعہ کالج، لکھنؤ
- جوش سمینار، یو پی اُردو اکادمی، لکھنؤ
- انٹرنیشنل غالب سمینار، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی
- دکنی ادب سمینار، شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی۔ دہلی
- انٹرنیشنل املا سمینار، شعبۂ اُردو، بمبئی یونی ورسٹی، بمبئی (10 دسمبر سے 13 دسمبر تک)
- مولانا آزاد سمینار، بمبئی یونی ورسٹی، بمبئی
- مولانا آزاد صدی تقریبات سمینار، یو پی اُردو اکادمی، لکھنؤ

املا ورک شاپ کنڈکٹ کی

1. یونی ورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے تین ہفتے کا تربیتی کورس، شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی: یکم جنوری سے 21 جنوری 1981 تک
2. ہائر سکینڈری اسکولوں اور کالجوں کے اساتذہ کے لیے دس دن کا تربیتی کورس (صحت املا) کرناٹک آرٹس کالج، دھارواڑ، کرناٹک یونی ورسٹی، 11 نومبر سے 22 نومبر، 1982 کو
3. پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے صحت املا کا تربیتی کورس۔ علامہ اقبال ایجوکیشن سوسائٹی ہبلی، کرناٹک۔ 27 مئی سے 3 جون، 1983 تک
4. پرائمری اور ہائر سکینڈری اساتذہ کے لیے صحت املا کا پانچ دن کا تربیتی کیمپ، کاروار، زیر اہتمام کرناٹک اُردو اکادمی، بنگلور 1985
5. اُردو املا کی معیار بندی پر تین روزہ سمینار۔ اُردو ٹیچنگ ریسرچ سینٹر، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز (حکومت ہند) لکھنؤ 28 دسمبر سے 30 دسمبر، 1987 تک

وزیٹنگ فیلو

1. شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی، تین ہفتے کے لیے بہ حیثیت وزٹنگ فیلو: اصول تحقیق، قواعد زبان اور نثری شعریات پر لکچر دیے۔ اپریل 1983
2. شعبۂ اُردو بمبئی یونی ورسٹی میں بہ حیثیت وزٹنگ فیلو: دو ماہ کے لیے۔ اصول تحقیق، قواعد زبان، قواعد شاعری اور علوم بلاغت پر لکچر دیے۔ فروری۔ مارچ 1992
3. شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی میں بہ حیثیت وزٹنگ فیلو: چار ہفتے کے لیے۔ متن کی قرأت، کلاسیکی ادب کی تفہیم، علوم بلاغت اور اصول املا پر لکچر دیے۔ ستمبر 1995

(رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات، مرتب، اطہر فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جولائی 2002، صفحہ 9 تا 18)

☆☆☆

رشید حسن خاں

اسلم پرویز

دُنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی روایت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے لیکن روایت کے ساتھ ہر شخص کا تعلق ایک سا نہیں ہوتا۔ بے شمار لوگ تو وہ ہیں جو اپنی روایت سے بے خبر اور بے گانے ہوتے ہیں۔ روایت کے ساتھ رشتہ استوار رکھنے والوں میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کے ہاں روایت کے زمانی ضابطوں کا کوئی تصور نہیں ہوتا اور جو روایت کے بارے میں ایک طرح کی ہیجانی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو روایت پرست کہا جا سکتا ہے روایت پرستوں کو اس وقت زبردست بحران کا سامنا ہوتا ہے جب کسی عبوری دور کے زمانی ضابطے روایت کے چراغوں کی لو مدّھم کر دیتے ہیں جب کہ روایت پرست عناصر انھی چراغوں کی روشنی میں راستہ چلنے کے عادی ہوتے ہیں۔ روایت کے ساتھ رشتہ استوار رکھنے والوں میں دوسری طرح کے لوگ ہیں جن کی شخصیت میں روایت کا امتزاج عقلی اور جذباتی دونوں سطحوں پر ہوتا ہے۔ گویا ان کے ہاں روایت کا عرفان اور احترام بھی ہوتا ہے اور اس کی توسیع اور بقا کا جذبہ بھی۔ انھی لوگوں کو صحیح معنوں میں روایت کا امین کہا جا سکتا ہے۔ روایت کی مختلف جہات ہیں اور علاحدہ علاحدہ سیاق وسباق میں اس کی الگ الگ سطحیں بھی۔ اس لیے کسی فردِ واحد کے تعلق سے روایت کی تخصیص بھی ضروری ہے۔ اور جب تذکرہ رشید حسن خاں کا ہوا ہے تو آپ یقیناً یہاں میرے ہم خیال ہوں گے کہ رشید حسن خاں کا شمار ان لوگوں میں ہے جو ہماری قدیم ادبی روایت کے امین ہیں۔ روایت کی یہ امانت ان تک اور ان کے ساتھ ان کے کئی دوسرے ہم عصروں تک حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی جیسی شخصیتوں کے واسطے پہنچی ہے۔ روایت پرست اور روایت کے امین کے درمیان خط کھینچنا اس لیے ضروری تھا کہ ہم واضح خطوط پر اپنی بات آگے چلائیں۔ روایت کے امین کا کام روایت کو، جو ماضی کی امانت ہے، حال کی وساطت سے مستقبل تک پہنچانا ہے جو اس کا حقیقی وارث ہے۔ اس اعتبار سے گویا کسی روایت کے امین کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ماضی سے اپنی پیوستگی اور حال سے وابستگی کے ساتھ ساتھ مستقبل کی نیابت کے فرائض بھی انجام دے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں اس لیے کہ یہاں تمام تر لیاقت اور صلاحیت کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص ذہنی رویے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ ذہنی رویہ ہے روایت کے معاملے میں ہر طرح تعصب اور تنگ نظری کو جھٹک کر الگ کر دینے کا، ایک سائنٹفک نقطۂ نظر اختیار کرنے کا اور حال کی حیرت انگیز حقیقتوں کو کھلے دل اور دماغ کے ساتھ تسلیم کرنے کا۔ مختصر یہ کہ اس ذہنی رویے کا دوسرا نام ہے روشن دماغی۔ رشید حسن خاں یقیناً قدیم ادبی روایت کے پرستار اور دل دادہ ہیں۔ ان کی اب تک کی تمام زندگی اس روایت کو گلے لگا کر گزری ہے یہاں تک کہ زندگی کے ایک خاص موڑ پر انھوں نے اس روایت کی خدمت ہی کو مشغلۂ حیات بنا لیا۔ چناں چہ پچھلے لگ بھگ پینتیس سال سے ادبی مشاغل ان کا اوڑھنا بھی ہیں اور بچھونا بھی۔ لیکن اس میدان میں ان کی شہرت اور کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ روشن دماغ بھی ہیں۔

تحقیق ایک سنجیدہ اور علمی مشغلہ ہے، اگر چہ بعض لوگوں کی نظر میں یہ ایک انتہائی خشک موضوع ہے۔ رشید حسن خاں ایک خوش طبع انسان ہیں اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک کھلا ذہن رکھتے ہیں اور اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں زمانۂ موجود کے انسان کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر تحقیق ان کا موضوع ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دقیانوسیت کی مکڑی نے ان کے گرد اپنا جال بنا کر انھیں اس میں قید کر دیا ہو اور وہ ایسے ہی کرم خوردہ سے لگنے لگے ہوں جیسی کرم خوردہ کتابوں سے انھیں عام طور پر واسطہ رہتا ہے۔ اس کے برعکس انھوں نے قدیم ادب کے بہت سے گوشوں پر سے مکڑی کے جالے صاف کر کے انھیں آج کے سورج کی دھوپ دکھلائی ہے۔

رشید حسن خاں جب دلّی آئے تو پہلے پہل کچھ دنوں ان کا قیام سر سید روڈ پہ سر سر سید کے مکان میں رہا۔ جامع مسجد کے اطراف میں اس وقت ڈی۔ ڈی۔ اے کا وہ بلڈوزر نہیں چلا تھا جو اور چیزوں کے ساتھ جامع مسجد کے ادبی ٹھکانوں کو بھی ڈھاتا ہوا نکل گیا تھا۔ چناں چہ روزانہ شام کو دہلی کی بیش تر ادبی شخصیتیں اُردو بازار میں مولوی سمیع اللہ قاسمی کے کتب خانہ عزیزیہ، فلورا ہوٹل، میر مشتاق کے ارونا ہال اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر قائم بھائی ظہیر کے فرینڈز ٹی اسٹال المعروف بہ چنڈو خانہ پر جمع ہوتی تھیں۔ رشید حسن خاں کے ساتھ میری اور خلیق انجم کی تقریباً روزانہ شام کو یہیں ملاقات ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ہم دونوں سر سید روڈ پر ان کی قیام گاہ پر بھی ان سے ملنے چلے جاتے تھے۔ خلیق انجم اس زمانے میں کروڑی مل کالج سے وابستہ ہو چکے تھے اور میں بھی اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے کام کے سلسلے میں تقریباً روزانہ ہی دہلی یونی ورسٹی جاتا تھا۔ لہٰذا اکثر دن کے اوقات میں بھی خاں صاحب کے ساتھ کیمپس میں ملاقات رہتی تھی۔ یہ تعلق رفتہ رفتہ ایک دوستی کے رشتے میں بدلتا گیا۔ اس طرح رشید حسن خاں سے جو قربتیں حاصل ہوئیں ان کے ذریعے ان

کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آئے۔ علمی پہلو بھی اور انسانی پہلو بھی۔ اور ہر پہلو انتہائی دل چسپ نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک باصلاحیت، روشن خیال اور دوست دار قسم کے انسان ہیں۔

اس گفتگو کے آغاز میں رشید حسن خاں کے تعلق سے روایت کے امین کا جو تذکرہ چھیڑا تھا اسی کی روشنی میں رشید حسن خاں کے بارے میں ایک بات یہ کہنی ہے کہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ ہماری جھولی میں اپنی روایت کا جو کچھ بھی سرمایہ ہے اسے ہمیں پوری فراخ دلی کے ساتھ اپنے خردوں میں تقسیم کرتے رہنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ خاں صاحب ادب کے طالب علموں کے لیے اپنا دروازہ کھلا رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہی نسل روایت کے مستقبل کے سفر کی ساتھی ہے۔ جن لوگوں کو رشید حسن خاں سے قربت حاصل ہے اور جو اُن سے مسائلِ ادب پر صلاح مشورہ کرتے رہتے ہیں ان کی تحریر و تقریر پر رشید حسن خاں کے کان اور نگاہ برابر لگے رہتے ہیں تا کہ ان کے ہاں اگر کہیں کوئی کوتاہی ہے تو وہ اس سے انھیں برملا آگاہ کر دیں۔ نوجوانوں کی وہ نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے ہیں بل کہ وہ ان کے لیے نئے نئے موضوعات بھی تجویز کرتے ہیں اور متعلقہ مآخذوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ وہ اس نازک سے فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ طالب علم کس سلوک کے مستحق ہیں اور ادب کی قد آور شخصیتوں مثلاً پروفیسر محی الدین قادری زور اور پروفیسر آلِ احمد سرور وغیرہ کے ساتھ علمی مجادلے کے کیا کیا تقاضے ہیں۔

تحقیق اور متنی تنقید رشید حسن خاں کے دو خاص میدان ہیں۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اعلا پائے کی تحقیق و تنقید کے نمونے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں بل کہ تحقیق و متنی تنقید کے اصول و ضوابط پر کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ اس طرح وہ تحقیق اور عملی تحقیق دونوں کے مردِ میداں ہیں۔ ان کے تحقیقی قول و عمل میں تضاد ڈھونڈھ نکالنا مشکل ہے اور یہی در اصل کسی شعبۂ علم میں خصوصی مہارت کے صحیح معنی ہیں۔ اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگ تھیوری کے تو بڑے ماہر ہوتے ہیں لیکن عملی طور پر جب وہ خود کچھ کرنے بیٹھتے ہیں تو کوئی مثالی کام انجام نہیں دے پاتے۔ دوسری طرح کے لوگ وہ ہیں جو خداداد صلاحیت کے بل پر اچھا کام تو سرانجام دے لیتے ہیں لیکن نئے کام کرنے والوں کی تربیت کی صلاحیت ان میں نہیں ہوتی۔ رشید حسن خاں کا امتیاز یہی ہے کہ وہ دونوں محاذوں پر چاق و چوبند ہیں۔

ہر شعبۂ علم میں اصلاح و ترمیم کا سلسلہ برابر جاری رہنا چاہیے تا کہ ہر زمانے میں اس میں تازگی اور توانائی برقرار رہے۔ یہ کام روایت پرستی کے بل پر نہیں، بل کہ روایت سازی کی قوت کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ رشید حسن خاں کے علمی کارناموں میں ان کی کتاب 'اُردو املا' اس کی روشن مثال ہے۔ اس کتاب میں اُردو املا سے متعلق انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے عہد تک کے تمام مباحث کو سمیٹا ہے بل کہ سائنٹفک انداز میں طریقۂ املا میں مناسب اور موزوں اصلاحات اور تبدیلیوں کے ذریعے اس کو ایک نئی شکل دینے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے عبارت میں رموزِ اوقاف کے استعمال پر شدت کے ساتھ زور دیا ہے جس کا اُردو میں خاطر خواہ رواج نہیں۔ اسی طرح املے کے سلسلے میں بھی انھوں نے ہمارے ذہن کو صاف کیا ہے۔ تاہم ضروری نہیں کہ املا سے متعلق آپ رشید حسن خاں کی ہر بات کو من و عن قبول کر لیں۔ ان کی بعض تجاویز سے لوگوں نے اختلاف بھی کیا ہے۔ دوسری طرف ایسے اسکالر بھی ہیں جنھوں نے 'اُردو املا' کی بنیاد پر املا کے مسائل پر کتابچے شائع کر ڈالے حالاں کہ 'اُردو املا' جیسی ضخیم کتاب کے بعد اگر ضرورت تھی تو اس بات کی کہ کتاب کی ایسی تلخیص تیار کی جاتی جس کے مطالعے سے اُردو کے اساتذہ اور طلبہ کو یہ آگاہی بہم پہنچائی جاتی کہ 'عبارت کیسے لکھیں'۔ یہ کام بھی بعد میں خود رشید حسن خاں ہی نے انجام دیا۔ بہر حال! املا کے معاملات میں رشید حسن خاں کی خصوصی دل چسپی آگے چل کر بڑی مبارک ثابت ہوئی۔ میرے نزدیک 'فسانۂ عجائب' اور 'باغ و بہار' کی تاریخی تدوین املا کے معاملے میں رشید حسن خاں کی اسی دل چسپی کا ثمرہ ہے۔ اب آپ 'فسانۂ عجائب' اور 'باغ و بہار' میں رجب علی بیگ سرور اور میر امن دہلوی کو براہِ راست بولتے ہوئے سن سکتے ہیں۔

رشید حسن خاں نے اس بات پر بھی بجا طور پر زور دیا ہے کہ تحقیق کی زبان صاف، سادہ اور دوٹوک ہونی چاہیے، ان کے نزدیک تحقیق، دلائل اور ثبوت کی بنیاد پر مروجہ حقائق کے رد و قبول اور نئے حقائق کی دریافت کا عمل ہے۔ اس اعتبار سے عبارت آرائی، طولِ کلام، انشا پردازی، صفات اور مغلق الفاظ کا استعمال تحقیق کے لیے غیر مناسب ہی نہیں نقصان دہ ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر اور تقریر دونوں میں بار ہا اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر چہ ادبی تحقیق کا تعلق براہِ راست ادب سے ہے لیکن بجائے خود تحقیق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ویسی ہی لچھے دار زبان میں گفتگو کرے جو سحر البیان، گلزارِ نسیم، فسانۂ عجائب اور باغ و بہار جیسی تخلیقات میں استعمال ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک تحقیق کی زبان دستاویزی زبان اپنے قاری کو گرفت میں کیسے لے۔ جان دار تحقیق میں جاسوسی ناول کا سا سسپنس ہوتا ہے۔ حقائق کی اندھی گپھا میں ٹٹول ٹٹول کر چلنے کا سا سسپنس۔ جو محقق یہ سسپنس پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے پھر دستاویزی زبان ہی راس آتی ہے۔

جیسا کہ میں تحریر کر چکا ہوں کہ رشید حسن خاں بنیادی طور پر مدرسے کے فارغ التحصیل ہیں۔ ان کے پاس یونی ورسٹی کی کوئی ڈگری نہیں پھر بھی ہندوستان کی بیش تر یونی ورسٹیوں میں وہ توسیعی خطبات دینے کے لیے بُلائے جاتے ہیں، ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات کے ممتحن بنائے جاتے ہیں۔ بمبئی، جموں، حیدر آباد اور دہلی کی جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں انھیں برابر دعوت دی جاتی ہے۔ ان کی جو قدر و منزلت ہندوستان میں ہے وہی پاکستان میں بھی ہے۔ وہاں بھی لوگ ان کے ادبی منصب اور مرتبے سے پوری طرح واقف ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسی پاکستان کی مقتدر شخصیتیں ان کی قدر دان اور مداح ہیں۔

جو شخص رشید حسن خاں سے ذاتی طور پر کبھی نہیں ملا ہو وہ ان کے کارناموں اور شہرت کو دیکھ کر اندازہ لگائے گا کہ یہ صاحب یقیناً کوئی مردم بے زار قسم کی چیز ہوں گے جو

بس ہمہ وقت اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف رہتے ہوں گے اور باہر کی دُنیا سے انھیں کوئی دل چسپی نہ ہوگی۔ رشید حسن خاں کے بارے میں یہ درست نہیں۔ وہ بالکل نارمل انسان ہیں۔ وہ ایک طرف پُرانی وضع داریوں اور رکھ رکھاؤ کے قائل ہیں اور انتہائی سلیقے سے انھیں اپنی زندگی میں برتتے ہیں تو دوسری طرف ان کی زندگی کے مشاغل و معلومات میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو انھیں آج کے زمانے کا آدمی ثابت کرتی ہیں۔ ان کی ادبی فتوحات کم نہیں لیکن انھوں نے یہ فتوحات سماجی رشتوں کی قیمت پر حاصل نہیں کیں۔ انھوں نے اپنے اوقاتِ روز و شب کو پورے توازن اور اعتدال کے ساتھ اپنے علمی کاموں، اپنے دوستوں اور عزیزوں اور مشاغل و تفریحات میں تقسیم کیا ہے۔ آپ سوال کر سکتے ہیں کہ پھر خاں صاحب نے تحقیقی کام کا اتنا انبار کیسے لگا دیا۔ اس کا ایک سیدھا سا جواب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سلامت روی اور وقت کے صحیح استعمال کے اصول پر قائم رہے ہیں۔ وہ اگر پٹھان ہیں تو اسی حد تک کہ غلط آدمی اور غلط بات کے ساتھ مصالحت نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں قابلِ رشک توازن اور اعتدال ہے۔ اپنے علمی مشاغل پر وہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف چند ہی گھنٹے صرف کرتے ہیں اور اپنے اس معمول پر وہ سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ لمبی لمبی قلانچیں بھرنے والے خرگوشوں کو جھاڑیوں میں سوتا چھوڑ کر اپنے اس استقلال کے بل پر وہ فتوحات کے جھنڈے گاڑتے چلے جا رہے ہیں۔

خاں صاحب یعنی رشید حسن خاں دہلی یونی ورسٹی کے گوائر ہال میں لگ بھگ تیس پینتیس سال رہے۔ گوائر ہال کے عملے، ہاسٹل میں رہنے والے طلبہ اور اساتذہ سب کے ساتھ خاں صاحب کے خوش گوار تعلقات تھے۔ یہ تمام لوگ خاں صاحب کے روزانہ کے معمولات سے بھی باخبر تھے۔ اس لیے کہ ان معمولات میں کبھی سرِ مو فرق نہیں آتا تھا۔ اگر آپ کسی وقت بنا بتائے خاں صاحب سے ملنے گوائر ہال چلے گئے اور وہاں خاں صاحب کے کمرے پر تالا لگا ہوا پایا تو آس پاس کے لوگ بتا دیں گے کہ خاں صاحب اس وقت کہاں ہو سکتے ہیں یہاں تک کہ اگر آپ گیٹ پر بیٹھے چوکی دار ہی سے خاں صاحب کے بارے میں پوچھ لیں تو وہی بتا دے گا کہ خاں صاحب نکل چکے ہیں یا ابھی نہیں نکلے ہیں۔ خاں صاحب کے معمولات یہ ہوتے تھے کہ صبح ساڑھے سات بجے تک ڈائننگ ہال پہنچ جاتے۔ ڈائننگ ہال میں ان کی نشست مخصوص تھی ہمیشہ وہیں بیٹھتے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر آٹھ بجے ڈائننگ ہال سے نکل کر کمرے پر واپس نہیں جاتے تھے بل کہ سیدھے دہلی اسکول آف اکنامکس کے کافی ہاؤس کا رُخ کرتے۔ یہاں بھی ان کی میز مخصوص تھی جہاں وہ ایک گھنٹہ بیٹھتے۔ کافی ہاؤس کے بیرے ان کے مزاج اور مذاق سے بہ خوبی واقف تھے۔ ان سے صرف مسکراہٹ کی زبان میں گفتگو ہوتی۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے کافی ہاؤس کے بعد کی اگلی منزل شعبۂ اُردو ہوا کرتی تھی جہاں سے ایک بجے سے کچھ پہلے لنچ کے لیے اُٹھ جایا کرتے تھے اس دوران کبھی کبھی اگر میں مل گیا تو مجھے بھی لنچ کی دعوت دے کر ساتھ گوائر ہال لیتے گئے۔ گوائر ہال کے باہر ایک کارندہ میز بچھا کر بیٹھتا ہے جو گیسٹ ٹکٹ کاٹتا ہے۔ ہال کے ممبر یہاں پہلے پیسے دے کر اپنے مہمان کا ٹکٹ لیتے ہیں پھر مہمان کے ساتھ کھانے کے لیے ہال میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کارندہ بہ خوبی جانتا ہے کہ خاں صاحب کی اپنے مہمان کو کھانا کھلانے کی تہذیب کیا ہے۔ خاں صاحب اپنے مہمان کو لے کر سیدھے کھانے کی میز پر پہنچتے تھے۔ مہمان کے ساتھ مزے مزے کی باتیں ہو رہی ہیں کھانا بھی چل رہا ہے اور اسی دوران نہ جانے کب بہ حسن و خوبی گیسٹ ٹکٹ والا معاملہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ شام کو خاں صاحب کناٹ پلیس کے کافی ہاؤس میں بھی اسی انداز سے رونق افروز ہوتے تھے۔ خاں صاحب اپنے زمانے میں ہاکی کے کھلاڑی تھے اس لیے دہلی کے شیواجی اسٹیڈیم میں ہونے والے ہاکی کے میچ بھی وہ اتنی ہی پابندی سے دیکھتے تھے اِدھر کچھ برسوں سے ان کا یہ شوق ختم ہو گیا ہے۔

مجھے جب کبھی خاں صاحب سے کوئی صلاح مشورہ کرنا ہوتا تو میں صبح 7:30 بجے سے کچھ پہلے گوائر ہال پہنچ جاتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ مجھے گوائر ہال پہنچتے پہنچتے ساڑھے سات سے کچھ اوپر ہو گئے۔ دیکھا تو خاں صاحب کے کمرے پر تالا پڑا ہے۔ میں سمجھ گیا ڈائننگ ہال گئے ہیں آٹھ بجے تک آ جائیں گے۔ میں انتظار میں کمرے کے آگے ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے آٹھ بجے پھر آٹھ بج کر پانچ منٹ ہو گئے لیکن خاں صاحب نہیں لوٹے۔ کچھ دیر اور انتظار کر کے ڈائننگ ہال کے سامنے پہنچا۔ بیرے سے پوچھا تو پتا چلا آٹھ بجے نکل چکے ناشتہ کر کے۔ دوڑ کر گیٹ پر آیا تو چوکی دار نے بتایا خاں صاحب تو گئے باہر۔ اب میں دوڑتا بھاگتا اسکول آف اکنامکس کے کافی ہاؤس پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں خاں صاحب مزے سے بیٹھے کافی کی چسکیاں لے رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے آؤ برادر۔ اسی کے ساتھ بیرے کو کافی کا اشارہ ہوا۔ میں نے کہا خاں صاحب مجھے پانچ منٹ کی دیر ہو گئی تھی۔ آپ کے کمرے کے آگے ٹہلتا رہا کہ آپ ناشتے سے فارغ ہو کر ادھر آئیں گے اور آپ سیدھے نکل آئے۔ خاں صاحب نے کہا کہ جب آپ وقتِ مقررہ پر نہیں آئے تو میں نے سمجھا آج آپ گول ہو گئے۔ میں بھی اپنے رستے ہو لیا۔ ایک دوبار اور میرے ساتھ یہی ہوا۔ پھر خاں صاحب کے ساتھ یہ طے ہوا کہ اگر میں آپ کے ناشتے پر جانے سے پہلے نہ پہنچ پاؤں تو سمجھ لیجیے لیٹ ہو گیا ہوں اب ناشتے کے بعد آپ سے ملاقات ہو گی اس لیے آپ ناشتے سے فارغ ہو کر اسکول آف اکنامکس جانے کی بجائے کمرے پر ہی واپس آئیں۔ اس پر خاں صاحب نے فرمایا کہ اگر کسی روز سرے سے آپ آئے ہی نہیں تو میرا تو سارا معمول درہم برہم ہو جائے گا۔ میں نے یقین دلایا ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔

خاں صاحب لباس کے بارے میں بھی وضع کے پابند ہیں۔ گرمیوں میں بش شرٹ، پتلون اور چمڑے کے براؤن رنگ کے سینڈل پہنتے ہیں۔ جاڑوں میں پوری آستین کی قمیص، پتلون اور وہی براؤن رنگ کا لیس والا جوتا۔ بش شرٹ اور پتلون ہمیشہ چیک کی ہوتی ہے، ہاتھ پر ویسٹ اینڈ کمپنی کی گھڑی خاں صاحب کے کمرے پر جائیے تو ان کی میز پر چمک دار سکوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں لگی ہوئی ملیں گی۔ پوچھنے پر پتا چلے گا کہ یہ بس کے لیے ہیں۔ خاں صاحب بس میں کنڈیکٹر کو کبھی بڑا نوٹ نہیں دیتے۔ ہمیشہ پورے پورے پیسے دیے اور اور جلد سے جلد اس سے خلاصی حاصل کی۔ وہ کنڈکٹر کو نوٹ دے کر اس جھنجھٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتے کہ وہ یہ کہے کہ ٹھہریے باقی پیسے بعد میں دوں گا یا اگر دے تو پھٹے پُرانے نوٹ پکڑا دے جس سے اس کے ساتھ اور جھک جھک میں پڑنا پڑے گا۔

رشید حسن خاں یاروں کے یار ہیں۔ منافقت سے انھیں سخت نفرت ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ ان کی بے تکلفی ہے ان سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ لیکن عام طور پر وہ کم آمیز ہیں۔ اس لیے کس وناکس کے ساتھ ہنسی مذاق تو کیا بات بھی احتیاط سے اور مختصر کرتے ہیں۔ بعض دوستوں کے ساتھ گاہے گاہے جا کر خود ملاقات کرنا بھی ان کی وضع میں شامل ہے۔ ان میں ایک تو غلام ربانی تاباں مرحوم تھے ان کے علاوہ بیگم ممتاز مرزا اور مخمور سعیدی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چوں کہ خاں صاحب ادب کے قدیم سرمائے پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ تنہا اس سمندر کے تمام موتی نہیں چن سکتے اس لیے وہ اپنے ذہن میں طرح طرح کے موضوعات سوچتے رہتے ہیں۔ یہ موضوعات وہ ان نوجوانوں کو تجویز کرتے ہیں جو تحقیق کے میدان میں نئے نئے وارد ہو رہے ہیں۔ ایسے نوجوانوں کی وہ رہ نمائی بھی کرتے ہیں۔ ایسے طلبہ جنھوں نے مدرسہ کی تعلیم بھی حاصل کی ہے انھیں تو خاص طور پر وہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کلاسیکی ادب سے متعلق موضوعات پر ریسرچ کریں۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ آج کے زمانے کا ہر طالب علم اس طرح کے موضوعات پر تحقیق کرنے کا اہل نہیں۔

میں نے اس مضمون کے آغاز میں رشید حسن خاں کو روایت کا امین کہا تھا اور اس حیثیت سے انھیں روایت پرستوں سے ممتاز قرار دیا تھا۔ لہٰذا اب تک کی اپنی تمام گفتگو میں برابر یہی کہنے کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ رشید حسن خاں کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے ہاں روایت کے عرفان واحترام کے ساتھ اس کی توسیع اور بقا کا جذبہ بھی ہے۔ یہ اجداد کی رہ نمائی میں اسلاف کو قیادت سونپنے کا عمل ہے۔ روایت کے عرفان واحترام کے لیے عقل وادراک ضروری ہے اور اس کی توسیع اور بقا کے لیے قوتِ عمل اور جوش کی۔ یعنی یہ دیوان گی عقل کا وہ سودا ہے جسے میرؔ نے شعور سے جنوں کرنے کا نام دیا ہے اور اس بات کو یوں بھی کہا ہے:

ہم کو دیوانگی شہروں میں ہی خوش آتی ہے
دست میں قیس رہو، کوہ میں فرہاد رہو

یہی شعورِ جنوں اور روایت وجدت کا خوش گوار امتزاج ان کی شخصیت کا سب سے زیادہ تاب ناک جوہر ہے۔

(سہ ماہی اُردو ادب، صفحہ 115 تا 122، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، اپریل، مئی، جون 2000)

(ہفت روزہ، ہماری زبان، انجمن ترقیٔ اردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 28 ستمبر 2006، شمارہ نمبر: 33,34,35,36 جلد نمبر: 65، صفحہ 5۔6 اور 11، اس شمارے میں یہ مضمون 'رشید حسن خاں: ادب اور زندگی کی ایک متوازن شخصیت' کے نام سے شامل ہے۔)

(گھنے سائے (کچھ خاکے کچھ شخصی مضامین) اسلم پرویز، صفحہ 120 تا 131، دلّی کتاب گھر، دہلی، مارچ 2010)

ooo

رشید حسن خاں

سیدہ جعفر

تدوینِ متن کے تقاضوں کی تکمیل اور تحقیق کے آداب سے آگہی کے سلسلے میں رشید حسن خاں کا نام اُردو ادب میں سرِفہرست نظر آتا ہے۔ گیان چند جین نے انھیں

’’خدائے تدوین‘‘ سے موسوم کیا ہے۔ اُردو میں تحقیق کو اعتبار عطا کرنے اور اس کی ادبی اہمیت تسلیم کروانے میں جن محققین نے نمایاں حصہ لیا ہے ان میں رشید حسن خاں کا نام بھی شامل ہے۔ رشید حسن خاں کی تصانیف کی تعداد زیادہ نہیں، لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑی سوجھ بوجھ اور ذمہ داری کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ بقول مالک رام رشید حسن خاں کی ولادت شاہ جہاں پور میں 10 جنوری 1930 کو ہوئی (تذکرہ ماہ و سال، صفحہ 425)۔ ’’مختصر تاریخ ادب اُردو‘‘ میں رشید حسن خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ ’’نسبتی طور پر خالص پٹھان ہیں۔ جس کا اثر ان کی روزمرہ زندگی اور تحریروں میں خاصا نمایاں ہے (اعجاز حسین بہ ترمیم و اضافہ سید عقیل رضوی، صفحہ 535) ان کا تعلق اس خطے سے ہے جہاں انگریزی حکومت کی مخالفت میں ان کی زبان اور کلچر سے بھی پرہیز کیا گیا تھا۔ چناں چہ رشید حسن خاں کی تمام تر تعلیم مشرقی انداز میں ہوئی (مختصر تاریخ ادب اُردو بہ ترمیم و اضافہ سید عقیل رضوی، صفحہ 535) یہی وجہ ہے کہ رشید حسن خاں عربی اور فارسی زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے السنہ مشرقیہ کے امتحانات الٰہ آباد یونی ورسٹی سے کامیاب کیے۔ چند سال شاہ جہاں پور کے اسکول میں تدوین کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریسرچ اینڈ ریفرنس اسسٹنٹ کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف مختلف اداروں اور اُردو اکیڈمیوں نے کیا ہے۔ ان کی تحقیقی کاوشوں میں ترتیب و تدوین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ’’فسانۂ عجائب‘‘، ’’گلزارِ نسیم‘‘، ’’باغ و بہار‘‘ اور ’’مثنویاتِ شوق‘‘ اس کے اچھے نمونے ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیق سے متعلق مختلف موضوعات پر بھی ان کی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ’’ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ‘‘، ’’اُردو املا‘‘، ’’انتخابِ سودا‘‘، ’’انتخابِ ناسخ‘‘، ’’گذشتہ لکھنؤ‘‘ (عبدالحلیم شرر) ’’مراثی انیس و دبیر‘‘، ’’مثنوی میر حسن‘‘، ’’تدوین تحقیق روایت‘‘ اور ’’تلاش و تعبیر‘‘ ان کے قابل قدر تصانیف ہیں۔ ’’تدوین تحقیق روایت‘‘ رشید حسن خاں کے گیارہ مضامین پر مشتمل ہے ان میں سے تین مضامین اصولِ تحقیق و ترتیب تدوین متن سے متعلق ہیں۔ ’’تدوین میں منشائے مصنف کا تعین‘‘ ایک فکر انگیز مقالہ ہے۔ رشید حسن خاں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اصل مآخذ کی جگہ ثانوی مآخذ کو نہیں دینی چاہیے۔ ’’مثنوی زہرِ عشق‘‘ کی تاریخ تصنیف ’’غم دلربا‘‘ (1277ھ) کی دریافت کا سہرا سر راس مسعود کے سر باندھا جاتا ہے انھوں نے اسے ’’انتخاب زرین‘‘ میں پیش کیا تھا۔ رشید حسن خاں نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ نظامی بدایونی نے پہلی مرتبہ مثنوی زہر عشق کے دیباچے میں اس کی نشان دہی کی ہے۔ اور راس مسعود نے اس کا حوالہ دیے بغیر اسے پیش کر کے غلط فہمی پیدا کی ہے۔ رشید حسن خاں نے ادبی دیانت داری اور حزم و احتیاط پر زور دیا ہے ’’اُردو املا‘‘ بھی رشید حسن خاں کی تحقیقی اور ادبی دل چسپی کا ایک موضوع رہا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے وسیع مطالعے کے بعد نتائج اخذ کیے ہیں اور مسائل و مباحث کو دقت نظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اُردو زبان میں لفظوں کی تراش خراش اور صورت گری کے عمل کو انھوں نے ادبی تاریخ کے منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور وہ ’’رواجِ عام‘‘ کو سند تصور کرتے ہیں۔ املا کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ’’صوتی کیفیت‘‘ مدِ نظر رکھ کر الفاظ کا املا تحریر کیا جائے جیسے بوالہوس کو بل ہوس حالانکہ کو حال آن کہ وغیرہ۔ رشید حسن خاں کی آسان املا کی تحریک سے بعض وقت مصنوعی مسائل پیدا ہونے کے امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ رشید حسن خاں نے ادبی تحقیق کے اصول و ضوابط اور نظریات کو مرتب و مدون کرنے کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اپنی کتاب ’’ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ‘‘ میں وہ رقم طراز ہیں کہ ’’تحقیق کا مقصد حقائق کی دریافت ہے۔ اور ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل و دخل ہو تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔‘‘ (ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ صفحہ 12) وہ تحقیق اور تنقید کے دو مختلف میدان متعین کرتے ہیں اور اس خیال کے حامل ہیں ان دونوں کے دائرۂ عمل مختلف ہیں اس لیے خلط مباحث سے گریز ضروری ہے۔ وہ تحقیق میں نکتہ رسی، حقیقت شناسی اور معنویت کو جو استخراجی نتائج پر مبنی ہوں اہمیت کا حامل تصور کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں ایک ایسے محقق ہیں جن کے نظریات میں لچک داری کو کہیں جگہ نہیں مل سکی ہے اور وہ دوٹوک فیصلوں ہی سے مطمئن ہوتے ہیں۔ کسی بیان کو قبول کرنے سے پہلے اسے تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنا اور مستند مآخذوں سے ان کی تصدیق کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بیاضوں میں ’’صحت انتساب‘‘ کی حیثیت ثانوی ہوا کرتی ہے (ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ، صفحہ 40)۔ رشید حسن نے معتبر، غیر معتبر اور مشکوک حوالوں سے بحث کی ہے اور تحقیق کے سرمائے میں مفید معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ پہلے اور نظریاتی حصے میں اصول سے بحث کی گئی ہے اور دوسرا حصہ عملی تحقیق سے متعلق ہے، جس میں دیوان غالب صدی ایڈیشن، اُردو شاعری کا انتخاب، تاریخ ادب اُردو جلد اول کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں مالک رام، ڈاکٹر زور اور جمیل جالبی کی فروگزاشت کی نشان دہی کی گئی ہے۔ تاریخ ادب اُردو جلد اول پر تبصرہ کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے جمیل جالبی کے لسانی مغالطوں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ تسامحات کی نشان دہی تحقیق کا ایک اہم فرض ہے لیکن اس میں محقق کا رویہ ہم دردانہ اور نرم ہونا چاہیے۔ رشید حسن خاں کی مرتب کردہ ’’فسانۂ عجائب‘‘ ان کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ انھوں نے یہ کام 1978 کے قریب شروع کیا تھا۔ اس میں مشکل مرحلہ ’’فسانۂ عجائب‘‘ کے متن کی صحیح قرأت کا تھا۔ اعراب اور رموز و اوقاف کا کام پڑھنے والے کے لیے باعث سہولت ہوتا ہے لیکن مرتب کے لیے بڑی عرق ریزی اور محنت کا کام ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف کے عہد کے تلفظ اور اس کے علاقے کی زبان کی عمومی خصوصیات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ رشید حسن خاں کی جگر کاوی اور ادبی زہرہ گدازی کا اندازہ اس کتاب کے عنوانات (سرور کی) ولادت، وفات،، فن، تعلیم مختلف معنوں سے واقفیت، وجہ تصنیف، اور زمانۂ تصنیف سے لگایا جا سکتا ہے۔ رشید حسن خاں نے صحیح ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور مستند معلومات اکٹھا کی ہیں۔ یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ رجب علی بیگ نے مختلف اوقات میں اس کتاب میں اضافے بھی کیے اور رد و بدل سے بھی کام لیا ہے اور یہ سلسلہ 1240ھ سے 1280ھ تک قائم رہا۔ رشید حسن خاں نے تمام ایڈیشنوں کا بغور مطالعہ کیا اور ہر لفظ پر غور و خوض کے بعد متن تیار کیا ہے۔ اس کتاب میں ضمیمے بھی شامل ہیں۔ ساتواں ضمیمہ اختلاف نسخ کا ہے۔ جو پچاسی صفحات پر مشتمل ہے لیکن ضخامت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف چودہ صفحات دیے گئے ہیں۔ تدوین متن کے سلسلے میں اختلاف نسخ کی اہمیت رشید حسن خاں جیسے محقق سے کیسے مخفی رہ سکتی ہے۔ یہ امر تعجب خیز ہے کہ انھوں نے تدوین کے ایک اہم تقاضے کو کیسے نظر انداز کر دیا۔ حالاں کہ وہ اس طرح کی غلطیوں پر دوسرے محققین کی بڑی سختی سے گرفت کرتے ہیں اور گرمیٔ کلام کا ثبوت دیتے ہیں۔ ؎

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

رشید حسن خاں نے دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کو بھی تحقیقی شان کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ گل بکاولی کا قصہ بنیادی طور پر ہندوستانی مزاج کا حامل ہے اور اس میں مختلف کہانیوں کے عناصر نے جگہ پائی ہے۔ رشید حسن خاں نے کتاب کے ابتدائی حصے میں یہ بتایا ہے کہ نہال چند لاہوری نے گل کرسٹ کی فرمائش پر پہلی بار اس کا اُردو ترجمہ ''مذہبِ عشق'' کے نام سے پیش کیا تھا۔ کتاب کے مقدمے میں قصہ اور شاعر کے بارے میں تمام ضروری معلومات فراہم کر دی گئی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ قصہ کی مقبولیت سے متاثر ہو کر 1838، 1839 میں دیا شنکر نسیم نے اُردو نظم کی شکل میں اسے پیش کیا تھا۔ ''تمہید'' دس مختلف عنوانات پر مشتمل ہے۔ اس قصے کی قدیم ترین تحریری روایت تمثیل، قصے کے محل وقوع، نسیم کے حالاتِ زندگی اور ان کی تصانیف کا ذکر موجود ہے۔ رشید حسن خاں نے اس سلسلے میں مختلف محققین کے بیانات کا جائزہ بھی لیا ہے اور اپنے اخذ کردہ نتائج سے بحث بھی کی ہے۔ گلزارِ نسیم کا مقدمہ تحقیقی اعتبار سے ایک وقیع کاوش ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں حالات زندگی بھی ہیں اور کام پر تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے۔ رشید حسن خاں نے ان محققین پر اعتراض کیا ہے جو مقدمے میں ادب پارے کے تنقیدی پہلو پر روشنی ڈالنا ضروری تصور کرتے ہیں لیکن خود انھوں نے گلزارِ نسیم کے مقدمے میں یہی کیا ہے۔ مقدمہ گلزارِ نسیم رعایت لفظی، تجنیس تشبیہ، استعارہ اور صنائع بدائع پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے (مقدمہ گلزارِ نسیم صفحہ 15 تا 28) حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ مرتبہ متن کا تعارف ہوتا ہے اور اس میں مصنف اور اس کی ادبی تخلیقات پر تبصرہ کسی طرح غیر ضروری اور بے محل نہیں ہوتا خواہ اس کے لکھنے والے ڈاکٹر زور ہوں یا رشید حسن خاں۔ مقدمے میں ''تعارف'' کے زیرِ عنوان گلزار نسیم کی اشاعت اول نسخہ مطبع مسیحائی، نسخہ مطبع مصطفائی، نسخہ چکبست، نسخہ شیرانی، نسخہ قاضی عبدالودود اور نسخہ اصغر گونڈوی سے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ کتاب 1995 میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

رشید حسن خاں کی ''مثنویاتِ شوق'' تحقیقی نقطۂ نظر سے ایک قابل قدر تصنیف ہے۔ انھوں نے ''فریب عشق''، ''بہارِ عشق'' اور ''زہرِ عشق'' کا متن مرتب کر کے شائع کر دیا ہے اور ان ہی تین مثنویوں کو وہ شوق کی شعری کاوشیں تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے مقدمے میں اہم معلومات اکٹھا کی گئیں ہیں۔ مثنویات کے زمانۂ تصنیف سے مفصل بحث کی ہے۔ انھوں نے عطاء اللہ پالوی کے تذکرہ شوق، شاہ عبدالسلام کی کتاب ''دبستانِ آتش'' اور سید محمد حیدر کے تحقیقی مقالے ''حیاتِ شوق'' کا تحقیقی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر حیدر کے بیانات کے پرخچے اُڑا دیے ہیں۔ مقدمے کا آخری عنوان ''طریق کار'' ہے۔ جس میں پیش کیے جانے والے اڈیشن کے بارے میں بیان دیا گیا ہے۔ گیان چند جین نے رشید حسن خاں کی ترتیب پر اعتراض یہ کیا ہے کہ انھوں نے بہت سی اہم معلومات کو جنھیں متن میں جگہ ملنی چاہیے تھی، حاشیہ میں درج کیا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ رشید حسن خاں نے اشک کی لغت کا نام ''نفس اللغۃ'' تحریر کیا ہے اس سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ لیکن یہ نام اور اس سے اخذ کی جانے والی تاریخ دونوں غلط ہیں (کتاب نما، ستمبر 1998، صفحہ 33-34) رشید حسن خاں کی اس کتاب میں نہ تو اشاریہ موجود ہے اور نہ کتابیات۔ اگر یہ غلطی کسی اور مصنف سے ہوتی تو وہ اس کو محققین کے زمرے سے خارج کر دیتے۔ پروفیسر نیّر مسعود نے ایوان اُردو جولائی 1998 میں اپنے مضمون ''بنام رشید حسن خاں'' میں رشید حسن خاں کی اس تدوین کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے لکھنؤ کے تہذیبی پس منظر اور معاشرت کو سمجھنے میں کوتاہی کی ہے اور صرف پانچ تصانیف کے مطالعے کو کافی سمجھا اور ان ہی پر اپنے محاکمات کی بنیاد رکھی ہے اور دوسرا اعتراض یہ ہے کہ رشید حسن خاں نے خود اپنے بیانات میں تردید کی ہے۔ رشید حسن خاں نے میر امن کی ''باغ و بہار'' کا متن بھی بڑی وقت نظر کے ساتھ مرتب کیا ہے اور مستند حوالوں ہی سے سروکار رکھا ہے۔ انھوں نے میر امن کے عہد کے املا اور اس زمانے کے ادبی مزاج کو پیش نظر رکھا ہے۔ مقدمے سے کتاب کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ رشید حسن خاں نے ثانوی مآخذوں کو درخورِ اعتنا تصور نہیں کیا ہے اور صرف مستند حوالوں کو اہمیت دی ہے۔

''تلاش و تعبیر'' رشید حسن خاں کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تدوین متن اور املا کے ماہر ہی نہیں تنقید کے رمز شناس بھی ہیں۔ ''تلاش و تعبیر'' رشید حسن خاں کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے دوٹوک فیصلے سنائے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا مضمون دوہرا کردار ہے۔ جس میں ان کا مخصوص طنزیہ لب ولہجہ نمایاں ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ادیبوں پر چوٹ کی ہے جو اپنا ذہن اور قلم بیچ ڈالتے ہیں۔ دوسرے مقالے میں رشید حسن خاں نے محمد علی جوہر کی سچائی، ایمان داری، حب الوطنی اور بے باکی پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون کا شمار تنقیدی مضامین میں کرنا مشکل ہے۔ ''تلاش و تعبیر'' کے ایک مضمون میں بعض اہل شخصیتوں کی زبان کی غلطیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ''فیض کی شاعری کے چند پہلو'' اور ''جوشؔ کی شاعری میں لفظ معنی کا تناسب'' ان کے اچھے مضامین ہیں۔ موخر الذکر میں رشید حسن خاں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ جوشؔ کے کلام میں الفاظ زیادہ ہیں اور معنی کم۔ ''شہید احساس سیماب کی غزلیہ شاعری''، ''جوہر کی شاعری''، اور ''دیوان حالیؔ'' میں ان کا تنقیدی شعور بروے کار آیا ہے۔ لیکن یہ مضامین تنقید کے اعلا نمونے نہیں کہے جاسکتے۔ رشید حسن خاں بنیادی طور پر محقق ہیں اور محقق کی حیثیت سے انھوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ جعفر زٹلی پر رشید حسن خاں کا مضمون معنی خیز ہے اور بعض نئے پہلوؤں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور اس میں انھوں نے تحقیقی نتائج سے تنقید میں اچھا کام لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہم نے ابھی تک جعفر زٹلی کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے اور اسے تاریخ ادب اُردو میں وہ مقام نہیں مل سکا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ جعفر زٹلی کے پھکڑ پن اور فحش نگاری پر توجہ کی گئی ہے لیکن اس نے اپنے عہد کے تہذیبی مزاج کی جس طرح ترجمانی کی ہے اور عصری حیثیت کو جس طرح اجاگر کیا ہے اس پر نقادوں نے زیادہ توجہ نہیں کی ہے۔

رشید حسن خاں نے تحقیق پر کوئی مستقل کتاب سپرد قلم نہیں کی ہے لیکن ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' میں تحقیق سے متعلق مختلف مباحث کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' کے بارے میں گیان چند جین رقم طراز ہیں کہ اس کتاب کے نو مضامین کے مطالعے کے بعد ہم یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ وہ ''ایک طیش زدہ محقق (Angry Researcher) ہو کر رہ گئے ہیں اور ان کی تحریروں پر جھنجلاہٹ برپا رہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مجبوریوں کی بنا پر دانش گاہوں میں انھیں مناسب مقام نہیں مل سکا۔'' (1978 کی

تصانیف (مضمون) مشمولہ ذکر وفکر۔ صفحہ 438)۔ رشید حسن خاں اُردو کے ایک سر برآوردہ محقق ہیں انھوں نے محققین کی رہبری کی اور انھیں حزم و احتیاط کے انداز سکھائے۔ رشید حسن خاں ترتیب متن کے ماہر تصور کیے جاتے ہیں اور ان کے مرتبہ متون قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

(تاریخ ادب اُردو، عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک (اُردو ادب کا سفر، اہم منزلیں، ممتاز رہبر، جلد سوم، 2002، ہاشم نگر، لنگر حوض، حیدرآباد، صفحہ 223 تا 229)

○○○

قابل قدر عالم، خوش اسلوب انسان

<u>انور خاں</u>

شب و روز کے اندھیرے اُجالے سے گزرتے ہوئے کبھی کبھی یک لخت یہ احساس آپ کو گھیر لیتا ہے کہ جینے کا ڈھب بدل گیا ہے۔ وہ اسلوب جو ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے پُرانے لگنے لگے ہیں۔ اُن میں چند اسالیب البتہ ایسے ہیں جن کی دل کشی میں وقت کے ساتھ کوئی فرق نمایاں نہیں آیا بل کہ اب وہ پہلے سے زیادہ پیارے لگنے لگے ہیں۔ رشید حسن خاں ایسے ہی خوش اسلوب انسانوں میں سے ہیں۔ نوجوان ان کی علمیت پر فدا ہیں تو معاصر بزرگ علمیت کے ساتھ اُن کی صاف گوئی کے قائل۔ زبان وقواعد اور املا وانشا پر گفتگو اور تحریروں سے عموماً زیادہ دل چسپی نہیں لی جاتی لیکن ان پر رشید حسن خاں گفتگو کریں تو وہ کہیں اور سُنا کریں کوئی والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دس سال قبل بمبئی یونی ورسٹی میں اُن کے لیکچر ہوئے تو شروع میں طلبہ صدر شعبۂ اُردو کے ڈر اور لحاظ سے لکچر سننے جمع ہو جاتے لیکن اپنے موضوع سے خاں صاحب کا لگاؤ اور انہماک اور اس پر بے پایاں عبور طلبہ پر اس طرح اثر انداز ہوئے کہ کہ املا اور تدوین کے خشک مسائل پر لکچروں کے دوران بھی ہال میں جگہ ملنی دشوار ہوگئی۔ اس کی ایک وجہ ان کا دل کش اندازِ تقریر بھی ہے۔ کہیں قدرِ جارحانہ انداز کبھی خوب صورت سا کوئی برجستہ فقرہ یا کوئی شعر، جسے سُن کر ہال میں جا بجا بے ساختہ تبسم کے پھول کھل اٹھیں۔ یونی ورسٹی کے دل کش سرسبز ماحول میں طلبہ و طالبات کے ہجوم میں تدوین کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے جب وہ غالبؔ کا شعر سُناتے ہیں۔

اسدؔ! اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرایش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

تو شعر کی خوب صورتی تدوین کے خشک مسائل سے بوجھل ذہن کو ایک لحظ کے لیے شگفتگی سے معمور کر دیتی ہے یا جیسے یہ شعر۔

اسدؔ! بندِ قبا ے یار، ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو، تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

سُن کر آپ یک عالم گلستاں کے تصور میں کھو جاتے ہیں اور پورے ہال میں تازگی اور بشاشت کی لہر دوڑ جاتی ہے، گھٹتی ہوئی توجہ بحال ہو جاتی ہے۔ اس سے خاں صاحب کی خوش ذوقی اور نفاست کے ساتھ اُستادانہ درک کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ خشک موضوع کو کیسے بیان کیا جائے کہ سامعین بے کیف نہ ہوں اور مطالب آسانی سے ذہن نشیں ہو جائیں۔

لیکچر کے اختتام پر اساتذہ، طلبہ ادبا و شعرا اور ادب دوست حضرات اُنھیں گھیر لیتے ہیں۔ متعلقہ موضوع کے علاوہ زبان وقواعد یا کسی ادبی نکتے پر اپنی الجھنیں گوش گزار کے مشوروں کے خواست گار ہوتے ہیں۔ خاں صاحب تحمل و بردباری کے ساتھ فرداً فرداً سب کی باتیں خندہ پیشانی کے ساتھ سنتے ہیں اور اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں دل جمعی کے ساتھ اس طرح سمجھاتے ہیں کہ مخاطب کی پوری تسلّی ہو جائے۔ گاہ ادبی نکات ذہن نشیں کراتے ہیں۔ گاہ بنیادی اصول بیان کرتے ہیں بار بار مثالیں دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ کبھی کبھی لیکچر سے زیادہ طویل ہو جاتا ہے۔ ان کی ممبئی آمد یہاں کے طلبہ و اساتذہ بل کہ خوش نویسوں، ادیبوں اور شاعروں کے لیے بھی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نئی نسل زبان وادب کے مسائل سے اتنی باخبر نہیں۔ فیضؔ و مجازؔ اور ساحرؔ لدھیانوی، مجروحؔ سلطان پوری اور سردارؔ جعفری پر رشید حسن خاں کی تنقید بھی وہ ان شعرا کے پورے

احترام کے ساتھ ساتھ خالص علمی دل چسپی سے پڑھتی ہے۔

اور جب اُنھیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ شخص پوری طرح مطمئن ہو گیا ہے تو پھر دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ بسا وقات لیکچر سے زیادہ طویل ہو جاتا ہے۔ تمام تر شہرت اور مقبولیت کے باوجود اُن میں وہ طنطنہ اور سوکھا پن نہیں جو طلبہ یا عام انسانوں کو کسی عالم یا پروفیسر کے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ کسی سوال پر چاہے وہ کتنا ہی بچکانہ ہو، میں نے انھیں چیں بہ جبیں ہوتے یا استہزا کے ساتھ جواب دیتے نہیں دیکھا۔ کمال شفقت اور پیار سے اور اکثر ایسے شگفتہ انداز میں جواب دیتے ہیں کہ فضا زعفران زار ہو جاتی ہے اور سوال کرنے والا بھی ان قہقہوں میں شریک ہو جاتا ہے۔

طبیعت کا یہ پہلو میرے خیال میں کلاسیکی شاعری کی عمیق مطالعے کے علاوہ کھیل کے میدانوں کی دین ہے اور اس پر کافی ہاؤس کی صحبتیں مستزاد! کھلاڑی کھیل کے قواعد اور جذبے کے ساتھ شکست و فتح کو بھی اُسی فراخ دلی کے ساتھ قبول کرتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ رویہ اس کے مزاج کا حصہ بن جاتا ہے وہ زندگی کے نصیب و فراز کو بھی اُسی کھلے ذہن سے دیکھنے لگتا ہے۔ کافی ہاؤس کی صحبتیں مختلف مزاج کی شخصیتوں اور نقطہ ہائے نظر کو برداشت کرنے کا عادی بناتی ہیں۔ وسیع النظری اور رواداری پیدا کرتی ہیں۔ خاں صاحب نے خود بھی ہاکی کھیلی ہے۔ ہاکی، فٹ بال اور باسکٹ بال کے میچ دیکھتے رہتے ہیں۔ کھیلوں سے مجھے دل چسپی ہے اس لیے جب کوئی بین الاقوامی ہاکی ٹورنامنٹ ہوتا ہے گفتگو کا ایک موضوع ہاتھ آ جاتا ہے۔ ادھر دو سال سے البتہ آنکھوں کے آپریشن کی وجہ سے وہ یہ مقابلے نہیں دیکھ پا رہے، جس کی کمی یقیناً انھیں محسوس ہوتی گئی۔ یہاں اُن کے خطوط سے ایک اقتباس پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جس سے ہاکی پر ان کی نظر اور اس سے لگاؤ کا پتا چلتا ہے۔ ایک خط میں انھوں نے مجھے لکھا:

> ''ایک مشکل یہ بڑھ گئی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اس وقت اعلا درجے کا سنٹر ہاف موجود نہیں۔ یہاں اجیت سنگھ کے بعد اور وہاں اختر رسول کے بعد ان دونوں کی سطح کا کوئی سنٹر ہاف نہیں نکلا۔ یہ بڑی اہم پوزیشن ہوتی ہے۔ سارا کھیل اسی محور پر گردش کرتا ہے۔ اجیت پال میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ بیک وقت ڈسٹری بیوٹر بھی تھا اور ڈفنڈر بھی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ کس وقت کہاں ہوتا ہے۔ پوزیشن لینے کا یہ احساس اب کم یاب ہے۔ یہی خوبی اختر رسول میں تھی۔ اب جو سنٹر ہاف میں دونوں جگہ وہ جتنے اچھے ڈیفنس کرنے والے ہیں، اُتنے اچھے تقسیم کار نہیں۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ اچھا رائٹ آؤٹ کوئی نہیں ہمارے پاس۔ جلال الدین ہوں یا کوئی اور، سب اوسط درجے کے ہیں۔ رائٹ آؤٹ کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پچیس گز کی لائن سے ذرا نیچے اتر کر جب گیند پھینکتا ہے تو سارا ڈیفنس ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوتا ہے کہ لفٹ ہاف بے کار ہو کر رہ جاتا ہے اور لفٹ ہاف کسی ٹیم میں بڑی ظالم چیز ہوتا ہے۔ رائٹ اِن اور رائٹ آؤٹ کو کمبائن نہیں ہونے دیتا۔ اب ایسے رائٹ آؤٹ نظر نہیں آتے جو مخالف لفٹ ہاف کو اس طرح بے کار کر کے رکھ دیں اور ایسی گیندیں سنٹر میں پھینکیں کہ دونوں فل بیک گھبرانے لگیں۔ یہ خوبی ہمارے لفٹ آؤٹ ظفر اقبال میں تھی مگر ان میں ایک خرابی ذرا سی یہ تھی کہ وہ اکثر لفٹ اِن سے کمبی نیشن نہیں بنا پاتے تھے۔ خود ہی گیند لے کر نکلنا اور گول کرنا چاہتے تھے۔ پھر بھی اور سب سے بہتر تھے۔''

اُن کی بہت چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی خوش مذاقی کا احساس آپ کو جا بجا ہوتا ہے۔ لباس، گفتگو، غذا سب میں ایک قرینہ نظر آتا ہے۔ ایک سادہ سا بوشرٹ پہنے وہ آپ کے سامنے آتے ہیں تو خیال گزرتا ہے بل کہ اس کی وضع قطع اور سلائی آپ سے کہہ اُٹھتی ہے کہ یہ یوں ہی نہیں خرید لیا گیا۔ کپڑا کسی خاص دُکان سے اپنے مذاق کے مطابق خریدا گیا ہے اور کسی خاص سلیقہ مند درزی سے سلوایا گیا ہے۔ کسی خاص ریستوراں میں داخل ہونے سے پہلے وہ تسلی کر لیتے ہیں کہ صاف ستھرا اور کچھ قرینے کا ہے۔ ریستوراں میں چائے پر کافی کو ترجیح دیں گے اور اگر فلٹر کافی مل جائے تو کیا کہنے! غذا تھوڑی ہو مگر اچھی ہو۔ کسی کے گھر جانا ہوا تو خواتین اور اور بچوں سے شفقت سے ملیں گے۔ ان کی روزمرّہ مصروفیات اور دل چسپیوں پر گفتگو ہوگی۔ ایک شفیق بزرگ اور عالم کو اتنی توجّہ سے مخاطب دیکھ کر وہ خوش ہو جاتے ہیں اور انسیت محسوس کرتے ہیں۔ خاں صاحب دنیادار نہیں لیکن اس سے بے خبر بھی نہیں۔ اپنے مخلصین کو تاکید کرتے ہیں، خطوں میں لکھتے ہیں کہ گھر اور دفتر کی ذمّے داریوں کو بخوبی نبھائیں۔ کسی بھی حالت میں ان سے لاپروائی نہ برتیں، دست کش نہ ہوں۔

ماحول سے دل چسپی لینا، اس سے نباہ کرنا اور مکروہات کو خاطر میں لائے بغیر اُن سے مقدور بھر ہم آہنگی پیدا کرنا ایک خوش اوصاف شخصیت کا ایک ایسا وصف ہے جس کی کمی شخصیت میں ادھورے پن کا تاثّر دیتی ہے۔ اس کمی کا احساس مجھے رشید حسن خاں سے مل کر کبھی نہیں ہوا۔ تحقیق جیسے خشک موضوع میں پِتّا مارنے کے باوجود وہ مردم بیزار نہیں۔ ہاں دوستوں اور شناساؤں کے انتخاب میں احتیاط برتتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسوّدہ نظر سے گزرے تو آپ دیکھیں گے کہ الفاظ کے درمیان مناسب فاصلہ دیا گیا ہے۔ قلم میں ہم واری ہے اور کانٹ چھانٹ برائے نام۔ ظاہر ہے یہ وہ ڈرافٹ ہے جو کئی مسوّدوں کے بعد فائنل ہوا ہے۔ یہی قرینہ تحریر میں ہے۔ ایک ایک لفظ چُنا ہوا، خیالات واضح، اظہار کی خوش سلیقگی موضوع کی خشکی کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ تحریر اس قدر پُر لطف کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہے۔ ایسے مضامین بھی جو عام پسند نہیں صرف اس لیے پڑھنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ ان کی تحریر ہے۔ کہیں کہیں ہلکے سے جارحانہ انداز سے قطع نظر ان کا اسلوب ادبی، تحقیقی مضامین کے لیے بہت مناسب ہے۔ اس کو اپنانے کی دل میں خواہش ضرور ہوتی ہے لیکن یہ ممکن نہیں۔ اس اسلوب میں ان کی شخصیت کی پوری کیمیا شامل ہے، وہ انسان کہاں سے لائے۔ ہاں اُس کا اثر تحریر کو یقیناً چمکا سکتا ہے۔

یہ اس کیمیا کا ہی اثر ہے کہ وہ لگی لپٹی گفتگو نہیں رکھتے۔ بے جا تعریف ان سے ہو نہیں سکتی۔ مروت کے نام پر لوگ من تُرا حاجی بگویم کے عادی ہو چلے ہیں لیکن اس کی

انھیں ضرورت نہیں۔اس سے وہ اس طرح بچتے ہیں گویا خاردار جھاڑیوں سے گزر رہے ہوں۔ادب و تحقیق کے شعبوں میں یہ ضروری بھی ہے۔اسی لیے وہ ان شعبوں میں انشائیہ اسلوب کو پسند نہیں کرتے۔بقول اُن کے ''انشائیہ اسلوب ادا کی سب سے بڑی خوبی'' یہ ہے کہ ایسی وضاحت کی نوبت آ ہی نہیں پاتی جس سے قطعیت کے ساتھ ذمّے داری کا انتساب کیا جا سکے۔ہر بات کو ایسے پہلو دار انداز سے کہا جا سکتا ہے کہ مختلف اوقات میں اس کی مختلف تعبیریں کی جا سکیں۔ذہن کی آوارہ خرام موجیں، تشبیہوں استعاروں اور کنایوں کے نظر فریب رنگوں میں آمیز ہو کر رواں دواں رہتی ہیں۔جو نہ خود ٹھہرتی ہیں نہ نظر کو ٹھہرنے کی مہلت دیتی ہیں۔ہر بات کو اس ڈھنگ سے کہا جا سکتا ہے کہ کہنے والے پر کوئی حتمی ذمّے داری عائد نہ ہو سکے۔مطالعے کی کمی، ایمان داری کی کمی، صلح سمجھوتے کی ضرورت اور کسی واضح ذمّے داری سے محفوظ رہنے کی اہمیت، ان سب کا حق ادا ہو جاتا ہے۔جملوں کا در و بست کچھ ایسا رکھا جاتا ہے کہ اقرار و انکار دونوں کے پہلو برابر رہتے ہیں۔مشہور شاعروں کے بولتے ہوئے مصرعے، مصرعوں کے چمکتے ہوئے ٹکڑے، دل فریب ترکیبیں، گویا مجموعی طور پر رنگ و نور کی برسات۔یہ انداز منافقانہ صفت رکھنے والوں کو خوب راس آتا ہے۔چوں کہ یہ بھی ڈر رہتا ہے کہ اس اسلوب پر اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ تنقید کو خشک، غیر دل چسپ اور بے آب و گیاہ ریگستان بنانے کے بجائے دل چسپ بنایا گیا اور یہ ''تخلیقی تنقید'' ہے۔

جو لوگ خاں صاحب کی تنقید کی زد میں آئے انھوں نے کہا یہ منفی تنقید ہے۔انتظار حسین کہتے ہیں کہ لفظِ منفی سیاست سے لیا گیا ہے اور ترقی پسند حضرات جب کسی کو سولی پر چڑھاتے ہیں کہ اس کا زندگی کے بارے میں منفی رویّہ ہے۔(اوراق، سال نامہ ستمبر دسمبر 69)

فیضؔ، مجروحؔ، سردار جعفری اور دوسرے ترقی پسند شاعروں کے کلام میں زبان و بیان کی ناہمواریوں کی طرف انھوں نے اپنے کئی مضامین میں توجہ دلائی ہے۔یہ شاعر اپنے عہد کے مقبول شاعر تھے اور ان میں سے کئی آج بھی مقبول ہیں۔اگر ان ناہمواریوں کی طرف توجہ نہ دلائی جاتی تو نئے شاعر اور ان کے بعد آنے والوں کے لیے یہ خامیاں سند ہو جاتیں اس لیے یہ اشد ضروری تھا اور رشید حسن خاں سے بہتر کون یہ کام انجام دے سکتا تھا۔یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان مضامین میں لہجہ کہیں کہیں کچھ سخت ہو گیا ہے۔یقیناً اس دور کی ادبی صورت حال کا نتیجہ ہے کہ پیورٹن (Puritan) مزاج کا بھی حصہ ہے جو ملاوٹ قبول نہیں کرتا۔ادیب و شاعر ایسی تنقیدوں سے بہت بدکتے ہیں۔انھیں خیال ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت پر روک لگائی جا رہی ہے۔سچ تو یہ ہے کہ روک لگانی بھی نہیں چاہیے۔شعرا کو پوری آزادی ہونی چاہیے کہ جس طرح کے تجربات چاہیں کریں۔جو طرزِ ادا چاہیں اختیار کریں لیکن خامیوں اور نقائص کی نشان دہی بھی اسی قدر ضروری ہے ورنہ ادب میں نراج پھیل سکتا ہے۔

رشید حسن خاں مشرقی تنقید کے مزاج داں ہیں۔مشرقی تنقید میں بنیادی حیثیت لفظ کو حاصل ہے کیوں کہ معنی لفظ میں شامل ہیں کسی شعر کے معنی بیان کرنا اور شعری حُسن کا بیان اس تنقید میں دو مختلف چیزیں ہیں۔مرتبے کا تعین مشرقی شعریات کا مقصد نہیں۔وہ محاسنِ شعر اور محاسنِ بیان سے بحث کرتی ہے۔نقطۂ نظر سے اسے سروکار نہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اُن کے لیے لفظ ہی سب کچھ ہے اور اپنے ایک خط میں انھوں نے مجھے لکھا:

> ''قلم میں تازہ افسانہ بھی پڑھا۔یہ بھی خوب ہے مگر آپ کے خالص رنگ کا نہیں۔اس میں ایک مسئلے کا بیان ہے، شخص کا نہیں۔زندگی کے المیے کی جھلک تو ہے خاص کر ایسے بڑے شہر کی زندگی جیسی بمبئی میں ہے یا کلکتے میں ہوگی، مگر اس میں وہ تہہ داری نہیں جو اچھے افسانوں کی خوبی ہوتی ہے۔سطح پر سب کچھ ہوا ہے۔ایک داستان گو نے اپنے خاص رنگ میں ایک معمار کی تعریف یوں کی تھی کہ جب وہ پتھر کے ٹکڑے پر رنگ سے بھری ہوئی کنّی مارتا ہے تو رنگ کی تہہ نیچے کے دوسرے پتھر پر اُبھر آتی تھی۔اُس حکایت میں تو یہ تھا داستانی بیان، مگر فن کی حد تک یہ سچا بیان ہے۔یہ تہہ داری اور تہہ نشینی نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں۔کیوں کہ افسانے تو ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں اور واقعات ہمہ وقت ہوتے رہتے ہیں اور حادثات بھی ہر لحظہ اپنی نمود کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔''

یہ بات بہر حال ذہن میں آتی ہے کہ آج ہم جس طرح مغربی ادب، تنقیدوں اور معیاروں کے زیرِ اثر ہیں چالیس پچاس سال قبل نہیں تھے۔آج ہم لحظہ لحظہ فلم، ٹی وی ریڈیو، ادب اور دوسرے ذرائع سے ان اثرات کو قبول کر رہے ہیں۔کلاسیکی ادب، قدیم معاشرت کی چھاپ دن بہ دن دھندلاتی جا رہی ہے۔مذاق تیزی سے بدل رہا ہے۔عجب نہیں کہ کل لوگوں کی پسند ناپسند بالکل ہی مختلف ہو۔سوچنے کا انداز مختلف ہو۔کلاسیکی ادب کو سمجھنے کے لیے مشرقی تنقید ناگزیر ہوگی چاہے تنقید اس میں کتنے ہی نئے پہلو تلاش کر لے۔چوں کہ غزل ہماری مقبول صنف ہے، اس کی وجہ سے ہمارا مزاج کسی نہ کسی حد تک اس سے آشنا رہے گا۔ترقی پسند شاعری کا ایک عہد جس طرح ''دیوان شاعری'' سے موسوم ہو کر موجودہ حسیت سے منقطع ہو چکا ہمارے یہاں اس کے آثار فی الحال نہیں لیکن جس طرح آزاد نظم اور نثری نظم اپنی جگہ بناتے جا رہی ہیں، نثری نظم کے قبول و رد کی بحثیں بھی پُرانی ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔اختر الایمان کی شاعری نے ہماری جدید شاعری کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔باقر مہدی محمد علوی، قاضی سلیم، شہریار، کشور ناہید، ثروت حسین اور افضال سیّد جیسے شاعر ہماری حسیت پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔غزلیں بہت کہی جا رہی ہیں لیکن ان کی ارزانی قاری کے لیے بیزار کُن ہے۔اس ادب کو نئے ذہن سے ہی دیکھنا اور سمجھنا ہوگا۔لفظ کی اہمیت بہر حال کم نہ ہوگی کیوں کہ ادب کے دائرۂ کار میں لفظ کی اہمیت بنیادی ہے۔

رشید حسن خاں نے ایک آٹھ سال کے بچے سے لے کر اسّی سال کے بزرگوں تک کی دل چسپی کے موضوعات پر لکھا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے حال ہی میں ان کی نئی کتاب ''انشا اور تلفظ'' چھپ کر آئی ہے۔اس میں انھوں نے ان غلطیوں کی نشان دہی کی ہے جو عام طور پر تحریر اور گفتگو میں ہوتی ہیں۔آج اُردو جس کسمپرسی کی حالت میں ہے یہ کتاب طالب علموں اور عام قارئین کے لیے ایک بیش بہا نعمت ہے۔اس لحاظ سے شاید رشید حسن خاں ہمارے درمیان واحد عالم ہیں جنھوں نے ادب کی ہر سطح کے قارئین کو

مستفید کیا ہے۔ایک طرف توان کا نام امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود اور عبدالستار صدیقی کے ساتھ لیا جاتا ہے دوسری طرف طالب علموں کے لیے ''انشا اور تلفظ'' جیسی کتاب لکھتے ہیں۔اس سے ان کی اُردو سے محبت اور ایک اُستاد کی طالب علموں کے لیے دل سوزی کا پتا چلتا ہے۔میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ بارہا ان سے ملنے کا موقع ملا اور خط و کتابت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ایسے خوش اسلوب، یگانۂ روزگار انسان کی صحبت نصیب ہونا خوش بختی نہیں تو اور کیا ہے۔

(کتاب نما، رشید حسن خاں حیات وادبی خدمات، مرتب، اطہر فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جولائی 2002، صفحہ 47 تا 52)

نوٹ:۔رسالہ سہ ماہی ترسیل بمبئی، مدیر یونس اگاسکر، گوشۂ رشید حسن خاں، مشترک شمارہ 11-21 جنوری تا جون 1999، صفحہ 54 تا 59 پر یہ مضمون ''رشید حسن خاں کا تنقیدی رویہ اور شخصیت'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ترسیل میں محترم انور خاں نے اپنے مضمون کی ابتدا رشید حسن خاں کے اس آفاقی نظریہ سے کی ہے جس میں کہا گیا ہے ''جب تک آخری سانس ہے تبدیلی وتغیر کی گنجایش ہے۔آدمی کا نقطۂ نظر بدلتا ہے۔واقعات بدلتے ہیں پھر ایک بات اور کہ سچائیاں اور حقیقتیں اپنے آپ کو ایک دم نمایاں نہیں کرتیں بالترتیب سامنے آتی ہیں۔''

- ''رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے''، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، مکتبہ الخیال، دربھنگہ، بہار، اشاعت اول 2008، صفحہ 135 تا 141 پر 'رشید حسن خاں کا تنقیدی رویہ اور شخصیت' کے نام سے مضمون شائع ہوا ہے۔

○○○

ہمارے خاں صاحب

عبداللہ ولی بخش قادری

رشید حسن خاں ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے بل بوتے پر میدانِ ادب کے مرد بنے۔ان کا تکیہ نہ میراث پر تھا نہ منصب پر۔اور نہ ان کے پاس سہارے کے لیے ڈاکٹر یا پروفیسر کی کوئی بیساکھی تھی۔دہلی میں ان کے جوہر کھلے اور خوب کھلے لیکن قطرے کو گہر بننے میں صرف وقت ہی نہیں لگا بلکہ خونِ جگر بھی صرف کرنا پڑا۔یہاں بڑے شہر کی زندگی اپنی وسعتوں میں جو تنگی رکھتی ہے اور پذیرائی میں جو کج ادائی دکھاتی ہے اس سے بھی انھیں دوچار ہونا پڑا۔ایسا بھی ہوا کہ ان کی محنت، دوسرے کی وجہِ شہرت بنی اور دستورِ مزدور میں نہ بھرپور اُجرت آئی اور نہ کما حقہٗ، اسے عزّت ملی۔انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ ہت کنڈوں سے دستارِ فضیلت بندھتی ہے اور ہنر کیوں کر بے آبرو ہوتا ہے۔پھر بھی انھوں نے قدر شناسی کے اس دور میں ادب شناسی کو اپنا کاروبارِ شوق قرار دیا اور ان کا ذوق، جستجو گل کھلانے لگا۔یہی وہ وقت تھا جب کہ حصولِ آزادی کے بعد اُردو کی بیخ کنی کر دی گئی تھی اور اس کی اُکھڑی ہوئی بیل کو منڈھے چڑھانے کے لیے مواقع بھی فراہم کیے گئے تھے۔اس صورتِ حال نے بہت جلد اُردو کا ایک طبقہ اشرافیہ پیدا کرنے کا ڈول ڈال دیا جس کی جاگیر اعلا تعلیم کے ادارے قرار پائے۔اس کے سیوخ، بہ استثنائے چند، سرِ پُرغرور کے مالک ٹھہرے اور پذیرائی کے خوگر۔وہ کسی، غیر کیف، کو اپنی اقلیم میں قدم رکھنے کے کہاں روادار ہو سکتے تھے۔ایسے مسند نشینوں کو رشید حسن خاں جیسے بوریہ نشیں اور صاف گو کی حد اندازی کیسے قابلِ قبول ہو سکتی تھی۔لہٰذا انھیں بہر طور نظر انداز ہی کیا گیا۔اسی زمانے میں مجھے ان سے نیاز حاصل ہوا۔کب اور کیسے؟ یہ اب یاد نہیں، لیکن گمانِ غالب یہی ہے کہ اب سے کم و بیش تیس سال قبل مکتبہ جامعہ میں پہلی مُڈبھیڑ ہوئی اور بلا شبہ ابتداً ملاقاتیں وہیں

رہی ہیں جو پُر خلوص ربطِ باہم کا سبب بنیں۔

یہی وہ موقع ہے جس کے آس پاس خاں صاحب نے مکتبہ جامعہ کے لیے ''باغ و بہار'' مرتب کی۔ انھوں نے اپنے مختصر پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ''مکتبہ جامعہ نے اُردو کی معیاری کتابوں کے سستے اڈیشن پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔'' (20 اگست 1964) یہ مکتبہ جامعہ کی طرف سے ایک مفید اور بروقت کام کرنے کی طرف پہلا قدم تھا اور میرے علم میں خاں صاحب کے وفورِ شوق کی پہلی برملا انگڑائی۔ اس وقت غلام ربّانی تاباں صاحب، مکتبہ جامعہ کے جنرل مینیجر تھے۔ تگ و دو سے اس سلسلے میں حکومتِ جموں و کشمیر سے مالی اشتراک حاصل ہو گیا۔ انھوں نے اس کام کے لیے ایک مجلسِ ادارت تشکیل کی جس میں خاں صاحب کو بھی شامل کیا گیا۔ تاباں صاحب نے اس مجلس کے تحت شائع ہونے والی پہلی کتاب کے اندر اپنے حرفِ آغاز میں تحریر فرمایا: ''مکتبہ جامعہ نے حکومت جموں کشمیر کے تعاون سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت قدیم معیاری کتابیں صحت متن اور حُسنِ طباعت کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔ ان کتابوں کا متن بہت اہتمام کے ساتھ تیار کیا جائے گا۔ جو اس کتاب کے معتبر ترین نسخے پر مبنی ہوگا۔ صحتِ متن کے ساتھ ساتھ صحتِ املا کا بھی بہ طورِ خاص لحاظ رکھا جائے گا۔'' تاباں صاحب کے ان الفاظ میں خاں صاحب کے دل کی آواز صاف سنی جا سکتی ہے۔ یہ پہلی کتاب مقدمہ شعر و شاعری ہے جسے خاں صاحب نے ہی مرتب کیا ہے جو کہ ستمبر 1969 میں منظرِ عام پر آئی۔ اب تک اس سلسلہ 'معیاری ادب'، کی چونتیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں تیرہ کی مشاطگی خاں صاحب نے کی ہے۔ اس ضمن میں کسی اور نے اس قدر دستِ تعاون دراز نہیں کیا ہے۔ ابھی حال ہی میں باغ و بہار کا ایک نیا اڈیشن، انجمن ترقی اُردو (ہند) نے پیش کیا ہے جو تقریباً آٹھ سو پچاس صفحات پر مشتمل ہے جس میں ڈھائی سو صفحات پر مرتب کا مقدمہ، حاوی ہے۔ مزید برآں تین ضمیمے بھی موجود ہیں۔ پہلا تشریحات سے متعلق ہے۔ جو چالیس سے زائد صفحات رکھتا ہے، دوسرا تلفظ اور املا کے بارے میں جو سوا دو سو صفحوں کا احاطہ کرتا ہے اور تیسرا الفاظ و طریقۂ استعمال سے متعلق سترہ صفحے پر پھیلا ہوا ہے۔ مزید برآں پینسٹھ صفحات پر مبنی ایک فرہنگ میں شامل ہے۔ یہ سارا کام اپنی مثال آپ ہے بالخصوص دوسرا ضمیمہ۔ اور یہ سب کس کا کارنامہ ہے؟ خاں صاحب کا۔ گویا، مکتبہ اڈیشن، طلبہ کے لیے تھا اس لیے پوری انگڑائی آنے پر حجاب مانع رہا یعنی کہ چار صفحے کے پیش لفظ اور چھیالیس صفحے کی فرہنگ پر ہی اکتفا کر لیا گیا اور اب پوری اٹھان کے ساتھ انگڑائی لی گئی ہے۔

اب سے چند برس پہلے تک میرے یہاں کچھ احباب اتوار کی صبح کی خوش گپیاں کرنے کے لیے مل بیٹھتے۔ خاں صاحب بھی نوازتے۔ ان کے علاوہ سب ہی آس پاس کے رہنے والے ٹھہرے لیکن خاں صاحب کو دہلی یونی ورسٹی سے جامعہ نگر تک کی طویل راہ طے کرنا ہوتی۔ بس کے ستم غمزوں کی بنا پر تاخیر ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ وہ ٹھیک دس بجے تشریف فرما ہوتے۔ دہلی میں موجودگی کی صورت میں آفاتِ ارضی و سماوی سے قطعِ نظر، عدم موجودگی کا سوال نہ تھا۔ البتہ اگر اس روز کوئی خاص اکھاڑا جم رہا ہے یا فٹ بال کا کوئی اہم مقابلہ ہو رہا ہے تو خاں صاحب کا دیدار ممکن نہ تھا۔ اس محفل یاراں میں ان کی خوش گفتاری سے لطف اندوز ہونے کا موقع خوب ملا۔ کبھی دنیائے ادب پر طائرانہ نظر ڈالی جاتی، کسی نئی ادبی اشاعت یا تازہ تہذیبی تقریب کی بات بھی نکل آتی، ادبی معرکوں اور ریشہ دوانیوں کا ذکرِ خیر آ جاتا۔ اور ایسا حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا کہ خاں صاحب کے ہاتھوں کسی کی شامت آ جاتی۔ اس وقت ان کے جملوں کی خار اپنی بہار دکھاتی۔ یوں تو ان کی چوٹ کسی واحد غائب پر ہوتی لیکن اس کی لپیٹ میں جملہ سامعین آ سکتے تھے اور کبھی ہم میں سے کوئی بالخصوص تختۂ مشق بنتا۔ ''ارے بھئی! وہ آپ کے۔ سمجھ گئے نا؟ بلاشبہ لائق صد احترام، علم و فضل کے مالک لیکن یہ کیا! نااہلوں کو سراہتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی، یہ بھی صحیح، یوں بھی درست۔ اچھا آپ ہی بتائیے جب فرصت نہیں ہے تو ذمہ داری کیوں قبول کی جائے۔ دیکھیے تاباں صاحب! اب آپ کے یہ صاحب خانہ کچھ بولیں گے نہیں۔ بس مسکرا رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں لیکن ادب مانع ہے مگر میں بھی ادب ہی کی خاطر کہہ رہا ہوں۔ کیا سمجھے؟ اچھا ایک بات اور، وہ مضمون پڑھا...؟ آپ ہی بتائیے کیا ضروری ہے کہ ہر موضوع پر قلم اُٹھایا جائے۔ یہ بھی ان ہی کے ہیں۔ معصوم آدمی۔ نیک ہونا اور بات ہے، ادبی کام اور معاملہ۔ اچھا آپ (صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب) فرمائیں۔ جی، وہ آپ کے بھی ہیں۔ بولیے نا۔ خیر، چھوڑیے۔ آپ ہی بتائیے پہلے تو ادب مانع تھا اور اب؟ مروّت!'' یارانِ خوش انفاس کے ساتھ ایسی صحبتیں برسوں رہی ہیں۔ ایک دھندلا سا نقش، حافظے کے نہاں خانے سے اس وقت برآمد ہو گیا۔ ان ملاقاتوں میں خاں صاحب کی گرمیِ گفتار نے دونوں میں حرارت بھی پیدا کی ہے اور وہ روشنیِ طبع کا باعث بھی رہی ہے۔ اس بزم بے تکلف کی شکست و ریخت کے بعد خاں صاحب سے بھولے بھٹکے ہی نیاز حاصل ہوتا ہے۔ ''آ خاہ! کیسے مزاج ہیں؟'' اور کلام جاری۔ ایسا لگتا ہے جیسے ادھوری بات پوری کی جا رہی ہو، کیوں کہ ان سے ملاقات، گذشتہ سے پیوستہ ہونے کا احساس قائم کرتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کا تعلق واقعات یا معاملات کے تسلسل سے ہوتا ہے بل کہ اپنے بے ساختہ پن اور انہماک توجہ سے درمیانی خلا پُر ہوتے دیر نہیں لگتی۔

اپنی ادبی سرگرمی میں خاں صاحب ترتیب و تدوینِ متن کی طرف خاص طور پر دھیان دیا ہے۔ اس باب میں ان کا کام نہ صرف نہایت وقیع ہے بل کہ وسیع بھی۔ شاید ہی کسی ایک ادیب نے ہمارے دور میں اتنی بہت سی کتب کا اس طور احیا کیا ہو۔ ''باغ و بہار'' کی تازہ بازیابی سے قطع نظر ''فسانۂ عجائب'' کی ترتیب کا کام بھی ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ خاں صاحب خواہ مصنف کی حیثیت سے جلوہ دکھائیں یا مرتب بن کر سامنے آئیں۔ ان کی ایک اہم خوبی صحتِ املا کا اہتمام بھی ہے۔ انھوں نے ترقی اُردو بیورو کی شائع کردہ اپنی اہم تصنیف ''اُردو املا'' میں جو اصول قبول اور قائم کیے ہیں، انھیں اپنی نگارشات میں برتا بھی ہے۔ صحتِ متن کے معاملے میں وہ اوّلین یا اصل متن کے محض نقل نویس بن کر نہیں رہ جاتے بل کہ ہر مقام پر ٹھوک بجا کر آگے بڑھتے ہیں۔ وہ ان اسباب و علل پر روشنی ڈالتے ہیں جو ان کی ترجیحات کا موجب ہوئے ہیں۔ وہ کسی ابہام کی گنجایش نہیں

برآں وہ تلفظ پر بھی توجہ کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے سب بڑے جگر گردے کا کام ہے۔ خاں صاحب نے اس کے لیے بے دریغ دیدہ ریزی اور عرق ریزی کی ہے ان کے دل سے لگا ہوا ہے۔

تحقیق وتنقید کی جولان گاہ کے علاوہ خاں صاحب کا ایک محبوب میدان اور بھی ہے۔ وہ ہے نئی نسل کی صحیح طور پر اُردو بولنے اور لکھنے پڑھنے کی طرف رہنمائی۔ اس شوق کی خاطر اسکولوں کے اساتذہ اور نوجوانوں سے سر مغزنی کرنے میں ان کا انہماک بڑا دل کش اور قابل قدر رہتا ہے۔ بچوں کے لیے ''اُردو کیسے لکھیں'' ان کی کتاب ہو یا پیام تعلیم اور اُمنگ، میں مضامین، بڑوں کے لیے ''اُردو املا''، ''زبان اور قواعد'' جیسی کتب ہوں یا تقریر و مقالہ۔ یہ سب ایک ہی جذبے کے مظاہر ہیں۔ گذشتہ جولائی میں جامعہ کی فیکلٹی تعلیم کے زیر اہتمام ثانوی سطح کے اُردو اساتذہ کے لیے ایک 'ورک شاپ' منعقد کی گئی۔ خاں صاحب ٹھیک وقتِ مقررہ پر تشریف لائے۔ واقعی اُفتاں و خیزاں۔ بیٹھے بیٹھے اپنی بات شروع کی، تھوڑی دیر میں قدم تختۂ سیاہ کی طرف اُٹھ گئے اور وہیں کھڑے کھڑے سارا سبق دے ڈالا۔ شرکا کو زبان کی نزاکتیں سمجھائیں، حوصلہ بڑھایا، سوالات کے جواب دیے، حالات کے تقاضوں پر روشنی ڈالی، ان کی دورانِ تدریس پیش آنے والی دشواریوں پر تبادلۂ خیال کیا، کچھ لطف کی باتیں بھی کیں۔ غرض یہ کہ دو گھنٹے مسلسل مصروف رہے جب کہ ان کی ناساز طبیعت کے پیش نظر منتظمین نے چاہا تھا کہ اپنے اوپر بار نہ ڈالیں۔ پھر بھی نہ کچھ کھایا، نہ چاے پی۔ بس پانی پر اکتفا کیا۔ ایسا لگا یہ وہی ہیں جو تقریباً پچیس سال قبل ایسے ہی ایک موقع پر پہلی مرتبہ یہاں آئے تھے۔ وہی ولولہ، وہی لگن اور وضع داری، رواداری کے حقوق اپنی جگہ محفوظ۔ یوں بھی ان کے حال وقال میں کوئی نمایاں تبدیلی ابھی تک رونما نہیں ہوئی ہے وضع قطع ویسی ہی ہے، مذاق اور مزاج ویسا ہی۔ نہ تیور بدلے ہیں اور نہ آہنگ۔ دہلی یونی ورسٹی کے گائر ہال میں برسوں سے ان کا کنجِ عزلت بدستور آباد ہے۔ حضرت داغؔ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے والا معاملہ ہے۔

خاں صاحب ادبی ریاضت اور صداقت کے علم بردار ہیں۔ ان کی گرفت سخت ہوتی ہے اور بات کھری، کبھی کبھی کھُردری۔ ان کے جملے بسا اوقات دھار رکھتے ہیں۔ وہ تنقید کو تائید بنانے کے مرتکب ہونے سے رہے۔ رورعایت کرنا انھوں نے سیکھا نہیں لیکن ان کے زبان و قلم سے جو کچھ نکلتا ہے اسے نظر انداز کرنا دشوار ہے۔ دراصل وہ افراد کے شاکی نہیں ہیں اور نہ ان کی نیت خراب ہوتی ہے۔ ان کا محاذ ادبی بد دیانتی اور تساہلی کے خلاف ہے۔ پچھلے تیس پینتیس سال کے مسلسل ارتکاز توجہ نے ان سے تحقیق وتنقید کے گراں قدر کارنامے سر انجام کرائے ہیں۔ وہ ہماری ان معدودِ چند ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی ہر تحریر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع قرار پاتی ہے۔ ان کے کام نے بجا طور پر انھیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ وہ خود دوسروں کی تنقید وتحقیق کا موضوع بنیں۔ آج ملک کے اندر اور باہر ان کا چرچا ہے۔ اُردو کے ایوان ان کے قدم لے رہے ہیں۔ دانش کدوں میں ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس، نیرنگی زمانہ سے ہمارے خاں صاحب کس قدر اور کیا رنگ پکڑتے ہیں یا پھر قطب از جانمے جُنبد!

26/اگست، 1993

(کتاب نما، رشید حسن خاں حیات وادبی خدمات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، مرتب اطہر فاروقی، جولائی 2002، صفحہ 134 تا 137)

○○○

رشید حسن خاں

محمد علی صدیقی (کراچی)

میں اُردو ادب کا معمولی سا طالب علم ہوں۔ جدید ادب میرا خصوصی میدان ہے۔ تحقیق کے میدان سے اسی قدر علاقہ ہے کہ اچھی تحقیقی کاوش اچھی لگتی ہے۔ میں رشید حسن خاں صاحب کا نیاز مند ہوں۔ ان کی متعدد کاوشوں پر اظہار کر چکا ہوں لیکن ''فسانۂ عجائب'' کے متن کو جس صحت اور محبت کے ساتھ اُردو پڑھنے والوں کی نئی نسل کے لیے تیار کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اب خواہ میرے دوست نثار احمد فاروقی، خاں صاحب کو کماحقہ داد نہ دیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ رشید حسن خاں سے زیادہ دیدہ ریزی کسی اور محقق کے حصے میں نہ آئی۔ تدوینِ متون میں رشید حسن خاں ایک بہت قد آور شخصیت ہیں۔ جب ایک محقق بہت بڑا کام کر چکتا ہے تو اپنے عظیم الجثہ خرمن کے خوشہ چینیوں کے لیے بھی کچھ کام چھوڑ جاتا ہے اور یہی ''فسانۂ عجائب'' کے ساتھ ہوا لیکن اصل بات ''فسانۂ عجائب'' کے متن کی صحت کا وہ اہم حصہ ہے جو ہم جیسے طالبانِ علم کے لیے ناگزیر طور پر مینارۂ روشنی کا کام کر رہا ہے۔

مجھے اس حقیقت میں کوئی کلام نہیں ہے کہ تدوین کا بنیادی مطلب یہ ہوتا ہے کہ متن کو ممکن حد تک منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔لفظ مجموعہ ہوتا ہے حرفوں کا اور یوں کہا جا سکتا ہے کہ حرف کا تعین اس ذمّے داری میں شامل ہے۔

رشید حسن خاں نے ''فسانۂ عجائب'' کے متن کی تدوین کے ذریعے اُردو کے ایک ایسے کلاسک کو عام فہم بنا دیا ہے جس نے مرزا غالب سے بھی داد تحسین حاصل کی تھی۔مرزا غالب نے لکھنؤ اور دہلی کی اُردو کے مابین جس فرق کی نشان دہی کی تھی وہ فرق فسانۂ عجائب کی زبان سے عیاں ہے۔

غالب نے صفیر بلگرامی سے اس فرق کے بارے میں کہا تھا:

> ''میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زباں کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے۔ورنہ بولنے کو کون نہیں بولتا۔اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے، مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کہ جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے۔ہاں قواعد لکھ نہیں گیا۔قواعد جاننے والا اس کے کلام کے مزے پاتا ہے ہماری دلّی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا۔''

(بحوالۂ غالب اور صفیر بلگرامی، مرتبہ مشفق خواجہ، صفحہ 104-103)

میرا خیال ہے کہ ''فسانۂ عجائب'' کے متن کی صحت کا اندازہ بھی محاورۂ لکھنؤ کے حوالے سے لگایا جائے۔دہلی اور روہیل کھنڈ کے محاوروں سے طرزِ ناسخ میں لکھی ہوئی زبان کے بارے میں زیادہ قطعیت کے ساتھ حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

میں متنی تنقید کے بُغادریوں کی نکتہ آفرینیوں میں اس بحث کے حاشیہ پر بیٹھے ہوئے ناظرین میں شامل ہوں، لیکن میں رشید حسن خاں صاحب سے زیادہ نکتہ رس محقق، خاص طور سے تدوین متون کے سلسلے میں، اب تک نظر نہیں آیا۔میرا خیال ہے کہ رشید حسن خاں پر تنقید کرتے ہوئے سموئل جونسن (Samuel Johnson) کے اس شہرۂ آفاق تنقیدی کلیّے کی ہم نوائی کی جائے کہ رشید حسن خاں کے کمالِ ہُنر کی پزیرائی کے لیے زیادہ وقت صرف کیا جائے اور زیادہ بڑے انتقادی پیمانے بروئے کار لائے جائیں۔

مجھے رشید حسن خاں صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل ہے اور میں بجا طور پر نازاں ہوں کہ وہ ہمارے دورِ کم نگہی کے محیّر العقول دوررس محقق ہیں۔

(کتاب نما، رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات، مرتب اطہر فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جولائی 2002، صفحہ 25 تا 26)

○○○

رشید حسن خاں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

مجھے اس وقت ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا کہ رشید حسن خاں سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی لیکن اتنا یاد ہے کہ جب میں پُل بنگش (دہلی) والے مکان میں مقیم تھا تو رشید حسن خاں اور قمر رئیس دہلی یونی ورسٹی کے قریب لکھنؤ روڈ پر ایک مکان، میں رہتے تھے اور اس مکان میں قمر رئیس اور رشید حسن خاں سے ملنے اکثر جایا کرتا تھا۔ممکن ہے رشید حسن خاں کبھی پُل بنگش والے مکان میں ہم لوگوں سے ملنے آئے ہوں لیکن مجھے اُن کا اس مکان میں آنا یاد نہیں۔ہاں 1963 میں جب ہم موتی باغ (نئی دہلی) کے فلیٹ میں منتقل ہو گئے تو اس مکان میں رشید حسن خاں کی آمد اور اس کے بعد وِنے مارگ والے مکان میں اور ان سے ملاقاتیں کسی حد تک مجھے یاد ہیں۔

اس زمانے میں اپنی مختصر سوانح حیات ''میرے گذشتہ روز و شب'' میں نے لکھنا شروع کی تھی۔ایک روز جب رشید حسن خاں آئے تو میں یہی لکھ رہا تھا اور جو صفحہ زیرِ تحریر تھا اس میں یہ مندرجہ عبارت درج تھی جو میری سات آٹھ برس کی عمر تک کی روداد کا حصہ تھا:

حفیظ صاحب بھیرے میں والد محترم کی نظم ''ہندو مسلمان'' میری زبانی سُن چکے تھے۔یہاں انھوں نے اعلان کر دیا کہ اب یہ بچہ آپ کو نظم سنائے گا اور مجھ سے کہا کہ پڑھو۔میں نے پوچھا کون سی؟ ''ہندوستان ہمارا'' یا ''آندھی'' انھوں نے کہا ''آندھی'' اور میں گراموفون ریکارڈ کی طرح شروع ہو گیا۔ذرا سا میرا قد تھا بس میز ہی کی اونچائی کے برابر اور مشاعرہ یہ بہت بڑا تھا۔بھیرے کے مشاعرے سے کہیں بڑا۔وہ اسکول کے ایک ہال میں تھا۔یہ باہر وسیع و عریض میدان میں۔حفیظ صاحب نے مجھے دونوں ہاتھوں سے

اب یہ دکھا کہ رنگ بدلتی ہے کس طرح
آندھی کلورکوٹ کو چلتی ہے کس طرح

آندھی کی رفتار سے سناڈالی۔

یہ مشاعرہ طرحی تھا اور اس میں دو مصرعے اس طرح تھے۔ایک مصرع جوش ملیح آبادی کا تھا۔

آگ برسانا بھی ہے آگ نہیں ہے بنا ہی ہے

ایک اور دوسرا تھا:

کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

رشید حسن خاں نے پوچھا کیا لکھ رہے ہیں آپ، تو میں نے بتایا کہ ایک سہ ماہی نے چند صفحات پر مشتمل میری سوانح حیات طلب کی ہے۔وہی لکھ رہا ہوں۔ایک مضمون ہی میں سب کچھ سما جائے گا۔پچیس تیس صفحات میں۔انھوں نے وہ کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا اور پڑھنا شروع کیا۔جب جوش کا مصرع پڑھنے کے بعد وہ دوسرے مصرع، کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم، پر پہنچے تو مصرع پڑھ کر کہنے لگے جب پہلے مصرع کے ساتھ شاعر کا نام لکھا ہے تو اس دوسرے مصرعے کے ساتھ کیوں نہیں لکھا۔میں نے شاعر کے نام سے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا تو فوراً انھوں نے کہا ''حالی''۔

جہاں تک حافظہ کام دے رہا ہے غالباً یہ تھی میری اور رشید حسن خاں کی پہلی ملاقات۔خیال آتا ہے کہ اس وقت بات چیت نے حالؔی اور غالبؔ کے بعد دیوانِ غالب اور نسخۂ شیرانی کا رُخ کیا اور حافظ محمود شیرانی موضوعِ گفتگو بن گئے۔میں نے بتایا کہ میں نے انھیں دیکھا ہے وہ میرے اساتذہ یعنی ڈاکٹر سید عبداللہ،صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور سید عابد علی عابد کے اُستاد تھے لیکن جب میں کالج میں داخل ہوا تو وہ کالج میں آنا جانا ترک کر چکے تھے۔اگر کبھی وہ ہمارے اُستاد ڈاکٹر شیخ محمد اقبال وائس پرنسپل اورینٹل کالج سے ملنے آتے تھے تو ان کے کمرے ہی میں ان سے ملاقات کر کے واپس چلے جاتے تھے اور ان کے آنے اور واپس چلے جانے کا ہمیں پتا ہی نہیں چلتا تھا اور اگر پتا چل بھی جاتا تو ہم طلبہ اس قابل تھوڑا ہی تھے کہ ان سے بات چیت کر سکتے۔

رشید حسن خاں نے میری زبانی حافظ محمود خاں شیرانی کا مختصر سا ذکر بڑی توجہ سے سُنا لیکن وہ ان کے کام کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ جانتے تھے اسی لیے جلد ہی تنقید شعر العجم بات چیت کا موضوع بن گئی اور وہاں سے گفتگو دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کام تک پہنچی۔اب مجھے یاد نہیں کہ کس کتاب کے ذکر پر رشید حسن خاں نے کہا کہ دارالمصنفین کے بعض اہلِ قلم کے سامنے تحقیق کا وہ معیار نہیں رہا جو ہونا چاہیے۔میں نے شاید یہ کہا کہ دارالمصنفین کے سامنے غالباً ''تو برائے وصل کردن آمدی'' کا مقصد رہا ہے اس لیے وہ تحقیق کے کام کو اس حد تک نہیں لے جاتے جہاں قومی یا مذہبی اختلافات کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔اس پر رشید حسن خاں نے کہا کہ تحقیقی کام کے سامنے مقصد صرف حق کی تلاش ہونا چاہیے۔تحقیق کا جو مقصد آپ نے بیان کیا ہے اس کی حدیں مصلحت اندیشی کے ساتھ جا ملتی ہیں اور تحقیق اور مصلحت اندیشی میں بُعد المشرقین ہے۔یہ ایک دوسرے کا تضاد ہیں۔میں نیا نیا لاہور سے ایک مہاجر بن کر آیا تھا،معلوم نہیں اور ''تو برائے وصل کردن آمدی'' کو اپنا ایمان بنائے بیٹھا تھا لیکن رشید حسن خاں نے اپنی مدلّل گفتگو سے میرے ایمان کو کہ ''تو برائے وصل کردن آمدی'' کا اطلاق تحقیقی کام پر بھی ہوسکتا ہے،مُتزلزل کر دیا اور ان کا مشورہ اس وقت میرے کام آیا جب میں گورنمنٹ آف انڈیا کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر جمّوں یونی ورسٹی میں شعبۂ اُردو کے صدر اور پروفیسر کی حیثیت سے آیا۔مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ شعبۂ اُردو کی صدارت اور پروفیسر شپ کے زمانے میں اگر چہ میں نے کوئی خاص تحقیقی نوعیت کا کام نہیں کیا لیکن ایک تو طلبہ کی رہنمائی ہمیشہ رشید حسن خاں کے مشورے کی روشنی میں کی،دوسرے تحقیقی نوعیت کے جو چند ایک مضامین لکھے مثلاً ''اقبال کی تاریخِ ولادت''، ''نسخۂ حمیدیہ سے نسخۂ شیرانی تک'' اور حیاتِ محروم کے بعض حصے جن کا تعلق تحقیق سے ہے ان کی تشکیل و تکمیل میں رشید حسن خاں کے مشورے کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔

مذکورہ ملاقات کے بعد رشید حسن خاں سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔اور یہ سلسلہ اس وقت تک خاصی باقاعدگی کے سے جاری رہا جب میرا تبادلہ دہلی سے سری نگر ہو گیا۔اس کے بعد دہلی میں ملاقاتیں جاری رہیں اور اگر چہ ان ملاقاتوں کے درمیان بُعدِ زمانی اب کے پہلے سے زیادہ ہو گیا تھا لیکن تعلق خاطر میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔دراصل تحقیق کے متعلق ان کے علم کی وسعت اور گہرائی نے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس علم کو دوسرے تک ایک دل کش انداز سے پہنچانے کے سلیقے نے مجھے اُن کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

اب جب کہ میں شعبۂ اُردو میں اپنی آمد کا ذکر کر دیا ہے تو اس بات کا ذکر کرنا بھی یہاں غیر مناسب نہیں ہوگا کہ میری شروع ہی سے یہ خواہش رہی کہ کبھی سارے جمّوں ڈویژن کے اُردو اساتذہ کو اپنی یونی ورسٹی میں مدعو کر کے چند روز تک مسلسل اِملا کے موضوع پر ایک ''سمر انسٹی ٹیوٹ'' کا سلسلہ جاری کیا جائے جس میں رشید حسن خاں تشریف لائیں اور سلسلہ وار لکچر دے کر تمام اساتذہ کو بتائیں کہ اِملا کا مسئلہ کیا ہے،لفظ کس طرح لکھا جائے،جملہ کس طرح لکھا جائے،عبارت کی خامیوں کا انشا سے کیا تعلق ہے وغیرہ وغیرہ۔

چناں چہ دہلی کے ایک سفر میں جب رشید حسن خاں سے ملاقات ہوئی تو میں نے اپنی خواہش کا اظہار ان سے کیا اور انھوں نے میری اس خواہش کا اظہار ان سے کیا اور

انھوں نے میری اس خواہش کو عملی جامہ پہنانا منظور کرلیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور جمّوں واپس آکر ان کو میں نے ایک رسمی یعنی فارمل دعوت نامہ بھیج دیا۔ رشید حسن خاں آئے اور اِملا کے موضوع پر سمر انسٹی ٹیوٹ جاری ہو گیا۔

اس سمر انسٹی ٹیوٹ میں رشید حسن خاں نے لکچر دیے اور ایک بورڈ پر الفاظ اور جُملے لکھ کر جس طرح اپنی بات کی وضاحت کی اُس سے جمّوں ڈویژن کے اساتذہ تو فیض یاب ہوئے ہی اس سمر انسٹی ٹیوٹ ورک شاپ کی خبریں بھی ہندوستان میں اُردو کے متعدد اخبارات میں شائع ہوئیں اور سمر انسٹی ٹیوٹ کی اطلاع دور دور پہنچ گئی۔ بل کہ ملک کے باہر شکاگو (یو اس اے) ریڈیو پر میں نے خود ایک انٹرویو کے دوران میں جو میرے عزیز اور خوش فکر شاعر افتخار نسیم مجھ سے لے رہے تھے اس سمر انسٹی ٹیوٹ یا ورک شاپ کا تفصیلی طور پر ذکر کیا۔

ہندوستان کی کسی یونی ورسٹی میں یہ پہلا سمر انسٹی ٹیوٹ تھا۔ اخبارات اور ریڈیو کے ذریعے سے جب اس کا شہرہ عام ہوا تو کرناٹک یونی ورسٹی (دھارواڑ) کرناٹک کے اُردو اساتذہ کے لیے املا پر ایک ورک شاپ کا انتظام کیا اور رشید حسن خاں نے کرناٹک یونی ورسٹی کی دعوت پر دھارواڑ جا کر علم وفضل کی بارش کی۔ یونی ورسٹی نے راقم الحروف سے اس ورک شاپ کے لیے پیغام کی فرمایش کی۔ راقم الحروف کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی کہ اُردو اِملا کی باریکیوں سے ملک کے دوسرے حصّوں کے اُردو اساتذہ رشید حسن خاں کے علم سے مستفیض ہوں۔ راقم نے یونی ورسٹی کو ورک شاپ کا فیصلہ کرنے اور رشید حسن خاں کو اس کے لیے زحمت دینے پر مبارک باد دی۔

اصل میں مجھے یہ تحریر بہت پہلے مکمّل کر کے مجوزہ کتاب کے مرتبین کو دے دینا چاہیے تھی لیکن کچھ ایسے کام ہاتھ میں تھے جنھیں مکمل کرتے کرتے آج کا دن آ گیا۔ اس لیے اب میں چاہتا ہوں کہ اس تحریر کو زیادہ طول نہ دوں اور کہوں کہ اس طرح مختلف یونی ورسٹیوں کی دعوت پر یونی ورسٹیوں میں اِملا انشا اور لغت کی باریکیوں پر لکچر دے کر رشید حسن خاں صاحب نے اساتذہ اور طلبہ کے علم ہی میں اضافہ نہیں کیا بل کہ اس طرح کے موضوعات پر معیاری کتابیں لکھ کر دنیا بھر میں اُردو کے ہر فرد اور ادارے کو یہ موقع دیا ہے کہ اس بہتے گنگا سے فیض یاب ہو سکے۔

میرا اندازہ ہے کہ رشید حسن خاں کی تصنیفات اور تالیفات کی تعداد بیس کے قریب ہے یا شاید بیس سے زیادہ ہو، لیکن سوال تعداد کا نہیں ہے سوال کتاب کی اہمیت کا ہے اور بعض موضوعات تو ایسے ہیں جس پر کتاب لکھنے یا کتاب مرتب کرنے کی اولیت کا شرف رشید حسن خاں ہی کو حاصل ہے۔ اس وقت ان کی جو کتابوں کا مجھے خیال آ رہا ہے اس میں سے بعض تصانیف کے زیرِ عنوان آتی ہیں اور بعض تالیفات کے زیرِ عنوان، بعض کی اہمیت ان کتابوں میں رشید حسن خاں کے دیباچوں اور حواشی کی بنا پر ہے۔ بعض کی متنی تنقید کی بنا پر بعض کی تصحیح اور اصلاح کی بنا پر لیکن کتاب کا موضوع اور اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، ایک خاصیت جو ان کی تمام تصنیفات اور تالیفات میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ ان کی رواں دواں اور دل کش نثر ہے جو پتّھر کی طرح مضمون کو بھی پانی اور خشک سے خشک مسائلِ علم وادب کو دل کش اور سرسبز بنائے چلی جاتی ہے۔ رشید حسن خاں کی نثر کی امتیازی خصوصیت جسے Readability کہتے ہیں انھیں دوسرے محققین سے ممتاز کرتی ہے اور ان کی تحقیق، تنقید اور تالیف کو تخلیقی ادب کی حدوں سے جا ملاتی ہے۔

(کتاب نما، رشید حسن خاں، حیات وادبی خدمات، مرتب اطہر فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جولائی 2002، صفحہ 21 تا 24)

○○○

یہ جو اپنے خاں صاحب ہیں نا...!

صدیق الرحمٰن قدوائی

شاید یہ سنہ پچپن یا چھپن کی بات ہے کہ 'قومی آواز' میں فیض احمد فیضؔ پر ایک مضمون شائع ہوا جس میں ان کی شاعری پر بہت سارے اعتراضات تھے۔ مثلاً؛ فیضؔ کی ایک مشہور نظم کے دو مصرعے ہیں۔

کیسے شفاف حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت سے پگھل جاتے ہیں

ہاتھوں کی حرارت سے پگھلنے والے حسیناؤں کے جسم کو چھوڑ کر برف اور برفاب کی لغت میں منجمد ہوگیا۔ مصنف کا نام دیکھا تو رشید حسن خاں لکھا تھا۔ کچھ عرصے بعد شعری زبان کے سلسلے میں اور بحثیں بھی شائع ہوئیں۔ اختر تلہری اور آثر لکھنوی کے ساتھ رشید حسن خاں اکثر گتھے ہوئے پائے جاتے تھے۔ ان تحریروں کو دیکھ کر مجھے ایک دن اچانک بڑا اطمینان ہوا۔ سوچا کہ یہ شخص جس کا نام رشید حسن خاں اور اپنے اطوار سے اختر تلہری اور آثر لکھنوی سے دس بیس سال بڑا ہی ہوگا۔ چناں چہ جلد مر جائے گا اور فیض کی شاعری کی حسیناؤں کے جسم کی حرارت برف و برفاب کی گردان سے بالآخر محفوظ ہو جائے گی پھر وقت گزرتا گیا۔ میں علی گڑھ سے دہلی آیا اور خواجہ احمد فاروقی صاحب کی عنایت سے دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہوا۔ فاروقی صاحب بے حد فعال، سلیقہ مند، سخت ڈسپلن کے عادی ہونے کے باوجود بڑے خوش مزاج، خوش گفتار اور بردبار انسان تھے۔ انھوں نے دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کو نہ صرف قائم کیا بل کہ اس بلندی تک پہنچایا کہ یہ برعظیم کے دوسرے ادارے رشک کرنے لگے۔ یہاں فاروقی صاحب نے اطراف و جوانب سے جمع تو بھانت بھانت کے لوگوں کو کیا مگر سب کو با مقصد کاموں میں لگا دیا اور اُردو تحقیق کا رُخ ایسے موضوعات کی طرف موڑا جدھر پہلے کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ یہ زمانہ قاضی عبدالودود صاحب کے تحقیقی تبصروں کی مقبولیت کا تھا۔ خود فاروقی صاحب کی میر تقی میر والی کتاب پر وہ پہلے ہی ہاتھ صاف کر چکے تھے۔ انھوں نے ساری اُردو دُنیا کو ہلا رکھا تھا۔ ہمارا معمولی طالب علم بھی اب بے چارہ علی ہٰذا القیاس جیسا روزمرہ استعمال کرنے لگا تھا۔ یونی ورسٹی کے اچھے بھلے لوگوں کے دماغوں میں دیکھتے دیکھتے اچانک تحقیق کی رگ پھڑک اٹھتی تھی اور پھر کوئی بھی نارمل رہ جاتا تھا۔ میں علی گڑھ کا فارغ، رشید صاحب اور سرور صاحب، خورشید الاسلام صاحب مسعود صاحب، جذبی صاحب اور خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب جیسے لوگوں کی آنکھیں دیکھے ہوا ہشاش بشاش نوجوان ایسے لمحوں میں ششدر رہ جاتا۔ دہلی آنے کے بعد صبح و شام کی خوش باشیوں میں شامل رہنے والے ساتھیوں میں کوئی حواشی و تعلیقات کے گورکھ دھندے میں پھنسا تھا تو کوئی کسی قدیم مخطوطے کے اول و آخر کے مفقود الخبر ہونے پر سر پیٹتا ملتا اور کوئی کسی کرم خوردہ نسخے کے صفحات کے اندر جھانک جھانک کر آنکھیں دیے دے رہا تھا۔ اکثر تو ان کی بھاشا سن کر ہی میری طبیعت مکدّر ہو جاتی تھی۔ فاروقی صاحب کی شہ پر میں نے بھی ان سب کو منہ چڑھانے کے لیے پہلے ماسٹر رام چندر اور پھر گل کرسٹ پر زور آزمائی کر ڈالی۔ ان دنوں فاروقی صاحب کے دولت کدے پر اکثر محفلیں ہوتی تھیں اور کام کے وقت کام بڑی سنجیدگی سے ہوتا۔ دراصل وہاں کام کا وقت تو چوبیس گھنٹے رہتا تھا۔ ایک دن فاروقی صاحب کے ہاں ایک صاحب ایک کرسی پر الگ تھلگ لیے دیے سے بیٹھے ہوئے اپنا کام کر رہے تھے۔ چہرے مہرے سے کچھ غلط آدمی نہیں لگتے تھے۔ دستور کے مطابق بہت سلیقے سے چائے آئی اور یہ صاحب بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کر آئے۔ تعارف ہوا۔ نام رشید حسن خاں بتایا گیا۔ اب یہ روز دکھائی دینے لگے۔ بات آگے بڑھتی گئی اور ہم لوگ کافی ہاؤس میں پابندی سے ملنے لگے۔ مجھے لگا کہ یہ جو بھی شخص ہو، اچھا اور دوست آدمی ہے۔ اسی دوران یہ راز کھلا کہ یہ وہی برف و برفاب والے رشید حسن خاں ہیں اور اب تک مرکھپ نہیں سکے۔ بس اپنی تحریروں سے اپنی عمر کے بارے میں دھوکا دے کر دشمنوں کی اُمیدیں بڑھاتے رہے، مگر ان سے اب کچھ ایسا تعلق ہوا کہ ان کی موت کی خواہش درازیِ عمر کی دعاؤں میں تبدیل ہوگئی۔ اب جب چالیس پینتالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور بیتے ہوئے دنوں کی کمائی پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ انمول خزانے ہم نے بھی جمع کیے ہیں ان میں ایک رشید حسن خاں کی دوستی ہے۔

خاں صاحب شاہ جہاں پور کے ہیں اور پٹھانوں کے کسی بڑے اڑیل جرگے سے تعلق رکھتے ہیں، وہ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ دوستوں کی دوستی میں وہ کسی حد تک جا سکتے ہیں اس کا اندازہ مجھ جیسے دوستوں کو ہے اور دشمنوں سے دشمنی کا اندازہ شاید اُردو دُنیا میں سب ہی کو ہوگا۔ دشمن بنانے کا گُر ہمارے زمانے میں ان سے بہتر کسی کو نہیں آتا۔ ان کا قلم بس خون کا پیاسا رہتا ہے۔ اگر روشنائی لال ہو کر نہ نکلے وہ خاں صاحب کا قلم نہیں۔ ایک بار اپنے دفتر میں خالی ہاتھ بیٹھے تھے، برابر میں دہلی کے مشہور خوش نویس زیدی صاحب کسی مسودے کی کتابت کر رہے تھے اور خاں صاحب اچھے بھلے حروف کے پیچ و خم میں مین میخ نکالنا شروع کرنے والے ہی تھے کہ میں پہنچ گیا۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ دفتر آتے ہوئے راستے میں کسی نے ان کا قلم اُڑا لیا۔ میں نے سُنا تو اُردو ادب پر اس چور کے احسان پر اظہارِ تشکر کیا۔ خاں صاحب پیچ و تاب کھاتے رہے اور پھر کافی کی پیالی پر معاملہ رفع دفع ہوا۔ خاں صاحب کے اور میرے مزاج میں کوئی بات بھی مشترک نہیں، مگر قدرت نے ہم دونوں میں نہ جانے ایسی کون سی شے رکھ دی ہے کہ آج تک کبھی لڑے نہیں۔ مدتوں بعد جب بھی ملتے ہیں تو بات وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں چھوٹی تھی۔ انھوں نے تحقیق کے میدان میں جو کچھ کیا ہے وہ سب جانتے ہیں اور آیندہ اس کی اہمیت کا زیادہ اندازہ ہوگا۔ میرے سامنے انھوں نے جب بھی تحقیق کا موضوع چھیڑا، میں نے اسے ٹال کر اِدھر اُدھر کی باتوں میں انھیں لگا لیا اور جب ہم دونوں ساتھ ہوں تو دراصل اِدھر اُدھر کی باتوں میں جی بھی خوب لگتا ہے۔ اور خاں صاحب پیشۂ تحقیق کے باہر ڈھنگ کے لوگوں کی بستی کے آدمی لگنے لگتے ہیں۔ ایک بار طے ہوا کہ کبھی کبھی ہم دونوں اس طرح ملیں کہ کسی تیسرے کا قدم درمیان میں نہ ہو۔ یہ زمانہ وہ تھا جب وہ جبلی ہال کے کھانے کے انچارج تھے۔ وہ بہترین کھانے بل کہ ایسی نعمتیں پکواتے تھے کہ ہوسٹل والوں نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوں گی۔ لازم تھا کہ ان کے اس انتظام کا جائزہ لینے کے لیے ان کے دوست بھی وقتاً فوقتاً پہنچتے رہیں۔ چناں چہ ہماری یہ ملاقاتیں بڑی کام یاب رہیں۔ بس دو بار ایسا ہوا کہ جیسے ہی ہم لوگ بیٹھے کسی نہ کسی بڑے قومی سانحے کی خبر آگئی۔ ہم نے طے کیا کہ ہمارا اس طرح ملنا قومی مفاد میں نہیں ہے چناں چہ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ان کے ہوسٹل میں بند ہوا۔

خاں صاحب نے مجھ پر ناراض نہ ہونا کیسے سیکھا یہ تو مجھے نہیں معلوم اور یقیناً انھیں بھی نہیں معلوم ہوگا کہ بعض اوقات تعلقات کی نوعیت خود ہی ہر بات کو اس طرح طے کر دیتی ہے کہ اس پر کسی قسم کی تحقیق کی ضرورت نہیں رہ جاتی، مگر انھیں ناراضگی کا سامان بہم پہنچانے میں میں نے بعض اوقات خاصا اہتمام کیا۔ میں جب بھی ملک سے باہر گیا علم و تحقیق کا حلیہ کر کے گیا۔ یہاں دوستوں سے اور کیا کہہ کے جاتا۔ خاں صاحب کی فرمائش ہوتی کہ لندن، پیرس وغیرہ میں زندگی کے عزیز ترین لمحے فلاں کتاب کے فلاں اڈیشن

کے فلاں صفحے کی فلاں سطر کے فلاں لفظ کے اعراب گننے میں ضائع کردوں، گویا میں بھی سفاک حسیناؤں کی جگہ برف و برفاب کے چکر میں کھو جاؤں۔ پٹھان کتنا ہی پڑھ لکھ جائے ،مہذب ہو جائے، چالاک بننے کی کوشش کرے مگر اس کی سادہ لوحی نہیں جاسکتی، چناں چہ وہ اس کی توقع بھی کرتے رہے کہ میں نے ان کی بات پر کان دھرا ہوگا۔ لوگ مغربی دُنیا میں کیا کیا ارمان لے جاتے ہیں، وہاں کی ہوا کھانے والوں کو تو جانے دیجیے جن لوگوں نے یہاں رہ کر صرف وہاں کے خواب دیکھے ہیں ذرا ان کے دل سے پوچھیے۔ مگر خیر! خاں صاحب مجھے اتنے عزیز ہیں کہ جہاں بھی رہا انھیں یاد کرتا رہا۔ کتب خانوں کی باہر کی دُنیا میں بھی وہ نہ جانے کتنے موقعوں پر یاد آئے۔ ان کی فرمایش کو بھی میں بھولا نہیں۔ جب لندن سے پیرس سدھارنے کا وقت آیا تو لندن میں میرے ایک ہم دم و ہم زاد بل کہ شکیب خاطر اہلِ وفا ہیں جنھیں اہلِ دُنیا ضیاءالدین شکیب کہتی ہے اور میرے زمانۂ طالب علمی کے دوست اور دیارِ غیر میں میرے اکیلے سرپرست ہیں۔ تحقیق کے سمندر میں گلے گلے ڈوبے ہوئے لندن کے کتب خانوں کی الماریوں کے اندر تک اُترے ہوئے ان سے خاں صاحب کی فرمایش کا ذکر کیا تو انھوں نے بڑی ہم دردی کے ساتھ یہ ذمہ داری قبول کی کہ میرے جانے کے بعد وہ خاں صاحب کو ان کے مطلوبہ مسودات کی نقل بھیج دیں گے۔ مجھے اطمینان ہوا کہ خاں صاحب کو خوش کرنے کا بہانہ مل گیا، مگر جس طرح میں اپنے شکیب کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں اُسی طرح خاں صاحب بھی مجھے جانتے ہیں۔ چناں چہ ہم سب دوست مطمئن رہے۔ مگر پٹھان دوست ہی کیوں نہ ہو، حساب تو ہمیشہ بے باک رکھتا ہے۔ اُدھار کبھی نہیں چھوڑتا۔ چناں چہ باغ و بہار کے مقدمے میں دو چار فقرے لگا ہی گئے۔ یہ بھی محض ان کی شرافت اور ہمارے بے لاگ دوستی کی دلیل ہے۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک خاں صاحب اس کی ساری علمی و ادبی فتوحات کو مٹی میں ملا چکے ہوتے۔

خاں صاحب دراصل مخصوص صحبتوں کے آدمی ہیں، مجمعے جم گھٹے کے نہیں۔ حالاں کہ اگر مجمع انھیں مل جائے جو اکثر سمیناروں یا جلسوں میں مل بھی جاتا ہے تو انھیں بہت بُرا بھی نہیں لگتا کہ وہ ایسے موقعوں سے لوگوں کو ڈرانے ہڑکانے کا کام لیتے ہیں اور خصوصاً نوجوان جو اُن سے پہلے پہل ملے ہوں یا کم ملے ہوں بالکل ہی ڈھیر ہو جاتے ہیں مگر خاں صاحب اتنے بھیانک ہیں نہیں جتنے خود وہ لگنا چاہتے ہیں۔ میری طرح وہ بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ رکھنا تو پسند نہیں کرتے پھر بھی ان کے دوستوں کا حلقہ اچھا ہے اور اپنی صحبتوں کے اعتبار سے معتبر لگتے ہیں اور ہم لوگوں کے ساتھ وہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے خاص طور سے اپنے بزرگ غلام ربانی تاباں صاحب بہت یاد آتے ہیں کہ مخصوص ترین صحبتیں وہی تھیں جہاں تاباں صاحب بھی ہوتے تھے۔ پٹھانوں میں ایک قبیلہ ایسا ہے جس نے اپنے نام کے ساتھ پٹھان ہونے کی علامت کو باقی نہیں رہنے دیا۔ شاید اس لیے کہ سماج نے ان کی ہر ادا سے خود بہ خود پہچان لیا کہ وہ نہ صرف پٹھان ہیں بل کہ بالکل اصیل۔ پھر اگر وہ محقق اور نقاد نہ ہوں تو انھیں لوگوں کو ڈرانے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تاباں صاحب ایسے ہی پٹھانوں میں تھے، بڑے نوک پلک کے شاعر، شفیق بزرگ، بے حد روادار اور صبر وضبط کے عادی۔ ان کی زیادہ تر خصوصیات شاید بائیں بازو کی تحریکات کے ڈسپلن میں ایک عمر گزارنے کی بدولت ان میں آئی تھیں۔ خاں صاحب ٹھہرے گھور محقق اور ترقی پسندی کے گھن گھور دشمن۔ وہ بے تکلف صحبتیں پُر لطف چشمکوں سے بڑی خوش گوار اور جان دار ہو جاتیں اور لاکھ کوشش کے باوجود دو پٹھانوں کا متحدہ محاذ نہ بن پاتا کہ دوسرے اہلِ بزم ان کی زد پر آسکتے۔

خاں صاحب کے بارے میں میرے کہنے اور نہ کہنے کے لائق ابھی ہزاروں باتیں ہیں جنھیں ان سے زیادہ کون جانتا ہے مگر بہرحال ہیں تو وہ اپنے آدمی، اس لیے فی الحال یہیں پر بس کرنا مناسب ہے۔

(خصوصی شمارہ 'رشید حسن خاں حیات اور ادبی خدمات' مرتب اطہر فاروقی، صفحہ 30 تا 33، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جولائی 2002)

- (سہ ماہی اُردو ادب، انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، صفحہ 140 تا 144، اپریل، مئی جون، 2004)
- (ماہ نامہ 'اُردو دُنیا' صفحہ 13 تا 15، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی، اپریل 2006)
- (رشید حسن کچھ یادیں کچھ جائزے، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، صفحہ 44 تا 48، مکتبہ الحرا، دربھنگہ، بہار، 2008۔ اس کتاب میں یہ مضمون ''ہمارے خاں صاحب [رشید حسن خاں] کے عنوان سے شائع ہوا)

نوٹ : یہ مضمون صدیق الرحمٰن صاحب کی کتاب 'مجموعۂ خیال' انجمن ترقی اُردو (ہند) 2016 کے صفحہ 41 تا 44 پر بہ عنوان 'ہمارے خاں صاحب (رشید حسن خاں) کے نام سے حذف اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

❍❍❍

رشید حسن خاں دہلی سے چلے گئے

مجتبیٰ حسین

اُردو کے مایۂ ناز محقق، ناقد اور دانش ور رشید حسن خاں اپنی زندگی کے پورے 37 برس دہلی میں گزارنے کے بعد، 3 فروری کو اپنے آبائی قصبہ شاہ جہاں پور کو واپس چلے گئے اور لوگوں کو یہ سوچتا ہوا چھوڑ گئے کہ اس فیصلے میں غلطی ان کی ہے یا دہلی شہر کی۔ دہلی شہر میں لوگوں کے آکر بس جانے کے بارے میں کسی من چلے نے کہا تھا کہ دہلی میں اکثر لوگ باہر سے آتے ہیں اور یہاں اس لیے بس جاتے ہیں کہ ان کے پاس واپسی کا کرایہ نہیں ہوتا۔ رشید حسن خاں کے سامنے یہ مسئلہ بھی نہیں تھا کیوں کہ وہ سال میں دو چار مرتبہ شاہ جہاں پور جایا کرتے تھے۔ یعنی ان کے پاس شاہ جہاں پور واپس جانے کا کرایہ تھا۔ پھر یہ اپنی زندگی کے 37 بھرپور برس دہلی شہر کو دینے کے بعد واپس کیوں چلے گئے۔ بہت عرصہ پہلے اُستاد شیخ ابراہیم ذوقؔ نے دکن میں شعرا کی سرپرستی کا حال جاننے کے باوجود کہا تھا ؎

کون جائے ذوقؔ دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

سچ تو یہ ہے کہ ان کے اس مصرع پر ہم اب بھی حیرت کرتے ہیں کہ ذوقؔ نے دہلی کی جن گلیوں کو چھوڑ کر نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا، وہ آخر دہلی میں کہاں واقع ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں نئی دہلی کا شہر تو تھا نہیں۔ جو کچھ بھی شہر تھا وہ جامع مسجد کے اطراف کی گلیوں میں ہی آباد تھا۔ ان گلیوں میں ہمیں بھی کبھی کبھار جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم جب بھی ان گلیوں میں گئے وہاں سے واپس آنے میں کئی کئی گھنٹے لگ گئے۔ اس لیے نہیں کہ یہ گلیاں ہمیں بہت پسند ہیں اور ہم یہاں سے جلدی نکلنا نہیں چاہتے بل کہ اس لیے کہ آدمی یہاں چیونٹی کی رفتار سے چلتا ہے۔ چلتا کیا ہے دھینگا مُشتی کرتے ہوئے اپنا راستہ بناتا ہے۔ وہاں سے واپس آکر تو ہمیں اپنا وزن بھی کم محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ذوقؔ کے زمانے میں یہ گلیاں اس قابل رہی ہوں کہ انھیں چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ مگر اب تو یہ گلیاں نہ صرف کاٹنے کو دوڑتی ہیں بل کہ اکثر اوقات تو کاٹ بھی لیتی ہیں۔

چاہے کچھ بھی ہو رشید حسن خاں نے جب دہلی کو چھوڑ کر شاہ جہاں پور واپس جانے کا فیصلہ کیا تو ان کے دوستوں (جن کی تعداد بہت کم ہے) اور دشمنوں دونوں کو تشویش ہوئی لیکن اس کے باوجود کسی نے انھیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بس اتنا کیا کہ 2 فروری کو انجمن ترقی اُردو (ہند) کی جانب سے ان کے اعزاز میں ایک وداعی جلسہ رکھا گیا جس میں ادب دوستوں سے خواہش کی گئی کہ وہ آئیں اور رشید حسن خاں کو وداع کریں۔ اُردو گھر میں منعقد اس جلسے میں ہم نے پہلی بار اتنا بڑا اجتماع دیکھا۔ کیا شاعر، کیا ادیب، کیا صحافی، کیا دانش ور، کیا طالب علم، کیا دوست، کیا دشمن سب کے سب وہاں موجود تھے۔ وہ بھی تھے جن سے رشید حسن خاں کے زبردست معرکے چلے۔ اس جلسے میں ایسی زبردست حاضری اس بات کا ثبوت تھی کہ اب جب کہ ادب اور بالخصوص اُردو ادب میں 'تجارت' کا عمل دخل بڑھتا جا رہا ہے اور لوگ ادب کو بھی ایک کاروبار کے طور پر چلا رہے ہیں۔ اب

بھی لوگ موقع آنے پر بھی سچے اور خالص علم کی قدر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر شمیم حنفی، شاہد علی خاں، اسلم پرویز، خلیق انجم، شارب ردولوی، شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی، رفعت سروش، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور نہ جانے کتنوں نے رشید حسن خاں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا کہ لگتا تھا واقعی سچ بول رہے ہیں۔

رشید حسن خاں سے اگر چہ ہماری شخصی ملاقات بائیس تئیس برس پہلے دہلی میں ہوئی تھی لیکن ہم عرصے سے ان کے نیاز مندوں میں رہے ہیں۔ ہم نے انھیں جب بھی دیکھا ایک قلندر صفت عالم کے روپ میں ہی پایا۔ ہمیشہ مطالعے میں غرق یا کسی سوچ میں غلطاں یا کسی نکتے پر کسی سے بحث میں مصروف۔ قلندری، ثابت قدمی، اور علم سے ان کے گہرے شغف کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج سے 37 برس پہلے وہ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر وابستہ ہوئے تھے اور آخر وقت تک وہ اسی عہدے پر ڈٹے رہے۔ نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے۔ نہ ستایش کی تمنا، نہ صلے کی پروا۔ سیکڑوں طالب علموں نے ان کی رہنمائی میں ڈاکٹریٹ کے مقالے لکھے اور بعد کو پروفیسر بھی بنے۔ سچ تو یہ ہے کہ رشید حسن خاں کی علمیت خود ایک عہدہ ہے جس کے آگے بڑے بڑے بھی پانی بھرتے ہیں۔

ہمیں نہیں معلوم کہ خاں صاحب نے خود کہاں تک رسمی تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کے نام کے ساتھ کبھی بڑی بڑی ڈگریاں نہیں دیکھیں۔ انھوں نے محض اپنے بل بوتے پر عربی، فارسی اور اُردو کا اتنا علم حاصل کرلیا ہے کہ اب خود ایک 'دانش گاہ' بن گئے ہیں۔

رشید حسن خاں نے تحقیق کے میدان میں برِّصغیر کی کئی نام ور ہستیوں سے ٹکّر لی اور بیش تر اوقات کامیاب بھی رہے۔ شاہ جہاں پور کے خالص پٹھان ہونے کے ناتے علمی معاملات میں وہ موقع آنے پر ٹوٹ جانے کو ترجیح دیتے ہیں بہ نسبت لچک جانے کے۔ انھوں نے جب بھی ٹکّر لی اپنے سے بڑے آدمی سے ہی ٹکّر لی۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ہمارے شخصی مراسم ہمیشہ خوش گوار ہی رہے۔ ہم سے ٹکّر لیتے بھی تو کس بات پر۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ میر امّن کی 'باغ و بہار'، رجب علی بیگ سرور کے ''فسانۂ عجائب'' اور دیا شنکر نسیم کی ''گلزارِ نسیم'' کو ہم نے پہلے بھی پڑھا ہے (صرف پڑھا ہے، سمجھا کم ہے) لیکن جب رشید حسن خاں نے ان کلاسیکی کتابوں کے متنوں کو مرتب کیا اور ان کے تنقیدی ایڈیشن شائع کیے تو تب ہی یہ ہماری سمجھ میں آسکے۔ اُردو کے ادب کو ہم جیسے طالب علموں اور عام آدمی تک پہنچانے کا جو کام رشید حسن خاں نے انجام دیا ہے وہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایک ایک نکتہ اور ایک ایک پہلو پر انھوں نے برسوں چھان پھٹک اور تحقیق کی ہے۔

اُردو قواعد پر بھی ان کے عبور اور بالغ نظری کو برِّصغیر کے ہر دانش ور اور عالم نے سراہا ہے۔ رشید حسن خاں نے اُردو املا کو آسان بنانے کے لیے کچھ اصول مرتب کیے ہیں جنھیں اب اُردو کے کئی اشاعتی اداروں نے اپنا لیا ہے۔ ہم جب نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں اُردو کے شعبۂ اشاعت کے سربراہ تھے تو ہم نے بھی ایک دن غفلت میں ان اصولوں کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا۔ نتیجے میں آج ہم بہت سے لفظوں کے املا بھول چکے ہیں۔ گاؤں اور پاؤں جیسے لفظوں کو وہ گانو اور پانو لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ کبھی ہم گانو تو صحیح لکھ لیتے تھے لیکن پانو لکھتے وقت نہ جانے کیوں ہمارے 'پاؤں' لڑکھڑا جاتے تھے، خیر یہ موقع نہیں ہے کہ ان کے املا کے اصولوں پر بحث کی جائے۔ ''تماشہ'' کو وہ ''تماشا'' لکھنے کے قائل ہیں لیکن ہم نے جب بھی ان کے کہنے کے مطابق ''تماشا'' لکھنے کی کوشش کی تو خود ''تماشہ'' بن گئے۔ ان کی تو یہ بھی سفارش ہے کہ ''گنگنانا'' کو ''گن گنانا'' لکھنا چاہیے۔ ہم سے تو خیر لکھا نہیں گیا لیکن باتھ روم میں گنگنانے کے جو شوق ہمیں برسوں سے تھا وہ اکثر موقوف ہوگیا۔ ''گنگنانے'' میں جو موسیقی ہے وہ ''گن گنانے'' میں کہاں۔ ایک بار ہم نے انھیں خط لکھا۔ جواب میں کسی لفظ کے املا پر انھوں نے ہمیں ٹوکا تو ہم نے انھیں یہ کہہ کر چپ کرا دیا ''قبلہ جہاں تک ہمارے املا کا سوال ہے اس کے سمجھنے والے تو مرزا غالب، محمد حسین آزاد، مولانا شبلی وغیرہ ہیں۔ ہمارا سلسلہ تو ان لوگوں سے ہے۔ آپ جیسے پڑھے لکھوں سے نہیں۔''

بہر حال اُردو گھر کے وداعی جلسے میں لوگوں نے ان کے بارے میں بڑی خوب صورت باتیں کیں اور سچے دل سے کیں۔ اس کے جواب میں رشید حسن خاں نے اپنی تقریر میں صرف دو جملے کہے کہ ''علم اور تحقیق کے معاملے میں میں نہ تو کبھی مصلحت پسندی کو روا رکھا اور نہ ہی آیندہ رکھوں گا'' جلسے کے دوسرے دن شاہ جہاں پور جانے والے تھے۔ ہم نے کچھ احباب سے کہا بھی کہ وہ صرف اس جلسے میں انھیں وداع کرنے پر اکتفا نہ کریں بل کہ دوسرے دن اسٹیشن پر جا کر بھی انھیں وداع کر آئیں۔ نادر شاہ بھی جب دہلی سے ایران جا رہا تھا تو بادشاہ وقت محمد شاہ انھیں وداع کرنے کے لیے شہر کی فصیل سے باہر تک گیا تھا کہ موصوف کہیں واپس نہ آجائیں۔ ہم تو خیر انھیں وداع کرنے کے لیے اسٹیشن نہیں گئے لیکن بعد میں پتا چلا کہ کچھ اصحاب حفظِ ماتقدّم کے طور پر انھیں وداع کرنے کے لیے سچ مچ اسٹیشن گئے تھے۔

رشید حسن خاں کے دہلی سے چلے جانے پر لوگ اب دکھی ہیں لیکن جب وہ یہاں تھے تو تب بھی دکھی تھے (وجوہ دوسری تھیں)۔ مانا کہ وہ دہلی میں 37 برس رہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان برسوں میں وہ دہلی کے معمولات کا حصہ کہاں بنے۔ نہ کبھی کسی سازش میں شریک ہوئے نہ کسی جوڑ توڑ میں حصہ لیا۔ وہ تو سدا اپنی گوشہ نشینی میں گم رہے۔ ہمیشہ لائبریریوں اور کتابوں کی خاک چھانتے رہے۔ دہلی کی ادبی محفلوں میں بھی وہ کم ہی آتے رہے۔ اور اپنا زیادہ تر وقت پڑھنے میں گزارا۔ ایسے لوگ دہلی میں رہیں یا شاہ جہاں پور میں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ شاہ جہاں پور جا کر بھی کتابوں میں کمر کمر ڈوبے رہیں گے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کردیں کہ جلسے کے بعد ہم جانے لگے تو ایک صاحب نے ہمارا راستہ روک کر پوچھا ''قبلہ! آپ کو بھی تو حیدرآباد سے دہلی آئے ہوئے لگ بھگ پچیس تیس برس بیت گئے۔ کیا آپ بھی 37 برس سے پہلے دہلی کی جان نہیں چھوڑیں گے؟''۔ اس سے اندازہ ہوا کہ لوگ ہمیں بھی وداع کرنے کے لیے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔

- (ماہ نامہ کتاب نما، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اپریل 1996، صفحہ 39 تا 41)
- (آپ کی تعری، مصنف مجتبیٰ حسین، صفحہ 210 تا 213، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2005)

نوٹ: یہ مضمون عزیزی مدنی اشرف (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی) نے دہلی یونی ورسٹی کی مرکزی لائبریری سے موہ 7/ مارچ، 2017 کو فوٹو کاپی کرا کر احقر کو دیا۔

ooo

رشید حسن خاں صاحب اور عصری دانش کی مشارکت

حافظ صفوان محمد چوہان

اَلَیُسَ مِنُکُم رَجُلٌ رَشِیدٌ؟

[بروز اتوار ۲۶ فروری ۲۰۰۶ء رات ۹:۳۰ بجے موبائل ٹیلی فون پر محبی سید محمد ذوالکفل بخاری کا سندیسہ ملا کہ شاہ جہاں پور میں رشید حسن خاں صاحب خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔ انالله وانااليه راجعون ۔ میرا اُن سے تعلق صرف اِتنا ہے کہ گذشتہ تقریباً چار سال میں کچھ خطوط کی آہر جاہر ہوئی ہے۔ اُنھیں کچھ کتابیں اور مختلف موقعوں پر الزبیر کے چند شمارے بھیجے ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ دو سال میں کئی ایک بار فون پر بھی بات ہوئی ہے۔

اِس مضمون کے تین حصے ہیں: پہلے حصے میں اصلاحِ اِملا و قواعد کے پرچم برداروں میں رشید حسن خاں صاحب کے مقام کا تعین کیا گیا ہے اور اُن کے ادبی کاموں پر کسی قدر اِظہارِ رائے کے ساتھ اُن سے متعلق یادوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے؛ دوسرے حصے میں اُن کے چند خطوط سے اقتباسات کیے گئے ہیں؛ آخری حصہ ایک مکالمہ ہے جو 17 اکتوبر 2005 کو اُن سے فون پر کیا گیا۔ میرے خیال میں یہ اُن سے کیا گیا آخری مکالمہ ہے۔ جن باتوں کا ملخّص میں نے اِس مضمون میں پیش کیا ہے اُس میں واوین کے اندر خاں صاحب کے صرف وہی جملے لکھے ہیں جو میرے پاس اُن کی اپنی آواز میں محفوظ ہیں یا جن

کے بارے میں مجھے غالب گمان ہے کہ یہ مجھے لفظ بلفظ یاد ہیں۔ واوین کے علاوہ جو کچھ اُن کے حوالے سے لکھا ہے وہ نفسِ مضمون کی حد تک تو اُن کا ہے لیکن الفاظ کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔

(حافظ صفوان محمد چوہان)]

ایک ظریفانہ قول ہے کہ کچھ لوگ بولتے ہوئے اِملا کی غلطیاں کرتے ہیں اور لکھتے ہوئے تلفظ کی۔ اُردو زبان میں آسان اِملا اختیار کرنے کی تبلیغ مرزا جعفر حسن سے شروع ہوتی ہے، جس میں جعفر کو ع کے بجائے الف سے اور حسن کو ح کے بجائے ہ سے لکھنے کی تجویز دی گئی۔ ت، ذ، ص، ض، ط، ظ اور ع، غ کے ساتھ ساتھ ۃ اور ء کی علامات کو ترک کر دینے کی سفارش تھی۔ دلیل کی خاطر حوالہ صوتیات کا دیا گیا۔ لیکن جب یہ راگ الاپا جا رہا تھا اُس وقت یہ بات ایک کھلا راز تھی کہ ایک جداگانہ قومی اور تہذیبی تشخص کے فروغ کے لیے عربی اور فارسی کے اِملائی نظام سے فاصلہ پیدا کرنا مطلوب ومقصودِلرِ دِفرنگی ہے، اور مسلمان اپنی روایتی سادگی کی وجہ سے شیخ سعدی کے الفاظ میں لکڑی کا وہ دستہ بنا ہوا ہے جس کے پھل میں لگے بغیر کلہاڑی کا دت کو کاٹ دینا ممکن نہیں ہوتا۔

تقسیمِ ہند کے بعد کم سے کم پاکستان کی حد تک حرف زدگی اور اِس کے نتیجے میں صوت زدگی کی موید یہ سفارشات اب تاریخ کے گرد و غبار میں گم ہو چکی ہیں لیکن ہندوستان کے بعض علماے لسانیات اور اصلاحِ اِملا کا باجا بجانے والوں پر اب تک اقبال کے الفاظ میں ''امتِ احمدِ مرسل گو مقامی'' کرنے کی اِس اوّلین کوشش کا اثر باقی ہے۔ اِن میں بانگِ بلند ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی ہے جو عربی کے بعض حروف کو ''مردہ لاشیں'' قرار دے کر ''اُردو کے حروفِ تہجی اور نظامِ درس کے لیے پیرِ تسمہ پا'' ارشاد فرماتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اُن کا اپنا شعری و نثری سرمایہ، سارا کا سارا، بہ شمول اُردو میں عربی حروف کے استعمال کے خلاف لکھے گئے اِن مقالات کے، اِن حروف پر مشتمل الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے ہی لکھا گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر وہ خود کم سے کم اپنی ہی کاوشوں کو اُس نظامِ اِملا کی مثال میں پیش فرما دیتے جسے رواج دلانے کی خواہش وہ سینے میں اُٹھائے رہے۔

اُردو اِملا کو باقاعدہ بنانے کی کوششوں کی کہانی فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوتی ہے جس کے بڑے بڑے سنگِ میل سرسید کی تحریک، محکمۂ تعلیم پنجاب، انجمنِ ترقیِ اُردو ہند، مکتبۂ فرینکلن لاہور، اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ لاہور، اور سب سے آخر میں مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد کے مرتب کردہ سفارشات برائے اِملا و رموزِ اوقاف ہیں۔ انتہائی اختصار کے ساتھ، بالاجمال، یوں کہا جاسکتا ہے کہ شکستہ نگاری کے اثرات کو دور کرنے اور عربیت و فارسیت کے ''غیر ضروری'' بوجھ سے اُردو کو آزاد کرنے کو مقاصدِ اصلی قرار دینے کی وجہ سے انجمنِ ترقیِ اُردو نے، ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں، '' کچھ زیادہ ہی اِصلاح کر دی'' اور متصل الفاظ کی تعداد بہت گھٹا دی۔ اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ کا اختیار کردہ متوازن اِملا اور بعدازاں مقتدرۂ قومی زبان کا سفارش کردہ اِملا ''درمیانی راستہ'' ہونے کی وجہ سے کامیاب رہا اور رفتار میں سست سہی، لیکن عوام میں چلنا ضرور شروع ہو گیا ہے۔ اِن کے مقابلے میں مذکورۂ بالا بقیہ اصلاحات عوام تو الگ رہے، خواص میں بھی شرفِ قبول نہ پاسکیں۔ مرحوم حکیم محمد سعید صاحب کے اِدارۂ ہمدرد سے شائع ہونے والی نگارشات اور الطاف حسن قریشی صاحب کے اُردو ڈائجسٹ کو میں اپنے موجود علم کی روشنی میں معیاری اِملا کے نفاذ کی رہ نما مثالوں کے ذیل میں پیش کرسکتا ہوں۔

اِملا کے باقاعدہ بنانے کی کئی ایک کوششیں ہوئی ہیں۔ یادش بخیر! جب پاکستان میں آئین بنانے کے لیے عوام سے مشاورت کا ڈول ڈالا گیا تو اُس وقت آئین بنانا ایک گھریلو دستکاری کی سی صورت اختیار کر گیا تھا (ابنِ انشا نے ایک مزاحیہ کالم ''آئین پر ہماری رائے تو لی ہی نہیں گئی'' بھی اِس سلسلے میں لکھا جو اُن کی خمارِ گندم میں بھی شامل ہے)۔ پاکستانی قوم پر بالکل اِسی طرح کا ایک پیغمبری وقت اِس سے دس بارہ سال پہلے بھی آیا تھا، جب اِملا کے تعین کے مسائل کی بحثوں کے گرمی پکڑ لینے پر بعض ایسے گرم شتاب، گھس کھدوں نے بھی طبع آزمائی (اگر صورتِ حال کی لفظی شکل لکھی جائے تو ''چاند ماری'') کی جن کا نام اِس گرم بازاری کے دور کے گزر جانے کے بعد کسی رسالے میں کبھی نظر نہیں آیا اور نہ کسی کتاب کے سرورق پر اُنھیں کسی حیثیت میں کوئی جگہ مل پائی۔ جہاں چار لکھنے والے لوگ جمع ہوئے، اُردو کا اِملا ''درست'' کرانے کی بحث شروع ہو گئی۔ چار تارے چ سے ٹوٹے، چراغاں ہو گیا۔ مجھے مرحوم والد صاحب کی کتابوں اور اُس دور کے کچھ ادبی جرائد میں جواب الجواب کے کئی ایسے طویل سلسلے ملے جن میں بحث کے آغاز کا تو پتا ملتا ہے، ڈور کا دوسرا سرا کہیں نہ ملا۔ بل کہ ایک بحث تو ایسی بھی ہے جو شروع تو لسانیات ہی سے ہوئی اور چلتے چلتے ایسے مقام تک پہنچ گئی جیسے دو پڑوسنیں لڑتے ہوئے ایک دوسرے کے خاندان کے اسرارِ خودی اور رموزِ بےخودی فاش کرنے تک چلی جاتی ہیں۔

اِملا کی اِس درستی کے لیے دی جانے والی تجاویز کئی سطحوں کی تھیں: حروفِ تہجی میں کمی بیشی، دخیل الفاظ پر تحفظات، اور یہاں تک کہ اصلاح کے نام پر ایک بالکل نیا بل کہ ''وکھرا'' اِملا متعارف کرانے کے سُجھاؤ بھی۔ حروفِ تہجی میں کمی کرنے سے ہم اپنے علمی اور تہذیبی ورثے سے محروم ہو جاتے ہیں جب کہ اِن میں اضافہ آج سے کروڑوں اُردو بولنے اور لکھنے والوں کو سیکھتڑ بنا دیتا ہے۔ دخیل الفاظ دراصل زبانِ اُردو کی بےنہایت مکانیت کی دلیل ہیں نہ کہ اِس کے حسن کو گہناتے ہیں۔ زندگی بھر ایک ہی کنویں میں رہنے والا مینڈک کیا جانے کہ دریا کی روانی کیا ہوتی ہے! رہی بات نئے طرزِ اِملا کی، اِس سلسلے میں تجربہ یہ بتاتا ہے کہ زندگی کے کسی بھی مرحلے میں ایک ہی زبان کے لیے دوسرا یا متوازی اِملا سیکھنا مافوق العادت امور سے ہے۔ یکسر مختلف اِملا سیکھنا بھی شاید اُتنا عجیب نہ لگے جتنا مروّجہ اِملا کے حلیے کو بدل دینے کی حد تک کی جانے والی تصحیح (بہ الفاظِ دیگر تبدیلی) لگتی ہے۔ یہ مصححین کرام اِس بات کو بھول گئے کہ اِملا عوام لکھتے ہیں، مشینیں نہیں۔ اور یہ کہ اِملا کمپیوٹر کا پروگرام نہیں ہوتا کہ آپ انسان کے حلیے میں ملبوس مشین کو اِس اِملا سے پروگرام

کر دیں۔ اِس قسم کی باتیں صرف وہی مصلحین اور انجام سے بے خبر واعظین کرتے ہیں جن کو زندگی میں عوام کے اندر کسی چیز کو رائج کرنے جیسے حقیقی مسائل سے کبھی واسطہ نہیں پڑا ہوتا۔ عربی کی اصطلاح میں یوں کہا جائے گا (اور مرورِ زمانہ نے اِس پر مہرِ تصدیق بھی ثبت کر دی ہے) کہ ایسے نظریات کا پالن کرنے والے لوگ مرفوع القلم ہیں! پوری کی پوری قوم کو اپنا راسخ طریقہ بدلنے پر مائل کرنے کی خواہش ایک خواب ہے جسے یہ لوگ جاگتے میں دیکھا کیے؛ ایسا خواب جو اگر حقیقت بن جائے تو قوم کے جملہ تحریری سرمائے کو بے کار بنا کر رکھ دے گا۔

اِملا کے تعین کے انتہائی اختصاصی مسئلے کو عوامی بنا دینے بل کہ صاف الفاظ میں بازیچۂ اطفال بنا دینے کی وجہ سے مسئلے کا حل تو کوئی نہ نکلا لیکن آج جب اُس دور کی چیزوں کو پڑھا جاتا ہے تو ایک تاریخ سی سامنے آتی ہے جس میں مسئلے کو آسان بنا کر حل کرنے کی طرف لے جانے والے مضامین بھی ملتے ہیں (میں یہاں مرحوم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا حوالہ دوں گا جنھوں نے اپنی ایک کتاب کے ابتدائیے میں اعراب کی مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد ایک نہایت آسان حل بھی پیش کیا ہے۔ اسی طرح محمد احسن خاں صاحب کا اُردو میں رموزِ اوقاف کا استعمال اور اِصلاحی تجاویز بھی ایک نہایت متوازن مقالہ ہے۔) اور دوسری طرف صورتِ حال کی نہائیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کچھ ''لئے کاروں'' نے ایسے مضامین بھی لکھے جن کا مافیہ کچھ ہی ہو، لیکن مجموعی طور پر رنگ یہ بندھا کہ اُردو ایک مشکل ترین زبان ہے، اور اسے ''ڈھب کھڑبا'' ہونے کی وجہ سے جلد یا بدیر خدا حافظ کہتے ہی بنے گی، اور !The sooner, the better۔ قواعد کی رو سے الفاظ کے صحت و سقم پر بحث در بحث کے نتیجے میں اور اِصلاح کی گھمبیر تاؤں میں منزل گم ہوگئی؛ یوں یہ مسئلہ لٹک جانے اور جلد طے نہ کر سکنے کی وجہ سے اُردو اِملا کو باقاعدہ بنانے کا خواب کثرتِ تعبیر کی نذر ہو گیا۔

یہ بات صرف اِملا کی اِصلاح پر موقوف نہیں بل کہ کسی بھی نظام میں جب اِصلاح کا نعرہ بلند ہوتا ہے تو سب سے پہلے موجودہ صورتِ حال میں شدید انتشار اور سخت بدنظمی بل کہ طوائف الملوکی کا نقشہ کھینچا جاتا ہے تا کہ مبالغے کی مدد سے مخاطَب کی منطقی حمیّت کو بیدار کیا جائے۔ اِملا کے مروّج اختلافات میں نیم خواندہ کاتبوں اور کمپوز کاروں کی غلط نویسیوں، کاپی پیسٹنگ میں کی بے ترتیبیوں، روزنامہ نگاروں کی جلد بازیوں اور اُپر جِلت اِملائی شکلوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا، لیکن پھر بھی کیا جاتا ہے۔ لسانی اِرتقا کسی بداہت یا اِرتجال کا نتیجہ نہیں ہوتا بل کہ حرف و صوت کی تبدیلی میں بسا اوقات برسوں اور صدیوں کی سِتیزہ کاری دکھائی دیتی ہے، لیکن اِس حقیقت سے جانتے بوجھتے ہوئے نظریں چُرا کر اِملا میں یکسانی کے نام پر غیر فطری و غیر مانوس، غیر تہذیبی اصطلاحات اور ترمیمات کو چلانے اور تحفظ دینے کی ہر ممکن کوشش کی گئی؛ اور اس پر مستزاد ایسی علامات کا بے جا استعمال جن سے سلاستِ اظہار میں تو کیا مدد ملتی، اُلٹا اُردو تحریر کے طبعی مزاج اور رسم الخط کی عمومی حسن کاری بھی مجروح ہوتی ہے۔

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دور میں سر آغا خان نے عربی کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کی تجویز دی تھی جس کی بظاہر لِم یہ رکھی گئی کہ ہمارا ورثہ عربی زبان میں ہے، ہم اس سے قریب ہو جائیں گے؛ اِس سے بھی جاننے والے اِس بات کو سمجھ گئے تھے کہ دراصل یہ انگریزی کو قومی زبان بنانے کے لیے جال ڈالا جا رہا ہے۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ اُس وقت میں کچھ لوگ ایسے تھے جو پوست پرست نہیں بل کہ مسائل کا صحیح اِدراک رکھنے والے اور دور درشک تھے، اور یوں اِس بانگِ بے ہنگام کا بندوبست کر لیا گیا۔ یوں بھی، ایسی ازخود رفتہ تجاویز کو زمانے کا خودکار تعامل خود ہی پشتِ پا مار دیتا ہے اور ان کا نتیجہ نقش بر آب اور گرہ بر باد ہی ہوتا ہے۔ تاریخ کے مزبلے پر دھری ایسی بہت سی تجاویز دیکھی جا سکتی ہیں۔

طریقِ اِملا کے ردّ و قبول کی اِس بحث کو میں جنابِ اعجاز راہی کے اِن الفاظ میں سمیٹتا ہوں: ''...جب کوئی لفظ زبان میں داخل ہوتا ہے یا قلبِ ماہیت کرتے ہوئے اِملا و تلفظ کو قبول کرتا ہے، تو اِن تبدیلیوں کے پیچھے ایک طویل زمانی تسلسل اور زمانی علائق کے ساتھ ساتھ عصری ادراک، اِستدلالیت اور تراش خراش کی فطری جبلت یکساں دخیل ہوتے ہیں۔ جیسے اصیل اشکال میں تبدیلی کا غیر فطری الحاقی محاکمہ، نارسیدگی یا جبری، شعوری کوشش یا تجربہ، لفظ کی عامۃ الناس میں قبولیت کی ضمانت نہیں بن سکتا، اِسی طرح عصری دانش کی مُشارَکت کے بغیر زمانی و مکانی تسلسل بھی لفظ کے قبولِ عام کا ضامن نہیں ہو سکتا۔''

اِملائی و قواعدی مسائل کی گرماگرمی کے اِس دور یعنی 1960 کی دہائی کے پہلے چند برسوں میں اُردو کے اِملا اور روِشِ تحریر میں اصلاح کے پرچم برداروں میں تقریباً سبھی لوگ ایسے تھے جو اِس دوڑ کو خود جیتنا چاہتے تھے۔ کاش کہ اس دوڑ کو باری کی دوڑ (Relay-Race) بنا لیا جاتا، یعنی ایسی دوڑ جس میں کئی کھلاڑی شریک ہوتے ہیں اور اپنی اپنی باری ختم ہونے پر دوڑ سے باہر نکلتے جاتے ہیں اور ہر نکلنے والے کی جگہ پر نیا کھلاڑی اندر آتا رہتا ہے، تا کہ آہستہ خرامی لیکن تجربات کے نتائج کے مستقل سامنے آتے رہنے کی بنا پر حسبِ موقع حکمتِ عملی میں تبدیلی کرتے رہنے کی وجہ سے کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا (جیسا کہ بالآخر مقتدرۂ قومی زبان نے کیا)۔ اِن لوگوں کے پاس مکمل پروگرام نہ تھے بل کہ جزئی طور پر اصلاحِ احوال کی روِشیں تھیں۔ اصلاحِ اِملا و قواعد کے داعی اِن سب پژوہندگان میں رشید حسن خاں صاحب کی خوبی یہ تھی کہ اُن کے پاس باقی لوگوں کے خلاف ایک مکمل، مربوط اور مفصل منصوبہ تھا۔ اور اُن کا یہی مذاق بالآخر اُن کے اُردو تحقیق و تدوین کے میدان میں قابلِ رشک نقوش مرتسم کرنے کا سبب ہوا۔

یہ الگ موضوع ہے کہ رشید حسن خاں صاحب کی اصلاحات کو، باوجود اُن کی ژرف بینی کے، قبولِ عام کیوں نہ ملا۔ اِس کے وجوہ جاننے کے لیے ایک نواحی مطالعے کی ضرورت ہے جس کے بڑے بڑے عنوانات یہ ہوں گے: الفاظ کی صوتیات کی بنیاد پر علاحدگی میں متشددانہ رویہ، اجتماعی لسانیات کے اصولوں کو ایک حد تک نظر انداز کرنا، داخلی تضادات، ضرورت سے بہت زیادہ اصلاح کی تجاویز کی بنا پر پڑھے لکھے لوگوں کو اَن پڑھ بنا دینا، عربی زبان کا ایک طرح سے ''کانٹا'' ہی نکال دینے پر اصرار، وغیرہ وغیرہ۔

رشید حسن خاں صاحب کی اُردو اِملا پہلے پہل 1974 میں ترقی اُردو بورڈ دہلی سے شائع ہوئی۔ بے مثال علمیت (Scholarship) کی جامع یہ کتاب اِن درج کی گئی

سب سطحوں کا مرکب ہے۔ (مجھے اعتراف ہے کہ یہ جملہ بڑی حد تک خوش عقیدگی کا حامل ہے۔) یوں اِصلاح کی زد میں قرآنِ پاک کے وہ الفاظ بھی آ گئے جن سے کئی کئی پیڑھیوں سے اُردو بولنے والےلوگوں کی آنکھیں بھی مانوس تھیں۔ فسادِزبان اور بہت سے چلن دارالفاظ کا مرگِ انبوہ ہو جانے کی وجہ سے اب اِس متشددانہ رویے سے گریز اور مستثنیات کا دائرہ وسیع کرنے کا عمل بتدریج شروع ہوا۔ یوں اپنے تجویز کردہ املا پر کلیتہً نہ تو خود رشید حسن خاں صاحب ہی جمے رہ سکے اور نہ کوئی دوسرا ایسا کر سکا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے بھی اقبالیات: تفہیم و تجزیہ میں اپنے ابتدائیے ''حرفِ اوّل'' میں بڑے بچے تلے الفاظ میں اِس املا کو بہ تمام و کمال اپنا لینے سے معذوری کا اظہار کیا ہے۔

دون کی لینے یا ہانکنے کی بات نہیں، بحمداللہ میں نے رشید حسن خاں صاحب کی اُردو اِملا کو بہت شوق سے اور تقریباً مکمل ہی پڑھا ہے۔ (یہاں اِس سے بحث نہیں کہ میری سمجھ میں اِس کا کتنا حصہ آیا ہے، یا میں اِس میں سے کتنا کچھ اپنے اندر سمو سکا ہوں۔) ہمارے گھر میں اِس کتاب کا وہ نسخہ رکھا ہے جس پر میرے والد صاحب نے کئی مقامات پر چھوٹے بڑے شذرات لکھ رکھے ہیں۔ میرا شعبہ نہ اُردو ہے اور نہ املا، لیکن اب سے کئی برس پہلے یہ کتاب سُر ود بہ مستاں یاد دہانیدن کا کام دے گئی۔ علمیت کا بے کنار خزانہ یہ کتاب آج بھی کچھ مدت کے بعد دوبارہ یاد آنے لگتی ہے۔ میں عموماً کتاب خرید کر پڑھتا ہوں کہ اِس کی نصیحت مرحوم والد صاحب نے کی تھی، کہ جو کتاب خرید کر پڑھی جائے اُس سے نفع زیادہ ہوتا ہے؛ اُردو اِملا کا ایک دستخطی نسخہ البتہ میں نے رشید حسن خاں صاحب سے ضرور فرمایش کیا تھا۔ یہ میرا ایک شوق ہے کہ میں جن لوگوں کی جن کتابوں کو اُن کی نمایندہ کتابیں سمجھتا ہوں، اُن سے دستخط کروا کے اپنے پاس رکھتا ہوں۔ خاں صاحب نے میرے اِس شوق پر بہت پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

ذیل میں اُردو اِملا سے ایک اقتباس کرتا ہوں جو میری ناچیز رائے میں آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے:

> ''...لفظوں کو لکھنے میں یا پڑھنے میں کبھی کوئی مشکل پیش آئی تو یہ کہا گیا کہ اُردو کے رسمِ خط میں اصلاح کی ضرورت ہے اور اِس بنیادی بات کو فراموش کر دیا گیا کہ اصلاح اِملا میں ہو سکتی ہے، رسمِ خط میں نہیں۔ وہ یا تو رہے گا یا نہیں رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے رسمِ خط میں تغیر ہو سکتا ہے، اصلاح نہیں ہوتی۔

❖ ❖ ❖

تدوینِ متن ایک جوکھم کا کام ہے، اور عمومی توجہ یا تحسین کے معاملے میں بڑی حد تک قطبین کی دوری پر۔ اپنے مقالے اِملا کا اختلاف اور لغت میں رشید حسن خاں صاحب نے تدوینِ متن کے فن کو جیسا مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیا ہے، حق یہ ہے کہ کمال کیا ہے۔ اِس فنِ شریف کے مالہٗ و ماعلیہ پر مجھے کچھ نہیں کہنا ہے کہ یہ علمائے ادب کا میدان اور مقام ہے لیکن اپنے موجود علم اور معلومات کی روشنی میں مجھے چند ایسے لوگوں کے نام اور کام معلوم ہیں جن کی جاں کاہی اور کامگاری نے اِسے اُردو میں ایک باقاعدہ سائنس بنا دیا: قاضی عبدالودود صاحب، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، اور ابھی ماضیِ قریب میں مشفق خواجہ صاحب۔ مجھے مشفق خواجہ صاحب کے مرتب کردہ کلیاتِ یگانہ کے مسودے کا کچا چٹھا، چند صفحات کی حد تک، دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اندازہ ہوا کہ یہ کس قدر یکسوئی سے کیے جانے کا کام ہے۔ تیز نگاہی، حاضر دماغی اور پہروں تک بے رُکے کام کرنا اور کرتے چلے جانا ہی اِس شعبۂ تحقیق کی ابجد ہے۔ ایسے لوگوں کا ایک خاص ذہنی کلبوت اور روز و شب کا ایک منفرد سانچہ بنا ہوا اور اُنھیں اُس کا پابند ہونا لابُدی ہے۔ ادب سے وابستہ پاکستان کے لوگ مشفق خواجہ صاحب کے سخت نظام الاوقات اور بے ہنگم مجلس آرائی سے تنفّر کی حد تک دوری کے رویے سے لاعلم نہیں ہیں؛ یہی وہ اوصاف ہیں جن کی وجہ سے وہ تحقیق و تدوین کے لوگوں کے قبلہ گاہ ہی نہیں، قبلہ راں بن گئے۔ یہ سطور لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ایک بار میرا بھارت جانے کا پروگرام تقریباً طے ہو گیا تھا۔ میں نے رشید حسن خاں صاحب سے فون پر اُن سے ملنے کے اوقات معلوم کیے اور عرض کیا کہ میں بھارت آ کر آپ سے ملے بغیر واپس نہیں ہوں گا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ شاہ جہاں پور آنے جانے میں خاصا وقت لگتا ہے اور اِس وجہ سے آپ کو اپنے باقی پروگرام خاصے بدلنا ہوں گے، اِس لیے اِس بالمشافہہ ملاقات کو آپ ضروری قرار نہ دیجیے۔ پھر فرمایا کہ وہ بہت علیل بھی ہیں اِس لیے میرے حاضر ہونے پر بھی بہت کم وقت دے سکیں گے۔

تدوینِ متن کے نام پر ٹھوس کام کرنے کی بہت سی مثالیں ہمارے ہاں موجود ہیں، ٹھوس کام کرنے والے آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ آج کے دور میں جب کہ نرے Cosmetics اور Presentation (نمود و نمایش) ہی سکۂ رائج الوقت ہیں، ایسے لوگ ناپید اور کم یاب ہیں جو شہرت اور دولت سے بے نیاز ہو کر یکسوئی سے پاک ٹھوس علمی کام کرنے میں اپنی زندگی کی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔ ایسے ہی کم یاب لوگوں میں ایک حقیقت پژوہ، رشید حسن خاں صاحب تھے جن کی اعتنا سے اُردو میں تدوینِ متن جیسے خالص تحقیقی کام کو آبرو ملی۔ اُن کے چلے جانے سے ادب میں تحقیق و تدوین کا ایک بڑا منصب خالی ہو گیا ہے ؎

منصبوں کو ہے آدمی کی تلاش
تاج کو کوئی سر نہیں ملتا

رشید حسن خاں صاحب بنیادی طور پر لسانیات کے آدمی تھے۔ اُنھوں نے تحقیق و تدوین اور مسائلِ قواعد و اِملا کے بعد سب سے زیادہ کام فرہنگ پر کیا ہے۔ (فرہنگ کے ذکر پر تفننِ طبع کے لیے ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کا عطا کردہ غالب کا ایک جملہ نقل کرتا ہوں جو خطوطِ غالب میں کہیں موجود ہے: جتنے یہ فرہنگ طراز ہیں، سب پوست در پوست مانندِ پیاز ہیں...) اُن کی مرتب کردہ کلاسیکی ادب کی فرہنگ بظاہر تو 2003 میں شائع ہوئی لیکن اِس بات میں کلام نہیں کہ یہ کام مدتِ مدید کی کتاب چشتی کے بعد ہی وجود

میں آیا ہے۔ دراصل لغت پر کام ایک ایسی مشقت ہے جو ہمیشہ پس منظر ہی میں رہتی ہے۔ دلِق ادب لیے ہوئے بڑے بڑے نام بعض اوقات فرہنگ کے عیار پر رکھے جائیں تو دلک جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے ادب کے لوگ بھی فنِ لغت کو دوں مرتبۂ ادب جانتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

رشید حسن خاں صاحب کی جن باتوں نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا اُن میں سرِ فہرست اُن کا سکول کالج کی باقاعدہ تعلیم بالکل نہ ہونے کے باوجود دہلی یونی ورسٹی میں ریسرچ ایسوسی ایٹ کے مقام تک جا پہنچنا ہے (اگرچہ گریڈوں کے پیمانے سے کی جانے والی نپائی کے اعتبار سے یہ کوئی بہت اونچا عہدہ نہیں ہے)۔ اُن کی زبانی جب یہ بات معلوم ہوئی تو مجھے تین اور ایسے لوگوں کے نام یاد آئے جنھوں نے ایسے شعبوں میں اوجِ کمال کو چھوا جن میں اُن کی تعلیم مروّجہ پیمانوں کے اعتبار سے نہیں تھی، پہلے خواجہ حسن نظامی، دوسرے شورش کاشمیری، اور تیسرے احسان دانش۔

رشید حسن خاں صاحب نے نیاز فتح پوری کو اپنے تحقیق کی طرف آنے کا سبب بتایا ہے۔ میں بھی اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اُردو کے صحیح لکھنے کا شوق، لکھاوٹ میں ایک روِش کو اختیار کرنے کا ذوق، اور اِس کے نتیجے میں اِملا و قواعد اور لسانیات سے متعلق مطالعے کی چیٹک، وغیرہ، رشید حسن خاں صاحب کو پڑھنے سے ملی ہیں۔ میری سعادت ہے کہ اُنھوں نے مجھے اِملا سبقاً سبقاً، باقاعدہ سکھایا ہے: مجھے یاے معروف پر ختم ہونے والے الفاظ کی ی کے نیچے زیر لگانے، الف یا واوِ معروف پر ختم ہونے والے الفاظ کے آخر میں ے (ہمزہ کے بغیر) کا اِضافہ کرنے، اور ہاے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ پر اضافت کے لیے اِس ہ پر ہمزہ (زیر لگائے بغیر) لکھنے کو بتایا۔ اور اِن میں سے ہر ایک کی کئی کئی مثالیں دیں۔ ایک بار ایک خط کے جواب میں لکھا کہ: ''...آپ نے اِضافت کے زیر کا اِلتزام کیا ہے اور یہ عمدہ بات ہے اور ضروری، اِسی طرح تشدید کا اِلتزام بھی ضروری ہے۔ صَدِیق اور صِدّیق، یہ دو لفظ ہیں؛ مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ میں عابد صدّیق پڑھوں یا عابد صدیق – یہ محض ایک مثال ہے۔ مشدّد حروف پر تشدید ضرور لگائیے، مثلاً: مُدّت، جِدّت، ذرّے، اُمّید – اِسی طرح جہاں ''لکھی'' یا ''لکھا'' آئے، وہاں اِسی طرح لکھا جائے اور جہاں وزنِ شعر کے لحاظ سے لکّھی یا لکّھا آئے، وہاں تشدید لکھنا ضروری ہے۔ مثلاً...''

ایک بار لکھا کہ: ''...یاد رکھیے کہ جب بھی کسی لفظ کے درمیان میں ی مفتوح ہوگی تو اِس جگہ پر ء نہیں آئے گا بل کہ ی ہی آئے گی، جیسے: چڑیل، مریل، سڑیل، وغیرہ۔ انگریزی لفظ بھی اِسی قاعدے پر لکھے جائیں گے، جیسے: جونیر، سینیر، لائبریرین، ایریا، ایتھین، انڈین، وغیرہ۔ اِن سب الفاظ میں ی مفتوح ہے۔ لیکن جب کسی لفظ میں درمیانی ی مکسور ہوگا وہاں ی نہیں ہوگی بل کہ ء ہوگا، جیسے: دائم، لائق، جائز، زائد، شائق، وغیرہ۔ ایسے انگریزی الفاظ بھی اِسی قاعدے پر لکھے جائیں گے، جیسے: لائٹ، پائپ، پائلٹ، ڈائریکٹر، لائبریری، موبائل، وغیرہ...''

غرض کیا کیا لکھوں! ایک نوسیکھ طالبِ علم کو ایک طرح سے اُنگلی پکڑ کر لفظ لفظ درست کرانے والے لوگ اب کہاں ملیں گے۔ رشید حسن خاں صاحب اِس حیثیت میں میرے اُستاد تھے: وہ رشید ہی نہیں، مرشد بھی تھے اور میں اُن کا مسترشِد۔ میں اُن کا احسان مند ہوں، اور ہمیشہ رہوں گا۔ (واضح رہے کہ یہاں مسترشِد کی اصطلاح ''مقلدِ محض'' کے معنٰی میں استعمال نہیں کی گئی؛ میرے مضمون کا لفظ لفظ اِس پر گواہ ہے۔)

ایک بار میں نے خاں صاحب کو لکھا کہ اگر موسیٰ نام کے کوئی صاحب بہت باریک لکھائی میں لکھتے ہوں اور بدخط بھی ہوں اور اُن کے بارے میں کوئی شخص یہ لکھنا چاہے کہ وہ اپنا لکھا صرف خود ہی پڑھ سکتے ہیں، تو اگر وہ موسیٰ کے لیے آپ کا تجویز کردہ اِملا استعمال کریں یعنی موسا، تو یوں لکھیں گے: ''لکھے موسا موسا، پڑھے خودآ''۔ اُنھوں نے جواب میں لکھا کہ عربی کے ایسے الفاظ کے بارے میں ایسا لکھنے کی میری صرف تجویز تھی اور بعد ازاں میں نے ایسے معروف الفاظ کے بارے میں واضح طور پر لکھا کہ یہ مستثنیات سے ہیں اور اِن پر قوانین لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آگے لکھا کہ آپ نے موسا کے لیے مثال بہت خوب گھڑی ہے۔ بعد میں میں نے کسی وقت میں فون پر بات کی تو عرض کیا کہ اِسی طرح اگر بل کہ اور چناں چہ وغیرہ الفاظ کو بھی ایسی مستثنیات کے جلو میں رکھ دیا جائے جن کی صورت سے آنکھیں آشنا ہیں اور ان کے عمومی اِملا یعنی بل کہ اور چنانچہ وغیرہ ہی کو چلنے دیا جائے تو اچھا ہے۔ میرے اصرار کے بعد وہ بل کہ کے بجائے بل کہ پر تو کچھ کچھ راضی ہوگئے کہ عام لوگ ایسے لکھ لیا کریں لیکن چناں چہ اور کیوں کہ وغیرہ کے لیے چنانچہ اور کیونکہ پر راضی نہ ہوئے۔

❖ ❖ ❖

مرحوم مشفق خواجہ صاحب پر میرا مضمون The Passing of the Old Guard رشید حسن خاں صاحب تک سب سے پہلے الزبیر کے ذریعے پہنچا۔ اُنھوں نے مجھے لکھا کہ: ''...خواجہ صاحب والا مضمون بہت پسند آیا۔ اُن کی وفات پر لکھے جانے والے تمام مضامین میں مجھے سب سے زیادہ اور یجنل مضمون یہی لگا۔ آپ نے بہت محبت سے لکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے خواجہ صاحب فون پر باتیں کر رہے ہوں۔...'' میں نے فون پر خط وصول ہونے کی اطلاع دی اور شکریہ ادا کیا تو مشفق خواجہ صاحب کے بارے میں ایک خاص درد کے ساتھ فرمایا کہ: ''خواجہ صاحب کے بعد خود کو اکیلا محسوس کرتا ہوں۔ بس، اُن کو یاد کرتا رہتا ہوں۔ بس۔'' دنیا سے چلے جانے والے اپنے عزیز دوست کی باتیں کرتے ہوئے اُن کی آواز بھرّا گئی۔ میں نے بات کا موضوع بدل دیا۔

مرحوم مشفق خواجہ صاحب جنابِ رشید حسن خاں کے تبحرِ علمی کے بے اندازہ قائل تھے اور اُن کا بہت ہی زیادہ احترام کرتے تھے۔ مجھے اُن کا پتا اور فون نمبر لکھوایا اور حکم

فرمایا کہ اُنھیں اپنے والد پروفیسر عابد صدیق صاحب کے کام کے بارے میں بتاؤں۔ تعمیلِ ارشاد میں میں نے اُن کا جمع شدہ کلام اور مضامین ہندوستان بھجوائے۔ خاں صاحب نے اپنے جوابی خط میں مجھے درست اِملا کی کئی باریکیاں سمجھائیں اور میرے والد صاحب کے کلام پر جگہ جگہ اپنی رائے بھی تحریر فرمائی۔ ذیل میں اِن جملوں کا ایک انتخاب درج کرتا ہوں: ''...میں نے آپ کے والد کا سارا کلام پڑھا۔ ہر صفحے پر منتخب اشعار کی تعداد زیادہ ہے...کئی ایک غزلیں اور ہندی کلام میں موجود بعض نظمیں تو پوری کی پوری ہی انتخاب ہیں...اُن کے ابتدائی دور کا کلام بھی بہت پختہ ہے۔ دل کو ٹھہرا دینے والے معاشرتی اور سماجی حقائق اُن کی شاعری کا موضوع ہیں لیکن انداز ایسا باوقار ہے کہ اُن کا لہجہ کہیں شکوہ سنج یا شکایت کا نہیں ہوتا...اپنی نارسائی پر متاسّف ہوں کہ عابد صدیق مرحوم سے مجھے نیاز حاصل نہیں رہا۔ حالاں کہ ایسے صاحبِ علم وصاحبِ طبعِ رسا سے غائبانہ سہی، ملاقات ہونا چاہیے تھی...آپ نے اچھا کیا کہ [اِشاعت سے پہلے اُن کا کلام دکھا کر] اِس کارِخیر میں مجھے شامل کرلیا۔ اِس طرح میں بھی داخلِ حسنات ہونے کا ثواب حاصل کرسکوں گا...''

یہ بات مجھے مشفق خواجہ صاحب ہی نے بتائی کہ رشید حسن خاں صاحب اُردو کے کلاسیکی ادب کو درست اور معیاری اِملا کے ساتھ مرتب کر کے شائع کروا رہے ہیں۔ کلیاتِ یگانہ کے متن کی تدوین کے آخری مرحلے میں خواجہ صاحب نے اِس عظیم کام کا فرہنگ تیار کیا، اور اِس پر خاں صاحب سے نظرِ ثانی کرائی۔ مشفق خواجہ صاحب جیسے عبقری کا کام اور اُس پر مستزاد رشید حسن خاں صاحب کی نظرِ ثانی — سونے پر سہاگہ شاید اسی کو کہتے ہیں۔ اور شاید اِسی لیے محبی سید محمد ذوالکفل بخاری نے کلیاتِ یگانہ کو اُن باسیانِ اقلیمِ ادب کے ''منھ پر تھپڑ'' کہا ہے جو تدوینِ متن کے نام پر بقراطی چھانٹ کر اور لوگوں کو بےوقوف بنا کر عمر بھر کی روٹیاں سیدھی کرلیتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کو ''فنِ اِملا کا امام'' لکھا تھا۔ اِملا کی اصلاح کی پرجوش پشتی بانی، تدوینِ متن کے فن میں مجتہدانہ بصیرت اور اُردو کے کلاسیکی ادب کو معیاری اِملا کے ساتھ مرتب کرنے پر رشید حسن خاں صاحب کو فنِ تدوینِ متن کا امام کہا جاسکتا ہے۔ کہاوت تو یہی ہے کہ تجلّی کو تکرار نہیں، اِس لیے مشفق خواجہ صاحب کے مرتب کردہ کلیاتِ یگانہ کے بعد تدوینِ متن کی امامت کے مصلّے پر جگہ باقی نہیں رہی؛ لیکن اگر ایک عربی کہاوت: طابَقَ النعلُ بالنعل استعمال کی جائے تو تدوین وتحقیق کے میدانوں میں مثالی، قابلِ تقلید نقوشِ قدم چھوڑ جانے کی وجہ سے اِس دُوئی کے لیے گنجایش ضرور نکلتی ہے۔

❖ ❖ ❖

اب آیئے کچھ خطوط کی طرف۔ میں نے رشید حسن خاں صاحب کو چند نسبتہً بےڈھور خطوط کے ساتھ ساتھ پانچ سوچے سمجھے، باقاعدہ خط لکھے۔ پہلا خط تو اپنے والد صاحب کی نگارشات اِرسال کرنے کے ساتھ، جس کا اوپر ذکر ہوا؛ دوسرے خط میں اُردو لغت بورڈ کراچی کے کلاں اُردو لغت سے متعلق اُن کی رائے کی پوچھا پریکھی کی، کہ رازِ درونِ پردہ زرندانِ مست پُرس؛ ایک خط میں مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق چند سوالات کیے؛ ایک طویل خط میں اُن کے ایک مقالے کلامِ اقبال کی تدوین کے بارے میں کئی چبھتے ہوئے سوالات کیے؛ اور ایک خط کے ساتھ پندرہ سوالات پر مشتمل ایک پرچہ نتھی کر کے بھیجا۔ ذیل میں اِن خطوط کے متعلقہ حصوں کی چھانٹن پیش کرتا ہوں۔

سنہ 2001 کے اوائل میں مرحوم مشفق خواجہ صاحب کی زبانی مجھے علم ہوا کہ رشید حسن خاں صاحب نے کئی سال پہلے اُردو لغت بورڈ کراچی کے کلاں اُردو لغت پر ایک جان دار تنقید کی تھی۔ خاں صاحب کا مذکورہ مقالہ اُن کی کتاب تفہیم (اشاعت 1993) میں شائع ہوا تھا۔ مقالہ پڑھا تو کلاں اُردو لغت کے بارے میں اُن کی تحقیق سے آگاہی ہوئی۔ میں نے خاں صاحب کو اِس لغت اور اُن کے مقالے سے متعلق ایک خط لکھا۔ یہ بھی پوچھا کہ آپ کے نزدیک اِس وقت سب سے اچھا اُردو اور سب سے اچھا انگریزی لغت کون سا ہے۔ اُنھوں نے لکھا کہ اُن کی: ''...رائے اِس لغت کے بارے میں اب بھی وہی ہے جو یہ مقالہ لکھتے وقت تھی...دراصل منصوبہ بندی کے تحت بڑے کاموں کو اجتماعی طور پر اور تعلق خاطر کے ساتھ، ڈھنگ سے کرنے کی اہلیت ہم لوگوں میں نہیں ہے...مجھے اُردو کے لغات میں جامع اللّغات سے زیادہ مطمئن کرنے والا لغت نہیں ملا، اور یہ اکیلے آدمی کا کام ہے...پلیٹس کا لغت اور فرہنگِ عامرہ بھی بہت اچھے ہیں...انگریزی - اُردو لغات میں حقی صاحب کی اوکسفرڈ اور جمیل جالبی صاحب کی قومی انگریزی - اُردو لغت ہر لفظ کی مناسب تعریف دیتی ہیں...''

یاد رہے کہ کلاں اُردو لغت پر رشید حسن خاں صاحب کے اعتراضات، اِس لغت کی پہلی جلد پر تھے۔ لغت جیسے علمی کام پر مدیرِ اوّل کی انشائیہ نگاری، اور عملۂ ادارت پر بھی خاں صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں چوٹیں کی ہیں۔ بہرحال، بعد کی جلدوں میں اِن کوتاہیوں کو دور کرنے کی سعی کی گئی۔

❖ ❖ ❖

رشید حسن خاں صاحب کے تنقیدی مضامین کے مجموعے تفہیم کا پہلا مقالہ مولانا آزاد کا اُسلوب میرے ذہن میں کئی سوالات پیدا کرگیا۔ خاں صاحب کے بقول یہ مقالہ عقیدت وجذباتیت کی پیدا کی ہوئی ہر طرح کی نسبتوں کو دست بسر کرتے ہوئے اور مختلف وقفوں میں مذہب وسیاست کے بارے میں مولانا آزاد کے بدلتے ہوئے اندازِ فکر اور اندازِ نظر کی روشنی میں اُن کے اُسلوب کا گہرا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ میں اِس مقالے کو رشید حسن خاں صاحب کے اندازِ نظر ہی نہیں بل کہ اُن کے تحقیقی وتنقیدی اندازِ فکر کا بھی نمایندہ مقالہ سمجھتا ہوں۔ اِس مقالے کی روشنی میں میں نے مولانا آزاد کے بارے میں چند سوالات ترتیب دِیے اور خاں صاحب کی خدمت میں خط لکھا۔ اُنھوں نے اِس خط اور سوالات کا جواب دیا لیکن افسوس کہ یہ جوابی خط ڈاک میں گم ہوگیا۔ بعد کو اِن میں کے کچھ سوالات میں نے اُن سے کیے گئے مکالمے میں پوچھ لیے۔ (اِن سوالات/جوابات کے لیے مکالمے کا آخری حصہ دیکھیے)۔

❖ ❖ ❖

مجھے کئی سال پہلے اور پھر ابھی چند ماہ پہلے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کی عنایت سے دوبارہ بھی، علامہ اقبال کے کلام کی تدوین کے سلسلے میں لکھا گیا رشید حسن خاں صاحب کا مقالہ کلامِ اقبال کی تدوین پڑھنے کا موقع ملا۔ میں نے 1995 کے اواخر میں اقبال اکادمی لاہور سے شائع ہونے والے اقبال کے اُردو اور فارسی کلیات خریدے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد (شاید 1997 کے لگ بھگ کسی وقت میں؛ لیکن یہ بالکل یاد نہیں کہ کہاں) مذکورۂ بالا مقالہ پڑھنے کا موقع ملا۔ کلیاتِ اقبال کے اِن نہایت دیدارو نسخوں پر ''اقبال اکادمی کے پنچایتی کلیات'' کی پھبتی کس کے خاں صاحب نے ایک ہی وار میں اقبال، کلیات اور اکادمی تینوں کو دیوار سے لگا دیا ہے۔ اُن کے اِس قسم کے جملے:

''...یہ دونوں کلیات ایسی طرح طرح کی غلطیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔''؛

''...ایسی دورنگی سے یہ کلیات بھرا ہوا ہے۔''؛

''...اِس کلیات کا احوال اِس لحاظ سے بہت تباہ ہے۔''؛

''...اگر کسی شخص کے سامنے کلامِ اقبال...یہ دونوں کلیات ہوں تو وہ نیرنگیِ اِملا پر حیران رہ جائے گا۔''؛

''...کلیاتِ فارسی میں طرزِ کتابت کا احوال بیان کیا گیا[جو سراسر اقبال کے طریقِ نگارش کے خلاف ہے]۔''؛

''...کیا ایسے اڈیشن کو معتبر کہا جا سکتا ہے؟ اِس سے زیادہ اہتمام تو اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے منشی نول کشور کے مطبع میں ملحوظ رکھا جاتا تھا۔''؛

''...اُسی صفحے کے نچلے حصے میں نمبر شمار...ہے۔ پڑھنے والا سمجھ ہی نہیں پائے گا کہ یہ ہُوا کیا ہے؟''؛

''اقبال اکادمی کے کلیاتِ فارسی میں جی بھر کے ایسی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔''؛

''...ایسی مثالوں سے یہ کلیات بھرا ہوا ہے۔''؛

''...دل چسپ بل کہ عبرت ناک مثال...''

وغیرہ وغیرہ، پڑھنے کے بعد کلیاتِ اقبال سے جی اُوب گیا۔ اِسی پر بس نہیں بل کہ شیخ غلام علی کے شائع کردہ اُس نسخے سے بھی دل اُٹھ گیا جو اِس خریداری سے پہلے سے میرے پاس موجود تھا، کیوں کہ اِس مقالے میں اِس نسخے کی بھی ''رج کے'' تواضع کی گئی ہے۔ سالہا سال گزر گئے اور مجھے کلامِ اقبال پھر پڑھنا نصیب نہیں ہوا، اور یہ کلیات میرے پاس اُس طرح پڑے سڑتے رہے جیسے کفار کے ترجمہ کیے ہوئے قرآنِ پاک کے نسخے لائبریریوں میں رکھے ہوتے ہیں، یعنی صرف حوالے کے لیے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے الحمراء والوں اور ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی صاحب کا، کہ اُنھوں نے آسان کلیاتِ اقبال شائع کر کے ادب کے میدان میں مجھ جیسی کوری تعلیمی استعداد کے حامل لوگوں پر احسان کیا؛ اِس کلیات کا املا بھی نہایت اچھا اور معیاری ہے۔ اب میں نے نہ صرف خود اقبال کو دوبارہ پڑھنا شروع کیا بل کہ اِس لمبے عرصے میں اللہ نے مجھے تین بچے دِیے جو اَب میرے ساتھ اقبال کی نظمیں پڑھتے ہیں۔

پھر، جب سے میں نے رشید حسن خاں صاحب سے خط کتابت اور فون پر رابطہ رکھنا شروع کیا تو ایک بار میں نے فون پر اُن سے یہ اجازت لے کر اور اطمینان کر کے کہ وہ میری صاف صاف باتوں سے خفا نہیں ہوں گے، اُنھیں اُن کا مذکورہ مقالہ پڑھنے سے ہونے والے اِس ذاتی سانحے یعنی کلامِ اقبال سے برگشتہ خاطری کے بارے میں لکھا۔ میں نے لکھا کہ: ''...تنقید کا ایک انداز مشفق خواجہ صاحب کا ہے جن کا کالم پڑھتے ہی وہ کتاب پڑھنے کو جی چاہتا ہے جس پر وہ کالم لکھا گیا، حالاں کہ وہ نہایت بے رحمی سے اور بانگِ بلند اصلاحِ احوال فرماتے ہیں۔ دوسرا انداز قاضی عبدالودود صاحب کا ہے جن کی تحریر پڑھ کر نہ صرف کتاب بل کہ صاحبِ کتاب کے بارے میں بھی تپاک کے جذبات ہمیشہ کے لیے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں...میرے والد صاحب نے ہم بچوں کو اقبال کے کلام کی ایک طرح سے گھٹی دی تھی، تو اقبال کے لیے محبت وعظمت کے شدید جذبات رکھنے والے ایک قاری کی حیثیت میں مجھے آپ کی تحریر سے یہی لگا کہ کلیاتِ اقبال کے یہ سب نسخے اغلاط کی کھتاؤنیاں ہیں جن میں ہر شعر بالکل غلط لکھا ہوا ہے، تو جیسے طباعتی اغلاط والے قرآنِ پاک کا احترام گو ضروری ہے لیکن اس سے تلاوت گناہ ہے ویسے ہی اگر اِن مجموعوں سے اقبال کا کلام پڑھا گیا تو وقت اور صلاحیتوں کے زیاں کے ساتھ ساتھ گناہ بھی ہو گا، اور ان سب نسخوں کا صحیح مقام صرف پنواڑی کا کھوکھا ہے یا انگیٹھی...جب کہ صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ آپ کی ذکر کردہ چھوٹی بڑی غلطیاں، سب کی سب، اوسطاً ہر دسویں صفحے پر ایک کے حساب سے ملتی ہیں...اِس طرح آپ مجھے قاضی عبدالودود لگے...اور پھر جس انداز میں آپ نے اپنے اِس مقالے کے آخر میں اقبال کے لیے وادین کے اندر ''شاعرِ ملت، شاعرِ مشرق'' اور ''حکیم الامت'' کے الفاظ لکھے ہیں، اُن سے تو خاکم بدہن مجھے آپ کے ہاں اُس خاص چیز کی موجودگی کا صاف پتا ملتا ہے جو جوش کو اقبال سے تھی۔ اور میرے اِس گمان کو یقین میں یہ بات تبدیل کرتی ہے کہ اِتنے طویل ادبی کیریر کے باوجود کلامِ اقبال کی تحسین یا تجزیے پر آپ کی کوئی مستقل تحریر آپ کے مضامین کے کسی مجموعے میں موجود نہیں ہے...میری نظر میں آپ نے یہ کچھ لکھ کر اقبال دوستی کا ثبوت نہیں دیا...ایک اور اہم بات یہ ہے کہ غالب کے بارے میں تو آپ اِملاے غالب کی پیروی کا جواز بتاتے ہیں جب کہ اپنے اِس مضمون میں آپ اقبال کے معاملے میں ایسی رواداری کے رویے کی صراحت کے ساتھ نفی کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ: 'اگر اقبال کی کسی تحریر میں اُن کے قلم سے [کسی لفظ کا غلط اِملا] ملتا ہے، اُس صورت میں اِس کی بھی صراحت کی جائے گی۔ اِس سلسلے میں مرتبین کو اپنے طریقۂ کار کا تعین کرنا ہو گا کہ...ایسے لفظوں کو کس طرح

لکھا جائے گا...' مٹھار مٹھار کر کی گئی اِن باتوں میں سے آپ کا منشا کشید کیا جائے تو یوں لکھا جائے گا کہ اقبال کی غلطی کی اصلاح کی جائے گی۔ صورت یہ بنی کہ غالب اگر دھڑّلے سے کسی لفظ کے غلط اِملا پر اِصرار کرے تو روا ہے، اقبال سے اگر چوک ہو جائے تو مجہول الاسم مرتبینِ متن کے پرے کے پرے اُن کے سہوِ قلم پر طویل اور ہمہ جہت شذرات لکھیں گے۔ بہ الفاظِ دیگر اگر غالب کا معاملہ سامنے آئے تو آپ کی اصلاحِ اِملا و قواعد کی توپیں زنجک چاٹ جاتی ہیں۔ جب کہ یہ بات ہر ایک کو معلوم ہے کہ غالب اپنی شاعری میں اظہارِ جذبات کے اعتبار سے بہت بڑے سہی، اُن کا علم اقبال جیسے کئی زبانوں کے گہرے آشنا عالم اور کئی ثقافتوں کے گرم و سرد چشیدہ مفکر کے سامنے بالکل ہیکا اور فرومانده ہے۔..اقبال کے کلام کی تدوین کے سلسلے میں اہم ترین بات یہ ہے کہ اقبال کی شاعرانہ عظمتیں اُردو سے بڑھ کر اُن کے فارسی کلام میں آشکارا ہوتی ہیں اِس لیے اُن کی اُردو شاعری کو فارسی شاعری سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ چناں چہ اقبال کے کلام کی تدوین صرف اور صرف اُسی مدوِّن کو سزاوار ہے جس کی نیک شہرت فارسی کے بڑے بڑے شعرا کے متون مدوَّن کرنے کے حوالے سے مسلَّم ہو، تاکہ وہ اقبال کے کلام کی تدوین کرے نہ کہ اِس متن پر تدوین کا کام سیکھے؛ اب مولوی محمد شفیع جیسا آدمی کہاں سے لایا جائے؟ حیرت ہے کہ کلامِ اقبال کے مدوِّنین کے لیے اہلیت کے کسی معیار کا حامل ہونے کا ذکر آپ نے اپنے بسیط مقالے میں کہیں اِشارۃً بھی نہیں کیا ہے۔ آپ جیسے پارکھی محقق سے ایسی چوک ہو جانا ممکن نہیں، یقیناً آپ نے اِس موضوع کو کسی مستقل مقالے میں ذکر کرنے کے لیے الگ رکھ چھوڑا ہوگا؛ اِس کی تلافی بہر حال ہونی چاہیے۔ فارسی شعر و ادب کی روایت اور ثقافت کا راسخ علم اور فارسی شعری متون کی تدوین کے وسیع تجربے کے بغیر کی جانے والی اقبال کے اُردو کلام کی تدوین صرف وسائل اور صلاحیتوں کا بے جا استعمال ہوگا اور ہوا کو مٹھی میں بند کرنے کی خواہش، اور **تعریفُ المجهولِ بالمجهول** کا نمونہ...اِسی طرح اقبال اکادمی کو آپ نے کاروباری اِدارہ، تجارت زدہ ذہن، وغیرہ کہہ کہہ کر کوسنے دینے والے لہجے میں بات رکھی ہے۔ پُننے کا یہ انداز آپ کی اپنی تعلیم فرمودہ اخلاقیات برائے تحقیق کے خلاف چلتا ہے۔ آپ کو اِس امر کا خیال ضرور رکھنا چاہیے تھا کہ ایک سرکاری اِدارے، اور وہ بھی ادبی اِدارے، کی انتظامی مجبوریاں کیسی ہوتی ہیں اور اُن کے سربراہوں کا سُبھاؤ کیسا ہونا چاہیے۔ یہ بات آپ کے علم میں ہوگی کہ شہنشاہِ ایران نے اپنے دور میں قرآنِ مجید کو بھی اپنے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اِس جرأت پر سوائے مختار مسعود صاحب کے آج تک کوئی ایک لفظ نہ بولا جب کہ اقبال اکادمی کے صدر نشین کا، کلیاتِ اقبال پر ابتدائیہ نزلہ بر عضوِ ضعیف کے مصداق آپ کے توسنِ تحقیق کی گرد بن گیا۔[1]...تدوینِ متن کی بات کی تان کلیات کے نسخوں کی قیمتوں کے تقابل پر آ کے توڑی گئی ہے جو بہت بے مزہ کر گئی ہے۔...کلامِ اقبال کے یہ کلیات جس انداز میں شائع کیے گئے ہیں اِسی ڈھب اور پیمانے پر 1969 میں وطنِ عزیز کے مایۂ ناز خطاط سید نفیس رقم صاحب کے قلم اور مصورِ پاکستان جناب عبدالرحمٰن چغتائی کی مصوری کے ساتھ دیوانِ غالب شائع ہوا تھا جس کی تحقیقِ متن و ترتیب کا کام محنتِ شاقہ، حسنِ ذوق اور مضبوط علمی اِستدلالات کے ساتھ مولانا حامد علی خاں صاحب نے کیا تھا، اور اُن کی ''کاوش و کاہش'' پر قارئینِ دیوان اُن کے ممنون رہے۔ مولانا مرحوم کی عدیم الفرصتی کے سبب سے کچھ چیزیں تشنۂ ابلاغ رہ گئی تھیں جن کی طرف ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب نے اپنے مقالے دیوانِ غالب پر مولانا حامد علی خاں کے حواشی میں توجہ دِلائی ہے۔ اُن کا ابتدائی جملہ ہے: '...مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس وقت، بصد ادب، چند گزارشات کی جسارت، اِس دواست کے ساتھ، کی جائے گی کہ اگر وہ قصورِ فہم کا نتیجہ ہوں تو معاف فرمائی جائیں اور اگر کسی قابل نظر آئیں تو، مولانا کی اجازت سے، اشاعتِ دوم میں ضروری ترمیم کا اہتمام ہو سکے۔' غالب کے کلام کی تدوین پر تنقید کا ایک انداز یہ ہے، اِس کے مقابلے میں اقبال کے کلام کی تدوین پر آپ کے تنقیدی مقالے کی Tone کو کیا نام دیا جائے؟...'' اپنے تفصیلی جواب میں رشید حسن خاں صاحب نے لکھا کہ: ''...آپ نے اپنے جذبات کا اظہار بہت دیانت داری سے کیا ہے...اِس تحریر سے میرا مقصد اہلِ علم اور اربابِ نظر کی توجہ اِس طرف منعطف کرانا تھی کہ کلامِ اقبال کی تدوین پر توجہ دینا بہت ضروری ہے۔..'' میں نے جواب الجواب میں لکھا کہ: ''...اپنی بنت میں ایک انتہائی اختصاصی چیز ہونے کی وجہ سے اِس مقالے کے موضوع اور مندرجات کو عوامی چیز نہیں بننا چاہیے ...اِس صورت میں آپ کو اپنا مقالہ کم سے کم رسالوں میں شائع نہیں کرانا چاہیے تھا۔ آپ خود اِس رویے کے نقیب ہیں کہ دوبدو اور محاذی ہونے کے بجائے دھیمے انداز اور دل سوزی کے ساتھ توجہ دلائی جائے تو اصلاح ہوگی...یہ مقالہ جو بہت ہی اہم نوعیت کی معلومات اور بحثوں کا جامع ہے، کسی کتاب ہی میں شائع ہوتا تو بہتر تھا۔ کسی ایسی کتاب جو یا تو آپ کے ذاتی مقالات کا مجموعہ ہوتی یا اقبال سے متعلق سنجیدہ تکنیکی تحریروں کے کسی انتخاب میں...''

میں نے رشید حسن خاں صاحب کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اُن کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اختلافِ رائے کا حق دیتے ہیں۔ یہ اُن کی ایسی اعلیٰ خوبی تھی کہ جس کی وجہ سے میدانِ ادب میں مجھ ایسا اُٹھل ''پانچواں سوار'' بھی مہینوں تک اُن سے اِس قدر اٹ پٹ، کھردری گفتگو کرتا رہا۔ سوچتا ہوں کہ اب دنیا میں ایسے کتنے باوقار اور متین رجالِ رشید ہوں گے جو، اُن کے اپنے الفاظ میں، ''علمی اختلاف کو خندہ پیشانی سے قبول کریں۔'' واحسرتا!

❖ ❖ ❖

اب آئیے اُس مکالمے کی طرف جس کا موقع یوں بنا کہ رشید حسن خاں صاحب نے میرے ایک خط کا جواب نہیں دیا۔ ہوا یہ کہ میں نے خاں صاحب کی خدمت میں پندرہ سوالات پر مشتمل ایک سوال نامہ اواخرِ جولائی 2005 میں ایک خط کے ساتھ اِرسال کیا تاکہ اُن کی زندگی اور کاموں کی بابت اپنی جہالت کو دور کر سکوں اور اُن جیسے عبقری کے زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ اُن کے اپنے الفاظ میں محفوظ کر سکوں۔ اِس مرد ناکارہ پر خاں صاحب کی یہ بہت شفقت تھی کہ وہ میرے خط کا جواب ضرور دیتے تھے، لیکن اب کے اُنھوں نے جواب نہیں دیا۔ میں نے اوائلِ ستمبر میں ٹیلی فون کر کے خط کی وصولی کی بابت اِستفسار کیا تو اُنھوں نے صحت کی خرابی، ہجومِ کار اور دراصل انٹرویو دینے سے کلّی احتراز

کی وجہ سے جوابات لکھ کر دینے سے صاف انکار فرما دیا[۲]۔ میرے اصرار اور اِس یقین دہانی پر کہ میں تشہیری انداز میں اخبارات کے اندر اِن جوابات کو شائع بالکل نہیں کراؤں گا، خاں صاحب کچھ نرم پڑے اور فرمایا کہ میں آٹھ۔ دس روز میں اُنھیں فون کرلوں تو وہ کچھ باتیں بتا دیں گے۔ یہ ''عشرۂ انتظار'' میں نے بہت بے صبری میں کاٹا۔ سخن کوتاہ، 17 ستمبر 2005 کو رات دس بج کر دس منٹ پر یہ مکالمہ شروع ہوا۔ تقریباً چالیس منٹ کی اِس گفتگو میں میں نے اُن سے کئی باتیں پوچھیں اور اُن کے جوابات قلم برداشتہ لکھتا رہا۔ ابھی اِس مسودے کو صاف کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ شان الحق حقی صاحب اللہ کے حضور حاضر ہوگئے۔ مخدومی و مطاعی ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی صاحب مدظلہٗ کی جانب سے حقی صاحب پر لکھنے کا حکم ایسا نہیں تھا جسے صرف مؤخر بھی کیا جاسکے۔ اِس سے فراغت ہوتے ہوتے بحمداللہ تبلیغ کے سفر میں جانا طے ہوگیا۔ واپسی کو ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ رشید حسن خاں صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اب عجلت میں جو کچھ بن پڑا، پیش کررہا ہوں۔ مکالمے میں کی کچھ باتوں کا ذکر اِس مضمون میں مختلف مقامات پر ضمناً موجود ہے۔ بقیہ باتوں کو یہاں لکھ رہا ہوں۔

واضح رہے کہ چوں کہ یہ سوالات خاں صاحب کے پاس پہلے سے موجود تھے اِس لیے یہ مکالمہ، سوال جواب کے بجائے، زیادہ تر فی البدیہہ (Extempore) گفتگو کی شکل میں ہوا۔ اِس مکالمے کو کاغذ پر سے اُتارتے ہوئے میری کوشش رہی ہے کہ اِسے جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ ہاں کہیں کہیں کچھ لفظوں کی تکرار سے غیر ضروری اُلجھاؤ کے باعث معمولی سے حذف سے ضرور کام لیا گیا ہے اور چند جملوں اور الفاظ کی حک و تہذیب کی گئی ہے، اِس احتیاط کے ساتھ کہ اُن کے نفسِ مضمون پر زد نہ آئے۔ گفتگو کو تحریر کے سانچے میں بہتر طور پر ڈھالنے کے لیے اوقاف و رموز بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ جن سوالات کے جواب میں خاں صاحب نے فرمایا کہ وہ ''اِس بارے میں لکھ چکے ہیں،'' کو یہاں اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ جلدی میں لکھنے کی وجہ سے، اور کچھ اِس تبییض کے دورانیے کے لمبا ہوجانے کی وجہ سے، چند الفاظ ضائع ہوگئے۔ الحاقی الفاظ کے شامل ہوجانے کے خدشے سے ایسے الفاظ والے جملوں کو شامل نہیں کیا جارہا ہے۔ اِس بات کا ذکر ضروری ہے کہ مجھے Living Legend لوگوں سے اِس قسم کے مکالمے کرنے کا ذوق ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کے سید نذیر نیازی سے ایک مکالمہ پڑھ کر ہوا۔

خاں صاحب کے اِس مکالمے کی سب سے بڑی خوبی اُن کا بے دغدغہ، دوٹوک اور دبنگ اندازِ بیان ہے؛ یہ اُن کی وہ خاصیت ہے جو اُن کی تمام تحریروں سے بھی ہویدا ہے۔

میرے اِس سوال کے جواب میں کہ آپ تعلیمی مراحل کو باقاعدہ عبور نہ کرنے کے باوجود ادب، اور ادب میں بھی تحقیق اور تدوینِ متن جیسے ایک حد تک بے فیض اور خشک موضوعات کی طرف کیسے آئے اور آپ کو تحقیق کا لازمہ کہاں سے ملا؟ خاں صاحب نے جواب دیا کہ وہ نیاز فتح پوری کی تحریروں سے اِدھر کو متوجہ ہوئے۔ اور اُن کے ذوقِ خطابینی کی تربیت میں حافظ محمود خاں شیرانی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود وغیرہ کی کتب کے مطالعے نے مہمیز لگائی۔

اِس سوال کے جواب میں کہ اِملا کے مسائل جوں کے توں کیوں ہیں اور اِتنے زیادہ لوگوں کے علمی مضامین شائع ہونے کے بعد بھی جب شائع شدہ مواد میں رنگ برنگا اِملا ہی نظر آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اِس سلسلے میں کبھی کوئی محنت ہوئی ہی نہیں، خاں صاحب نے فرمایا کہ اِن موضوعات پر لکھنے والوں نے اِملا کے مسائل کو رسم الخط کے مسائل سے خلطِ مبحث کردیا۔ میرے اِس ضمنی سوال پر کہ مجھے مختصراً بتا دیجیے کہ اِملا اور رسم الخط میں کیا فرق ہے، اُنھوں نے فرمایا کہ یوں سمجھیے کہ اِملا پھول کے مانند ہے اور رسم الخط اِس کے رنگ اور خوشبو کی مثال ہے۔ پھول نہ ہوگا تو نہ اِس کے رنگ کا کوئی سوال ہوگا اور نہ خوشبو کا ٹھکانہ۔ رسم الخط میں تبدیلی ضرورتوں کے مطابق ہوتی ہے جیسے مثلاً نستعلیق ہاتھ کی لکھائی میں اور نسخ ٹائپ رائٹر پر استعمال ہوتے ہیں۔ اور ایسے ہی پہلے خطِ شکستہ دفتری استعمال میں آتا تھا۔ اب تو کمپیوٹر پر بھی نستعلیق لکھی جانے لگی ہے۔

اُردو کے اِملا ہی کے بارے ایک چبھتا ہوا سوال یہ تھا کہ اب جب کہ اُردو کی اپنی موجودگی پر ہی سوالیہ نشان لگنا شروع ہورہا ہے، وہاں زبان اور بالخصوص رسم الخط کو مشکل بنا دینے سے کیا بُعد اور تنفّر میں اضافہ نہیں ہوگا؟ خاں صاحب کے بڑے رسان سے کہا کہ وہ اُردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔

میرا اگلا سوال اُن کے اندازِ تنقید کے بارے میں تھا۔ عرض کیا کہ آپ کی شہرت علی العموم صرف منفی اندازِ نظر اور اغلاط گیری کے عناوین سے ہے۔ اِس کی کیا وجہ ہے؟ ''تباہ'' ایسا مرغوب لفظ ہے جو آپ کے تقریباً ہر مقالے میں ملتا ہے، مثلاً کلیاتِ اقبال کے موجود نسخوں کو بھی آپ متن کے اعتبار سے ''تباہ'' کہتے ہیں اور کلاں اُردو لغت بھی ہر لحاظ سے آپ کے حساب میں ''تباہ'' ہے۔ خاں صاحب نے جواب دیا کہ لوگ صرف تعریف سننے کے عادی ہیں اور ایسے لوگ بہت کم ہیں جو علمی اختلاف کو خندہ پیشانی سے قبول کریں۔ کسی نے تدوینِ متن کا کام کیا اور معلومات جمع کیں تو اِسے تعمیری تحقیق کا نام دیتے ہیں؛ اور اگر کوئی اِس تحقیق میں رہ جانے والی خامیاں گِنا دے تو اِسے تخریبی تحقیق کہتے ہیں۔ تحقیق کا مقصد حقیقت کی دریافت ہے۔ بے لاگ احتساب نے ہمیشہ بہت مفید کام انجام دیا ہے۔ جہاں کسی شخصیت کا سحر ٹوٹا، وہاں اب شخصیت کے بجائے کام کو دیکھا جاتا ہے۔ اغلاط کی نشان دِہی میں کسی بڑے نام سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ اغلاط کی نشان دِہی میں تمسخر کا انداز نہ ہو۔ غلطی ہر ایک سے ہوسکتی ہے۔ تحقیق کی شریعت میں ذاتی تعلقات اور علمی اختلافات کے خانے علاحدہ علاحدہ ہیں اور اِن میں کے ایک کو دوسرے پر اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہیے، اور اشتعال خواہ کتنا ہی شدید ہو، تحریر میں شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ دھیمے انداز اور دل سوزی کے ساتھ توجہ دِلائی جائے تو اصلاح ہوگی لیکن اگر تحقیقی بحث میں ذاتی حملے کیے جائیں گے تو اعتراض کا مدعا خبط ہوجائے گا۔

تنقید اور اِس کے آداب کے بارے میں میں نے سوال کیا کہ کسی فن پارے پر تنقید یا اُس کی پرکھ کے بارے میں ایک رویہ تو حافظ محمود خاں شیرانی کا ہے یعنی کسی تحریر پر اعتراض سے پہلے اُس میں موجود کمال کی تعریف کرنا اور پھر بانگِ گل کی سی نرمی سے اعتراض کرنا؛ ایک انداز قاضی عبدالودود صاحب کا ہے جو نہ تو نرم گوئی کے قائل تھے بل کہ تحریر میں طنز و تعریض سے مملو تھے اور پوستین دری میں طاق؛ ایک انداز علامہ شبلی نعمانی کا ہے یعنی اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ جن شخصیات کے ادبی کاموں کے بارے میں اُنھوں نے رائے دی ہے اُن میں باہم فرقِ مراتب کیا بنتا ہے، جب کہ ایک انداز مظفر علی سید صاحب کا ہے کہ اُن کی تحریروں سے ادب کی زوال آمادگی ہی کی واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ اِس بارے میں اُن کی رائے کیا ہے، یعنی تنقید میں کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟ خاں صاحب کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کا سوال تین چیزوں کے بارے میں ہے: تنقید، تحقیق اور تدوین۔ یہ الگ الگ چیزیں ہیں اور ادب کے مستقل موضوعات۔ تنقید اور تحقیق کے لوگ مختلف ہیں۔ جیسے مثلاً مولوی عبدالحق نے کئی متن تیار کیے جب کہ وہ تنقید کے آدمی نہیں ہیں[3]۔ اِسی طرح حافظ محمود خاں شیرانی، مالک رام، نثار احمد فاروقی اور مولانا امتیاز علی عرشی وغیرہ نے بہت پائے کے متون ترتیب دیے لیکن اِن سب کا فنِ تنقید میں کوئی اہم مقام نہیں ہے۔ جہاں تک تحقیق اور تدوین کا تعلق ہے، اِن دونوں فنون کی حدیں کہیں کہیں مل ضرور جاتی ہیں۔ لوگ عام طور سے تدوین کو تحقیق کا ایک جز سمجھتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ صورتِ حال اِس سے یکسر مختلف ہے، یعنی تدوینِ متن کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آدابِ تحقیق سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ تحقیق کا آدمی متن کی معیاری تدوین بھی کر سکے، یہ ضروری نہیں۔

رشید حسن خاں صاحب کی زبانی تحقیق اور تدوین کے الگ الگ فنون ہونے کا علم ہونے پر میں نے جلدی میں ایک سوال یہ گھڑا کہ چلیے تدوینِ متن تو صرف اُن لوگوں کا کام ہوا جو تحقیق کے پانیوں میں شانوں تک اُترے ہوئے ہوں۔ آپ اُن نو واردوں کے لیے چند موضوعاتِ تحقیق بتایئے جو تحقیق کی منزل مارنے کے بعد بالآخر تدوینِ متون کے جولان گاہ میں دل و دماغ کی صلاحیتوں کے جھونک دینے کو مقصود بنائے ہوئے ہیں، یا بہ الفاظِ دیگر، یہ بتایئے کہ ادب کے لوگوں میں نئے رشید حسن خاں کیسے پیدا ہو سکتے ہیں؟ اُنھوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ سوال آپ کے لکھ کر بھیجے ہوئے سوالات میں شامل نہیں ہے۔ پھر فرمایا کہ ابتدا میں تو کسی تذکرے، داستان یا شاعری یا کسی انجمن یا ادارے وغیرہ پر تحقیق سے کام کا آغاز کیا جائے۔ ادبی محققین کی علمی مدد کے لیے لکھی گئی حوالہ جاتی کتابوں پر کام کیا جائے اور کسی ایسی پرانی کتاب میں اشاعت سے لے کر آج تک کیے گئے کاموں کے حوالوں کا اضافہ کیا جائے۔ اِس سے تحقیق و تدوین کا صحیح مزاج بنے گا۔ ایک کام بین العلومی موضوعات کا ہے، یعنی وہ لوگ جو بنیادی طور پر اُردو کے لوگ ہیں لیکن کسی اور علم یا فن میں بھی دسترس رکھتے ہیں وہ متداول ادبی موضوعات سے آگے نکلیں اور ادب کا رشتہ دوسرے علوم و فنون سے استوار کریں۔ پھر کچھ کام ہیں جو ادب اور لسانیات دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ادب اور لسانیات بھی دو بالکل الگ الگ موضوعات ہیں لیکن ادبی تخلیقات سے متعلق لسانی مطالعہ صرف ادب کے لوگ ہی کر پائیں گے۔

اِسی ذیل میں ایک مختصر سوال یہ تھا کہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے رہ نما کتابوں کے نام بتا دیجیے۔ جواب ملا کہ ڈاکٹر سلطانہ بخش کی کتابیں اور ڈاکٹر گیان چند کی کتاب تحقیق کا فن۔

ایک سوال یہ تھا کہ ایسے قدیم متن جو آب رسیدگی یا کرم خوردگی کی وجہ سے جگہ جگہ سے ضائع ہو گئے ہیں، جیسے کہ اکثر ہوتا ہے، اُن پر کام کرتے ہوئے مدوّنِ متن اپنی جانب سے اِضافے کس حد تک کرے۔ جواب ملا کہ تدوینِ متن میں قیاس کا دائرہ اِتنا وسیع نہ کیا جانا چاہیے کہ اصل متن، مرتب کے کام کا تابعِ مہمل معلوم ہونے لگے۔

اِسی سوال کا ایک ذیلی سوال یہ تھا کہ تدوینِ متن میں اِملا زمانۂ تحریر کا یعنی جوں کا توں رکھا جائے یا جدید اِملا استعمال کیا جائے، کیوں کہ اِسے پڑھا تو آج اور آج کے بعد کے زمانے میں جائے گا۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ قدیم متن اور مخطوطے مصنفین کے ہاتھوں سے لکھے تو بہت ہی کم دست یاب ہیں اور زیادہ تر کاتبوں ہی کی روش میں لکھے ملتے ہیں اِس لیے متن میں مصنف کی منشا کو سمجھنا چاہیے۔ لیکن اگر ہمیں کسی قابلِ اعتبار ذریعے سے کسی مصنف کے کسی خاص اِملا کو اختیار کرنے کا علم ہو جاتا ہے، جیسے مثلاً غالب کے خطوط کے ذریعے سے کچھ الفاظ کے مخصوص اِملا کا علم ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں معاملہ مختلف ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں تقلید مصنف کے مختارات ہی کی کرنی چاہیے۔ لیکن جن مصنفین کی خطی تحریریں ناپید ہیں یا جن کے مختارات سے ہم لوگ لاعلم ہیں اُن کے متون مرتّب کرتے وقت اُن کے زمانے کے باقی لکھنے والوں کی روش برقرار رکھی جانی چاہیے۔

میں نے اپنے اِس سوال کو اِن الفاظ میں دوہرایا کہ عام قاری صرف موجودہ رسم الخط سے مانوس ہے۔ اُن مصنفین کا اِملا اُن کے وقتوں کے لیے تھا، ہمارا اِملا ہمارے دور کے لیے ہے۔ بل کہ مدوّنِ متن کو تو الفاظ کے ہجا کے ساتھ ساتھ آج ہمارے رواج میں آنے والی علاماتِ اوقاف و موز بھی استعمال کرنی چاہییں تا کہ پرانے متن آج عمومی فائدہ دے سکیں۔ ہر تحریر، خواہ وہ شاہ ولی اللہ یا غالب ہی کی کیوں نہ ہو، مروّجہ جدید اِملا ہی میں لکھی جانی چاہیے ورنہ یہ ترتیب دادہ متن صرف خواص کے استعمال کی چیز ہوگا، عوام کے لیے اِس میں دلچسپی کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہ تو صرف ایسا ہی ہوگا کہ آپ نے ایک قدیم چیز کو نئے کاغذ پر لکھ دیا۔ اِس بات کو بھی وزن دینا چاہیے کہ اگر یہ مصنفین آج لکھتے تو کون سا اِملا استعمال کرتے؟ اِس بحث نما سوال جواب کے بعد بھی خاں صاحب قدیم متون کو مروّجہ اِملا میں لکھنے کے بارے میں اپنے موقف پر قائم رہے اور اپنے موقف کی حمایت میں مثالیں دیتے رہے۔ البتہ یہ فرمایا کہ کچھ صورتوں میں ایسا کیا جا سکتا ہے کہ ایک فہرست ابتدائیے میں دے دی جائے جس میں اِس کی گئی تبدیلی کا ذکر ہو۔

اِس موضوع کا ایک ضمنی سوال یہ تھا کہ آپ نے غالب کے متن میں چند خاص الفاظ میں اِملائے غالب کی پیروی کرنے کا کہا ہے۔ کیا یہ اُصول اختیار کرنا کہ مصنف کا خصوصی اِملا برقرار رکھا جائے، اِملا و ہجا کا ایک گلدستہ تیار نہیں کر دیتا اور کیا اِس سے اِملا میں شتر گربگی پیدا نہیں ہوتی؛ اور کیا یہ چھوٹ (License) خلفشار کا سبب نہیں بنتی؟ اور

جب اِس چھوٹ دینے کی وجہ سے کسی لفظ کے ایک متوازی اِملا کی گنجایش بنادی جاتی ہے تو یہ فائدہ اُٹھانے سے باقی اُردو لکھنے والے کیوں محروم رہیں، یعنی عیسیٰ بہ دینِ خود، موسیٰ بہ دینِ خود کے مصداق جس طرح چاہیں لکھتے رہیں؟ اور اگر غالب کے اِملا میں کوئی تقدیس ہے تو یہ صرف چند الفاظ تک کیوں محدود رکھی جائے۔ تقلید کی منطقی مانگ تو یہ ہے کہ غالب کے اِملا کی سوفی صد پیروی کی جائے، یعنی متن سے وفاداری کا پورا حق ادا کرنے کے لیے کتابت کی جملہ فرسودگیوں کو بھی من وعن نقل کیا جائے۔ کیا آج کے مصروف ترین دور میں عام آدمی کو تو چھوڑیے، کسی محقق کے پاس بھی اتنا وقت ہے کہ ہر کتاب کو پڑھنے سے پہلے اُس میں استعمال کیے گئے مخصوص اِملا کی روِش کو سیکھے؟ بہر حال، خاں صاحب نے اِس سوال کا، جو زیادہ تر اُن کے اپنے اُسلوبِ تحقیق پر اعتراض ہے، جواب ایک طرح سے محفوظ ہی رکھا۔

ایک سوال یہ تھا کہ آپ کی مجوزہ اصلاحاتِ اِملا وقواعد کو، آپ کے مستقل چھپنے والے Supporting (تائیدی) مضامین کے ہوتے ہوئے بھی وہ پذیرائی نہ خواص میں ملی نہ عوام میں جن کی یہ بجا طور پر مستحق تھیں، اور آپ پر شدید اعتراضات بھی ہوئے جن میں سے کچھ کا علمی پایہ بھی بہت مضبوط ہے۔ یوں یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ مستقبل میں اِن اصلاحات کو کیا مقام ملے گا۔ اِس ناقدری اور عمومی بے توجہی پر آپ کے کیا احساسات ہیں؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ وہ اُردو ادب وتحقیق پر کیے گئے اپنے کام سے بالکل مطمئن ہیں اور اُنھیں اُمید ہے کہ اُن کے بالخصوص کلاسیکی ادب کے متن پر کیے ہوئے کام ایسے نہیں ہیں جن کی زندگی کا دورانیہ مختصر ہو۔

میرا اگلا سوال تھا کہ تحقیقی کام کا اُسلوبِ نگارش کیسا ہونا چاہیے: شگفتہ، سادہ یا عالمانہ؟ اور کیا اُردو میں دانش وری کی روایت کے استوار ہونے میں اُسلوب کو کوئی دخل ہے؟ خاں صاحب نے جواب دیا کہ اِن تینوں اسالیب کا مناسب امتزاج ہونا چاہیے لیکن بنیادی توجہ پیش کی جانے والی معلومات کی درستی پر رہے۔ انشا پردازی یا افسانہ طرازی نہیں ہونی چاہیے یعنی نہ تو مولانا ابوالکلام آزاد والی عبارت آرائی ہو اور نہ جوش والی لفاظی، لیکن بالکل بے رس بھی نہ ہو۔ اُردو میں تنقید وتحقیق کی روایت اِس لیے بھی مضبوط نہیں ہے کہ تحقیق کے نام پر لکھے گئے تذکرے زبان وبیان اور قدرتِ کلام کے مرقعے بن کر رہ گئے ہیں۔

اگلا سوال یہ تھا کہ میں نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے لغاتِ روزمرہ (اِشاعتِ اوّل:2003) میں پہلی مرتبہ ایک ''بدعت'' دیکھی ہے، کہ اِس میں متن میں حوالے کے طور پر صفحات کے جو نمبر دیے گئے ہیں وہ دائیں سے بائیں لکھے گئے ہیں، یعنی مثلاً صفحہ نمبر ۵۰۰ کو ۰۰۵ اور صفحہ نمبر ۱۵۸۰ کو ۰۸۵۱ لکھا گیا ہے، علیٰ ہٰذا۔ جب کہ اِس کتاب کے اپنے صفحات کے نمبر مروّجہ متداول ترتیب (بائیں سے دائیں) میں لکھے گئے ہیں۔ میں نے اب سے پہلے ایسا کیا ہوا کہیں نہیں دیکھا، اِسی لیے اِسے ''بدعت'' کہا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اِس کام کے لیے اُکسایا کس نے دیا۔ کیا آپ حوالے کے صفحات کے نمبر لگانے کی اِس ''غریب'' ترتیب کی، جو اِس کتاب کے ہر پڑھنے والے کو صریحاً کوفت میں مبتلا کر دیتی ہے اور تدوین وتحقیق کے پہلے سے ہی مشکل کام کو ایک اور الجھن اور بے برکتی کی بیخ لگا دیتی ہے، حمایت کرتے ہیں؟ خاں صاحب نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اور ڈاکٹر خلیق انجم کے بارے میں بہت بلند الفاظ کہے لیکن سوال کا جواب بہر حال ٹال دیا۔ (یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ لغاتِ روزمرہ میرے مستقل استعمال میں رہتا ہے۔ میرے خیال میں جو شخص بھی ایک بار اِسے استعمال کرنا شروع کر دے گا، اِسے کبھی نہ چھوڑ سکے گا۔ شان الحق حقی صاحب کے فرہنگِ تلفظ کے بعد یہی لغت ہے جو مجھے سب سے زیادہ کھولنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ زبان کو نکھارنے والے اِس لغت کو مرتب کر کے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے بہت بڑا احسان کیا ہے؛ یہ اُن لغات میں سے ہے جن کی ضرورت دائمی ہے اور عام قاری سے لے کر اساتذۂ ادب تک کسی کو اِس سے اِستغنا نہیں۔)

اُردو لغت بورڈ کراچی کے کلاں اُردو لغت کے بارے میں میرا سوال تھا کہ اِس کی نئی یعنی ۲۰ ویں جلد کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ جواب عطا ہوا کہ جو اسناد فراہم کی گئی ہیں وہ تعداد میں کم ہیں لیکن غنیمت ہے کہ اب یہ اسناد نسبتاً معتبر ہیں۔ صحتِ اِملا پر توجہ دی جانے لگی ہے۔ کمپیوٹر پر کمپوز کاری کی وجہ سے پچھلی جلدوں کے مقابلے میں اِس جلد کی طباعت بھی بہتر ہے۔

میں نے کچھ سوالات مولانا ابوالکلام آزاد پر خاں صاحب کے تنقیدی مقالے مولانا آزاد کا اُسلوب کے بارے میں کیے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ آپ کے نزدیک الہلال اور البلاغ کے ذریعے سے مولانا نے صرف اپنے امام الہند بننے کے مقصد کو پالا پوسا ہے، لیکن اِن جریدوں سے مسلمانوں میں ایک عمومی ادبی بیداری بھی تو پیدا ہوئی۔ اِس Contribution کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ خاں صاحب نے ارشاد فرمایا کہ شعلہ مزاجی اور بے پناہ جذباتیت کا حامل مسلمان معاشرہ کھوکھلی جذباتیت میں اور زیادہ ڈوب گیا۔ مولانا کے مشتعل اندازِ نگارش نے مسلمانوں میں اُس شدید جذباتیت کو فروغ بخشا جو بنیادی طور پر عقل دشمن ہوتی ہے اور مستقبل کو حال کے آئینے میں دیکھنے سے آنکھیں چراتی رہتی ہے۔ اُن کی اِس زمانے کی پُرزور تحریریں پڑھنے والوں کے دلوں کو گرما دیتی تھیں اور روح کو تڑپا دیتی تھیں، لیکن جذباتیت سے بھرے ہوئے بیانات ذہنوں میں پیدا ہونے والے ہر طرح کے سوالات کو گہری نیند سلا دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اگلا سوال یہ تھا کہ غبارِ خاطر ایک زندہ رہنے والی کتاب ہے؛ اِس کے اُسلوب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ جواب ملا کہ غبارِ خاطر میں مخاطبین کو مرعوب کرنے اور علمی خودنمائی کا جذبہ ہے نہ کہ خطوں والی بے تکلفی اور مکتوباتی نثر۔ تاریخ میں ایسے خطوط کبھی نہیں لکھے گئے۔ یہ خطوط نہیں، خطبات ہیں۔ اگلا سوال تھا کہ مولانا کی سوانح، تذکرہ، کی علمی وادبی حیثیت اور اُسلوبِ تحریر کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ یہ کہنے کو ایک سوانحی کتاب ہے مگر سوا تین سو صفحات میں سوانحی مواد کی مقدار شاید دو تین صفحات سے آگے نہیں بڑھتی۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فقہ وتفسیر اور منطق وفلسفے کے غیر متعلق مباحث لائے گئے ہیں جنھیں مشکل ترین زبان میں لکھا گیا ہے۔ تذکرے کے مخاطب علمائے کرام تھے، کہ اُنھی کے ذہنوں پر امام الہند کی افضلیت کا نقش بٹھانا مقصود تھا۔ یہ سوانح عام

لوگوں کے لیے لکھی ہی نہیں گئی۔ مولانا نے جس طرح زندگی بھر اپنے آپ کو عوام سے دور رکھا، اُسی طرح اپنے حالاتِ زندگی کو بھی روشنی میں نہیں آنے دیا۔ اِس میں شک نہیں کہ مولانا ایک صاحبِ طرز نثر نگار تھے اور اُن کے منفرد طرزِ نگارش کی بدولت اُن کے قلم سے نفیس ترین ترکیبیں نکلی ہیں، مگر اِن کی کثرت نے عبارتوں کو بطورِ عموم بوجھل بنا دیا ہے۔ بات معمولی، بیان غیر معمولی۔ بہت سے زیور لاد دینا دولت مندی کی پہچان تو ہوسکتی ہے، مگر خوش ذوقی پر بھی حرف آسکتا ہے۔ سوانح میں مولانا کا طرزِ بیان داستانی ہے، جس نے سوانح نگاری کی زبان اور بیان دونوں کو تباہ کر دیا ہے۔ اگلا سوال ترجمان القرآن کی ادبی حیثیت، اِنشا اور بناوٹ کے بارے میں تھا۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ قرآنی آیات کے ترجمے کی حد تک سادگی موجود ہے لیکن تفسیری مباحث طول کلامی اور مرصع کاری سے محفوظ نہیں رہے۔ یہ خالص مذہبی تحریر ہے اور موضوع ایسا ہے جس میں انشا پردازی کی گنجایش نہیں ہوتی لیکن خطابت کے مولانا کی طبیعت کا جُز ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں ابہام اور اکثر مقامات پر عبارت آرائی در آئی ہے۔ میں نے ضمناً سوال کیا کہ آپ کے نزدیک مولانا کی اِس زمانے کی تحریروں کے نسبتہً سادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اِس زمانے میں مسلم قیادت کے جویا نہیں رہے تھے جس کا راستہ مذہب کے کوچے سے ہو کر نکلتا تھا، بل کہ اِس وقت میں وہ عمومی قیادت کے راستے پر گام زن تھے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے حزب اللہ، امام الہند اور تحریکِ خلافت جیسے سارے مقامات سے دامن جھٹک کر الگ کھڑے ہو جانے کی وجہ سے اب ترجمان القرآن کی تکمیل میں مولانا کو کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی؟ خاں صاحب نے فرمایا کہ آپ کا اندازہ بالکل درست ہے؛ اور مولانا نے باوجود اپنی قد آور علمی شخصیت کے، تاریخ، فلسفے، علم الکلام یا کسی اہم موضوع پر کوئی مستقل تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی۔ اگلا سوال یہ تھا کہ مولانا کی تحریروں نے آیندہ نسل پر کیا اثرات ڈالے؟ جواب ملا کہ خطابت اور تحکّمانہ انداز میں گفتگو؛ ابہام؛ عبارت آرائی؛ بات کو بار بار دوہرانا؛ بے مغز بات پر صفحات کے صفحات بل کہ کتابیں لکھ دینا (خاں صاحب نے کئی لوگوں کی نام بہ نام مثالیں بھی دیں)۔ زبان کو سادگی وصفائی کے لحاظ سے سرسید اور اُن کے رفقا جس سطح پر لے آئے تھے اور اُردو نثر کو جس منطقی طرزِ استدلال، وضاحتِ بیان اور علمی انداز سے روشناس کرایا تھا، وہ کم وبیش پچیس تیس سال کے لیے ایک بھولا ہوا سبق بن گیا؛ مولانا آزاد نے اپنے اُسلوب سے اُردو زبان کو سرسید کے زمانے سے پیچھے پہنچا دیا۔ خاں صاحب کی اِس بات پر میں نے سوال گھڑا کہ اُردو کی تاریخ میں مختصراً ایک شاعر اور ایک نثر نگار کا نام لیا جائے تو اقبال اور مولانا آزاد ہی کا نام لیا جائے گا۔ اُردو میں اگر سرسید کی زبان پر Full-stop لگا لیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ زبان اپنی معراج کو پا چکی ہے- حالاں کہ سرسید جیسے تعلیم کے بے چون نقیب کا مقصود یہ ہرگز نہ تھا- تو جنابِ مختار مسعود اور مشتاق احمد یوسفی صاحب، جن کے نام سے ہمارے عہد کو بجا طور پر موسوم کیا گیا ہے، کی لکھی من بھاونی نثر کو آپ کیا مقام دیں گے؟ خاں صاحب جواب میں طرح دے گئے۔ میں نے اگلا سوال کیا کہ عربی اور فارسی کے بغیر اُردو تو چھوڑیے، ہندی بھی نہیں چل سکتی۔ آزاد نے جو لکھا، اپنی علمیت اور ماحول کے مطابق لکھا۔ اپنے مقالے میں آپ جیسے عالم آدمی کو مولانا کی نثر کے اِس پہلو کو ضرور Endorse کرنا چاہیے تھا، کیوں کہ اُن کی ذات ہماری علمی عظمت اور ثقافت کا ایک نادر مجموعہ تھی۔ خاں صاحب اِس سوال کا جواب بھی ٹال گئے اور فرمایا کہ یہ سوال آپ کے لکھ کر بھیجے ہوئے سوالات میں شامل نہیں ہے۔

[مولانا آزاد کے حوالے سے یہ سوالات پوچھے جانے کا اصل میں ایک پس منظر تھا۔ مقالۂ مذکور پڑھنے کے بعد میں بری طرح ''چونکا'' ہوا تھا، اور اپنے تأثر کو ''گاڑھا'' یا ''پتلا'' کرنے کے لیے پہلی نظر محبی سید ذوالکفل بخاری ہی کی طرف اُٹھی۔ ایسے مواقع پر اُن کے دوٹوک محاکمے، جنھیں میں Rulings کہا کرتا ہوں، ہمیشہ ہی کارِ تریاق (Antidote) کیا کرتے ہیں۔ موصوف نے چھوٹتے ہی کہا: آپ کو معلوم ہے، تاج محل کی تعمیر پر شاہ جہاں کو کس قدر برا بھلا کہا گیا ہے؟ ساحر لدھیانوی کی غزل تو گویا حرفِ آخر ہے۔ لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ایک بزرگ کے قولِ فیصل نے اِن سب غباروں سے کیوں کر ہوا نکال دی تھی۔ ایک یادگار جملہ، کہ: ''شاہ جہاں، تاج محل نہ بنواتا تو کیا بڈھوکا آوا بنواتا؟'' سو آپ ہی بتلایئے کہ ابوالکلامؒ غبارِ خاطر اور ترجمان القرآن نہ لکھتے تو کیا زٹل نامہ تصنیف فرماتے؟ ''پیرومرشد'' سے یہ خوراک (Dose) لینے کے بعد، ضروری ہو گیا تھا کہ خاں صاحب سے بارِ دِگر کچھ سنوں، سو یہ سوالات کیے گئے۔]

چند ذیلی سوالات پر مشتمل ایک سوال کلامِ اقبال کی تدوین سے متعلق تھا۔ اِس ''بیش رسیدہ'' موضوع پر میں اُن سے خط کتابت کے ذریعے سے بھی اور فون پر بھی پہلے کئی بار باتیں کر چکا تھا۔ اِس موقع پر میں نے دریافت کیا کہ آپ کے زیرِ بحث مقالے میں کلامِ اقبال کی تدوین کے اتنے باریک اور پہلو دار عنوانات گنائے گئے ہیں کہ جن کی محض خاکہ سازی بھی مدتِ مدید کا کام لگتی ہے۔ اگرچہ اقبال کا کلام مقدار میں بھی کم نہیں ہے لیکن آپ کی ہدایات کی روشنی میں دِکھتا یہی ہے کہ اِس صورت میں اصل زر سے بیاج بہت بڑھ جائے گا۔ اور جب اِن آداب کے ساتھ کام شروع کیا جائے گا تو مدوّنینِ متن کی ایک مستقل جماعت شاید عمرِ ابد میں ہی اِسے انجام دے پائے گی۔ کیا آپ کے خیال میں یہ کام آپ کی خواہش کردہ ترتیب پر کبھی شروع ہو پائے گا؟ میں ایک سرکاری محکمے میں انتظامیہ کا حصہ ہونے کی وجہ سے اِس حقیقت کو جانتا ہوں کہ اتنی زیادہ باریکیاں صرف اُسی کام کے لیے مخصوص کی جاتی ہیں جسے بالکل نہ کرنے ارادہ ہو۔ جواب میں خاں صاحب نے کلامِ اقبال کی تدوین کے سلسلے میں اپنے مجوزہ طریقِ کار کی قدرے تفصیل سے وضاحت کی (یہ باتیں مذکورہ مقالے میں موجود ہیں اِس لیے اِن کا یہاں ذکر طوالت کا سبب ہوگا) اور فرمایا کہ وہ اقبال کے کلام کے شایانِ شان اِسے مرتب کیا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اِس مقالے کو لکھے تیرہ چودہ سال ہو چکے ہیں۔ تدوین میں جس گہرائی، نزاکتوں اور لطافت کی آپ بات کرتے ہیں اور کلامِ اقبال کی تدوین کی جو سطح آپ چاہتے ہیں، چاہیے تو یہ تھا کہ اِس لمبے عرصے میں آپ اپنی صلاحیتوں کو اپنے پہلے سے مدوّن کیے ہوئے متون کی از سرِ نو تدوین کرنے میں کھپانے کے بجائے خود ہی اِس کام کو کر لیتے۔ کلاسیکی ادب کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن میری ادنیٰ رائے میں مثنویوں اور افسانوں کی کلاسیکی حیثیت کلامِ اقبال جیسے کلاسیک کے مقابلے میں بہر حال ثانوی ہے:

We'd do first things first! خاں صاحب نے جواب دیا کہ سچ کہتا ہوں کہ اِس میں میرا قصور کم سے کم ہے۔ سارا کیا دھرا میری خرابیِ صحت کا ہے۔ دوسرے حملۂ قلب کے بعد سے یہ احوال ہوگیا ہے کہ اچانک قلب کی رفتار بگڑ جایا کرتی ہے۔ ڈاکٹر نے سختی کے ساتھ گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگادی ہے۔ مدّ و جزر کا سا عالم رہتا ہے؛ آج ٹھیک، کل خراب۔ بعض دفعہ یہ وقفۂ خرابی بڑھ جایا کرتا ہے۔ میں بہت مصروف ہونے اور بیمار ہونے کی وجہ سے اپنے اندر کوئی نیا کام کرنے کا حوصلہ نہیں پاتا۔

میں نے مشفق خواجہ صاحب پر لکھے اپنے مُحوّلۂ بالا مضمون میں اِس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ مجھ سے کن الفاظ میں مرحوم خواجہ صاحب اور جنابِ مختار مسعود نے رشید حسن خاں صاحب کے مرتب کردہ زٹل نامہ کے بارے میں اپنے اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا؛ اور خاں صاحب کے خواجہ صاحب جیسے مدّاح بھی اُن کے اپنی صلاحیتوں کے اِس نازل درجے کے کام میں صَرف کرنے پر کبیدہ ہوئے تھے۔ اِس تناظر میں خاں صاحب سے میرا آخری سوال یہ تھا کہ آپ نے جعفر زٹلی کے کلام کی تدوین آخر کیا سوچ کر کی؟ جواب میں وہ طرح دے گئے۔ میں نے پیچھا نہ چھوڑا اور سوال کو اُلٹا کر پھر پوچھا کہ کیا اِس متن کی تدوین سے آپ اُردو کی ''کلاسیکی چرکینیت'' کو محفوظ کرنا چاہتے تھے؟ فرمایا کہ یوں ہی سمجھ لیجیے۔

❖ ❖ ❖

یہ مقالہ محترمہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش کی تشویق سے لکھا گیا؛ اِس کی اُسترکاری میں مدد دینے پر میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب، ڈاکٹر سید خورشید رضوی صاحب اور محبی سید محمد ذوالکفل بخاری کا انتہائی شکر گزار ہوں۔

مآخذ

الف: کتب

- اُردو اِملا، رشید حسن خاں، ترقیِ اُردو بورڈ، بھارت، ۱۹۷۴ء
- اُردو کیسے لکھیں، رشید حسن خاں، انجمنِ ترقیِ اُردو، دہلی، ۱۹۹۵ء
- اُردو زبان کا لسانیاتی تجزیہ، شمشاد زیدی، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، میسور، بھارت
- اِملا اور موزِ اوقاف کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد
- اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتبہ اعجاز راہی، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد
- تنقید کی آزادی، مجموعۂ مضامین، مظفر علی سید، دستاویز پبلیکیشنز، لاہور
- منتخباتِ اخبارِ اُردو، مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد
- منتخباتِ اُردو نامہ، مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد
- کتابیاتِ اُردو اِملا اور دوسرے مسائل، مرتبہ ابو سلمان شاہجہان پوری، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد
- تحسینیات، مجموعۂ مضامین، عابد صدیق، مغربی پاکستان اُردو اکادمی، لاہور
- تحقیق اور اصولِ وضعِ اصطلاحات پر منتخب مقالات، مرتبہ اعجاز راہی، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد
- تحقیق کا فن، ڈاکٹر گیان چند، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد
- اقبالیات: تفہیم و تجزیہ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، اقبال اکادمی، ایوانِ اقبال، لاہور
- اطراف، مجموعۂ مضامین، ڈاکٹر خورشید رضوی، مغربی پاکستان اُردو اکادمی، لاہور
- صحتِ الفاظ، سید بدر الحسن، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی، بھارت
- کشف الالفاظِ اقبال، ڈاکٹر حافظ ساجد اللہ تفہیمی، خانۂ فرہنگ ایران، کراچی

ب: ادبی و تحقیقی مجلات

- سہ ماہی اقبالیات، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور؛ جلد ۴۴، شمارہ اوّل (علامہ اقبال: مولانا مدنی، مولانا آزاد اور پنڈت نہرو از پروفیسر فتح محمد ملک)
- ماہنامہ اخبارِ اُردو، مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد، مختلف شمارے
- ماہی الزبیر، بہاول پور، مختلف شمارے

ج: انگریزی کتب اور مآخذ

1. The Cambridge Encyclopedia of the English Language, by David Crystal, The Cambridge University Press, 1995.
2. Indo-Iranian Phonology with Special Reference to Middle & New Indo-Iranian Languages, by Louis H Gray, The Columbia University Press, 1902.
3. The Language Policy of India: Problems of its Implementation & their solution, by Mukhtar Zaman, National Language Authority, Islamabad, 1984.

د: متفرقات

- 17ستمبر،2005 کورشید حسن خاں صاحب سے شاہ جہان پور (بھارت) سے ٹیلی فون پر کیے گئے ایک مکالمے کے دوران میں لکھے گئے شذرات
- رشید حسن خاں صاحب کے راقم کے نام چند خطوط

ہ: کتب خانے

- مشفق خواجہ لائبریری، کراچی (ناصر جاوید صاحب)
- بیدل لائبریری، کراچی
- مقتدرۂ قومی زبان اسلام آباد

(مخزن، لاہور، پاکستان، شمارہ مسلسل 11، 2006ء جلد 6، شمارہ 1، صفحہ 35 تا 54)

۱۔ کلیات اقبال کی تدوین پروفیسر محمد منور کے زمانے میں ہوئی تھی۔ رشید حسن خاں کے سامنے کوئی بعد کا ایڈیشن ہوگا۔ ہر ایڈیشن میں دیباچے اضافہ ہوتے رہے لیکن متن وہی رہا اور کتابت کے پازیٹو بھی وہی استعمال ہوئے۔ (مدیر)

۲۔ اس زمانے میں بعض سوالات کا تحریری جواب انھوں نے رفیع الدین ہاشمی کو دیا جو بازیافت شعبہ اُردو اورنٹیل کالج لاہور میں شائع ہوا۔ (مدیر)

۳۔ مولوی عبدالحق نے متون پر کام کیا لیکن ناقص تاہم وہ نقاد ضرور تھے۔ خدا جانے مرحوم نے یہ جملہ کس عالم میں کہا؟ (مدیر)

نوٹ: یہ مضمون ڈاکٹر ذکیہ مراد، لاہور، نے میرے استفسار پر بہ ذریعے ای میل یکم/اپریل، 2017 کو ارسال کیا۔ (مرتب)

❍❍❍

رشید حسن خاں

''باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیے گا''

مخمور سعیدی

مصدر علم و فضل ذات تری
تجھ سے مشتق ہیں سب صفات تری
درسِ فن تجھ سے گفتگو کرنا
ادب آموز بات بات تری
ہیں طلوعِ شعور دن تیرے
آگہی کا فروغ رات تری
مفتخر وہ ہر ایک شعبۂ علم
ہو جدھر چشم التفات تری
سب سے ممتاز ہمسروں میں تو
مختلف سب سے کائنات تری

رشید حسن خاں اُردو زبان وادب کے ایک معتبر محقق، باذوق نقاد اور سلیقہ مند مدوّن تھے، یہ ان سے منسوب ایسی صفات ہیں جنھیں ان کے مخالفین بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ علمی امور میں اختلاف معیوب نہیں بل کہ اس سے دید و دریافت کی نئی راہیں کھلتی ہیں جو ایک امرِ مستحسن ہے لیکن خاں صاحب سے اختلاف کی جسارت کم لوگوں کو ہوئی، بعض حلقوں کی طرف سے ان کی اور ان کے کاموں کی مخالفت زیادہ کی گئی۔

اختلاف اور مخالفت میں جو فرق ہے، بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ رشید حسن خاں سے زیادہ اختلافات اس لیے نہ کیے جا سکے کہ ان کے نتائجِ تحقیق اور ان کی تنقیدی رائیں ایسی صحیح سمتوں کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں جنھیں رد کر دینا آسان نہیں اور انھوں نے تدوین کے بھی جو نمونے پیش کیے، مثالی کہے جا سکتے ہیں لیکن ان کی مخالفت بہت ہوئی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

دراصل رشید حسن خاں علم وفضل کی دشوار گزار منزلوں کو سر کرتے ہوئے جس طرح قدم بہ قدم آگے بڑھے اس کا حوصلہ ان کے بہت سے معاصرین نے علمی فتوحات سے زیادہ مادّی فتوحات پر نظر رکھی اور اس میدان میں وہ خاں صاحب سے بہت آگے نکل گئے۔ خاں صاحب ان کی اس پیش قدمی سے ذرا کبیدہ خاطر نہ ہوئے کہ ان کا مقصودِ سفر ہی کچھ اور تھا۔ ان کی پیش قدمی کا ایک مختلف سمت میں رہا اور یہاں وہ ان لوگوں کو، جو خدمتِ علم وادب کی آڑ میں ذاتی اُمنگوں کی تکمیل کے درپے تھے، پیچھے چھوڑ گئے۔

کہا گیا کہ رشید حسن خاں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ نک چڑھے اور گھمنڈی ہیں اور اپنے اس گھمنڈ میں دوسروں کی دل آزاری تک کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ ان کی خود بینی اور خود پسندی نے انھیں مردم بیزار بنا دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور دوسری تمام باتیں جو خاں صاحب کے بارے میں بعض لوگ کہتے رہے ہیں، ان کا تعلق خاں صاحب کی علمی شخصیت سے نہیں، نجی شخصیت سے ہے، اس لیے اگر انھیں درست بھی مان لیا جائے تو خاں صاحب کی عادات واخلاق کے بارے میں کچھ منفی خیالات بعض لوگوں کے ذہن میں جگہ بنا سکتے ہیں لیکن ان کے علمی اکتسابات اور کمالات پر ایسی باتیں کیا اثر ڈال سکتی ہیں! ویسے واقعہ یہ ہے کہ یہ ساری کی ساری باتیں، ان بے بنیاد افواہوں کی طرح ہیں جو بدنیتی سے دیدہ و دانستہ پھیلائی جاتی ہیں اور یہ صرف انھیں لوگوں کو مغالطے میں ڈال سکتی تھیں، جو خاں صاحب کو ذاتی طور پر نہیں صرف ان کی تحریروں کے حوالے سے انھیں پہچانتے تھے۔ اپنی تحریروں میں بلاشبہ وہ آدابِ مروت ومحبت کے قائل نظر نہیں آتے کہ اپنے قلم سے انھوں نے حقیقتوں کی تلاش اور صداقتوں کی ترجمانی کا کام لیا ہے اور اپنی علمی زندگی

کے آغاز ہی سے ان کا یہ شعار رہا۔

رشید حسن خاں سے میرا غائبانہ تعارف لگ بھگ چالیس سال پہلے ہوا۔ ان دنوں میں گوپال متل صاحب کے رسالے ''تحریک'' میں کام کرتا تھا۔ رسالے کی ڈاک میں ہی دیکھتا تھا۔ ایک دن شاہ جہاں پور سے ایک بھاری بھرکم لفافہ موصول ہوا۔ کھولا تو اس میں ایک مختصر سا خط اور ایک مفصل مضمون تھا فیضؔ کی شاعری پر۔ خط میں لکھا تھا کہ فیضؔ ہمارے دور کے بہت مقبول شاعر ہیں لیکن اس مقبولیت کا ایک منفی پہلو بھی ہے کہ ان کی شاعری میں زبان و بیان کے جو نقائص پائے جاتے ہیں وہ لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں، اس سے فیضؔ کے بعد آنے والے شاعر اس غلط فہمی میں پڑ سکتے ہیں کہ ان نقائص کا شاعری کی اچھائی یا بُرائی سے قریب و دور کا کوئی واسطہ نہیں۔ مضمون میں فیضؔ کے اس وقت تک کے شائع شدہ مجموعوں کو سامنے رکھ کر نہ صرف زبان و بیان کی بہت سی خرابیوں کی بل کہ فکر و احساس کی بے راہ رویوں کی بھی نشان دہی کی گئی تھی۔ مضمون ''تحریک'' میں شائع ہوا تو اس کی بازگشت دور دور تک سنائی دی۔ فیضؔ کے ساتھ غیر مشروط عقیدت رکھنے والوں نے اس کا برا مانا لیکن شاعری کے ان قدر شناسوں نے جو فیضؔ کی ذات یا ان کے شعری نظریات سے اس طرح کی کوئی جذباتی یا ذہنی وابستگی نہیں رکھتے تھے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس مضمون کی اثر آفرینی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد جن لوگوں نے فیضؔ کی شاعری پر قلم اُٹھایا، ان میں سے اکثر نے اس کا حوالہ ضرور دیا۔

غزل گو شاعروں کی حیثیت سے ہمارے دور میں جو لوگ معتبر سمجھے گئے، ان میں ایک نام مجروح سلطان پوری کا ہے۔ ان کا یہ اعتبار و امتیاز آج بھی برقرار ہے لیکن ترقی پسندوں کی بھیمڑی کانفرنس کے بعد انھوں نے نظریاتی شدّت پسندی کے زیر اثر بعض ایسی غزلیں بھی کہیں جو ہنگامی سیاست کے تقاضوں کی تابع مہمل تھیں۔ یہ اندازِ سخن غزل کی اس روایت کی نفی تھا جس کی توسیع ہمیں خود مجروحؔ صاحب کی اچھی غزلوں میں نظر آتی ہے اور جس کا زور ہمیشہ اس پر رہا ہے کہ ماورائے سخن بھی ہے اک بات۔ خاں صاحب کا دوسرا مضمون جو ''تحریک'' نے شائع کیا، مجروح کی غزل گوئی پر تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ترقی پسندی کے بے جا جوش میں ایک اچھے غزل گو شاعر کے برباد ہو جانے کے کیسے قوی امکانات ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مجروحؔ صاحب نے جلد ہی اس روش کو خیر باد کہہ دیا اور صراطِ مستقیم کی طرف لوٹ آئے۔

رشید حسن خاں کا ایک اور ہنگامہ خیز مضمون جو ''تحریک'' میں شائع ہوا ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' پر تھا جو لاکھوں روپئے کے مصارف سے مشہور و معتبر لوگوں کی نگرانی میں تیار کرائی گئی تھی لیکن جو غلط بیانیوں کا پشتارہ تھی۔ خاں صاحب نے کتاب کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے مرتبین کے تسامحات کی بھی نشان دہی کی تھی اور ایسے بیانات کی بھی جو حقائق کے بجائے مرتبین کے ذہنی تحفظات بل کہ تعصّبات کو سامنے لاتے تھے۔ تسامحات کا امکان تو ہر ایک کے ساتھ ہے لیکن اپنے مفروضات کو تاریخی حقیقتیں بنا کر پیش کرنے کی کوشش ایک مجرمانہ فعل تھا جس کی خاں صاحب نے بہت سخت گرفت کی۔ ایسی غیر ذمے دارانہ کتاب کی اشاعت کسی نجی ادارے کی طرف سے نجی قابلِ گرفت سمجھی جاتی لیکن یہ کتاب تو ایک قومی ادارے نے قومی حکومت کی فراہم کردہ مالی مدد سے تیار اور طبع کرائی تھی اس لیے جب اس کی گمراہ کُن نوعیت سامنے آئی تو بڑا ہنگامہ ہوا اور بالآخر یہ کتاب واپس لے لی گئی۔

خاں صاحب نے اُردو املا کے مسئلے پر بھی توجہ صرف کی اور اس کی معیار بندی پر متواتر زور دیتے رہے، ان کی کتابیں ''اُردو املا'' جو بڑوں کے لیے ہے اور ''اُردو کیسے لکھیں'' جو بچوں کے لیے ہے، اس سلسلے کی کوششیں ہیں۔ خاں صاحب سے پہلے مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جیسے بزرگ بھی اس مسئلے پر دماغ سوزی کر چکے تھے لیکن یہ خاصا پیچیدہ مسئلہ ہے یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں لیکن اس معاملے پر اپنی معروضات میں نے ''اُردو املا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے پیش کی تھیں۔ یہ تبصرہ ''تحریک'' میں شائع ہوا تھا۔

رشید حسن خاں کا ایک بڑا اہم کام کلاسیکی متون کی تصحیح و تدوین اور ان کی پیش کش ہے۔ یہ کام تحقیقی ذوق کے علاوہ تنقیدی شعور کا بھی تقاضا کرتا ہے اور قدرت نے یہ دونوں صفات خاں صاحب کو ودیعت کی تھیں۔ اس سلسلے کی کئی کتابیں مکتبہ جامعہ نے شائع کی ہیں جو اکثر اہلِ ذوق کی نظر سے گزری ہوں گی، ان میں ایک کتاب ''انتخابِ کلامِ ناسخ'' ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ناسخ کے کلام کا اس سے بہتر انتخاب میرے محدود مطالعے میں ابھی تک نہیں آیا، اس کا مقدمہ خاں صاحب کی ادبی سوجھ بوجھ ہی کو نہیں، تاریخی عوامل اور امورِ سیاست سے بھی ان کی باخبری کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ لکھنؤ میں تہذیبی و ادبی سطح پر دہلی سے جو انحرافات روبہ عمل آئے، دراصل ان کی نوعیت سیاسی تھی۔ اودھ میں تاریخ نے ایک نئی بساطِ سیاست بچھا دی تھی۔ اس بساط پر جو کھیل کھیلا جا رہا تھا، اس کی کامیابی کی شرط تھی دہلی سے ہر معاملے میں انقطاع و انحراف کا نقطۂ عروض کہا جا سکتا ہے اور اس وقت کے لکھنوی معاشرے میں ان کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب بھی یہیں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

تدوین کے سلسلے میں خاں صاحب نے کئی ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے میر امن کی ''باغ و بہار'' اور رجب علی بیگ سرور کے ''فسانۂ عجائب'' کے ان کے مرتب کردہ نسخے اس کی روشن مثالیں ہیں جن پر ان کے طویل مقدمات میں ان اہم کلاسیکی متون سے متعلق تمام مباحث سمٹ آئے ہیں اور بہت سے نکات روشن ہوئے ہیں۔ ان کے مستند متنوں کی تعیین اور ان کی فرہنگوں کی تیاری میں خاں صاحب نے جو محنت اور دیدہ ریزی کی ہوگی، اس کا اندازہ کچھ ہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اس طرح کے مشکل کاموں کو بھی ہاتھ لگایا ہو۔ ان کے علاوہ مثنوی ''سحر البیان''، مثنوی ''گلزارِ نسیم''، ''مثنویاتِ شوق لکھنوی''، ''غرائب اللغات'' اور ''زٹل نامہ'' (کلیات جعفر زٹلی) کی تدوین بھی انھوں نے بڑی محنت اور لگن سے کی ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے، خاں صاحب سے میرا غائبانہ تعارف، ان کے قیام شاہ جہاں پور کے زمانے میں ہوا تھا جوان کا آبائی شہر ہے اور ان سے پہلی ملاقات ''تحریک'' کے دفتر میں ہوئی۔

''تحریک'' کا عملہ تین افراد پر مشتمل تھا۔ رسالے کے مالک و مدیر گوپال متّل، ان کے بڑے بیٹے پریم گوپال اور یہ خاکسار۔ ایک دن سہ پہر کے وقت میں اور پریم گوپال۔ دفتر کے فرش پر بیٹھے مکتبۂ تحریک کی مطبوعات کے بنڈل باندھ رہے تھے، اچانک ایک صاحب جو کرتے پاجامے اور شیروانی میں ملبوس تھے اور سر پر ٹوپی بھی تھی، تبسم زیرِ لب کے ساتھ وارد ہوئے اور کہا ''میں رشید حسن خاں ہوں'' میں نے اور پریم گوپال نے اُٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا اور اپنا اپنا نام بتایا۔ خاں صاحب نے تپاک سے ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور ساتھ ہی متّل صاحب کے بارے میں پوچھا۔ دیر تک بیٹھے رہے اور بتایا کہ اب وہ مستقلاً دہلی آ گئے ہیں۔ خاں صاحب سے مل کر خوشی ہوئی مگر وہ تصویر چکنا چور ہو گئی جو ان کی تحریروں نے ذہن پر نقش کی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ کوئی ساٹھ ستّر سالہ بزرگ ہوں گے۔ خاں صاحب کی عمر اس وقت چالیس سال کے آس پاس رہی ہوگی۔

خاں صاحب پر مردم بیزاری کا الزام تو سراسر بیجا ہے لیکن وہ دیر آشنا اور کم آمیز ہے ضرور تھے۔ دہلی میں ان کے جن لوگوں سے مراسم قائم ہوئے ان میں میرے اُستادِ محترم بسمل سعیدی، گوپال متّل، غلام ربانی تاباں، شہباز حسین، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور بیگم ممتاز مرزا اور نوجوانوں میں ڈاکٹر اطہر فاروقی کو شاید ان سے زیادہ قربت رہی۔ اس فہرست کے آخر میں اس خاکسار کا نام بھی رکھا جا سکتا ہے۔

میرا دوسرا مجموعۂ کلام ''سہ بر سفید'' شائع ہوا تو رشید حسن خاں دلّی آ چکے تھے۔ برادرم ڈاکٹر اسلم پرویز نے اپنے گھر پر اس کتاب کے اجرا کی تقریب رکھی۔ اس تقریب میں خاں صاحب نے میری شاعری پر ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا ''ذہن کا سفر''۔ مضمون میں انھوں نے چھوٹے شہر سے نکل کر بڑے شہر میں آ بسنے والے تنہا فرد کے جذبات و احساسات کی نشان دہی میرے کلام میں کی تھی اور اس پر زور دیا تھا کہ دراصل یہ محض نقل مکانی نہیں، یہ گزرے ہوئے کل کو خیر باد کہہ کر آنے والے کل کی طرف پیش قدمی کا مرحلہ ہے جس سے بہ سلامت گزر سکنا زیادہ آسان نہیں ہوا کرتا کہ اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں۔ خاں صاحب کا خیال تھا کہ میں ان مقامات سے سلامت روی کے ساتھ گزرا ہوں۔ یہ مضمون نہ صرف یہ کہ اس محفل میں بہت پسند کیا گیا بل کہ جب ایک رسالے میں چھپا تو وہاں سے کئی جگہ نقل ہوا اور اس کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے ''مخمور سعیدی۔ ایک مطالعہ'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تو اس میں بھی انھوں نے اس مضمون کو شامل کیا لیکن مجھے افسوس ہے کہ خود خاں صاحب کے کسی مجموعۂ مضامین میں جگہ نہ پا سکا۔ انھوں نے غلام ربانی تاباں کی شاعری پر بھی ایک مضمون لکھا تھا، وہ بھی ان کے کسی مجموعۂ مضامین میں شامل نہیں ہے۔

دلّی کی زندگی بڑی جاں کاہ مصروفیتوں کی زندگی ہے۔ دوستوں سے بل کہ خود اپنے سے بھی ملاقات کے مواقع کم کم ہی میسر آتے ہیں، مکانی فاصلے بھی بہت زیادہ ہیں۔ مہینوں گزر جاتے خاں صاحب سے ملنا نہ ہوتا لیکن اس سے تعلق کی وہ گرم جوشی ذرا متاثر نہ ہوتی جو ایک دوسرے کے لیے ہمارے اندر موجود تھی۔ جب بھی ملنا ہوتا خاں صاحب تپاک سے ملتے اور کبھی کبھی اپنے لطف آمیز خطوں سے نصف ملاقات کی مسرّت بھی وہ بخشتے رہتے، خاص طور پر اگر میری کوئی شائع شدہ یا نشر شدہ نظم و غزل انھیں پسند آ جاتی تو وہ ضرور خط لکھ کر اس کی داد دیتے اور اس داد میں اپنی پسندیدگی کی وجوہ پر اس طرح روشنی ڈالتے کہ سامنے ہوں تو ان کے ہاتھ چوم لیے جائیں۔

چند برس پہلے تک دلّی میں ایسی کئی ذی علم شخصیتیں موجود تھیں کہ کسی علمی ادبی مسئلے میں الجھن پیش آنے پر ان سے رجوع کیا جا سکتا تھا۔ اب ایسے لوگ کم ہی رہ گئے ہیں، ایسے موقعوں پر مجھ حقیر فقیر کا دھیان سب سے پہلے رشید حسن خاں کی طرف ہی جاتا۔ دلّی آنے کے کچھ ہی مدت بعد کسی وجہ سے خاں صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ واپس شاہ جہاں پور چلے جائیں ان کے اس فیصلے کی اطلاع جب ان کے کچھ قریبی دوستوں کو ملی، جن کے نام اوپر آ چکے ہیں تو انھوں نے خاں صاحب کے لیے ایک الوداعی محفل کا اہتمام کیا۔ اس محفل میں میں نے ایک مختصر نظم پڑھی تھی جس میں خاں صاحب کے ساتھ اپنے تعلق قلبی کے ظہار کے علاوہ ان کے اس حسنِ سلوک اور اس فراخ دلانہ تعاون کا بھی ذکر تھا جو تشنگانِ علم کو ان سے ملتا رہا تھا۔ بعد میں خاں صاحب نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور ملازمت سے سبک دوشی تک دلّی ہی میں رہے۔

خاں صاحب کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا شعر کے فنی محاسن یا معائب کی بحث ہو، کوئی عروضی مسئلہ ہو، زبان و بیان کی خوبیاں یا خامیوں کا معاملہ ہو، صحت یا عدم صحت متن کا سوال ہو، لغات، محاوروں، کہاوتوں اور روز مرہ کی بات ہو؛ خاں صاحب ہر سوال کا جواب اتنی وضاحت و صراحت کے ساتھ دیتے کہ محسوس ہوتا سامنے کوئی دبستان کھل گیا ہے۔ اتنا بھر پور علم اوّل تو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے اور جنھیں نصیب ہو جاتا ہے وہ اس کے صرف میں اکثر بخل سے کام لیتے ہیں۔

ایک اور معاملے میں میں نے اکثر لوگوں کو، بالخصوص ان لوگوں کو جن کی کارکردگی کسی خاص شعبے میں تسلیم کی جا چکی ہو، بخیل پایا ہے، وہ ہے دوسروں کے اچھے کاموں کا اعتراف۔ خاں صاحب اس معاملے میں فراخ دل تھے۔ غالبؔ صدی تقریبات کے موقع پر دہلی کے دو رسائل ''اُردوے معلّٰی'' اور ''تحریک'' نے اپنی خصوصی اشاعتوں میں غالبؔ کی فارسی کتاب ''دستنبو'' کے اُردو تراجم شائع کیے۔ ''اُردوے معلّٰی'' میں جو ترجمہ شائع ہوا وہ خاں صاحب کے نام سے نہیں تھا لیکن کیا ہوا انھیں کا تھا۔ ''تحریک'' میں جو ترجمہ چھپا وہ میں نے کیا تھا۔ دونوں رسالے ساتھ ساتھ منظر عام پر آئے۔ خاں صاحب نے میرا ترجمہ پڑھا تو اس کی داد ان لفظوں میں دی کہ ''آپ نے صرف کتاب کے مفہوم کو نہیں غالب کے اسلوب کو بھی اُردو میں منتقل کر لیا ہے۔''

میں اسے دہلی اور اہلِ دہلی کی خوش نصیبی پر محمول کرتا ہوں کہ خاں صاحب ایک مدتِ مدید تک دہلی میں رہے۔ چند برس پہلے دہلی یونی ورسٹی کی ملازمت سے سبک دوشی

کے بعد اپنے وطن شاہ جہاں پور واپس چلے گئے تھے۔ کسی شہر میں ان جیسے لوگوں کی موجودگی اس شہر کے علمی اور ادبی منظر نامے کو وقار اور اعتبار بخشتی ہے اور وہاں کی تہذیبی زندگی کو تابانی اور درشانی عطا کرتی ہے۔ خاں صاحب جن تہذیبی قدروں کے امین تھے موجودہ دور میں ان کی پامالی کا منظر عام ہے لیکن خاں صاحب سے مل کر یہ منظر جیسے دھندلانے لگتا اور حالؔی کا یہ مصرع مجسم ہو کر سامنے آ کھڑا ہوتا۔

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

خاں صاحب نے عمرِ طبعی پائی۔ ان کے انتقال کی خبر ملنے سے تین چار روز پہلے، ان سے فون پر بات ہو رہی تھی، کہنے لگے: بھائی اب میں اسّی کے لپیٹے میں ہوں، کئی عوارض نے آ گھیرا ہے مگر بہت سے کام ہیں جو ابھی تشنۂ تکمیل ہیں۔ میں نے کہا: خاں صاحب! ابھی آپ بہت جئیں گے اور مزید کام کریں گے۔ اس وقت وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد سفر آخرت پر روانہ ہونے والے ہیں۔ خاں صاحب کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے، اسے پُر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ انھوں نے پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں صرف کی، اس خدمت کا پورا اعتراف بھی ہوا اور اُمید ہی کیا یقین ہے کہ آیندہ بھی ان کے کاموں کی قدر و قیمت محسوس کی جاتی رہے گی۔

(ماہ نامہ اُردو دُنیا، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی، صفحہ 17-15، اپریل 2006)

OOO

رشید حسن خاں: رفیق اور دوست

قمر رئیس

ہمارے عہد کے سب سے معتبر محقق رشید حسن خاں بھی صت ہو گئے۔ 25 فروری 2006 کی رات میں 2:30 بجے ان پر قلب کا تیسرا حملہ ہوا۔ وہ گھبرا کر اُٹھے، قے ہوئی۔ پاس کی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ گھر کے لوگ اُٹھ کر آ گئے اور چند منٹ میں روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ آخری وصیت، طبی مشورے اور معالجے کی مہلت بھی نہ ملی (1)۔ حسبِ عادت دن میں وہ کام کرتے رہے۔ کچھ ملنے والوں سے دیر تک باتیں بھی کیں۔ برسوں سے وہ ایک بڑے پروجیکٹ ''لفظیات غالب'' پر کام کر رہے تھے۔ کوئی لفظ غالب کے یہاں کب، کہاں، کس سیاق میں، کن معنوں میں استعمال ہوا ہے تقریباً ایسے ایک ہزار نو سو الفاظ انھوں نے جمع کر لیے تھے۔ بہت فخر سے اپنے اس آخری کارنامے کا ذکر کرتے تھے۔ مگر، وہ جو شاعر نے کہا ہے۔

زندگی اک شمع ہے جلتے ہوئے بجھ جائے گی

اُردو املا، زبان و قواعد، تلاش و تعبیر اور کلاسیکی ادب کے سرمائے کی بے شمار وقیع کتابوں، جیسے فسانۂ عجائب، انتخابِ ناسخ کے متن کو مثالی صحت اور حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کرنے والے اس نامور محقق نے ہند و پاک کی دانش گاہوں کے اساتذہ و طلبہ اور علما کے لیے تحقیق، متنی تنقید اور علمی تلاش و تعبیر کے جو معیار مقرر و متعین کیے ہیں شاید

اس میدان میں معاصرین میں کوئی ان کا مقابل اور ہم سر نہیں تھا، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو ہمیشہ انھوں نے اپنے گرو کا درجہ دیا ان سے سیکھنے کا اعتراف کیا ہے۔رشید صاحب مرحوم کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی قدر شناسی کا کام تو برسوں جاری رہے گا۔اس معاملے میں مجھے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہے اور مجھے اُمید نہیں کہ ان کے سرمایۂ تحقیق کا محاکمہ کرنے والا کوئی دیدہ ور عالم ّسانی سے دستیاب ہو سکے گا۔اس لیے کہ بقول شاعر ؎

شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

اس لیے میں چاہوں گا کہ اس وقت ان کی شخصیت کا ایک ایسا سرسری سا خاکہ پیش کر سکوں جو دکھا سکے کہ ان کے ذوقِ علم کا سفر کن دشوار مرحلوں سے گزرا۔ان کے جن بیش تر اور معاصر علمانے تحقیق کے میدان میں ان کی رہبری کی ان میں مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود، عبدالستار صدیقی، مولانا امتیاز علی عرشی اور محی الدین قادری زور کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔لیکن یہ وہ اکابر شخصیتیں ہیں جو اشرافیہ اور اعلا علم دوست خانوادوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ان کی تعلیم اعلا تعلیمی اداروں اور بعض کی یورپ کی دانش گاہوں میں ہوئی تھی۔علمی تحقیق کا کام یکسوئی اور لگن سے کرنے کے لیے انھیں بے شمار سہولتیں اور آسائشیں مہیا تھیں،لیکن رشید صاحب مرحوم کی ذات علمی کام کی سہولتیں تو بڑی بات ہے زندگی کی ادنیٰ سہولتوں سے بھی محروم تھی۔

رشید صاحب میرے ہم وطن تھے۔اور نوعمری میں یعنی 1949 میں جب میں نے گاندھی فیض عام کالج میں انٹر میں داخلہ لیا تبھی ان سے میرا تعارف ہوا۔عمر میں وہ مجھ سے کم از کم سات آٹھ سال بڑے تھے(ان کے ریکارڈ میں درج تاریخ ولادت 10 رجنوری، 1930 صحیح نہیں)ان سے جب میری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا وہ محلّہ لال املی کے پاس واقع مدرسہ فیض عام میں مدرس تھے۔شعر و ادب کا اچھا ذوق تھا اور شہر میں ان کے علم کی دھاک تھی۔انھوں نے شہر کے مشہور مدرسہ بحر العلوم میں تعلیم حاصل کی تھی۔ان کے والد امیر حسن خاں سپاہی تھے اور بقول رشید حسن خاں انھوں نے ترکِ موالات کی تحریک سے متاثر ہو کر سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی عُسرت میں زندگی بسر کی۔ان کے بچے اسکول کی تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہے۔نوعمری میں رشید صاحب برسوں آٹا پیسنے کی چکی پر ملازم رہے۔شہر میں فوجی لباس تیار کرنے کی ایک آرڈیننس فیکٹری تھی۔اب بھی ہے۔دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں اس میں سیکڑوں مزدوروں کی نئی بھرتی ہوئی تو رشید صاحب کو بھی عارضی سرکاری نوکری مل گئی۔یہاں کچھ اشترا کی نظریے کے ٹریڈ یونین لیڈروں سے ان کی دوستی ہوئی اور وہ فیکٹری کی ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں میں فعال ہو گئے۔بائیس دن فیکٹری میں ہڑتال ہوئی۔اس دوران جنگ ختم ہو گئی اور ہزاروں مزدوروں کو بیک جنبش قلم نوکری سے برخاست کر دیا گیا۔رشید صاحب بھی بے روزگار ہو گئے۔

شہر میں شاعروں کی کثرت تھی۔ان کے الگ الگ اکھاڑے تھے۔شعرا میں باہمی چشمکیں تھیں۔آئے دن مشاعرے ہوتے تھے۔وہ زبان و بیان کی خامیوں پر برسرِ مشاعرہ ٹوک دیتے تھے۔فنِ عروض و بیان پر ان کی گہری نظر تھی۔شعر گوئی میں نے بھی شروع کر دی تھی۔رشید صاحب نے مجھے ایک اُستاد شاعر حضرت عابد شاہ جہاں پوری سے ملوایا اور اصرار کیا کہ اپنا کلام انھیں دکھاؤں۔میں نے دو غزلیں انھیں بغرض اصلاح و مشورہ دیں لیکن ان کی لفظی اصلاح سے اطمینان نہیں ہوا اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔تاہم ان سے اور رشید صاحب سے دوستانہ مراسم قائم رہے۔رشید صاحب نے اس دوران مولوی وغیرہ کے کچھ اور ینٹل امتحانات پاس کیے۔ان کی بنیاد پر غالباً 1956 کے آس پاس ان کا تقرر فارسی اُستاد کی حیثیت سے اسلامیہ اسکول میں ہو گیا۔

58-1957 میں جب میں علی گڑھ میں پی۔ایچ۔ڈی کر رہا تھا اور جامعہ اُردو کا ماہ نامہ''ادیب''ترتیب دے رہا تھا تو رشید صاحب سے لکھوا کر میں نے ان کے کئی مضامین''ادیب''میں شائع کیے۔ان میں ایک مضمون 1857 کی بغاوت پر تھا۔اسی زمانے میں رشید صاحب نے''اغلاط اللغات''کے عنوان سے ایک طویل مضمون انجمن ترقی اُردو ہند کے جریدے''اُردو ادب''میں اشاعت کی غرض سے مجھے بھیجا۔میں نے مضمون آل احمد سرور صاحب مدیر رسالہ کو اس اُمید کے ساتھ دیا کہ وہ اسے ضرور شامل کریں گے۔لیکن چار پانچ مہینے تک پاس رکھ کر مضمون انھوں نے مجھے واپس کر دیا۔مجھے تکلیف ہوئی اور غصہ بھی آیا۔مجھے یقین تھا کہ سرور صاحب نے مضمون پڑھنے کی زحمت نہیں کی کیوں کہ ان کے نام سے بھی وہ نا آشنا تھے۔میں مضمون لے کر اپنے اُستادِ معظم رشید احمد صدیقی کے پاس گیا۔ان سے التجا کی کہ وہ اسے ضرور پڑھیں اور پسند آئے تو سرور صاحب کو''اُردو ادب''میں اشاعت کے لیے بھیج دیں۔وہ انجمن کی مجلسِ عاملہ کے رُکن تھے۔انھوں نے مضمون پڑھ کر اپنی سفارش کے ساتھ سرور صاحب کو بھجوا دیا۔اور اس طرح اس طویل تحقیقی مضمون کی پانچ چھ قسطیں''اُردو ادب''میں شائع ہوئیں۔میرا خیال ہے کہ رشید صاحب کا یہ پہلا عالمانہ مضمون تھا جس نے اُردو کے اہل نظر کو متاثر کیا۔

1959 میں میرا تقرر دہلی یونی ورسٹی میں ہو گیا تو صدر شعبہ خواجہ احمد فاروقی نے ایک دن مجھ سے کہا کہ انھیں شعبے کے تحقیقی پروجیکٹ کے لیے ایک ایسے اسکالر کی ضرورت ہے جو عربی و فارسی سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔میں نے فوراً رشید صاحب کا نام لیا اور ان کے تبحرِ علمی کی تعریف کی۔شاید''اُردو ادب''میں انھوں نے ان کا مقالہ پڑھا تھا۔چند منٹ سوچ کر انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ابھی تار گھر جائیے اور رشید صاحب کو تار دیجیے کہ اگر ڈیڑھ سو ماہانہ(جہاں تک یاد پڑتا ہے یہی رقم تھی)مشاہرے پر انھیں یونی ورسٹی کی یہ ملازمت منظور ہو تو فوراً آجائیں۔۔تار رشید صاحب کو ملا اور دوسرے ہی دن صبح کو دہلی پہنچ کر دریا گنج میں میری قیام گاہ پر آ گئے۔میں انھیں فاروقی صاحب کے پاس لے گیا اور چند روز بعد آ کر انھوں نے ریسرچ اسسٹنٹ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

یہاں سے ایک اسکالر اور عالم کی حیثیت سے رشید صاحب کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔شعبے کے تحقیقی کاموں کے علاوہ وہ تحقیقی مجلّہ''اُردوئے معلّٰی''کی ترتیب و طباعت کا

کام بھی دیکھتے تھے۔شعبے سے تذکرۂ سرور، گنج خوبی (میر امن) اور دیوان بقا جیسی کتابیں شائع ہوئیں۔ان کی ترتیب میں بلا شبہ رشید صاحب کی محنت کا حصہ بھی رہا ہے۔شعبے میں خواجہ احمد فاروقی صاحب مرحوم نے انھیں تحقیقی کام کرنے کے لیے جملہ سہولتیں فراہم کر دی تھیں۔ان سے انھوں نے فائدہ بھی اُٹھایا۔شعبے سے زیادہ وہ اپنے ذاتی علمی کاموں پر توجہ دیتے رہے۔چھ سال تک میں صدر شعبہ رہا تو میں نے بھی ان کو ذاتی کام کرنے کی پوری آزادی دی۔ان کا کمرہ کچھ فاصلے پر دوسری عمارت میں تھا۔اگر ان سے کسی معاملے میں مشورے کی ضرورت در پیش ہوتی تو ہمیشہ ان کو اپنے کمرے میں بلانے کے بجائے میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔بعض رفیقوں کی شکایت کے باوجود میں نے کبھی کسی معاملے میں ان سے محاسبہ نہیں کیا۔

رشید صاحب کی علمیت اپنی جگہ،لیکن ان کی ذات میں ہمیشہ مجھے ایک طرح کی بے چینی، تلخی، بیزاری اور برگشتہ دلی کا شدت سے احساس ہوا۔ابتدا میں مدت تک وہ منفی نکتہ چینی پر آمادہ رہتے تھے۔کسی علمی کام یا کسی مشہور ادبی شخصیت کو Demolish کر کے انھیں جو داد ملتی تھی اس سے وہ خوش ہوتے تھے۔شاید اس معاملے میں ان پر قاضی عبدالودود صاحب کے موقف کا بھی اثر تھا۔لیکن قاضی صاحب کی گرفت علمی ہوتی تھی۔رشید صاحب کی تحریروں میں بت شکنی کا جذبہ کچھ تلخی پیدا کر دیتا تھا۔اس سلسلے میں میں نے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص اثر نہ ہوا۔وہ پٹھان تھے۔کبھی کبھی انتقامی جذبہ بھی ان پر حاوی ہو جاتا تھا۔مثلاً آل احمد سرور صاحب سے انھیں کچھ شکایات تھیں۔نتیجے میں ان کی نگرانی میں ترتیب پانے والی علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی ابتدائی جلدیں جب شائع ہوئیں تو انھوں نے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے۔بے شک تحقیق کی جن چھوٹی بڑی غلطیوں کی انھوں نے گرفت کی وہ صحیح تھی لیکن یہی کام اگر وہ ہمدردانہ اور تعمیری جذبے سے انجام دیتے تو وہ انداز زیادہ علمی ہوتا۔اسی طرح خواجہ احمد فاروقی صاحب ان کے عہدے میں اضافہ و ترقی کے معاملے میں ان کے مطالبات پورے نہیں کر سکے۔اس کا بڑا سبب ان کی رسمی تعلیمی اسناد کی کمی تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ''تذکرۂ سرور'' جو فاروقی صاحب کے نام سے شائع ہوا اور جس کی ترتیب میں علمی معاون کی حیثیت سے رشید صاحب نے بڑی مدد کی اس میں کچھ ایسے کھانچے چھوڑ دیے گئے یارہ گئے کہ قاضی عبدالودود صاحب نے سختی کے ساتھ ان کی گرفت کی اور نکتہ چینی کی،اور شعبے کے لوگوں کو کہنا پڑا کہ رشید صاحب نے اپنے منصبی فرائض ادا کرنے میں کوتاہی برتی۔دراصل رشید صاحب کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ اسکول اور یونی ورسٹی نیز انگریزی زبان کی تعلیم سے محرومی نے انھیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔اور اگرچہ اکیڈمیوں اور اعلا علمی اداروں نے انھیں انعامات اور اعزازات سے نوازنے میں کوتاہی نہیں کی لیکن اس احساس کی گرانی سے وہ نجات نہ پا سکے۔بہر حال یہ ایسے مسئلے ہیں جن پر گفتگو ہوتی رہے گی۔دہلی میں ان کے قیام کے آخری زمانے میں ان کے اندر کی تلخی اور تناؤ میں کچھ کمی ضرور آ گئی تھی۔یہی وہ زمانہ ہے جب انھوں نے اعلا معیار کے کچھ مثبت تحقیقی اور علمی کام انجام دیے۔کئی کلاسیکی کتابوں کے متن مثالی صحت اور تنقیدی تعارف کے ساتھ شائع کیے۔یہ بھی سچ ہے کہ انھیں کچھ ایسے خوش ذوق شعرا اور شاعرات کی صحبتیں میسر آ گئی تھیں جن کے ساتھ وہ گل رنگ شامیں گزارتے اور خوش رہتے تھے۔اس سچائی سے انکار بھی مشکل ہے کہ ایسا علمی تجر رکھنے والے اور صرف اپنی لگن، جاں فشانی اور علمی انہماک سے شہرت اور ناموری کی ایسی ارفع منزلوں تک پہنچنے والے اسکالر اُردو میں اب مشکل ہی سے پیدا ہو سکیں گے۔

(1) رشید صاحب کے خاص مقرب اختر شاہ جہاں پوری نے فون پر اطلاع دی۔

❍ (ماہ نامہ اُردو دُنیا،صفحہ 12-11،قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی، اپریل 2006)

❍ (رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، صفحہ 49 تا 53 مکتبہ الحرا در بھنگہ، بہار 2008)

❍❍❍

رشید حسن خاں

نامی انصاری

رشید حسن خاں (10 جنوری 1930 تا 26 فروری 2006) [1] ہمارے زمانے کے ایک نام ور محقق ہی نہیں تھے بل کہ زبان و قواعد، ادب لسانیات ولغات اور تنقید پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔وہ کسی یونی ورسٹی سند یافتہ نہ تھے۔ان کی پوری تعلیم شاہ جہاں پور کے عربی مدرسہ بحر العلوم میں ہوئی تھی۔مگر وہاں بھی وہ درسِ نظامی کی تکمیل نہ کر سکے۔والد کی وفات کے بعد کم عمری ہی میں ان کو مزدور کی حیثیت سے روزی روٹی کی جگت کرنی پڑی۔مگر قدرت کو ان سے کچھ اور ہی کام لینا منظور تھا۔کچھ درسِ نظامی کی عربی فارسی کی تعلیم کام

کوئی حریف نظر آئے گا۔

عادتاً شائستہ، نرم خو اور خلیق تھے مگر جب پٹھانی جلال میں آجاتے تھے تو ہدف کو پانی مانگنے کی بھی مہلت نہیں دیتے تھے۔ زبان و تحقیق کے معاملے میں وہ کسی رورعایت کے قائل نہ تھے۔ فیض احمد فیض کی زبان اور اندازِ بیان پر ان کی سخت تنقید، ادبی تاریخ کا جزو بن گئی ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے فیض کا کچھ نہیں بگڑا اور ان کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی میں شمّہ برابر بھی کمی نہیں آئی۔ دیوانِ حالی کے مقدمے میں ان کی تنقیدی بصیرت اس وقت اُجاگر ہوتی ہے جب وہ حالی کے قدیم اور جدید کلام کو موازنہ کر کے بتاتے ہیں کہ حالی نے اپنی فطرت اور ذوق کے خلاف، سرسید کے اثر میں آکر جو رنگِ جدید اختیار کیا وہ ایک کارِ لا حاصل ہی ٹھہرا۔

رشید حسن خاں کی اصل فتوحات کا زمانہ اس وقت شروع ہوا جب وہ 1959 میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں بہ حیثیت ریسرچ اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ یہاں انھوں نے تیس سال کا طویل وقفہ گزارا اور اسی پوسٹ سے 31 دسمبر 1989 کو سبک دوش ہو کر واپس شاہ جہاں پور چلے گئے۔

تیس برس کے اس دورانیے میں انھوں نے زبان و قواعد، اُردو املا، انشا اور تلفظ اور انشائے غالب کے علاوہ فسانۂ عجائب، باغ و بہار، گلزارِ نسیم، مثنویاتِ شوق کی جدید علمی اصولوں کے مطابق تدوین بھی کی حتیٰ کہ متنی تحقیق میں ان کو خدائے تدوین کا درجہ حاصل ہو گیا۔ ان کی چھوٹی بڑی کل تصنیفات کی تعداد 23 ہے۔ کسی یونی ورسٹی کے وہ طالب علم نہیں رہے، انگریزی سے بھی تقریباً ناواقف تھے مگر ان کی قوت مدرا کہ اتنی زبردست تھی کہ زبان، انشا، قواعد اور لغات کے بارے میں ان کے ارشادات زبان و ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ بنے رہیں گے۔ عربی اور فارسی لغات کے بارے میں اُردو کے اپنے تصرفات کی جو عالمانہ تشریحات انھوں نے اپنی کتاب ''زبان اور قواعد'' میں کی ہے، اس سے ادب کا ہر طالب علم کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ادبی تحقیق و تدوین کا جو اعلا معیار انھوں نے قائم کیا وہ اپنی مثال آپ بن گیا۔ ہندو پاک کے سبھی معتبر ادیبوں اور نقادوں نے بہ یک زبان ان کے علم و آگہی کی تحسین کی ہے۔

اصل صورتِ حال یہ ہے کہ متنی تنقید اتنی زیادہ مغز ماری کا کام ہے کہ اوسط درجے کے ذہن و فکر کا اسکالر اس کو بھاری پتھر سمجھ کر، چوم کر رکھ دینے کے سوا اور کچھ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ رشید حسن خاں نے ایک ایک لفظ کو تولا، پرکھا، مختلف ذرائع سے اس کی تصدیق کی اور تب اس کو داخل متن کیا۔ آنکھوں سے تیل ٹپکانے کا اتنا بڑا کام شاید رشید حسن خاں کے علاوہ کوئی دوسرا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود نے بھی متنی تدوین میں ایسا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ ان کی متنی تدوین کی کتابوں کے صرف حواشی اور تعلیقات پڑھ لیجیے تو حیرت سے آنکھیں پھیل جاتی ہیں۔

اُردو کے اولین طنز و مزاح نگار شاعر جعفر زٹلّی کا ''زٹل نامہ'' بھی متنی تحقیق پر مبنی ان کی ایسی کتاب ہے جس میں جعفر زٹلّی اپنی تمام کمیوں کوتاہیوں اور بے باکیوں کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ تحقیق میں رشید حسن خاں صرف سچ اور سچ کے انکشاف کو اپنا بنیادی مقصد قرار دیتے ہیں۔ یہ سچ چاہے کڑوا ہو یا میٹھا، ثقہ ہو یا فحش، مہذب ہو یا غیر مہذب، یہ سب رشید حسن خاں کا مسئلہ نہیں ہے۔ ان کے سچ کو آپ خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھ سکتے۔ شاید یہ کچھ ثقہ حضرت اس پر چیں بہ جبیں ہوں کہ زٹل نامہ میں انھوں نے ایسے اشعار بھی درج کیے ہیں جو حد درجے فحش ہیں اور بعض غریب یا بازاری زبان کے لفظوں کے معنی بھی اس قدر کھول کر لکھے ہیں کہ اس کے آگے سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ متنی تحقیق کی کتابیں تو ان کے دورِ آخر کے کارنامے ہیں۔ جب وہ شاہ جہاں پور ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے مگر ان کی شہرت کا آفتاب اس وقت بامِ عروج پر پہنچ گیا جب ایک خاص پروجیکٹ کے تحت، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی تیار کردہ ''تاریخِ ادب اُردو'' کی پہلی جلد منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب کی اغلاط اور اس کے پنچائتی بیانات کی انھوں نے اتنی کڑی تنقید کی کہ یہ کتاب چھپتے ہی پایۂ اعتبار سے گر گئی اور یونی ورسٹی کو اس کتاب کو بازار سے واپس لینا پڑا اور پھر پورا پروجیکٹ ہی منسوخ ہو گیا۔ رشید حسن خاں نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''درحقیقت اس کو ایسے مضامین کا مجموعہ کہنا چاہیے جن میں نہ باہم ربط ہے اور نہ تناسب و توافق اس کے بجائے متضاد بیانات، غیر متعلق تفصیلات، غلط سنین، غلط انتسابات، مفروضات اور غیر معتبر اقتباسات کی فراوانی ہے۔''
>
> (ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ص: 255)

بعض معتبر اصحاب کا خیال ہے کہ رشید حسن خاں کے اس منفی رویے سے فروغ اُردو کے ایک بڑے اور نفیس منصوبے کی جڑ ہی کٹ گئی۔ غلطی ہائے مضامین کو اجاگر کرنا غلط نہ تھا، مگر ان کا جارحانہ بل کہ کسی حد تک مشتمانہ رویہ اس پورے پروجیکٹ کو خاک میں ملانے کا سبب بن گیا اس کام میں ان کے معاون لکھنؤ کے انتہا پسند مولوی، عبدالماجد دریابادی بھی تھے، جنھوں نے صدق جدید میں ان کی پُر زور تائید کی تھی۔

اُردو کے الفاظ و تراکیب، مہند، مفرس، اور معرب الفاظ اور اُردو میں اُن کے چلن کے بارے میں رشید حسن خاں کی کتاب ''زبان و قواعد'' (مطبوعہ 1976) جدید سائنٹفک اصولوں پر مرتب کی گئی ایسی کتاب ہے جو اُردو کے طالب علموں، اُستادوں اور ادیبوں کے لیے یکساں طور سے بڑی کار آمد کتاب ہے۔ روز مرہ بولے جانے والے اکثر الفاظ کے بارے میں ہم لوگ شک و شبہے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اُردو کی مروجہ لغات رہ نمائی کر سکتی ہے۔ انشا کی طرح رشید حسن خاں نے بھی فارسی اور عربی الفاظ کے اصل تلفظ کی بجائے ان کے چلن ہی کو درست مانا ہے۔ اسی طرح بعض فارسی + ہندی تراکیب کو بھی خواہ وہ قواعد کی رو سے غلط ہی کیوں نہ ہوں انھوں نے درست ٹھہرایا ہے۔ مثلاً فوق البھڑک، سنسنی

خیز، رہائش لبِ سڑک اور دن بدن وغیرہ۔ اُردو املا کی معیار بندی نہ ہونے سے جو ایک قسم کا انتشار پایا جاتا ہے اس کے تدارک کے لیے انھوں نے اُردو املا کے موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے اور اس میں نہ صرف املا کے اصول طے کیے ہیں بل کہ اس کی وافر مثالیں بھی فراہم کیں ہیں، لیکن اس بارے میں ان کے تمام ارشادات سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ اس خاص وجہ یہ ہے کہ اُردو الفاظ وتراکیب کے بارے میں تو انھوں نے چلن کو ترجیح دی ہے۔ لیکن املا کے بارے میں یہ اصول نہیں اپنایا ہے۔ سیکڑوں برس سے الفاظ کا جو املا اُردو میں رائج ہے، اس کو نئی شکل دے کر انھوں نے اچھی خاصی الجھن کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر خاں صاحب ''بلکہ'' کو ''بل کہ''، ''آجکل'' کو ''آج کل'' اور ''گاؤں'' کو ''گانو'' لکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔

ادبی تحقیق کے متعلقات پر ان کی گراں مایہ تصنیف ''ادبی مسائل تحقیق اور تجزیہ'' ایک بے حد اہم کتاب ہے بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ تحقیق کرنے والوں یا تحقیق سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کتاب میں تحقیق کے جو اصول وضوابط انھوں نے مرتب کیے ہیں وہ بے حد مستحکم، مدلّل اور جینوئن ہونے کے باوجود، ان اصولوں پر لفظاً ومعناً عمل کرنے والے آخری شخص خود رشید حسن خاں تھے۔ اب تو ہندو پاک کی پوری اُردو دُنیا میں شاید ہی کوئی اس پائے کا محقق موجود ہو جیسا کہ رشید حسن خاں تھے۔ اپنی کچھ ذاتی خامیوں اور کمیوں کے باوجود رشید حسن خاں ایک نابغۂ روزگار شخص تھے۔ اور موجودہ حالت میں اس کی اُمید بہت کم ہے کہ ان کے رتبے کا کوئی دوسرا محقق اور عالم منصۂ شہود پر نمودار ہوگا۔

1۔ رشید حسن خاں کی تاریخ پیدایش ان کے اسناد میں 10 جنوری 1930 لکھی ہے، مگر ڈاکٹر خلیق انجم کہتے ہیں کہ خود رشید حسن خاں نے ان کو بتایا تھا کہ یہ 1930 نہیں بل کہ 1928 ہے۔ ایک اور دریافت کے مطابق ان کی تاریخِ ولادت 25 دسمبر 1925 ہے (بحوالہ ''شاعر'' ہم عصر ادب نمبر)

(سہ ماہی روشنائی، کراچی، جلد: 7 شمارہ 26، جولائی تا ستمبر 2006، صفحہ 150 تا 152)

(عالمی اُردو ادب، مدیر نند کشور وکرم، جلد 25، صفحہ 242 تا 245، نئی دہلی 2007)

ooo

رشید حسن خاں

(آمد: 10 جنوری 1930۔ رخصت: 26 فروری 2006)

رفعت سروش

آج صبح یہ دلدوز خبر ملی کہ 25 اور 26 فروری کی درمیانی شب میں شاہ جہاں پور میں اُردو کے محقق اور دانش ور رشید حسن خاں کا انتقال ہو گیا۔ (انا اللہ وانا الیہ راجعون) کسی سے ممبئی فون پر بات کر رہے تھے کہ دل کا شدید دورہ پڑا اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ ''کیا دیوانے نے موت پائی ہے''

رشید حسن خاں کی عمر کا ایک بڑا حصہ دہلی میں گزرا۔ وہ 60 کے آس پاس شاہ جہاں پور سے دہلی آئے تھے اور دہلی یونی ورسٹی کی لائبریری میں ملازم ہو گئے تھے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی بھی ان کے ہم پیشہ تھے۔ مگر وہ پرائیویٹ امتحان دے دے کر پی ایچ ڈی کی اور پھر پروفیسر ہو گئے تھے۔ دونوں تحقیق کے مردِ میدان تھے اور دونوں ہی کے پروفیسر اور صدر شعبۂ اُردو خواجہ احمد فاروقی سے ''محتاط تعلقات'' تھے۔ خواجہ صاحب مرتبے میں ان سے کہیں بلند تھے، مگر ان دونوں کو ناز تھا اپنی علمیت پر۔ نثار احمد فاروقی صاحب تو آخر میں پروفیسر ہونے کے بعد خواجہ صاحب کے ہم پلّہ ہو گئے تھے لیکن رشید حسن خاں لائبریری کے کارکن ہی رہے۔ ویسے وہ ریسرچ اسکالروں کے گائڈ بھی تھے اور نہ جانے کتنے ''ادبی ڈاکٹروں'' نے خاں صاحب سے فیض اُٹھایا ہوگا۔ میری ان سے ملاقات انجمن تعمیر اُردو (اُردو بازار دہلی) کے جلسے میں ہوئی تھی۔ ان دنوں شاہ جہاں پور کے دو ادیب دہلی آئے تھے اور دہلی ادبی ماحول سے متعارف ہوئے تھے۔ ایک ڈاکٹر قمر رئیس اور دوسرے رشید حسن خاں۔ دونوں ہی دہلی یونی ورسٹی سے متعلق تھے۔ ایک شعبۂ اُردو میں بہ حیثیت لیکچرر اور دوسرے لائبریری میں۔ رشید حسن خاں کلاسیکی مزاج رکھتے تھے اور ادب کو اسی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کی شہرت اس ایک مضمون سے ہوئی تھی جو انھوں نے فیض احمد فیض کی شاعری پر لکھا تھا اور اس مشہور زمانہ شاعر کی زبان وبیان کی غلطیوں کی گرفت کی تھی۔ یہ مضمون انھوں نے انجمن تعمیر اُردو کے جلسے میں پڑھا تھا اور اس کا بہت چرچا ہوا۔ فیض ٹھہرے ترقی پسند کے مثالی شاعر اور ان کی غلطیوں کو دو ٹوک انداز سے طشت از بام کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا چناں چہ ترقی پسندوں کے مخالف کیمپ میں ان کی بڑی واہ واہ ہوئی اور اس میں وہ ایڈیٹر تحریک گوپال متّل کے قریب ہو گئے۔

رشید حسن خاں یونی ورسٹی کی طرف سے ایک معمولی مکان میں اکیلے رہتے تھے۔اپنے اہل خانہ کو دہلی لاکر رکھنے کی حیثیت نہ تھی۔وہ بڑی کفایت سے زندگی گزارتے تھے۔ان کو اپنی بیٹی کی شادی کی بہت فکر تھی۔مشہور شاعر ممتاز مرزا سے ان کی دوستی تھی اور یہ میرے علم میں ہے کہ انھیں تنخواہ کے علاوہ اپنی تحریروں اور انعامات وغیرہ سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ روپیہ پس انداز کرتے تھے اور ممتاز مرزا کے پاس رکھوا دیتے تھے۔آہستہ آہستہ ان کے علم کی شہرت پوری اُردو دُنیا میں پھیل گئی۔انھوں نے ''اُردو املا'' پر وقیع کام کیا اور نہ جانے کتنی کتابوں کی تدوین کی۔ان کی مدون کتابیں آج اُردو ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں جن کو ترقی اُردو کونسل،مکتبہ جامعہ اور انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا اور ان کے ان ادبی اور تحقیقی کارناموں نے ان کے لیے اُردو ادب میں ایک ایسی جگہ بنائی جو صرف ان کے لیے مخصوص ہے اور اس سلسلے میں کوئی ان کا حریف نہیں۔گو رشید حسن خاں کی زندگی کے اس پہلو پر لکھنا اس وقت میرے لیے دشوار ہے اور نہ یہ میرا منصب۔

''لکھی جائے گی حدیث دل کی تفسیریں بہت''

اس وقت تو میں اپنے غم خانے میں بیٹھا ان کو یاد کر رہا ہوں اور ان کی شخصیت اور ''خانصاحبیت'' کے کئی پہلو میرے ذہن میں ہیں۔ریڈیو میں اُردو مجلس کا پروڈیوسر تھا ،وہاں میں نے ایک پروگرام شروع کیا تھا ''بزمِ ادب'' جس میں ایک شاعر یا افسانہ نگار کو اپنی تخلیق پیش کرنے کی دعوت دی جاتی تھی اور اس پر برجستہ بحث کی جاتی تھی۔اس مباحثہ میں حصہ لینے کے لیے ہم لوگ ایک نقاد کو بھی بُک کرتے تھے۔ایک بار شہاب جعفری کو نظم پڑھنے کے لیے بلایا اور رشید حسن خاں کو تنقید کے لیے۔یہ بات 65 کے آس پاس کی ہے۔شہاب جعفری پُرانے براڈ کاسٹر تھے اور ان کی فیس تھی تیس روپے،جب کہ رشید حسن خاں نسبتاً نئے تھے اور ان کی فیس تھی پچیس روپے۔خاں صاحب یہ دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے۔مجھ سے سنبھالے نہ سنبھلے۔میں نے کہا فی الحال تو کنٹرکٹ کو نہیں بدلا جا سکتا۔پھر وہ پہنچے اس پورے معاملے کی شکایات کرنے علی جواد زیدی کے پاس جن کا دفتر ہماری ہی بلڈنگ میں تھا۔زیدی صاحب کا ریڈیو سے کوئی تعلق نہیں تھا۔مگر وہ ہم دونوں کے بزرگ تھے۔میں نے ان کو اپنی مجبوری بتلائی۔خاں صاحب کا کہنا تھا کہ نقاد کا رتبہ شاعر سے بڑا ہوتا ہے۔بہر حال زیدی صاحب کے سمجھانے سے وہ مان گئے اور پروگرام میں حصہ لیا۔اور بعد میں میں نے ایک خصوصی نوٹ لکھ کر اگلے پروگرام کے لیے ان کی فیس بڑھوا دی۔یہ میرے علم میں نہ تھا کہ خاں صاحب اور خواجہ احمد فاروقی کے باہمی تعلقات اچھے نہیں ہیں۔خواجہ صاحب تھے صدر شعبۂ اُردو اور خاں صاحب لائبریری کلرک،مگر انھوں نے اپنی علمیت کا لوہا منوالیا تھا۔اتفاق سے کچھ عرصہ بعد میں نے بزمِ ادب پروگرام میں خاں صاحب کو بہ حیثیت نقاد بُک کیا اور اس بار انھوں نے خواجہ احمد فاروقی کے مقالے پر تنقید کرنا تھی۔ریکارڈنگ کے لیے آئے مگر ایک دل چسپ بات شکایت کے انداز میں کہی بولے۔''رفعت صاحب!اگر چہ لوہے کے قلم سے لکھتا ہوں،مگر آنکھوں میں مروت ہے۔'' میں سمجھ گیا اور میں نے مسکراتے ہوئے کہا،خاں صاحب!آپ سے اسی توازن کی اُمید ہے اور میں نے ریکارڈنگ میں دیکھا کہ خاں صاحب نے کئی موقعوں پر اپنی ''خان صاحبیت'' کی روش بدلی۔یہ پروگرام بغیر ایڈیٹ کیے جوں کا توں نشر کیا جاتا تھا۔

ریسرچ گائڈ بننے کے بعد ان کی کچھ اہمیت بڑھ گئی تھی اور انہیں کئی اداروں نے انعامات واعزازات سے بھی نوازا تھا۔آخر میں ان کے مزاج کی جھلاہٹ اور جھنجھلاہٹ کم ہوگئی تھی۔ان کا ایک اور جملہ یاد آیا۔میں ان سے ڈاکٹر محمد حسن کے کئی مضمون کے بارے میں لکھنے کے لیے کہا تو نہایت بلیغ فقرے میں جواب دیا۔''رفعت صاحب میں رائفل سے چڑیوں کا شکار نہیں کرتا۔'' ان کے ریٹائرمنٹ سے کچھ پہلے میں نے ''یاد زمانہ'' سلسلے کے تحت ان کا انٹرویو،کیا آرکائیو میں محفوظ ہے یا نہیں مگر مجھے بہت سی باتیں یاد ہیں۔انھوں نے عربی فارسی کی تعلیم بھی نصابی طور پر پوری نہیں ہوئی ہے۔انھوں نے جو کچھ حاصل کیا ذاتی مطالعہ سے ہی حاصل کیا۔وہ دہلی آنے سے قبل ایک فیکٹری میں ملازم تھے۔بائیں بازو کی سیاست سے متعلق تھے اور فیکٹری کی ٹریڈ یونین کے لیڈر رہتے تھے۔یہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ آخر وہ اتنے Bold کیوں ہیں،ٹریڈ یونینسٹ تھے۔

اس انٹرویو میں ان سے بہت کھل کر باتیں ہوئیں۔عام زندگی میں وہ بے حد دل چسپ آدمی تھے۔قلم کے دھنی تو تھے ہی،ادبی محفلوں اور سمیناروں میں بھی ان کی دھاک تھی۔آٹھ دس سال پہلے ان کے دہلی سے شاہ جہاں پور چلے جانے کے بعد یہاں کی محفلوں میں ان کی کمی بہت دنوں تک محسوس کی جاتی رہی اور اب تو خیر پوری اُردو دُنیا ہی اس نابغہ روزگار سے محروم ہوگئی۔ہمارے یہاں لوگوں کو ان کی ڈگریوں اور عہدوں کے حساب سے ناپا جاتا ہے اور جو آدمی ان ''نمایشی ہتھیاروں'' سے لیس نہیں ہے اسے اپنے آپ کو منوانے میں عمر گزر جاتی ہے کوئی اور ملک ہوتا تو رشید حسن خاں جیسے عالم اور محقق کو ڈاکٹریٹ کی کئی اعزازی ڈگریاں دی جاتیں مگر وہ ادیب تھے ہندوستان کے ،اور وہ بھی اُردو کے۔ساری عمر دو روٹیوں کے لیے جدو جہد کرتے رہے اور آخر مرکز کو چھوڑ کر اپنے آبائی وطن میں گوشہ نشین ہوگئے اور اب موت ان کو لے اُڑی۔رشید حسن خاں ،کلاسیکی ادب کو سمجھنے اور پرکھنے والے اور ایک ایک لفظ کی ماہیت کو واضح کرنے والے اپنے طرز کے آخری آدمی تھے۔اب میدان صاف ہے،ان کی جگہ نہ جانے کب تک خالی رہے گی۔شاعری کی زبان میں شاید یہی ان کے لب پر ہوگا۔

مت سہل ہمیں جانوں پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

(اُردو بک ریویو،دریا گنج نئی دہلی،مدیر عارف اقبال،صفحہ 77 تا 78،جنوری-فروری 2006)

(سہ ماہی روشنائی،کراچی،جلد:7،شمارہ:26،جولائی تا ستمبر 2006،صفحہ 146 تا 149)

نوٹ : یہ مضمون رفعت سروش صاحب نے اپنی کتاب ''آنسوؤں کے چراغ''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، اشاعت 2008، میں صفحہ 85 تا 88 پر ''آہ! رشید حسن خاں'' کے نام سے شامل کیا ہے۔ رفعت سروش کی کتاب میں شامل مضمون کا عکس عزیزی عادل احسان (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی) نے مرکزی لائبریری، دہلی یونی ورسٹی سے بہ ذریعہ وہاٹس اپ 11 اپریل 2017 کو ارسال کیا۔

ooo

رشید حسن خاں کی یاد میں

ڈاکٹر شمس بدایونی

26 فروری 2006 بروز اتوار، صبح کے سات بجے تھے، میں سفر کے لیے تیار ہو کر پورٹیکو کے قریب پہنچ چکا تھا۔ معاً فون کی گھنٹی بجی۔ میں واپس ہوا، ریسیور اٹھایا، اُدھر سے آواز آئی ''میں حنیف نقوی۔ رشید حسن خاں صاحب کا رات انتقال ہو گیا۔ آپ ان کی تدفین میں شریک ہو سکتے ہیں۔'' میں کسی اہم وجہ سے اپنے سفر کو ملتوی نہیں کر سکا اور تدفین میں شرکت سے معذور رہا، مگر اس دن ایک اضمحلال کی کیفیت طاری رہی۔ اُن سے ملاقاتیں، فون پر کی گئی باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی رہیں۔ اُن کی اعتماد و یقین سے بھرپور آواز، کاٹ دار جملے، بے تکلف لہجہ، کچھ خاص تکیہ کلام۔ ہاں بھائی! ارے بھئی! دیکھیے! یہ جو ہیں نا! ہاں بس۔ اُن کے لہجے اور بیان کا طنطنہ سماعت پر بار بار دستک دیتا رہا۔ میں کبھی محظوظ ہوتا رہا اور کبھی ملول۔ اب یہ آواز سننے کو کہاں ملے گی؟ کون اس طرح دوٹوک انداز میں پکارے گا؟

(1) ''ہیلو... ارے بھئی! آپ کہاں ہیں؟ ایک ماہ ہو گیا آپ کا کوئی فون نہیں آیا۔ دیکھئے شمس صاحب، کم از کم مہینے میں ایک بار ضرور فون کیجیے یا پھر تعلق منقطع کر لیجیے۔''

(2) ''ہیلو جی! میں شمس بول رہا ہوں۔ ہاں بھئی شمس صاحب کیسے ہیں آپ؟ آپ کے بچے کیسے ہیں؟ کیسی ہے ہماری بہو؟ اور ہمارے لطیف صاحب ٹھیک ہیں؟ کاروبار کیسا چل رہا ہے آپ کا؟ کیا لکھ رہے ہیں آج کل آپ؟ دیکھیے شمس صاحب، میں برابر سُن اور پڑھ رہا ہوں کہ آپ لگاتار سمیناروں میں شرکت کر رہے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے آپ کو جم کر سنجیدگی کے ساتھ کسی موضوع پر تین چار سال کام کرنا چاہیے۔ بس اگر آپ یہ نہیں کریں گے تو خود کو ضائع کر دیں گے۔ ارے بھئی یہ سب میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں آپ سے کچھ بہتر توقعات رکھتا ہوں۔ باقی آپ کی مرضی''۔

(3) ''ہیلو! کہیے شمس صاحب، کیسے ہیں آپ جی، میں ایک مضمون نواب محمد یار خاں امیرؔ پر لکھنا چاہتا ہوں۔ مواد اکٹھا کر لیا ہے۔ رُکیے شمس صاحب! کیا آپ نے ناظمؔ رام پوری کا یہ شعر سنا ہے؟

غلطی غیر کی گفتار کی دیکھی ناظمؔ
جب میں جاتا ہوں تو کہتا ہے نواب آتے ہیں

سمجھ گئے نا؟ جی، میں سمجھ گیا۔ صحیح تلفظ تو اب ہے۔ ہاں اب بتائیے۔ کیا امیرؔ کے حالات و کلام یکجا کرنا ٹھیک ہوگا...؟ سنیے شمس صاحب! امیرؔ ادب میں صرف اپنے ایک شعر...

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

...کی وجہ سے مشہور ہیں اور مشہور رہیں گے، بس۔ اس سے زیادہ ان کی اہمیت نہیں۔ آپ ان پر اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟ دیکھیے، موضوع کی ترجیح کو ضرور ذہن میں رکھا کیجیے۔ قاضی عبدالودود نے رضاؔ عظیم آبادی پر تحقیق کی۔ بلاشبہ اعلا درجے کا کام کیا۔ رضاؔ بے چارے کو کیا ملا؟ وہ آج بھی غیر معروف اور غیر اہم شاعر ہے۔ آپ کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اپنا وقت ایسے ویسے کاموں میں برباد نہ کیجیے۔ صرف ڈھنگ کے کام کیجیے۔ جیسے آپ پہلے بھی کر چکے ہیں۔''

(4) ہاں شمس صاحب! وہ فلاں صاحب ہیں نا، وہ تو فرقۂ ملامتیہ سے معلوم ہوتے ہیں ان کی تحریروں میں معائب کے کیڑے بری طرح بلبلا رہے ہیں اور آپ لکھتے ہیں کہ وہ عالم وفاضل ہیں۔ بھائی یہ سب کیا ہے؟ کیا آپ بھی اوروں کی طرح دُنیا ساز بن گئے؟ دیکھیے شمس صاحب ایک بات سمجھ لیجیے۔ تحقیق شرک کو گوارہ نہیں کرتی۔ آپ اگر کسی کو ناراض نہیں کر سکتے تو قلم رکھ دیجیے۔ دُنیا میں بہت کام کیے جاسکتے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ آپ تحقیق ہی کریں''۔

دن بھران کی آواز میں قید رہا۔ وہ مجھے مخاطب کرتے رہے اور میں ایک نیاز مند کی طرح سنتا رہا۔ رات کو جب گھر واپس لوٹا تو گیارہ بجے شب ان کے بیٹے خورشید حسن خاں کو میں نے فون کیا۔ تب معلوم ہوا کہ 25 فروری اور 26 فروری کی درمیانی شب 2 بج کر 40 منٹ پر ان کو دل کا دورہ پڑا اور روح پرواز کرگئی، پشاوری قبرستان شاہ جہاں پور میں ان کی تدفین ہوئی۔

رشید حسن خاں صاحب سے میرا تعلق کب قائم ہوا صحیح طور پر یاد نہیں۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ 1988 میں جب میری کتاب ''اُردو لغت کا شرعی محاسبہ'' شائع ہوئی ،اس پر انھوں نے 'غالب نامہ' دہلی (جنوری 1989) میں تبصرہ لکھا تھا۔ اُس وقت تک میرے اور ان کے بیچ شناسائی کا رشتہ قائم نہیں ہوا تھا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے میری طلب وخواہش کے بغیر محض موضوع کے بدیع ونادر ہونے کے سبب تبصرہ لکھا اور خوب لکھا۔

میرا علمی مقالہ 'نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات' جب 1995 میں چھپ کر منظرِ عام پر آیا تو اس کی ایک کاپی خاں صاحب کو بھی ارسال کی گئی۔ خاں صاحب نے 9 جون کو مجھے ایک طویل خط لکھ کر مقالے کی بھرپور داد دی اور تبصرہ کرنے کا وعدہ فرمایا۔ میرے دل میں خاں صاحب کے علم وفضل، احتساب وسخت گیری کا جو رعب و دبدبہ اس خط کو پڑھ کر وہ احساس ان سے نیاز مندی اور ان کی محبت میں تبدیل ہوگیا۔ اُس وقت وہ دہلی میں تھے۔ اسی خط میں انھوں نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ آج کل وہ 'مثنویاتِ شوق' مرتب کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں 'مثنوی زہر عشق' کے نسخۂ نظامی (یعنی نظامی پریس بدایوں سے شائع شدہ) کی تلاش تھی جس کا طبعِ ثانی شمس الرحمن فاروقی سے مل گیا لیکن طبع اوّل 1919 نہیں مل سکا۔ اس خط میں انھوں نے لکھا:

''آپ کے نظامی صاحب (نظامی بدایونی) نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے آج کل۔ 'زہر عشق' کا نسخۂ نظامی میرے پاس نہیں تھا، بارے شمس الرحمن فاروقی صاحب نے بھیج دیا۔ اور ایک نسخہ بدایوں سے آ گیا۔ اس نے مرحوم نے تنسیخ ممانعت کے آرڈر کا نمبر بھی لکھا ہے۔ مگر حسبِ معمول ادھوری بات لکھی ہے اور اندازِ بیان بڑا مبہم ہے۔ کچھ بھی واضح نہیں ہوتا۔ میں نے الہ آباد آرکائیوز میں اس نمبر کے آرڈر کو نکلوانا چاہا معلوم ہوا کہ وہاں 1857 تک کے کاغذات ہیں۔ بعد کے کاغذ لکھنؤ میں ہیں۔ اب لکھنؤ آرکائیوز کے لیے دو حضرات کو لکھا ہے۔ دیکھیے کیا رہتا ہے۔ مرحوم ذرا سی وضاحت کر دیتے تو اس قدر پریشانی نہ ہوتی۔ قطعۂ تاریخ کا بھی احوال یہی ہے۔ شوق کی عمر اس وقت 77 برس کی تھی اور ذاکر 27 برس کے تھے۔ اس کو معاصرت اور مصاحبت کیسے کہیں گے؟ پھر حوالہ حسبِ معمول ادھورا بل کہ مجہول۔ اب اس کی تصدیق کے لیے سرگرداں ہوں۔ ہاں آپ یہ پتا لگا سکتے ہیں کہ ذاکر مرحوم لکھنؤ میں کس زمانے میں تھے اور کیا کرتے تھے؟ ہے کوئی صورت؟''

(خط مکتوبہ 9 جون 1955)

اس سلسلے کی بعض باتیں اور بھی تھیں جو بعد کے کئی خطوط میں زیرِ بحث آئیں۔ مثلاً ایک خط میں انھوں نے مجھے لکھا:

''کتاب میں (مراد 'نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات') ص 417 پر ذاکر بدایونی کا قطعۂ تاریخ مشمولہ زہر عشق درج کیا گیا ہے۔ اس میں تین باتیں ایسی ہیں جن سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آخری مصرعے کے آخر میں 'کذا' ہے۔ یہ کیوں آیا ہے؟ اس کا تعلق پورے مصرعے سے ہے یا کسی خاص لفظ سے؟

'آپی' لکھا گیا ہے، مگر اصل نسخے (زہرِ عشق طبع 1920) میں 'آئی' ہے۔ اسے کیوں بدلا گیا۔ جب کہ بقول اساتذۂ فن تاریخ، 'آئی' کے 21 عدد ہوتے ہیں اور وہی یہاں مراد لیے گئے ہیں۔

چوتھے مصرعے میں 'رہنمائی' ہے۔ اصل نسخے میں اس جگہ 'رونمائی' ہے۔ اسے کیوں بدلا گیا؟ میں نے از راہِ احتیاط (نہ کہ از راہِ اعتراض) یہ باتیں پوچھی ہیں کہ شاید طبع اوّل (1919) میں اسی طرح ہو۔ وہ اشاعت یعنی طبع اوّل مجھے نہیں ملی۔ دوسری اشاعت (1920) میرے سامنے ہے۔''

(خطوط مکتوبہ 7 فروری 1996)

خط کے مذکورہ اقتباسات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ متن کے اجزا کو کتنی باریک بینی سے دیکھا کرتے تھے اور اس کے اختلافات کو آخری حد تک حل کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

رشید حسن خاں جن دنوں مثنویاتِ شوق مدون کر رہے تھے، انھوں نے اس کے طویل مقدمے کے بعض حصے مختلف مضامین کی صورت میں ہم عصر رسائل میں شائع کرا دیے۔ جولائی 1996 کے 'آجکل' (دہلی) میں ان کا ایک مضمون 'مثنویاتِ شوق منعِ اشاعت' شائع ہوا جس میں انھوں نے ان مثنویات یا ان میں سے ایک مثنوی کی اشاعت پر

حکومت کے ذریعے لگائی گئی پابندی کی روایت کو بعض دلائل کی بنیاد پر قطعی طور پر رد کر دیا اور نظامی بدایونی (ف 1947) کے تنسیخ ممانعتِ اشاعت کے آرڈر اور اس کے نمبر و تاریخ کے اندراج کو بھی فرضی قرار دیا۔ اس مضمون پر کاظم علی خاں (لکھنؤ) اور بعض دوسرے قلم کاروں نے 'آجکل' میں خطوط لکھ کر خاں صاحب کے نتائج و خیال سے اختلاف کیا۔ راقم الحروف بھی خاں صاحب کے نتائج سے متفق نہیں تھا۔ راقم نے اس سلسلے میں خاں صاحب کو خط لکھ کر اپنے اختلاف سے آگاہ کیا۔ جس کے جواب میں انھوں نے لکھا:

''نظامی کا آرڈر نمبر ہو یا مولانا حالی، سید ضامن علی اور ایسے ہی دوسرے بزرگوں کی روایتیں، جب تک ان کا قابلِ استدلال نہیں ہوسکتیں۔ ہمارے بزرگ بہت زود یقین اور خوش گمان تھے۔ اس لیے ہمیں ان کی تحریروں سے استفادہ ضرور کرنا چاہیے مگر آدابِ تحقیق کے تحت۔ آپ کے اندازِ نگارش سے مجھے محسوس ہوا کہ مولانا نظامی ہیرو بن گئے ہیں۔ دیکھیے ہیرو ورشپ درست اندازِ فکر نہیں۔ نسخۂ نظامی میں 5 شعر الحاقی ہیں تو کیا انھیں مان لیا جائے گا؟ اس طرح مت سوچا کیجیے۔ 'ایوانِ اُردو' کے حالیہ شمارے میں جو تحریریں شائع ہوئی ہیں اس میں الحاقی اشعار کا کچھ بیان آ گیا ہے۔ مجھے قاضی عبدالودود صاحب کا یہ قول ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ مُردوں کا حق ہم پر زندوں سے زیادہ نہیں۔ راوی مرحوم ہو یا زندہ ایک ہی طریق کار اختیار کیا جائے گا۔ قبول روایت میں۔''

(خط مکتوبہ 13 جولائی 1996)

خاں صاحب کا جواب موصول ہونے کے بعد میں نے مدیرِ 'آجکل' کو ایک خط لکھا جس میں خاں صاحب سے اس بحث کو مزید صاف کرنے کی گزارش کی۔ خط کا متعلقہ حصہ حسبِ ذیل ہے:

''رشید صاحب کو جتنا عرصہ لکھتے ہو گیا، شاید میری عمر بھی اس کی برابری نہ کر سکے۔ ان کو مجھ سے جو غایت درجہ محبت ہو اس کا تقاضہ تھا کہ میں بہ سروچشم ان کی بات کو درست مان لوں۔ اب کاظم علی خاں صاحب نے جو کچھ لکھا ہے میں سمجھتا ہوں یہی بات اور نہ معلوم کتنے ذہنوں میں آئی ہوں گی۔ تازہ شمارے (اکتوبر) میں جناب عالم گیر (سدھارتھ نگر) نے اپنے مکتوب میں چند سوالات قائم کر دیے ہیں۔

میری جناب رشید حسن خاں سے گزارش ہے کہ ان کی بحث کا نتیجہ یقیناً درست ہوسکتا ہے لیکن اس بحث کو ابھی مزید صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً نظامی کے حوالے سے جو اجازت نامہ مع آرڈر نمبر کے زیرِ گفتگو ہے اس کی تردید کے لیے واضح گفتگو ضروری ہے۔''

(آجکل، دہلی، دسمبر 1996)

خاں صاحب نے اس بحث کو اسی طرح اپنے مقدمے میں شائع کر دیا۔ میں نے نظامی بدایونی کے پوتے جناب مونس نظامی سے کئی بار خط لکھ کر گزارش کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنا موقف پیش کریں مگر وہ خاموش رہے۔ سالِ گذشتہ انھوں نے مجھے بتایا کہ آرڈر نمبر کی کاپی انھیں پُرانے کاغذات میں مل گئی ہے اور اس کے وجود سے انھوں نے رشید حسن خاں کو بھی مطلع کر دیا ہے۔ آگے کیا ہوا مجھے معلوم نہیں۔

اس سلسلے کا ایک مضمون 'ایوانِ اُردو'، دہلی (اپریل 1998) میں بہ عنوان 'مثنویاتِ شوق لکھنوی معاشرے کے آئینے میں' شائع ہوا تھا جو بڑا ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ خاں صاحب نے اس مضمون میں عبدالحلیم شرر کی 'گذشتہ لکھنؤ' اور حکیم نجم الغنی خاں کی 'تاریخِ اودھ' کے حوالے سے پُرتعیش زندگی کا ایک خاص انداز میں تذکرہ کیا تھا اور لکھنوی معاشرے میں طوائف کے کردار کو جزوِ زندگی دکھایا تھا۔ معاشرے کے سوادِ اعظم پر اربابِ نشاط کے تسلط کو شوق کے اشعار کا پس منظر قرار دیتے ہوئے شوق کی مثنویات کو لکھنوی معاشرے کا آئینہ دار بتایا تھا۔ بعض حلقوں نے اس مضمون کو اہالیانِ لکھنؤ کی تذلیل سمجھا۔ چناں چہ پروفیسر نیّر مسعود نے اس کا جواب ایک مراسلے نما مضمون 'بہ نام رشید حسن خاں' کے عنوان سے دیا جو 'ایوانِ اُردو (دہلی) کی جولائی 1998 کی اشاعت میں شامل ہوا۔ یہ بہت سخت جواب تھا جس میں ظاہری آداب و اخلاق کو بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ میں اس مضمون کو پڑھ کر لرز گیا اور کئی مرتبہ میرے لبوں پر یہ مصرعہ آ گیا۔

مشکل بڑی پڑے گی برابر کی چوٹ ہے

لیکن خاں صاحب نے خاموشی اختیار کر لی۔ دونوں قلم کار ذی علم و ذی احترام۔ میں نے مدیرِ 'ایوانِ اُردو' کو ایک خط لکھا جو ستمبر 1998 کے شمارے میں شائع ہوا۔ خط حسبِ ذیل ہے:

''ایوانِ اُردو' کے تازہ شمارے میں پروفیسر نیّر مسعود صاحب کا مراسلہ نما مضمون نظر سے گزرا۔ نیّر صاحب اور رشید حسن خاں صاحب دونوں میرے کرم فرما ہیں اور دونوں بزرگوں کا ان کی علمی خدمات اور ایک خاص ذہنی معیار کے سبب میرے دل میں بڑا احترام ہے، لیکن ان کے مضمون کے تیور دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا۔ ایک معاصر دوسرے معاصر کے لیے کیسے رطب اللسان ہوتا ہے اس کا نمونہ نیّر صاحب کا تبصرہ 'فسانۂ عجائب' مرتبہ رشید حسن خاں مشمولہ 'کتاب نما' (دہلی) میں دیکھا تھا اور ایک معاصر اپنے معاصر کے لیے کیسے دل آزار بن جاتا ہے اس کا یہ دوسرا نمونہ ہے۔ ایک ہی قلم سے بہت مختصر سے وقت کے اندر دو متضاد تحریروں نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ بڑے لوگوں سے بڑے اخلاق کے مظاہرے کی توقع کی جاتی ہے۔ میری مودبانہ گزارش ہے کہ نیّر صاحب نے اگر اپنے خیلات پیش کرنے میں عجلت اور جذباتیت سے کام لیا ہے تو جناب رشید حسن خاں ایسا نہ کریں۔ اگر اس علم و فضل کے لوگ ایک

دوسرے کے لیے ادب واحترام کی تمام حدیں توڑ دیں گے تو ہم جیسے ادب کے طالب علم کس کو اپنا آئیڈیل بنائیں گے۔''

اسی شمارے میں پروفیسر عبدالحق (دہلی) اور لطیف صدیقی (لکھنؤ) کے مضامین شائع ہوئے جس میں انھوں نے نیّر صاحب کی تحریر کو جذباتی، غیر سنجیدہ، اور غیر علمی اسلوب کا حامل بتایا۔ دونوں مضمون نگاروں نے یہ تاثر بھی دیا کہ دراصل خاں صاحب کو یوپی اُردو اکیڈمی کے مولانا آزاد ایوارڈ ملنے سے لکھنؤ کے بعض حلقے رنجیدہ ہیں اور شاید یہ مضمون اسی رنجیدگی کے آنسوؤں سے لکھا گیا ہے۔ خیال رہے 1997 کا آزاد ایوارڈ خاں صاحب کو دیا گیا تھا جو ایک لاکھ روپے اور ایک توصیفی سند پر مشتمل تھا۔ اس سلسلے میں خاں صاحب نے مجھے جو خط لکھا اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ انھوں نے لکھا:

''میں 27 ستمبر (1998) کو دو ماہ کے بعد واپس آسکا۔ یہاں آپ کا خط محفوظ تھا۔ مطبوعہ خط پہلے ہی پڑھ چکا تھا، اس کا شکریہ! متعدد لوگوں نے مجھ سے میر صاحب (مراد پروفیسر نیّر مسعود) کے لب ولہجے کی شکایت کی۔ انھوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے میرا کچھ نہیں بگڑا۔ علمی مسائل تبرّائی زبان میں زیر گفتگو نہیں آسکتے۔ آپ محمد شاہ رنگیلے کی خرابیوں کو بیان کیجیے کوئی دہلی والا بُرا نہیں مانے گا۔ یہ نہیں سمجھے گا کہ دہلی کی تہذیب کو بُرا کہا جا رہا ہے۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کے کسی مسخرے حکمراں (نصیرالدین حیدر یا واجد علی شاہ) کی واقعی خرابیوں پر کچھ کہیے، سمجھا جائے گا کہ پورے لکھنؤ، لکھنوی تہذیب اور شیعہ کمیونٹی پر حملہ کیا گیا ہے۔ یہ وہی اقلیت کی نفاست ہے جس میں لسانی یا مذہبی اقلیتیں اکثر مبتلا رہتی ہیں۔

بہ ہر طور اس کے بعد سے بھی مجھ سے اُن (مراد نیّر مسعود) مراسلت حسبِ سابق برقرار رہے۔ اِدھر پُرسشِ احوال کے دو خط یکے بعد دیگرے آئے ہیں۔ مشیر لکھنوی کی ہرسیہ گوئی مشہور ہے۔ میرے بھائی نے نثری ہرسیہ لکھا ہے۔ خیر، یہ ان کا معاملہ ہے، وہ جانیں۔ 'ایوانِ اُردو' میں لطیف صدیقی کی تحریر آپ نے پڑھی ہوگی اُن کا خط بھی میرے پاس آیا تھا۔ میں نے مزید کچھ لکھنے سے منع کر دیا۔ غیر علمی باتیں جس قدر کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ مرحوم سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، مولانا نجم الغنی خاں کو 'نجم الغبی' کہا کرتے تھے۔ یوں کہ انھوں نے پوست کنندہ حالات لکھے ہیں 'تاریخ اودھ' میں۔

ہاں! 'کتاب نما' کا حالیہ شمارے میں جین صاحب کا تبصرہ مثنویاتِ شوق پر پڑھا؟ اصلاً یہ سارا معاملہ اُس مولانا آزاد ایوارڈ کا تھا۔ اکبر حیدری نے کراچی کے 'طلوعِ افکار' میں بھی کچھ گل افشانی فرمائی ہے۔ انعام کا اعلان ہوتے ہی یہی تحریر انھوں نے 'قومی آواز' میں چھپوائی تھی۔ لب لباب یہ تھا کہ بڑے غیر مستحق شخص کو اب کے یہ انعام دیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ روزانہ نیّر مسعود صاحب کے یہاں جاتے ہیں۔ خیر حیدری صاحب کو میں غیر مکلّف مانتا ہوں بہ لحاظ تحقیق۔ یوں وہ کیا اور ان کی بات کیا۔''

(خط مکتوبہ 4 اکتوبر 1998)

اس سلسلے میں ایک خط اور لکھتے ہیں:

''میں نے اس ایوارڈ کے ملنے کے جواب میں انٹرویو میں (مطبوعہ 'انقلاب' بمبئی، 13 ر اکتوبر، 1998) جو کچھ کہا (سچی بات) اس پر بھی اب اہلِ لکھنؤ خوش نہیں، نہ ہوں، بریشم قلندر۔ وہاں سے دو خط آئے ذاتی۔''

(خط مکتوبہ 28 اکتوبر 1998)

جولائی 1997 میں انھوں نے میرے علمی مقالے 'نظامی بدایونی...' پر تبصرہ لکھ کر مجھے بھیجا۔ اس نوٹ کے ساتھ کہ آپ 'جہاں چاہیں' اور 'جس طرح چاہیں' چھپوا سکتے ہیں۔ جہاں چاہیں کا مفہوم واضح تھا، لیکن 'جس طرح' کا مفہوم میں نے یہی سمجھا کہ تبصرے کے ناپسندیدہ حصے کو حذف کیا جا سکتا ہے۔ میں نے تبصرہ من وعن 'ایوانِ اُردو' (دہلی) کو بھیج دیا جو نومبر 1997 کے شمارے میں شائع ہوا۔ خاں صاحب نے ملاحظہ فرمایا۔ فون پر بات ہوئی، کہنے لگے لگتا ہے تبصرہ آپ کو پسند آیا۔ میں کہا جی ہاں۔ کہنے لگے لوگ غلطیوں اور تسامحات کی نشان دہی پر ناراض ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اسے من وعن شائع کر کے علمی اخلاق کا ثبوت دیا۔ آپ سے یہی توقع تھی۔ خاں صاحب نے اس تبصرے میں صرف دو مقامات کی گرفت کی تھی، باقی حصہ سراسر توصیفی تھا۔ انھوں نے تبصرے میں لکھا:

''پچھلے بیس پچیس برسوں میں دانش گاہوں سے جن مقالات پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے ان میں جو چند مقالے تحقیق کے نقطۂ نظر سے قابلِ ذکر قرار دیے جائیں گے ان میں یہ مقالہ بھی شامل ہوگا اور ہونا بھی چاہیے۔''

سطور بالا میں جو کچھ مذکور ہوا اس کا تعلق یا تو فون پر کی گئی گفتگو سے ہے یا نصف ملاقات یعنی خط کتابت سے۔ ان سے بالمشافہ ملاقاتیں کم ہوئیں۔ باوجود اس ذہنی قربت، ہم خیالی اور محبت کے ملاقات کے مواقع بہت کم حاصل ہوئے۔ ایک خط میں انھوں نے کس خوب صورت پیرائے میں لکھا ہے:

''بریلی آنا نہیں ہو پاتا، یوں کہ بہت قریب ہے قربت کے یہ کرشمے اکثر دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ آدمی اپنے سے قریب بھی اسی لیے نہیں ہو پاتا کہ وہ اپنے سے دور نہیں ہوتا۔ اسی لیے تصوف میں عرفانِ ذات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ بہر صورت کبھی توفیق ہوگی۔''

(خط مکتوب 14 اگست 1996)

''بمبئی شاید دو چار ماہ میں پھر جانا ہوگا۔ اچھا ہے اس درمیان آپ لوگوں سے دو چار بار ملاقات ہو جائے۔ معلوم نہیں پھر کب اور کہاں ملاقات ہو۔''

(خط مکتوبہ 28 اکتوبر 1998)

خاں صاحب سے پہلی ملاقات دسمبر 1995 میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی میں سہ روزہ سمینار (22 تا 24 دسمبر) کے دوران ہوئی۔ اس ملاقات میں انھوں نے محبت و شفقت کے جتنے جام تھے سبھی لنڈھا دیے۔ انھوں نے سمینار میں مجھے خود سے علاحدہ نہیں ہونے دیا۔ دو پہر کا کھانا بھی ساتھ ہی کھایا۔ میں مرغ و بریانی کے مزے لے رہا تھا ،انھوں نے محض سبزیوں کے سلاد پر قناعت کر لی تھی۔ سمینار کے مختلف اجلاسوں میں بھی وہ مجھے اپنے پاس بیٹھنے کی تاکید کرتے رہے۔ گفتگو کے دوران وہ میری ذہنی سطح، مطالعے اور مشاہدے، مزاج و نفسیات کو ماہرانہ انداز میں جانچتے اور آنکتے رہے۔ انھوں نے متعدد علمی موضوعات پر گفتگو کی۔ اُس وقت وہ دہلی یونی ورسٹی کے گوائر ہال میں رہتے تھے۔ سمیناروں کے اجلاسوں میں وہ شریک ہوتے اور شام کو واپس چلے جاتے۔

2 فروری 1996 کو وہ تمام اسباب لے کر دہلی سے شاہ جہاں پور آ گئے اور یہیں انھوں نے اپنے گھر پر لکھنے پڑھنے کی بساط بچھا دی۔ اس دوران انھوں نے بہت کام کیا ۔اُن سے مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔

میں 7 اکتوبر 1997 کو ملاقات کے لیے شاہ جہاں پوران کے دولت کدے پر حاضر ہوا، بہت خوش ہوئے اور بڑی تواضع کی۔ چلتے وقت تین کتابیں نذر کیں:

- مثنوی زہرِ عشق جدید تحقیق و تبصرہ کی روشنی میں از عشرت رحمانی، عکسی کاپی
- مقالاتِ صدیقی، جلد اوّل، از عبدالستار صدیقی، مطبوعہ یوپی اُردو اکیڈمی، لکھنؤ، 1983
- نجوم الفرقان فی اطرافِ القرآن (بہ زبان فرنچ) از گستووس فلیجل، مطبوعہ 1898

موخرالذکر قرآن کریم کے الفاظ کا اشاریہ ہے۔

خاں صاحب کا گھر سادہ سا بنا ہوا تھا۔ جس کمرے میں، مَیں بیٹھا ہوا تھا، اس کی نوعیت ڈرائنگ روم کم ریڈنگ روم کی سی تھی۔ چاروں طرف الماریوں میں کتابیں سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ سینٹر ٹیبل کے پاس ہی کسی چھوٹی ٹیبل یا اسٹول پر ادبی رسائل سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ کمرے میں ایک طرف ریڈنگ ٹیبل تھی جو ضخیم لغات کی جلدوں سے لدی ہوئی تھی۔ اسی ٹیبل پر پین اسٹینڈ میں بہت سے پین اور داہنہ طرف ایک ٹیپ ریکارڈر اور بہت سے کیسٹ رکھے ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر کمرہ کتابی ماحول پیش کر رہا تھا۔ میں نے بڑی حیرت اور استعجاب سے پوچھا۔ جناب! ٹیبل پر ٹیپ ریکارڈر کا موجود ہونا آپ کا اس سے غیر معمولی شغف ظاہر کرتا ہے۔ کہنے لگے ہاں بھئی، لکھتے پڑھتے وقت میں ہلکی میوزک یا غزلیں سننے کا عادی ہوں۔ اس سے تکان نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ میوزک آپ کے مطالعے یا تحریر میں خلل انداز نہیں ہوتی۔ کہنے لگے بالکل نہیں۔ یہ پُرانی عادت ہے۔

ایک مرتبہ پھر 1997 میں میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سمینار میں ملاقات ہوئی۔ اس مرتبہ وہ شاہ جہاں پور سے دہلی تشریف لائے تھے۔ ایک اجلاس میں ان کی صدارت اور میری نظامت تھی۔ اجلاس کے اختتام کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا'' آپ نے نظامت اچھی کی، الفاظ کی ادائگی بھی ٹھیک تھی مگر ایک لفظ کا تلفظ وہ نہیں ہے جو آپ نے ادا کیا۔ بھائی صحتِ تلفظ کا بھی خیال رکھیے۔''

جولائی 1998 میں رضا لائبریری رام پور کے سمینار میں بھرپور ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں یہ طے پایا کہ ہر ماہ ایک نشست بریلی میں رکھی جائے اور خاں صاحب اس میں بطورِ خاص شریک ہوں۔ چناں چہ وہ میری دعوت پر 8 نومبر 1998 کو بریلی تشریف لائے اور میرے غریب خانے پر دن گزار کر شام کو شاہ جہاں پور واپس ہو گئے۔ اس موقع پر وہ میرے لیے اپنی تین تصانیف بھی لائے تھے۔ میں نے ان کی ذہنی ضیافت کے علاوہ ذہنی ضیافت کے لیے مقامی ادیبوں اور ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، ڈاکٹر مصطفیٰ خاں نظامی، محمد عرفان، سید آفتاب علی، قنبر سعید اور چند اُردو دوستوں ڈاکٹر اطہر جمال، فاروق احمد وغیرہ کو مدعو کیا تھا۔ بہت اچھی اور کامیاب نشست رہی۔ تقریباً دو گھنٹے کی اس نشست میں املا، تلفظ اور زبان کے بہت سے مسائل زیرِ گفتگو آئے۔ رشید صاحب کی گل افشانیِ گفتار دیکھنے کی تھی۔ ذہنی ضیافت اور گل افشانیِ گفتار کا ذکر آیا تو ان کے دو خطوں کے یہ مختصر اقتباس بھی ملاحظہ کیجیے:

> ''محض اطلاعاً یہ لکھ رہا ہوں کہ حنیف نقوی صاحب یہاں جو آئے تھے تو بدایوں سے پیڑوں کا ڈبّا ساتھ لے کر آئے تھے۔ بریلی آنے کی ایک شرط یہ ضرور ہو گی کہ پہلی بار (صرف پہلی بار) یہی ڈبّا ملنا چاہیے۔ یہ محض اس لیے کہ سگونِ آغاز اچھا ہو۔ آپ بریلوی ہونے کے ناتے اصرار کریں گے تو اس پر اعلا حضرت کی فاتحہ بھی ہو جائے گی۔ مقصد یہ ہے کہ آپ خوش رہیں۔''
>
> (خط مکتوب 28 اکتوبر 1998)
>
> ''انڈا، مکھن، گوشت؛ بس ان سے پرہیز ہے اور کچھ نہیں۔''
>
> (خط مکتوب 2 نومبر 1998)

اُن سے جب سے تعلق قائم ہوا تب سے انھوں نے اپنی ہر نئی کتاب دستخط کر کے مجھے ضرور بھیجی اور میری حقیر رائے جاننے کے بھی خواہش مند رہے۔ میں نے ان کی دو

کتابوں 'مثنویاتِ شوق' اور 'زٹل نامہ' پر تبصرے لکھے جو بالترتیب 'ہماری زبان' دہلی (اگست سے اکتوبر 1998 کے درمیان) میں شائع ہوئے۔ اوّل الذکر تبصرے کو انھوں نے پسند فرمایا اور ڈھیر ساری دُعائیں دیں۔ لیکن دوسرے تبصرے کو پڑھ کر وہ کچھ کبیدہ خاطر ہو گئے اور کچھ دن فون پر 'ہاں ٹھیک ہوں' تک گفتگو محدود رہی۔ پھر وہ گفتگو بھی بند ہو گئی۔ اس تبصرے میں میرے درج کردہ تسامحات ان کی رنجیدگی کا باعث نہیں تھے بل کہ رنجیدگی کا باعث میری وہ عبارت تھی جس میں میں نے لکھا تھا کہ رشید صاحب نے طویل بیماری کے سبب یہ کام عجلت میں کیا ہے اور ان کے دوسرے تدوینی کاموں سے یہ فروتر ہے۔ آخر آٹھ نو ماہ بعد ان کا فون آیا۔

شمس صاحب میں رشید حسن خاں بول رہا ہوں۔ آپ تو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ سچ سچ بتائے آپ مجھ سے ناراض کیوں ہیں؟ میں نے کہا قبلہ میں آپ سے ناراض ہونے کی جسارت کیسے کر سکتا ہوں۔ آپ تو میرے بزرگ ہیں، محسن ہیں کہنے لگے دیکھئے منافقانہ باتیں نہ کیجیے۔ سچ۔ سچ بتائے آپ اب فون کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا جانے بھی دیجیے۔

میری	ان	کی	کوئی	لڑائی	ہے
اب	چلا	جاؤں	اب	صفائی	ہے

کہنے لگے، خیر جانے دیا۔ لیکن رابطہ ضرور رکھیے۔ میرے دل میں آپ کی بری قدر ہے۔ دل کے معاملات تھوڑے بہت آپ بھی جانتے ہوں گے؟ آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟

(2)

رشید حسن خاں کی حیات، شخصیت اور تحقیقی و تنقیدی کام ہر طرح کے پیشہ ورانہ تصور سے خالی تھا۔ انھوں نے تحقیق کے جو پیمانے بنائے تھے، ان پر سود و زیاں سے بالاتر ہو کر تحقیقی کام نہایت تحمل اور صبر و ضبط کے ساتھ کرتے رہے۔ انھوں نے جو کام بھی کیا ہے وہ ہماری تاریخ ادب کا زریں باب ہے۔ سطور ذیل میں ان کی حیات و خدمات کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

اضلاع روہیل کھنڈ میں شاہ جہاں پور، بریلی اور رام پور میں پٹھانوں کے خیل (گروہ) کثرت سے آباد ہوئے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسویں میں روہیلوں کے عروج اور ان کی ریاست کے قیام کے زمانے میں افغانستان اور صوبہ سرحد سے کافی تعداد میں پٹھان ان علاقوں میں وارد ہوئے اور یہیں بس گئے۔ رشید حسن خاں بھی بقول ان کے بیٹے خورشید حسن خاں نسلاً یوسف زئی تھے اور اپنے طور و طریق میں مکمل پٹھان تھے۔ وہ پٹھانوں کی فطرت سے بہ خوبی آشنا تھے، جس کا ذکر بھی نہایت دل چسپی سے کرتے تھے۔ انھوں نے رضا لائبریری رام پور میں منعقد سمینار (25 تا 28 جولائی 1998) بہ عنوان 'روہیل کھنڈ کی تاریخ ثقافت اور ادب' میں شاہ جہاں پور میں آباد پٹھانوں پر ایک مضمون پڑھا تھا جو بعد میں کسی رسالے میں شائع ہوا، اس کی اشاعت کے بعد شاہ جہاں پور کے کسی خاں صاحب نے اس کا جواب 'کتاب نما' دہلی میں لکھا تھا۔ اس وقت یہ شمارے پیش نظر نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس مضمون میں خاں صاحب نے اپنے خان دان کے بارے میں بھی کچھ تفصیلات ضرور دیں ہوں گی۔

خاں صاحب کے والد کا نام امیر حسن خاں تھا، جو محکمۂ پولس میں داروغہ تھے۔ انگریزوں اور انگریزی تعلیم کو بُرا سمجھتے تھے۔ انھوں نے تحریک عدم تعاون کے زمانے میں نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

رشید حسن خاں کی تاریخ پیدائش از روئے تعلیمی اسناد 10 جنوری 1930 لکھی جاتی رہی ہے۔ (رشید حسن خاں، اطہر فاروقی، دہلی 2002 ص، 9) جو غلط معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ 1939 میں انھوں نے شاہ جہاں پور کی آرڈیننس فیکٹری میں مزدور کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ ظاہر ہے 9 سال کی عمر میں تو فیکٹری میں ان کو ملازم نہیں رکھا گیا ہوگا۔

خاں صاحب یکم اگست، 1998 کو بمبئی علاج کے لیے گئے تھے۔ اسی زمانے میں روز نامہ 'انقلاب' بمبئی کے لیے ڈاکٹر صاحب علی نے ان سے انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو (مطبوعہ 13 اکتوبر 1998) میں خاں صاحب کے تعارف میں ادارے کی طرف سے جو نوٹ دیا گیا تھا اس میں خاں صاحب کی تاریخِ پیدایش دسمبر 1925 درج کی گئی تھی۔ اخبار کا تراشہ خاں صاحب نے خود مجھے بھیجا تھا اور اس میں کتاب کی غلطیوں کی بھی نشان دہی کی تھی۔ اگر یہ تاریخ غلط ہوتی تو خاں صاحب یا تو اسے قلم زد کرتے یا اس سے مطلع کرتے۔ علاوہ ازیں 'شاعر' بمبئی کے ہم عصر اُردو ادب نمبر جلد: 1، 98-1997 میں خاں صاحب کا ایک مضمون شامل ہے۔ اس نمبر کے لیے افتخار امام صدیقی نے مضمون سے ان کے سوانحی کوائف بھی طلب کیے تھے جو اس نمبر میں سوانحی لغت کے تحت شامل کیے گئے۔ رشید حسن خاں اور بعض دوسرے قلم کاروں کے کوائف تاخیر سے موصول ہوئے، انھیں ضمیمہ کے طور پر اس سوانحی لغت میں شامل کیا گیا۔ خاں صاحب کے کوائف اس نمبر میں صفحہ 1194 پر درج ہیں جس میں تاریخ پیدائش اس طور مرقم ہے: پیدائش: 10 جنوری 1930 (اصلاً 25 دسمبر 1925)۔ لہٰذا طے ہے کہ ان کی صحیح تاریخ پیدایش 25 دسمبر 1925 ہے۔ اس سال پیدایش سے ان کی ملازمت کے آغاز کا سنہ بھی درست قرار پاتا ہے۔ یعنی وہ بوقتِ ملازمت چودہ سال کے تھے۔

خاں صاحب کی ملازمت کو بھی باضابطہ نہیں کہا جا سکتا۔ اولاً ان کا داخلہ شاہ جہاں پور کے عربی مدرسے بحر العلوم میں کرایا گیا تھا، لیکن وہ درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کر سکے اور معاشی حالات اچھے نہ ہونے کے سبب ملازمت پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے پرائیویٹ طور پر اُردو، عربی، فارسی کے امتحانات پاس کیے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی سے دبیر کامل اور الہ آباد بورڈ

سے مولوی کا امتحان پاس کیا۔ وہ کثرتِ مطالعہ سے اپنے علم میں برابر اضافہ کرتے رہے۔ باضابطہ یونی ورسٹی ایجوکیشن سے محروم رہے 1947 میں وہ آرڈیننس فیکٹری سے برطرف کر دیے گئے۔ ملازمت سے برطرف کیے جانے کا سبب خاں صاحب کا مزدور یونین میں جوائنٹ سکریٹری کا عہدہ قبول کرنا تھا۔ اس فیکٹری میں تیس ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے۔

اُس وقت وہ شادی شدہ تھے۔ 1944 ان کی شادی خان دان ہی کے ایک فرد منظور علی خاں کی بیٹی نفیس بیگم سے ہوئی تھی، جن کے بطن سے ایک بیٹی پیدا ہو کر آٹھ نو ماہ بعد فوت ہو گئی تھی۔ بے روزگاری، اولاد کا پہلا غم لیکن وہ ہمت نہیں ہارے۔ انھوں نے کچھ دن مدرسہ فیض عام شاہ جہاں پور میں عربی و فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں۔ یہ ملازمت مدرسے کی فضا سے ذہنی و عملی مناسبت نہ ہونے کے سبب قائم نہ رہ سکی۔ کچھ مدت انگریزوں کو کھانے کی اشیا سپلائی کرنے کے لیے اشیائے خوردنی کی دکان کھولی، مگر اس میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر ترکِ وطن کیا۔ اہلیہ کو میکے بھیجا اور خود بریلی آ گئے اور ایک مقامی ہفتہ وار اخبار 'ندرت' کے دفتر میں ملازمت کر لی۔

ہفتہ وار 'ندرت' (بریلی) کے مالک و مدیر سید ابراہیم حسن رسؔا بریلوی (ف 1987) تلمیذ دلؔ شاہ جہاں پوری تھے، جنھوں نے 1947 میں ہفتہ وار 'ندرت' کا اجرا کیا تھا۔ 'ندرت' کا دفتر رسؔا کے رہائشی مکان واقع محلہ شاہ آباد بریلی میں تھا۔ ملازمت کی نوعیت کا پتا نہیں چلا۔ بزرگ ادیب ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب (پ 10 جون 1931) جو اُن دنوں شاہ آباد محلّے میں رہتے تھے، نے بتایا کہ خاں صاحب کا قیام رسؔا کے رہائشی مکان ہی میں تھا۔ خاں صاحب کے ساتھ شاہ جہاں پور کے ایک اور شخص حباب ترمذی بھی کبھی کبھی نظر آتے تھے۔ مولوی رئیس الدین وکیل کی کوٹھی واقع محلّہ شاہ آباد میں شہر کے متعدد شعرا مثلاً عبداللطیف راز (ف 1993)، انور چغتائی (ف 2005) ابراہیم حسن رسا (ف 1987) سید عابد حسین کلیم وغیرہ جمع ہوتے تھے۔ ان شعری نشستوں اور مشاعرہ نما بڑی محفلوں میں رشید حسن خاں بھی شرکت کرتے تھے۔ یہ 1950 کے بعد یا قریب کا زمانہ رہا ہوگا۔ راقم الحروف نے رشید حسن خاں کے بیٹے خورشید حسن خاں سے اس ملازمت کی تفصیل جاننی چاہی تو انھوں نے فون پر بتایا:

> ''میری والدہ بتاتی تھیں کہ یہ تمھاری ولادت (16 اپریل، 1953) سے پہلے کی بات ہے جب تمھارے والد بریلی میں ملازمت کرتے تھے۔ تقریباً ساڑھے تین سال وہ بریلی میں ملازم رہے، اس کے بعد شاہ جہاں پور آ گئے۔''

سید ابراہیم حسن رسؔا مدیر 'ندرت' کے بھائی سید عابد حسن کلیم (پ 1925) خاں صاحب کے ہم عصر ہیں اور ابھی حیات ہیں، انھیں آنکھوں سے بہت کم سوجھتا ہے۔ ان سے خاں صاحب کی 1960 سے 1970 کے دہے میں لگاتار خط و کتابت رہی۔ 1962 سے 1965 کے درمیان کے بعض خطوط جو فوری طور پر وہ تلاش کر سکے، انھوں نے راقم الحروف کو عنایت کیے۔ ان کی تعداد گیارہ ہے۔ ان خطوط کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ دہلی میں ملازمت کے دوران بھی خاں صاحب کلیم صاحب سے ملنے کے لیے بریلی آتے تھے۔ یہ خطوط دوستانہ و مخلصانہ روابط پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کلیم صاحب نے خاں صاحب کے بریلی میں قیام کے سلسلے میں بتایا:

> ''رشید حسن خاں میرے بھائی سید زاہد حسن کے ساتھ آرڈیننس فیکٹری میں ملازمت کرتے تھے۔ دونوں میں باہمی اتحاد و اُنس تھا۔ خاں صاحب عملاً بائیں بازو کے ٹریڈ یونینسٹ تھے، ملازمت سے برطرف ہو جانے کے بعد زاہد حسن کے ذریعے بریلی آ کر روپوش ہو گئے، جہاں میرے اہلِ خانہ نے تقریباً ڈیڑھ دو برس کفالت کی۔ وہ اپنا وقت ہم اہلِ خانہ اور اہلِ محلّہ کی مصروفیتوں میں ہاتھ بٹا کر اور شریک ہو کر گزارتے۔ خاں صاحب محلّے کی ایک آٹا چکی پر بھی بیٹھتے تھے اور اس کا حساب لکھ دیا کرتے تھے۔ محلّے کے بچوں کو بھی پڑھا دیا کرتے تھے۔ یہ سارے کام وہ بغیر اجرت کرتے تھے۔ خاں صاحب نے یہ وقت انتہائی تنگ دستی، تکلیف مگر استقلال اور خودداری کے ساتھ گزارا۔ ڈیڑھ دو برس بعد ان کی شاہ جہاں پور واپسی ہوئی۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی کوشش سے انھیں دہلی یونی ورسٹی میں سروس مل گئی۔ اس کے بعد ان کے خوش گوار دن لوٹ آئے۔''

مذکورہ بالا روایتیں زبانی ہیں جن میں قیامِ بریلی کی نوعیت اور زمانۂ قیام کی مدت میں واضح اختلاف ہے۔ جب تک ان کی سند نہ ملے حتمی طور پر اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں یہ درست ہے کہ 1950 کے آس پاس وہ بریلی میں قیام پذیر رہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے فون پر چکّی پر کام کرنے کی تصدیق کی اور بتایا کہ پاکستان میں دیے گئے کسی انٹرویو میں خاں صاحب نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ دہلی یونی ورسٹی کی ملازمت کے سلسلے میں ڈاکٹر قمر رئیس کی سعی و کوشش کی بھی تصدیق ہو گئی۔ خود ڈاکٹر قمر رئیس نے اس سلسلے کی تفصیل اپنے مضمون میں دی ہے جو 'اُردو دُنیا' دہلی کے 'گوشۂ رشید حسن خاں' میں شامل ہے۔

بریلی سے واپس شاہ جہاں پور آ کر ایک مرتبہ پھر مدرسہ فیض عام میں مدرسی کے فرائض انجام دیے۔ کچھ مدت بعد اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول شاہ جہاں پور میں فارسی و عربی کے اُستاد کی جگہ خالی ہوئی، اس جگہ پر خاں صاحب کا انتخاب کر لیا گیا۔ 1959 کے وسط تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ اگست 1959 میں شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر ان کا تقرر ہوا۔ یہ تقرر عارضی تھا۔ 1964 میں اسے کل وقتی منظوری حاصل ہو گئی۔ تقریباً تیس سال دہلی میں ملازمت کرنے کے بعد 31 دسمبر 1989 کو وہ اسی عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ایک مدت تک وہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ انھیں دہلی میں رہنا چاہیے یا واپس اپنے وطن لوٹ جانا چاہیے۔ آخر 2 فروری 1996 کو وہ دہلی سے مستقل طور پر شاہ جہاں پور آ گئے (مکتوب بنام راقم) اور لکھنے پڑھنے کے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ چند سال پیش تر ان کو ذیابیطس کا مرض لاحق ہو گیا تھا جس کے زیرِ اثر انجائنا کا شکار ہوئے۔ ادبی کام اس حال میں بھی جاری رکھا۔ سیمیناروں میں شرکت بند کر دی تھی۔ متقاعد زندگی گزار رہے تھے۔ 29 مارچ 2003 کو ان کی اہلیہ نے وفات

پائی۔ اس صدمے کا انھوں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ بالآخر 26 فروری 2006 کو ان کا بھی وقتِ موعود آ پہنچا۔ پس ماندگان میں انھوں نے دو بیٹے خورشید حسن خاں و خالد حسن خاں اور ایک بیٹی نادرہ بیگم زوجہ مقصود حسن خاں یادگار چھوڑیں۔ خاں صاحب کے دونوں بیٹے اُردو ٹیچر ہیں۔

خاں صاحب نے ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً 32 کتابیں تالیف کیں۔ 13 کتابیں مکتبہ جامعہ، دہلی کے لیے ترتیب دیں۔ جن میں سے چند دستیاب نہیں ہو سکیں۔ مطبوعہ کتب کے اسما مع سنین و مقامِ اشاعت حسبِ ذیل ہیں:

- باغ و بہار (دہلی 1964)
- مقدمہ شعر و شاعری (دہلی 1969)
- انتخابِ نظیر اکبرآبادی (دہلی 1970)
- انتخابِ شبلی (دہلی 1971)
- انتخاب مراثی انیس و دبیر (دہلی 1971)
- دیوانِ خواجہ میر درد (دہلی 1971)
- انتخابِ سودا (دہلی 1972)
- انتخابِ ناسخ (دہلی 1972)
- اُردو املا (دہلی 1974 مختلف سنوں میں دو اڈیشن اور شائع ہوئے)
- اُردو کیسے لکھیں (دہلی 1975)
- زبان اور قواعد (دہلی 1976، 1983)
- ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ (دہلی 1978 لکھنؤ سنہ نامعلوم، لاہور 1989)
- تلاش و تعبیر (دہلی 1988)
- فسانۂ عجائب (دہلی 1990، لاہور 1990، دہلی 1996)
- باغ و بہار (دہلی 1992، لاہور 1992)
- تفہیم (دہلی 1993)
- انشا اور تلفظ (دہلی 1994)
- عبارت کیسے لکھیں (دہلی 1994)
- انشائے غالب (دہلی 1994 کراچی 2001)
- مثنوی گلزارِ نسیم (دہلی 1995)
- انتخابِ کلام ناسخ (کراچی 1996)
- مثنویاتِ شوق (دہلی 1998 کراچی 1998)
- تدوین تحقیق روایت (دہلی 1999)
- املائے غالب (دہلی 2000)
- مثنوی سحرالبیان (دہلی 2000)
- مُصطلحاتِ ٹھگی (دہلی 2002)
- زٹل نامہ (دہلی 2003)
- کلاسیکی ادب کی فرہنگ جلد اول (دہلی 2003)

ان کا آخری تدوینی کام 'لفظیاتِ غالب' ہے، انھوں نے 'گنجینۂ معنی کا طلسم' نام دیا ہے۔ یہ دو جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ تقریباً 1500 صفحات پر، غالبؔ کے اُردو کلام میں مستعمل الفاظ کے نوعیتِ استعمال پر بحث کی گئی ہے۔ جلد اول جس کی کتابت ہو چکی ہے، جلد ہی انجمن ترقی اُردو ہند (ہند) شائع کرے گی۔

تین کتابیں 'غرائب اللغات'، 'امراؤ جان ادا' اور 'قصائد سودا' کی تدوین بھی ان کے پیش نظر تھی۔ اس سلسلے کا مواد وہ برابر اکٹھا کر رہے تھے لیکن ان پر کام کرنے کی

نوبت نھیں آسکی۔اقبال اکیڈمی (لاہور) کے ایما پر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے اشتراک سے اقبال کے جملہ کلام کی تدوین کا پروگرام بھی زیرِ غور تھا۔اس سلسلے میں اقبال کے مجموعۂ کلام 'زبورِ عجم' کا خطی نسخہ بقلم اقبال کا عکس بھی انھوں نے حاصل کرلیا تھا۔بعض اور خطی اور مطبوعہ نسخے ان کو مطلوب تھے جن کے بارے رفیع الدین ہاشمی سے مستقل رابطہ تھا۔

خاں صاحب جے پسندیدہ موضوع ادبی تحقیق اور تدوین رہے ہیں۔لیکن ادب میں ان کا اختصاص ادبی تحقیق اور تدوینِ متن کے ساتھ ساتھ املا، لغت، زبان وقواعد کے مسائل اور عروض بھی رہے ہیں۔ان کی جملہ تصانیف ان موضوعات میں سے کسی نہ کسی کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔

خاں صاحب نے ہندو پاک کی مختلف جامعات میں اصولِ تحقیق وتدوین اور مشرقی شعریات پر تقریباً دو درجن لکچر دیے۔املا پر متعدد ورکشاپ کنڈکٹ کیں۔شعبۂ اُردو جموں یونی ورسٹی اور شعبۂ اُردو بمبئی یونی ورسٹی میں بہ حیثیت وزیٹنگ فیلو متعینہ مدت میں لکچر دیے۔

خاں صاحب کو ملک اور بیرون ملک کے تقریباً ایک درجن انعامات واعزازات سے نوازا گیا۔مثلاً دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ، 1977، غالب ایوارڈ 1979، نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی) 1989، محمد طفیل ادبی ایوارڈ (لاہور) 1990 کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ 1991، ابوالکلام آزاد ایوارڈ 1997۔

ڈاکٹر خلیق انجم رشید حسن خاں صاحب کے بہت پُرانے ساتھی تھے۔خلیق انجم صاحب رشید حسن خاں صاحب سے تقریباً پچیس تیس سال قریب رہے۔یہ وہ زمانہ تھا جب خاں صاحب دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ملازم تھے اور جب خاں صاحب 1996 میں شاہ جہاں پور واپس چلے گئے تو ان دونوں کے تعلقات خطوط کے ذریعے بدستور قائم رہے۔ڈاکٹر خلیق انجم نے کوشش کی کہ رشید حسن خاں صاحب کی 'باغ و بہار' اور اس کے بعد کی تمام کتابیں انجمن ہی سے شائع ہوں۔ڈاکٹر خلیق انجم نے انجمن کی ادبی کمیٹی سے یہ بھی منظور کرالیا کہ خاں صاحب کی کسی بھی کتاب کے مسودے کو اشاعت کی منظوری حاصل کرنے کے لیے کمیٹی کے سامنے نہ رکھا جائے اور نہ ہی ان کی کتاب رائے کے لیے کسی ایکسپرٹ کو بھیجی جائے بل کہ مسودہ حاصل ہوتے ہی بغیر کسی تاخیر کے طباعت کے لیے دے دیا جائے۔کہا جاتا ہے کہ خاں صاحب کی ایک کتاب ابھی تیار بھی نہیں ہوتی تھی کہ ڈاکٹر خلیق انجم اس سے اگلی کتاب تجویز کردیا کرتے تھے۔چوں کہ رشید حسن خاں ڈاکٹر خلیق انجم کی ادبی اور انتظامی صلاحیتوں کے معترف تھے اس لیے ان کو انکار کرتے نہ بنتی۔ڈاکٹر انجم نے انجمن کی ادبی کمیٹی سے یہی بڑا فیصلہ کرایا تھا کہ مسودہ وصول ہوتے ہی طباعت کے لیے بھیج دیا جائے۔انجمن کی تاریخ کا یہ سب سے انوکھا فیصلہ تھا جو ہر لحاظ سے مفید مطلب ثابت ہوا۔

ایک مصنف کی کتاب اگر اشاعت سے محروم یا اس کی اشاعت میں توقف یا التوا پیدا ہوجائے تو اس کے آیندہ کے تصنیفی منصوبے متاثر ہوجاتے ہیں۔خاں صاحب اس معنی میں خوش نصیب مصنف تھے کہ ان کی ہر نئی کتاب تصنیف وتکمیل کے دوران ہی اشاعت کے مراحل طے کرنے لگتی تھی۔خاں صاحب کو اشاعت کے مراحل سے بے نیاز کرنے اور ان کے خاص اختیار کردہ املا، توقف نگاری، اعراب نگاری کو برقرار رکھنے کی انجمن نے جو مثال قائم کی اس کے لیے وہ تمام اُردو برادری کے شکریے کے مستحق ہے۔

دو مصروعوں پر میں اپنی بات کو ختم کرتا ہوں:

تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

(ہفت روزہ، ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 28 ستمبر 2006، صفحہ 9-10 اور 30 تا 32)

○○○

رشید حسن خاں کی یاد میں

(پیدائش: 25 دسمبر 1925 تا وفات: 26 فروری 2006)

نکہت بریلوی

رشید حسن خاں حقیقی معنی میں ایک معتبر عالم تھے۔اعلا پائے کے محقق، صاحبِ بصیرت ناقد اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے اُردو دنیا انھیں بھلا نہیں سکے گی۔شاہ جہاں پور کا نام حضرت دلؔ شاہ جہاں پوری کے نام سے معروف تھا، رشید حسن خاں کے کام نے اس شہر کو اور روشن کردیا۔

رشید حسن خاں نے باقاعدہ کسی جامعہ سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ان کے پاس مروجہ تعلیم کی کوئی اعلا ڈگری نہیں تھی،لیکن علم وفضل کے اعتبار سے وہ جامعات سے اعلا ترین ڈگریاں رکھنے والوں کے مقابلے میں وہ بہت لائق وفائق صاحب عالم ثابت ہوئے۔ان کے حالات نے انھیں اس قابل ہی نہیں بنایا تھا کہ وہ کالج یا یونی ورسٹی میں داخل ہو کر نصابی ہو کر نصابی تعلیم حاصل کرتے۔انھیں اپنے کنبے کی کفالت کے لیے دن کا زیادہ وقت کسب معاش کی تگ ودو میں گزارنا ہوتا تھا۔شام کو گھریلو کام کاج سے فارغ ہو کر وہ میلوں پیدل سفر کر کے جید عالم مفتی مجتبیٰ حسن خاں کے حضور پیش ہو کر کسبِ فیض کرتے۔اُردو،فارسی اور عربی زبان وادب کی تعلیم مفتی صاحب ہی سے حاصل کی۔رشید حسن خاں کی تربیت میں بھی مفتی مجتبیٰ حسن خاں کے علم وتدبر کا بڑا دخل ہے۔

رشید حسن خاں سچے جویائے علم تھے۔انھوں نے اپنے پیش رو بزرگوں مثلاً حافظ محمود شیرانی،قاضی عبدالودود،ڈاکٹر عبدالستار صدیقی،مولانا عرشی اور علامہ نیاز فتح پوری سے بھی ان کے علم وذہانت سے استفادہ کیا۔دراصل یہ ان کے معنوی اُستاد تھے۔انھیں تحقیق سے فطری لگاؤ تھا۔اس کے لیے جس استقلال،مستعدی،دیدہ ریزی اور انہماک کی ضرورت ہوتی ہے،وہ خاں صاحب میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

خاں صاحب سے میری ملاقات 1948 میں ہوئی تھی۔اسلامیہ انٹر کالج کے سیکنڈری سیکشن میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔والد صاحب کی خواہش کے احترام میں شام کو باڑوزئی کے مدرسہ میں محترم مولوی دانش سے فارسی پڑھنے جاتا تھا۔اس وقت تک رشید حسن خاں ادبی افق پر نمودار نہیں ہوئے تھے۔شہر میں البتہ ادبی حلقوں میں ان کا چرچہ شروع ہو گیا تھا۔شہر کے نئے پرانے شعرا ان کی بے لاگ تنقید وتبصرے سے خائف رہتے تھے۔اس معاملے میں وہ کھرے پٹھان تھے۔شعر وادب کے سلسلے میں وہ بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوئے تھے۔ٹھوس علمی پیمانے سے ناپتے تھے۔جو کوتاہیاں اور کمزوریاں دیکھتے برملا بلا جھجک وہ بیان کر دیتے تھے۔مولوی دانش صاحب سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔اکثر شام کو آتے اور فارسی کے کلاسیکی ادب پر گھنٹوں گفت وشنید ہوتی۔مجھے ان سے مولوی صاحب ہی نے متعارف کرایا تھا۔

میرے بارے میں یہ بھی بتایا کہ اُردو ادب سے دل چسپی رکھتا ہوں اور اُردو کے افسانوی ادب کے مطالعے کا شوق ہے۔رشید حسن خاں نے غور سے مجھے دیکھا اور کہا،ادب سے دل چسپی بُری بات نہیں لیکن فی الحال زیادہ توجہ تعلم پر ہونا چاہیے۔وہ اس زمانے میں دبلے پتلے ہوتے تھے۔عام طور پر گرمی کے پورے موسم میں قمیض پاجامہ پہنتے تھے۔جاڑوں میں سوئٹر کا اضافہ ہو جاتا۔ہم نے انھیں ہر موسم میں بند جوتے کی بجائے کھلی چپلوں ہی میں دیکھا۔طالب علموں کے بہت شفیق دوست تھے۔حصولِ علم کی تلقین کرتے اور حسب ضرور تعلیم میں ان کی مدد بھی کرتے۔کئی بار یہ ہوا کہ مولوی صاحب کو آنے میں دیر ہوئی۔رشید حسن خاں آ گئے۔یا مولوی صاحب کسی اور کام میں یعنی عربی کے طلبہ کو کچھ سمجھانے بتانے میں مصروف ہوتے تو رشید صاحب نے کئی کئی بار مجھے فارسی گرامر کے اصول ورموز اس سادگی اور دل نشیں انداز میں سمجھائے کہ آج تک از بر ہیں۔

اکثر شام کے پہلے پہر میں،میں نے انھیں لال املی کے چوراہے کے کے علاقے میں پیامؔ شاہ جہاں پوری اور عروجؔ زیدی بدایونی کے ساتھ چہل قدمی کرتے دیکھا۔مجھے جب بھی ملتے شفقت سے پیش آتے۔بہادر گنج کے دارالمطالعہ میں ایک دن ملے تو دیکھ کر خوش ہوئے۔میرے ہاتھ میں ایم۔اسلم کے افسانوں کا کوئی مجموعہ تھا،وہ میرے ہاتھ سے لے کر لائبریرین کو دیا اور خود الماری سے ایک کتاب نکال کر لائے اور کہا،اسے جاری کرا لو۔وہ مرزا ہادی رسوا کا ناول ''شریف زادی'' تھا۔پوچھا''یہاں سے کہاں جاؤ گے؟''عرض کیا گھر جاؤں گا۔''کہاں رہتے ہو؟''میں نے بتایا جلال نگر میں،ریلوے اسٹیشن کے بالکل سامنے۔بولے''چلو مجھے بھی اسی طرف جانا ہے۔''میں خوش ہو گیا۔یکہ والے کو آواز دی۔فرمایا،''کس لیے''میں نے کہا گرمی ہو رہی ہے،آرام سے پہنچ جائیں گے۔ہنسے،''کیوں کیا ٹانگوں میں کچھ تکلیف ہے؟''میں نے کہا نہیں۔بولے''تو پھر یکہ کی کیا ضرورت،میں تو پیدل چلنے کا عادی ہوں،یہ صحت کے لیے مفید ہے۔''راستے میں بتاتے آئے کہ کب کیا پڑھنا چاہیے۔عمر کے ساتھ کتابوں کے انتخاب میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔مطالعہ کیسے کیا جانا چاہیے وغیرہ۔

جب بھی ملتے کچھ نہ کچھ بتاتے۔وہ میرے دوست تھے نہ اُستاد،لیکن ان کی صحبت بہت فیض رساں تھی۔1950 میں،میں لاہور چلا آیا۔ان سے رابطہ نہیں رہا۔آخری ملاقات 1989 میں ہوئی تھی جب وہ''نگار و نیاز'' کی سالانہ تقریب میں کلیدی مقالہ پیش کرنے کراچی تشریف لئے تھے۔اب وہ شہرت کی بلندیوں تک پہنچ چکے تھے۔اُردو دنیا میں ان کے علم کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔بڑی محبت سے ملے۔کہنے لگے قمر سے تمھارے بارے میں معلوم ہوتا رہا ہے۔

ان کی مدون کتابیں خصوصاً''باغ و بہار''اور'فسانۂ عجائب''ہر علمی ادبی حلقے میں پسند کی گئیں۔انھوں نے جو کام بھی کیا ہے محنت اور پوری دیانت داری سے انجام دیا ہے۔تنقید،ترجمہ،انتخاب،ہر شعبے میں ان کی قابل قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔زبان وبیان کے معاملے میں وہ بہت حساس تھے۔چاہے کتنی بڑی شخصیت ہو وہ اس کی زبان وبیان کی غلطیوں کی گرفت سے نہیں چوکتے تھے۔اس ضمن میں فیضؔ پر ان کے مقالے نے عالم گیر شہرت پائی۔

اُردو املا سے متعلق انھوں نے خاصی توجہ سے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔اُردو املا کی معیار بندی پر بڑا زور دیا ہے۔ان کی کوششوں سے بعض الفاظ لکھنے سے متعلق انتشار کم ہوا اور صحت کے ساتھ لکھنے والوں کے لیے کچھ اصول سامنے آ گئے ہیں۔اس ضمن توجہ دینے والوں کے مداح تھے۔انھوں نے اپنی کتاب''اُردو عبارت کیسے لکھیں''کا انتساب جناب مسعود احمد برکاتی کے نام اس عبارت کے ساتھ کیا ہے:

''جو بچوں کے بہت اچھے رسالے''ہمدرد اور نونہال''(کراچی) کے ایڈیٹر ہیں اور صحت املا کا پیغام بچوں تک پہنچاتے رہتے ہیں''۔

اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ بھلے اور بڑے انسان تھے۔ ع

ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں

نوٹ: جناب رشید حسن خاں کی تاریخ پیدایش 25 دسمبر 1925 مصدقہ ہے۔ اس کا حوالہ ''شاعر'' ممبئی کے ''ہم عصر ادب نمبر'' مطبوعہ 1997 کے صفحہ نمبر 1194 پر یہی تاریخ اور سنہ درج ہے۔ مدیر

(سہ ماہی روشنائی، کراچی، جلد: 7، شمارہ 26، جولائی تا ستمبر 2006 صفحہ 153 تا 155)

○○○

رشید حسن خاں

صدیق الرحمٰن قدوائی

علم و ادب کی دُنیا میں خود احتسابی کی اہمیت ہمیشہ رہی ہے۔ اس سے مراد کسی شخص کا خود اپنے کاموں پر بار بار نظر ڈالنا تو ہے ہی اسی کے ساتھ اس کے معنی اس روایت کی پاس داری بھی ہے جن کی رو سے تلاش کی راہ میں یہ لازم ہے کہ ہم سے پہلے جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کو پھر نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی جائے اور اگر کوئی نیا پہلو نظر آئے تو اس کو بھی اُجاگر کیا جائے۔ یہی نہیں پہلے جو کچھ سچ سمجھا جاتا رہا ہے اگر وہ غلط ثابت ہو جائے یا اُس میں شک کی گنجایش بھی نظر آئے تو اُسے سب کے سامنے لایا جائے۔ ایسے کسی بھی مہذب معاشرے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا جہاں علمی دُنیا کے لوگ اُن سب باتوں کو بغیر اپنی طرف سے چھان بین کیے مان لیں جو اُن سے پہلے یا اُن کے زمانے میں بھی عام طور سے مانی جاتی ہے۔

جستجو کی یہ خواہش انسان کی بنیادی فطرت ہے، مگر ایسا بھی دیکھا گیا ہے اور خصوصاً ان معاشروں میں جو زوال کو دور سے گزر رہے ہوں کہ ماضی کے سرمایے پر ہی بھروسا کر کے اُسے روایات اور توہمّات کے غلافوں میں لپیٹ کر یا بزرگوں کی عظمت کو اخلاقی قدر قرار دے کر ان کی ساری باتوں کو ایک ابدی تقدس عطا کر دیا جائے اور اس حد تک اس جال میں پھنسایا جائے کہ اس کے باہر نکلنا ہی دشوار نظر آنے لگے۔ ہمارا معاشرہ ہر منزل سے گزرا ہے۔ عروج کی ان منزلوں سے بھی جب ہر دن نئی دریافتیں، ایجادات، نئے خیالات و تصورات کا مرانیوں کی بلندیوں تک ہمیں پہنچا گئے اور ایسے بھی وقت آئے جب فرسودگی و توہم پرستی اور نئی راہوں کی تلاش سے بچنے کی تن آسانی نے ہمیں پستی و پس

ماندگی کی طرف دھکیلنا شروع کیا اور ہم زوال کے دور میں داخل ہو کر زوال کی اخلاقیات اور زوال کی اقدار کے اسیر ہوتے چلے گئے۔

ہمارے ملک میں انیسویں صدی کے وسط میں یہ شعور بیدار ہونا شروع ہوا کہ زوال کی ڈھلان پر سے پھسلتے ہوئے ہم بہت نیچے پہنچ چکے ہیں، جہاں سے نکلنے کے لیے ہمیں اپنی زندگی کے پورے نظام کو سرے سے بدلنا ہوگا۔ اس وقت سیاست، مذہب، فلسفہ، طرزِ معاشرت، علم و ادب غرض کہ ہر پہلو پر نظر گئی ہے۔ جب خاموش دریا چڑھا ہوا ہوتا ہے تو دھارے کی ساری موجیں ظاہر ہے ایک ہی جانب زور و شور سے بہتی ہیں۔ چناں چہ اس طلاطم میں علم و ادب نے بھی پوری زندگی کی طرح ایک نیا رُخ اختیار کیا۔ پائی ہوئی اقدار کو پھر سے جانچا پرکھا جانے لگا، نئے نئے گوشوں میں نظر جانے لگی۔ چھپے ہوئے خزانے سامنے آنے لگے، نئی نئی جہتیں روشن ہونے لگیں اور علم کی دُنیا میں کھوج اور جستجو کی وہ روایت جو دورِ زوال میں پست ہو گئی تھی پھر سے اُبھرنے لگی۔ بیسویں صدی میں نئی علمی ڈگر، اور عام ہوتی مغرب اور مغربی علوم کی آگاہی پر ہم نے اور زیادہ توجہ صرف کی۔ شبلی اور شیرانی سے لے کر ان کے بعد دور تک ایک سلسلہ نظر آتا ہے جس کے ذریعہ ہم ادب کی دُنیا میں، خصوصاً اُردو اور فارسی میں ایک نیا چلن دیکھتے رہے ہیں۔

بے شمار نئے خزانے دریافت ہوئے، مسودات، مخطوطات اور دستاویزات کے انبار ہاتھ آنے لگے۔ نئی معلومات نے نہ جانے کتنے عقائد و مفروضات کو منہدم کر ڈالا۔ ''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است'' کا اصول پامال ہوا۔ خود اپنے بنائے ہوئے بڑے سے بڑے بُت گرنے لگے۔ اُردو محققین کی دُنیا میں جن لوگوں نے انقلاب برپا کر دیا ان کی فہرست طویل ہے۔ ہم نے جن لوگوں کو دیکھا اور جن کے اثرات کو پھیلتے ہوئے دیکھا ان میں ایک بڑا نام قاضی عبدالودود کا ہے۔ انھوں نے اپنا سارا زور صرف احتساب پر ہی کیا مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے عہد میں تحقیق میں احتیاط پر خاص زور دیا جانے لگا اور تشکیک کا پہلو بھی نمایاں ہوا۔

اس نئی روایت کے اثر سے جن لوگوں کی علمی زندگی کی ابتدا ہوئی ان میں سب سے نمایاں نام رشید حسن خاں کا ہے۔ ان کا ایک بڑا امتیاز یہ تھا کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ سب کچھ اپنے بل بوتے پر کیا۔ کنواں کھودنا اور پانی پینا بھی بڑی بات ہے مگر پانی سب تک پہنچانا غیر معمولی حوصلے کا تقاضا کرتا ہے اور خاں صاحب کا یہ حوصلہ ہم سب پر عیاں ہوا۔ ان کی ابتدائی زندگی، ماحول اور اس میں تعلیم و تربیت کی سہولتیں بہت کم تھیں۔ اُن کے خان دان کے پاس اس سے بھی فائدہ اُٹھانے کے وسائل نہ ہونے کے برابر۔ خاں صاحب نے مسجد اور مدرسے میں تعلیم پائی، فوج کے محکمے کے تحت ایک کپڑے سینے کے کارخانے میں ملازمت کی۔ اس دور میں کارخانے کی ٹریڈ یونین میں سرگرم ہوئے پھر خود اپنے شوق کی بنا پر مشرقی انداز کی تعلیم جو اُن کے وطن شاہ جہاں پور میں حاصل کر لی کہ وہاں کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے گاندھی فیضِ عام کالج میں اُردو اور فارسی کے اُستاد مقرر ہوئے اور کالج اور شہر کے کتب خانوں اور ملک کے اہلِ علم سے خط و کتابت کے ذریعے اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو فروغ دیتے ہوئے ایسے مرتبے پر پہنچ گئے کہ دہلی یونی ورسٹی کے فاضل صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی جو بلا کے مردم شناس بھی تھے، ان کو بڑے حیلے بہانوں سے شاہ جہاں پور کے پُر سکون ماحول سے اُٹھا کر دہلی لانے میں کام یاب ہوئے۔ انھیں یونی ورسٹی کے تحقیق کے شعبے میں جگہ ملی جو ان کی صلاحیتوں سے تھی تو کم تر درجے کی چیز مگر کاغذوں کی اسناد کی عدم موجودگی کی بنا پر اسی حد تک حاصل ہو سکتی تھی۔ خاں صاحب نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھایا جو ایک ذہین سمجھ دار علم کا شوق رکھنے والا ہی اُٹھا سکتا تھا۔ تنخواہ دہلی کے معیاروں سے بہت کم، رہنے کے لیے بس ایک ڈیڑھ کمرہ اور اسی تنخواہ پر شاہ جہاں پور کے ایک بھرے پُرے خان دان کی کفالت اور خانگی ضروریات کے تحت آئے دن کا شاہ جہاں پور آنا جانا۔ خاں صاحب نے سب کچھ قبول کیا اور اور یونی ورسٹی کے کاموں کے ساتھ ساتھ اپنی نجی تحقیقی کاوشوں میں مصروف ہو گئے۔ قاضی عبدالودود صاحب کے اثر سے انھوں نے ابتدا میں دوسروں کے کاموں کا جائزہ لینے پر بڑا وقت صرف کیا، پھر رفتہ رفتہ اس روش کو ترک کر کے اپنے کاموں میں آزادانہ مصروف ہو گئے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کی تاریخ ادب پر ان کے تبصرے نے ان کی جارحانہ علمیت کی طرف سب کو متوجہ کیا۔ یونی ورسٹی میں ہونے والی تحقیقی اور تدریس پر خاص طور سے انھوں نے تنقید کی۔ اسی دوران تحقیق کے آداب اور اصول مرتب کرنے کی جانب متوجہ ہوئے جو ان کے متعدد مضامین میں ملتے ہیں۔ ان سب باتوں سے ان کی بلند حیثیت تو ظاہر ہو ہی چکی تھی مگر اس سے زیادہ اور اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہنے والا اُن کا کام تدوین کے میدان میں ہوا۔ فسانۂ عجائب، باغ و بہار، سحر البیان، گلزار نسیم، مثنویاتِ شوق، اور زٹل نامہ کی تدوین، یہ تمام کام جس پیمانے پر تنہا رشید حسن خاں نے کیا اس کے لیے عموماً ہمارے ملک میں ہی نہیں ترقی یافتہ ملکوں میں بھی ادارے بنائے جاتے ہیں۔ خاں صاحب نے اپنی نجی محنت، تعلقات اور وسائل کے ذریعے تمام اہم مخطوطات کو حاصل کیا۔ ضروری سوانحی اور متنی معلومات جمع کیں اور ساری کتابوں کے متون اعراب و اوقاف کے اس التزام کے ساتھ مرتب کیا جس سے خود ان کے مطابق اور تدوین متن کے ضوابط کی رو سے بھی مصنف کی تخلیق کے اصل مسودے کی بازیافت ہو جائے۔ ہر کتاب کے ساتھ ایک فرہنگ جو لفظوں کے تلفظ اور معانی کو اس عہد کے رواج کے مطابق کر دے جب وہ کتاب لکھی گئی تھی۔ اس کے لیے جو غیر معمولی مشقت، ذہانت درکار ہوتی ہے اس کی بلا کی صلاحیت تو قدرت نے انھیں عطا کی ہی تھی مگر زندگی کی عام مشکلات، مالی وسائل کی کمی اور پھر اپنے نجی مسائل میں گھرے رہنے کی بنا پر آسودگی کا فقدان جو تمام عمر ان کی جان کے ساتھ چمٹی رہیں وہ بھی کبھی کبھی اُن کے آڑے نہ آئیں۔

وہ ایک بے حد مخلص دوست اور خوش مزاج انسان تھے۔ دوستوں کی بے تکلف محفلوں میں ان کی موجودگی بڑی خوش گوار ہوتی۔ فقرے بازیاں خود اپنی ذات پر پُر لطف جملوں سے مزے لینا ان کے مزاج میں داخل تھا۔ ان کے دوست بہت تھے مگر زیادہ تر لوگوں کے ساتھ وہ ایک خاص فاصلہ رکھتے تھے۔ میری یہ خوش قسمتی تھی کہ وہ جب دہلی آئے اسی وقت ہم ایک دوسرے سے بے حد قریب آ گئے۔ وہ اپنی تحریریں جہاں تک ہو سکتا اشاعت کے لیے اپنے خاص دوستوں کو ضرور دکھاتے اور اپنی کامیابی کی داد چاہتے۔ یہی موقع ہوتا جب ہم ان سے استفادہ کرنے کے ساتھ کھل کر ان کی تحریروں کے بارے میں مذاق بھی کرتے۔ اس دوران انھوں نے بھی میری ہر تحریر اشاعت سے پہلے دیکھی، مفید

مشورے دیے، جو اچھا لگا اس کی فیاضانہ داد دی اور جہاں اختلاف ہوا آزادانہ کبھی مذاق اُڑایا، کبھی سنجیدہ بحث کی مگر ناراضگی کا اظہار کبھی نہیں کیا۔

اُن کی جیسی شخصیت میں اگر انانیت زیادہ ہوتو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ انانیت ان میں یقیناً تھی مگر دوستوں کے ساتھ تعلقات میں یہ انانیت کبھی خلل انداز نہ ہوئی۔ اُن کے کاموں کی پذیرائی ان کی زندگی میں بہت ہوئی اگر چہ کبھی اس سے وہ مطمئن نہ رہے۔ وہ صاف گو، سچے، معاملات کے کھرے اور بڑے نوک پلک درست رکھنے کے قائل تھے۔ ان کا لباس، وضع قطع، اخلاق وآداب، گفتگو، غرض کہ ہر شے میں ایک ستھراپن، شائستگی اور طبقۂ اشرافیہ کے سے انداز تھے۔ صبح گیارہ بجے یونی ورسٹی اور شام کو کناٹ پلیس کے کافی ہاؤس میں پابندی کے ساتھ پائے جاتے۔ ان کی عادتوں سے کافی ہاؤس کے بیرے بھی واقف تھے۔ چناں چہ ان کی کافی بھی اہتمام سے بنتی۔ ہاکی کھیلتے تھے۔ ہاکی کا کوئی اہم میچ ہوتا تو اسی انداز میں بحث کرتے جیسے کسی پُرانے مخطوطے کے بارے میں کیا کرتے تھے۔

عمر کے ساتھ ان کی بیماریاں بڑھتی رہیں۔ علاج کے وسائل کم ہوتے رہے۔ دہلی سے شاہ جہاں پور منتقل ہوئے اور بستر سے لگ گئے۔ میرے خیال میں دہلی کا چھوٹنا ان کی زندگی کا سب سے المناک واقعہ تھا۔ دہلی ان کے دل ودماغ میں سما چکا تھا۔ یہاں کی صحبتیں ان کی زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔ حالات نے انھیں دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ شاہ جہاں پور میں بیوی بچوں میں یقیناً خوش رہے مگر پھر بیوی کا انتقال اور ان کی اپنی بیماری کی بڑھتی ہوئی شدت نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا، مگر ان سب باتوں کے باوجود تحقیق و تدوین کے کام اپنے بستر پر لیٹے لیٹے ہی کرتے رہے۔ ان ہی حالات میں غالبؔ کے اشعار میں ان کے مخصوص الفاظ، تراکیب کا تجزیہ کیا، جعفرزٹلی اور ٹھگی کے بارے میں کتابیں اسی عالم میں مکمل ہوئیں۔ ٹیلی فون پر ان کی آواز کا کرب روز تشویش پیدا کرتا تھا، مگر وہ اپنے بے بس من سے اس کو دباتے اور ان حالات میں بھی اپنی بیماری کا ذکر نہ کرتے۔

رشید حسن خاں کی وفات علمی دُنیا کا ایک بڑا سانحہ ہے۔ ہم لوگوں کے لیے جواُن کے شب وروز اور خلوت وجلوت کے ساتھی تھے۔ ایک شدید محرومی ہے۔ مگر ایک ایسی زندگی جو خود ہماری زندگی میں شامل ہوگئی وہ موت کے ہاتھوں ہم سے الگ کیسے ہوسکتی ہے۔

❖ ❖ ❖

''نیّر مسعود

ادبستان، دین دیال روڈ لکھنؤ: 226003

26/فروری، 2006

برادرم اسلم پرویز صاحب اسلام علیکم

رشید حسن خاں بھی رخصت ہوئے۔ میں ان کے پسماندگان میں کسی سے واقف نہیں لہٰذا اس لیے آپ سے تعزیت کررہا ہوں۔ میری بیٹی کے نام کچھ دن پہلے ان کا خط آیا تھا، وہ ان کو نئے سال کی مبارک باد کا کارڈ بھیجتی تھی جس کے جواب میں وہ خط ضرور لکھتے تھے۔ اسلم محمود صاحب سے بھی ان کی بات دو ہی دن پہلے ہوئی تھی، اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کا وقت موعود اتنا قریب ہے۔

نیّر مسعود''

- (سہ ماہی اُردو ادب، سرورق، خصوصی اداریہ، صدیق الرحمٰن قدوائی، صفحہ 5 تا 9، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، جنوری، فروری، مارچ 2006)
- (ہفت روزہ، ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم اکتوبر تا 28/ستمبر 2006، شمارہ نمبر 33,34,35,36 جلد نمبر: 65، اس شمارے میں نیر مسعود صاحب کا خط شامل نہیں ہے)
- (یہ مضمون پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب نے اپنی کتاب ''گمان اور یقین کے درمیان'' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، دسمبر 2006 میں 'رشید حسن خاں کی اُردو تحقیق' کے نام سے صفحہ 177 تا 181 پر شائع کیا)

❍❍❍

رشید حسن خاں کی
ادبی و غیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو

خورشید حسن خاں (فرزند رشید حسن خاں)

والدِ محترم رشید حسن خاں کا شمار اُردو ادب کے ایک اعلا درجے کے محقق اور نقاد کی حیثیت سے ہوتا تھا اور تدوین میں تو ان کا کوئی مدِ مقابل نہیں۔ انھوں نے بہت سے دیگر کاموں کے علاوہ پانچ عظیم کارنامے انجام دیے ہیں جن سے وہ تدوین کے شہنشاہ تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ یہ کام بہت جلد بازی میں نہیں ہوئے بل کہ ان کی تکمیل میں برسوں لگ گئے اور آنے والی نسلوں کے لیے وہ ایسا کارنامہ انجام دے گئے ہیں جن کی مثالیں نہیں ملتی۔ (1) مثنوی گلزارِ نسیم (2) مثنویاتِ شوق (3) مثنوی سحر البیان (4) فسانۂ عجائب (5) باغ و بہار

والدِ محترم کی تصانیف میں کوئی کتاب ایسی نہ ہوگی جو ان کی غیر معمولی محنت اور دیدہ ریزی کی شاہد نہ ہو۔ ان کے حصے میں ایک ایسا قلم آیا جو تلوار کی دھار سے بھی تیز تھا انھوں نے روایتی تنقید نگاری سے ہٹ کر اپنے خاص اسلوب اور منفرد تنقیدی نکتۂ نظر سے فیض احمد فیضؔ کی شاعری پر بھی تبصرہ کیا۔ بہ قول ڈاکٹر گیان چند جین: ''یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ رشید حسن خاں اُردو کے خدائے تدوین ہیں۔'' آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی شخصیت کو کئی زاویوں میں بانٹ سکتے ہیں (1) ادبی (2) غیر ادبی شخصیت۔ دہلی یونی ورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد 1996 میں وہ اپنے وطن شاہ جہاں پور واپس آئے اور ہم لوگوں کے ساتھ رہنے لگے۔ میں یہاں اُن کی ادبی مصروفیت پر بھی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

اُن کے بارے میں لوگ مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ خاں صاحب روکھے انسان ہیں، کسی سے ملتے جلتے نہیں۔ یہ بات ہمارے وطن میں بھی مشہور ہوئی۔ کوئی کہتا ہے کہ بھئی خاں صاحب کی شخصیت ایسی ہے کہ ان سے ڈر لگتا ہے۔ طرح طرح کی باتیں ان کے سلسلے میں کہی گئیں، لیکن اصل میں ایسا بالکل نہیں ہے۔ والدِ محترم نے ہر اُس شخص کے لیے دروازے کھلے رکھے جو ادبی کام کے لیے ان کے پاس آیا۔ چاہے وہ کوئی اسکالر ہو یا کوئی طالب علم۔ طالب علموں کے لیے والدِ محترم نے صبح کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔ کئی لوگ ان سے اُردو پڑھنے گھر پر آتے تھے اور وہ ان کو وقت دیتے تھے۔ ان کو بے کار وقت برباد کرنے سے سخت نفرت تھی۔ وہ کہتے تھے کہ وقت بہت قیمتی ہے اور بہت کم ہے اور کام زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ والد صاحب کا اخلاق بہت عمدہ تھا۔ ہر ایک سے میٹھی زبان میں بات کرنا ان کا معمول تھا۔ غصہ تب آتا تھا جب کوئی بہت بلند آواز میں بولے یا شور مچائے۔ خاص کر وہ میرے چھوٹے بھائی خالد حسن خاں کے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی ہر بات کا خیال رکھتے تھے۔ بچوں کے ساتھ خریداری کرتے تھے اور اپنی اولاد کے بارے میں فکر مند رہتے تھے۔ میری والدہ جن کا انتقال مارچ 2003 میں ہوا تھا، ان کے انتقال کے بعد ان کی زندگی میں ایک خلا سا ہو گیا تھا۔ والدہ نے ان کی زندگی کے ہر موڑ پر ساتھ دیا، اس لیے ان کی کمی ہر وقت محسوس کرتے تھے۔ میری ہم شیرہ اور ان کے شوہر کی بھی انھیں فکر تھی۔ خودداری اتنی کہ کبھی بھی کسی معاملے میں سفارش نہیں کی۔ وہ کہتے تھے کہ تم لوگ اپنا مقام خود بناؤ، محنت کرو۔ ان کی کئی نصیحتیں مجھے یاد آ رہی ہیں۔

والد صاحب کو اُردو سے اتنا لگاؤ تھا کہ وہ میرے اور بھائی کے چھوٹے بچوں کو روز ایک گھنٹہ اُردو پڑھاتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے خان دان میں سب لوگ اُردو پڑھے ہوئے ہیں۔ والد صاحب اپنی ادبی مشغولیات میں سے وقت نکال کر ہاکی کا کھیل TV پر ضرور دیکھتے تھے، ابھی حال ہی میں جو ہندوستان اور پاکستان کے کرکٹ میچ ہوئے

تھے انھوں نے پابندی سے دیکھا۔ دہلی کے قیام کے زمانے میں بھی وہاں پر جو کھیل ہوتے تھے وہ دیکھنے اسٹیڈیم ضرور جاتے تھے۔ ڈراموں کا بھی شوق رکھتے تھے۔ کئی ڈرامے میرے ساتھ دیکھے ہیں اس کے علاوہ ان کو بہترین کھانے کا بھی بہت شوق تھا، اکثر مچھلی، مرغ گھر پر پکواتے تھے۔ انتقال سے ایک دن پہلے انھوں نے میرے چھوٹے بھائی سے کہا کہ کل اتوار (26 فروری) کو مچھلی لانا۔ لیکن افسوس وہ کل نہ آ سکا۔ میں یہاں گورنمنٹ اُردو کا اُستاد ہوں۔ مجھ سے بہت بے تکلفی تھی لیکن حدود کے اندر۔ مجھ سے اکثر وہ پوچھتے تھے کہ تمھارے اسکول میں اُردو کے کتنے طالب علم ہیں۔ جب میں ان کو بتاتا تھا کہ میں پابندی سے ہر طالب علم کو اُردو پڑھاتا ہوں تو وہ بہت خوش ہوتے تھے اور انھیں اطمینان ہوتا تھا۔ یہی نصیحت وہ چھوٹے بھائی خالد حسن خاں کو بھی کرتے تھے کیوں کہ وہ بھی ٹیچر ہیں۔ اپنی بیٹی نادرہ بیگم کا وہ بہت خیال رکھتے تھے اور وہ انھیں بہت عزیز تھیں۔ ان کے شوہر جو ڈرافٹ انجینئر ہیں، اُن سے بھی بہت لگاؤ تھا۔

والد محترم جنھوں نے پنی زندگی کا بیش تر حصہ دہلی میں گزارا اور وہاں پر بھی انھوں نے بہتوں کو علمی و ادبی تعاون دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے لوگوں کی مالی امداد بھی کی۔ پریشانی وہ کسی کی دیکھ نہیں سکتے تھے۔ دہلی میں وہ یونی ورسٹی کے ہاسٹل میں رہتے تھے۔ وہاں طالب علموں کی خاص طور پر مدد کرتے تھے اور ان سے بیٹھ کر بات چیت بھی کرتے تھے۔ دہلی میں ان کے ملنے والوں میں ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، خاص لوگوں میں سے تھے۔ دہلی میں جب تک رہے پابندی کے ساتھ کافی ہاؤس جاتے تھے اور شام چار بجے کا وقت وہاں کے لیے مقرر تھا۔ اصول پسندی اور وقت کی پابندی ان کی شخصیت کے خاص جز تھے۔ ان کی کوئی بھی چیز اپنی جگہ سے ہٹ جاتی جہاں انھوں نے اسے رکھا تھا تب وہ بہت ناراض ہوتے تھے۔ وقت کے بہت پابند تھے اور ہم لوگوں کو نصیحت کرتے تھے کہ جہاں جاؤ صحیح وقت پر جاؤ۔

تعلیم کے بارے میں ان کے بہت عمدہ خیالات تھے۔ وہ کہتے تھے کہ تعلیم کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے کم تعلیم یافتہ ہونے پر ان کو بہت فکر تھی۔ وہ کٹّر پن کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مدرسوں میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ ماڈرن تعلیم بھی بچوں کو دی جائے۔ خاص کر انگریزی، سائنس اور کمپیوٹر، جس سے ان بچوں کو آگے تعلیم جاری رکھنے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ اسلامی تاریخ اور دینیات پر ان کو خاص عبور حاصل تھا۔ نماز پڑھنے کے بارے میں برابر نصیحت کرتے تھے۔ احادیث کے بارے میں بھی ہم لوگوں کو بتاتے تھے۔ اس کے علاوہ گھر میں سجاوٹ کی چیزیں ہوں، کراکری ہو، کپڑے ہوں، ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے اور اپنی پسند بتاتے تھے، لیکن اپنی پسند دوسروں پر تھوپتے نہیں تھے۔ ان کی میز پر جس خوب صورتی اور سلیقے کے ساتھ ان کی کتابیں، قلم، کاغذ، پیپر ویٹ وغیرہ رکھے ہوتے تھے۔ اس سے ان کی اس خصوصیت کا پتا لگتا تھا۔ بہترین قلموں سے ان کو عشق تھا۔ غیر ملکی قلم ان کے قلم دان کی خاص زینت بنے ہوئے ہیں۔ ان کے شاگرد ان کا بہت خیال رکھتے تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

اچھی چائے کا انھیں بہت شوق تھا، وہ اپنی چائے کی پتّی دہلی سے منگواتے تھے اور اس چائے کو تیار کرنے کا انداز بھی مختلف تھا۔ الگ الگ پارٹس میں چائے اور پھر اس چائے دانی پر بہت خوب صورت ٹی کوزی۔ اس سے ان کے شوق کا پتا لگتا ہے کہ کس انداز میں وہ زندگی جینا چاہتے تھے اور اسی انداز میں انھوں نے اپنی زندگی بسر کی۔ خان دان میں کوئی تقریب ہو، اس میں شرکت ضرور کرتے تھے۔ خان دان کے ہر فرد کا خیال رکھتے تھے۔

والد محترم آج اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کی یادیں ہمیشہ باقی رہیں گی۔ وہ اپنے اعلا اور معیاری ادبی کاموں کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ تدوین و تحقیق میں ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی اور شاید اس خلا کا پُر ہونا اب مشکل ہے۔ ان کی تصانیف کے ذریعے ان کا نام اُردو ادب کی دُنیا میں ہمیشہ روشن رہے گا۔

(ہفت روزہ، ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 28 ستمبر، 2006، شمارہ نمبر: 33,34,35,36 جلد نمبر: 65 صفحہ 11)

○○○

رشید حسن خاں: ایک عہد ساز شخصیت

محمد ایوب واقف

25 فروری 2006 کی رات اس اعتبار سے حد درجہ منحوس، دل آزار اور مخبوط الحواس کر دینے والی تھی کہ اس رات اُتر پردیش کے مشہور مقام شاہ جہاں پور میں عہدِ حاضر کے بے مثال اور یکتائے روزگار محقق، ماہرِ زبان اور متنی نقاد رشید حسن خاں موت کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ یہ ایسا بڑا اور جانکاہ حادثہ تھا کہ جس نے دل و دماغ کے ہر تار کو مرتعش کر دیا۔ مرحوم رشید حسن خاں ممبئی کے اُردو کے جلسوں اور سمیناروں میں اکثر آیا کرتے تھے۔ یہاں راقم الحروف سے ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں کچھ تو طویل تھیں اور کچھ مختصر۔ ان سے پہلی بار میرا تعارف میرے محسن اور کرم فرما مرحوم سید نجیب اشرف ندوی نے انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں واقع اپنے دفتر میں کرایا تھا۔ ہاں یاد آیا اس ملاقات میں انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے رفیق مرحوم عبدالرزاق قریشی بھی شامل تھے۔ اس کے بعد خاں صاحب سے رسم و راہ رہی، کم کم ہی سہی لیکن خط و کتابت بھی ہوتی رہی۔ وہ صحیح معنوں میں اُردو کی آبرو تھے اور اب ان کے انتقال سے ایک خلا سا محسوس ہو رہا ہے۔

ان کی ہمہ جہت اور مہتم بالشان شخصیت میں اتنی کشش اثر پذیری تھی کہ آدمی پہلی فرصت میں ان سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ میرے دل و دماغ پر ان کی ہمہ گیریت کا بہت گہرا اثر تھا۔ اسی لیے جب ان کے اچانک سانحۂ ارتحال کی خبر پڑھی تو دل ان کی یادوں کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو گیا۔ ان کا سراپا نگاہوں میں سرایت کر گیا۔ متوسط قد و قامت کے رشید حسن خاں صاحب کا گورا چٹّا چہرا اپنی تمام تر ضیافتوں کے ساتھ سامنے تھرک رہا تھا۔ چوڑی پیشانی، متجسس دمکتی آنکھیں، سر پر گھنے اور پیچھے کی جانب مُڑے ہوئے سفید بال اس پر ستواں ناک اور بڑے بڑے کان ان کے سراپے کو خوب صورت بنانے کے لیے کافی تھے۔ خاں صاحب بڑے نفاست پسند تھے۔ اچھے اور قیمتی کپڑوں کی پینٹ اور بش شرٹ ان کے پسندیدہ لباس تھے۔ کاغذ اور قلم وہ اچھے سے اچھا استعمال کرتے تھے۔ ملنے جلنے اور بات چیت کا سلیقہ رکھتے تھے۔ کسی سے مرعوب ہونا ان کی فطرت میں شامل نہیں تھا البتہ اچھے کام کی حسبِ ضرورت تعریف سے کتراتے بھی نہیں تھے۔ موتیں تو آئے دن واقع ہوتی ہیں لیکن موت جب رشید حسن خاں جیسے معتبر اور قابلِ وثوق محقق اور تدوینی کام کے ماہر کی ہو تو ایک زمانہ روتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے بڑے اور یکتا لوگ جسمانی طور پر ہم سے جدا ہوتے ہیں، ان کی باغ و بہار شخصیتوں کے نقوش دلوں پر نقش ہو جاتے ہیں۔ نظیریؔ نیشاپوری نے ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا تھا کہ۔

ہر گز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو حینِ حیات ہی لیجینڈ (Legend) کا درجہ و مقام حاصل کر لیتی ہیں۔ ایسی عظیم اور مقناطیسی شخصیتوں کی جتنی بھی تعریف و تحسین کی جائے وہ کم ہی ہوتی ہے۔ رشید حسن خاں صاحب ایسی ہی ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے تحقیق، تدوین اور متنی تنقید کا جو اعلا و ارفع معیار قائم کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، امتیاز علی خاں عرشی، مسعود حسن رضوی ادیب، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود وغیرہ اپنے وقت کے مابہ الامتیاز اور مسلم الثبوت محقق تھے۔ ان کے تدوینی اور تحقیقی کام آج تک بہ نظرِ استحسان دیکھے جاتے ہیں۔ مذکورہ محققین، مدونین اور ناقدین کے پیش رو مولانا شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالیؔ اور ''آبِ حیات'' والے محمد حسین آزادؔ اور ان سب کے سرخیل، ذی اثر اور ذی وقعت، عالم، دانشور اور مدبر و مفکر سر سید احمد خاں کے تصنیفی اور تالیفی کاموں کا ایک ایسا سلسلہ ہے جو رہتی دُنیا تک حرارتِ قلبی کا ذریعہ بنتا رہے گا۔

رشید حسن خاں صاحب نے کھلے ذہن سے اپنے ان یادگارِ زمانہ بزرگوں اور پیش رووں کی عرق ریزی اور کمالِ محنت کی حامل تحریروں کو نہ صرف پڑھا بل کہ ان کے پس منظر سے کما حقہ واقفیت حاصل کی۔ انھیں اس بات کا پورا علم تھا کہ علم و ادب کی دُنیا میں کوئی علمی و ادبی تحکیم مروّج کرنا اپنے اسلاف کے لائق و فائق کاموں سے لاتعلق ہو کر ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے رشید حسن خاں صاحب نے اپنے پیش رو اہلِ قلم کی تحریروں کو خوب خوب پڑھا لیکن انھوں نے ہر تحریر کو شک کے دائرے میں بھی رکھا۔ ہمارے خیال سے ایسا شک و شبہ مثبت کردار کا حامل ہوتا ہے۔ جو بہتر اور معتبر نتائج کا تانا بانا تیار کرے۔ اسی شک کی بنیاد پر مشہور مورخ شبلی نعمانی کی ''شعر العجم'' پر انھوں نے اُنگلی رکھی۔ اور برجستہ کہا

تھا،لیکن خاں صاحب نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کر دیا۔صرف شبلی نعمانی پر ہی کچھ موقوف نہیں،ان کے شکوک کے گھیرے میں بیش تر مصنفین اور محققین آئے ایک طریقے سے بُت شکنی ان کا تحقیقی اصول بن گیا تھا۔

رشید حسن خاں صاحب اپنے وطن عزیز شاہ جہاں پور کے مدرسہ بحر العلوم اور درسِ نظامیہ کے نظام سے وابستہ ہوئے تو اپنے اساتذہ کو فقہی اصولوں اور احادیث کی چھان پھٹک اور جمع و ترتیب میں مصروف دیکھا، دراصل تحقیق اور تدوین سے دل چسپی ان کو یہیں سے ہاتھ لگی۔اسلامیہ ہائی اسکول شاہ جہاں پور کی ملازمت نے ان کی اس دل چسپی کو مہمیز کیا، کئی سال تک انھیں کارخانے اور ٹریڈ یونین میں بھی کام کرنا پڑا۔ یہاں ان کو مطالعے کا موقع ملا تو ادب کی بہت سی کلاسیکل کتابوں کو انھوں نے پڑھ ڈالا۔ان کے مطالعے میں اُردو کی بڑی داستانیں بالخصوص ''طلسم ہوش ربا'' جیسی مشہور داستان بھی رہی۔انہی ایام میں انھوں نے نیاز فتح پوری کا مشہور زمانہ رسالہ ''نگار'' بھی دل چسپی سے پڑھا۔اس کے بعد وہ اپنی زندگی کے سنہری دور میں داخل ہوئے۔یعنی ان کا تعلق دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے قائم ہوا۔حالاں کہ ان کی زندگی میں سکون کی منزل کبھی نہیں آئی،لیکن اس بے سکونی کے عالم میں انھوں نے تحقیق و تدوین کے ایسے معیاری اور بے بدل کام کیے کہ دُنیا انگشت بہ دنداں رہ گئی۔سچ ہے کہ کام کے لیے بے قراری اور بے کلی پیدا کی جائے تو ہی بڑے کام ہو پاتے ہیں۔اس کی مثال رشید حسن خاں نے بہ طریقِ احسن پیش کی۔

ویسے تو رشید حسن خاں صاحب نے اُردو املا میں سدھار، زبان و قواعد سے متعلق بہت کچھ لکھا اور ان کے ان کاموں کو شرفِ قبولیت بھی بخشا گیا۔لیکن اصل کام تو ان کے وہ ہیں جو تحقیق و تدوین کے دشاں کام بن کر اہلِ ادب کے سامنے آئے۔مثلاً ''فسانۂ عجائب''،''مثنوی سحر البیان''،''باغ و بہار''،''مثنوی گلزارِ نسیم'' اور ''مثنویات شوق''۔یہ سارے کے سارے کام ایسے ہیں جن کا تعلق فنِ تدوین سے ہے رشید حسن خاں صاحب نے ان پُرانی دستاویزات کی تدوین میں جس محنت اور مشقت سے کام لیا تھا وہ انہی کا حصہ تھا۔تدوین کے کام اگر چہ کچھ دوسرے اصحاب نے بھی کیے ہیں لیکن ان کے اور رشید حسن خاں کے تدوینی کاموں میں نمایاں فرق ہے۔دوسرے لوگوں نے اکثر ایسا کیا ہے کہ جب انھیں پُرانی کتب کے نایاب نسخے اور مخطوطے ملے تو انھوں نے سہل الحصول طریقے سے کام کیا، مثلاً انھوں نے اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ان پُرانے نسخوں کی مختلف کاپیاں جہاں جہاں سے مل سکتی ہیں انھیں حاصل کریں پھر ان کے متن کا ایک دوسرے سے موازنہ کریں۔دستیاب ہونے والے نسخوں میں جہاں جہاں غلطیاں ہیں ان کی نشان دہی کریں اس کے بعد تصحیح شدہ نسخوں کے تعلق سے اس امر کا پختہ یقین کرلیں کہ اب ان میں غلطیاں نہیں ہیں۔اس کے بعد انھیں شائع کرنے کا بندوبست کریں، ظاہر ہے یہ بہت پتہ مار کام ہے اور اکثر اوقات تدوین کا یہ پتہ مار کام غیر ذمہ دارانہ اور سہل الحصول طریقے سے بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔اس طریقے سے غلطیوں کا پلندہ بن جانے والی کتابیں بازار میں آجاتی ہیں۔ان کتابوں سے تحقیقی اور تدوینی سرمائے میں اضافہ تو خیر کیا ہوگا اُلٹا ایسی کتابوں سے تحقیقی و تدوینی کام کا معیار اور اعتبار گھٹ کر رہ جاتا ہے۔

رشید حسن خاں صاحب نے تحقیق و تدوین کے سلسلے میں ایسا سہل الحصول طریقہ رواں نہیں رکھا۔جب وہ کسی مثنوی کا یا نثر کی کسی پُرانی کتاب کا قلمی یا مطبوعہ نسخہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرتے تھے تو ان کی باچھیں کھل اُٹھتی تھیں اور تحقیق و تدوین کا نادر المثال اور فضیلت مآب (Pedantic) کام کرنے کا جوش اور جذبہ ان کے اندر جاگ جاتا تھا۔ان کے تحقیقی و تدوینی کاموں کی جو فہرست ہم نے گذشتہ سطور میں دی ہے ان کاموں کا بالاستیعاب مطالعہ آپ پر ظاہر کرے گا کہ ان قدیم نسخوں کے متن کو اغلاط سے پاک و صاف کرنے کے سلسلے میں انھوں نے کتنا دردِ سر مول لیا۔ان نایاب کتابوں کے نایاب نسخے جہاں جہاں سے مل سکتے تھے انھیں حاصل کرنے کے مشکل سے مشکل ذرائع انھوں نے اپنائے، پھر متون کے ایک ایک لفظ کی چھان پھٹک کی۔غلطیوں کی نشان دہی کی اور حشو و زوائد کا کہیں کوئی احتمال ہوا تو اس کے تعلق سے مصدقہ معلومات حاصل کرنے کی بالکل غیر جانب دارانہ کوششیں کیں۔ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ان کتابوں کی اشاعت کی انھوں نے جرأت کی۔ایک بات کا ذکر یہاں اور کر دوں کہ کسی کتاب کے مخطوطے یا کسی کتاب کے قدیم طبع شدہ نسخے کی ترتیب و تدوین کے وقت وہ اولین مآخذات پر ہی تکیہ کرتے تھے، ثانوی مآخذات کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔اسی لیے ان کے مدون کیے ہوئے کاموں کو آنکھ موند کر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ان کی تدوین کی ہوئی کتابوں کے دیباچوں کو پڑھنے سے ان کے کام کرنے کے باکمال اور باضابطہ طریقے کا علم ہوتا ہے۔ان کے دیباچے اس بات کا بھی پتا دیتے ہیں کہ وہ تحقیقی و تدوینی کام میں پیش پا افتادہ باتیں اور آلائش، آلودگی اور فرسودگی کو کسی طرح کوئی جگہ نہیں دیتے تھے۔

رشید حسن خاں صاحب کے تحقیق و تدوین شدہ کاموں کو ہر مکتبِ فکر کے لوگوں نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ڈاکٹر گیان چند جین نے ان کے تحقیقی و تدوینی کاموں کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر انھیں ''خدائے تدوین'' کا درجہ دیا۔ڈاکٹر خلیق انجم ہمارے عہد کے ممتاز اور قابلِ احترام محقق اور متنی تنقید کے معتبر شخص ہیں، انھوں نے رشید حسن خاں صاحب کی شاہ کار کتابوں کو نہ صرف پڑھا ہے بل کہ انھیں انجمن ترقی اُردو (ہند) کی جانب سے شائع کرنے کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔انھوں نے رشید حسن خان صاحب کی متنی تنقید کی کتابوں کی روشنی میں بیانگِ دُہل کہا ہے۔

> ''اُردو میں رشید حسن خاں کے پائے کا کوئی اور متنی نقاد ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوا۔خاں صاحب کو متنی تنقید کے سائنٹفک طریقوں پر قدرت حاصل ہے، وہ املا اور تلفظ کے ماہر ہیں، اسی لیے وہ متن کا جس طرح تنقیدی اڈیشن تیار کرتے ہیں وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔''
>
> (مثنویاتِ شوق کا پیش لفظ)

کالی داس گپتا رضا صاحب ہمارے عہد کے بہت بڑے محقق تھے۔اُردو کے بہت سے شاعر اور ادیب جو اپنے عہد کی غفلتوں اور بے توجہی کے سبب قعرِ گمنامی میں چلے

گئے تھے ان کو از سرِ نو دریافت کر کے تاریخ ادب اُردو میں ان کے جائز مقام پر انھیں فائز کیا۔ غالبیات کے تو وہ ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''سُلطان الشعرا خاقانیِ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق (معتبر حالات، مستند کلام)'' جناب رشید حسن خاں کے نام اس طرح معنون کی ہے۔

''رشید حسن خاں کے نام جو ہمارے زمانے کے ممتاز محقق ہیں اور تدوین میں آج جن کا کوئی مدمقابل نہیں ہے۔''

تحقیق اور متنی تنقید کے حوالے سے جب ہم رشید حسن خاں صاحب کی باتیں کرتے ہیں تو اس موقع پر ڈاکٹر خلیق انجم کا ان سے تعلق سے ایک اور بیان یاد آ رہا ہے۔ 'ہماری زبان' میں رشید حسن خاں صاحب کی مدون کی ہوئی ایک کتاب کا اشتہار شائع ہوا تھا، اشتہار میں خلیق انجم کا بیان درج تھا، اپنے بیان میں انھوں نے کہا تھا۔

''انجمن میں جب کسی ادیب کی کتاب اشاعت کی غرض سے آتی ہے تو اس کے بارے میں میٹنگ ہوتی ہے، بحث و مباحثہ ہوتا ہے لیکن رشید حسن خاں صاحب کی جب کوئی کتاب آتی ہے تو بغیر کسی چوں چرا کے اشاعت کے لیے اسے قبول کرلیا جاتا ہے۔''

اس بیان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رشید حسن خاں کس پائے کے محقق اور متنی نقاد تھے۔

پروفیسر آل احمد سرور کی سربراہی میں ماہرین تاریخ ادب اُردو کی ایک کمیٹی وضع کی گئی اور اس کے ذمہ یہ کام سونپا گیا کہ وہ اُردو ادب کی ایک مستند تاریخ ''تاریخِ ادب اُردو'' کے نام سے مرتب کرے۔ بڑے تزک و احتشام اور طمطراق سے یہ کام شروع ہوا۔ اس کی پہلی جلد چھپ کر جب بازار میں آئی تو اس پر ایک تفصیلی تبصرہ جناب رشید حسن خاں نے دہلی کے رسالہ 'تحریک' میں شائع کروایا۔ اپنے اس تبصرے میں رشید حسن خاں صاحب نے علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو کو عیوب کا پلندہ قرار دیا۔ انھوں نے لکھا کہ اس میں اشاریہ سازی، اشعار کے اکثر حوالوں، زبان و بیان کے طریقوں اور تاریخ و تحقیق کے مآخذات کے سلسلے میں ایسی ایسی غلطیاں راہ پا گئیں ہیں کہ جنھیں کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس تبصرے کی اشاعت کا یہ ردِعمل ہوا کہ جتنی کاپیاں بک سیلرز کو فراہم کی گئی تھیں انھیں فوراً واپس منگا لیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک فیصلے کے تحت دوسری جلدوں کی اشاعت پر روک لگا دی گئی۔ اسی طرح پاکستان میں جمیل جالبی کی اُردو ادب کی تاریخ شائع ہوئی تو خاں صاحب نے اس میں در آنے والی غلطیوں کی بھی نشان دہی کی۔ پاکستان کے ایک بڑے ادارے نے اقبالؔ کے کلام کا کلیات بڑے شاندار طریقے سے شائع کیا، رشید حسن خاں صاحب نے اس کلیات کے بارے میں کہا تھا کہ اس سے خوب صورت کتاب انھوں نے آج تک نہیں دیکھی لیکن اس کتاب کے بارے میں یہ بھی کہا کہ اس میں تدوین کی غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں۔

اُردو کی انتہائی مشہور کتابوں میں گمبھیر غلطیوں کی نشان دہی کوئی ایسا ویسا محقق یا ادیب تو نہیں کرسکتا۔ یہ کام وہی شخص کرسکتا جس کا مطالبہ بہت عمیق اور وسیع ہو، جس کو تحقیق، متنی تنقید اور تدوین کا بھرپور سائنٹفک طریقہ معلوم ہو۔ رشید حسن خاں صاحب نے تحقیق، تنقید اور تدوین کے جو بھی کام کیے وہ پوری طرح سائنٹفک تھے۔ اپنی کتابوں کے ساتھ انھوں نے جو تشریحی ضمیمے، اشاریے اور فرہنگیں دی ہیں وہ ایسی اعلاترین ہیں کہ ان کا مقابلہ اور موازنہ یورپ کے متنی تنقیدات اور تحقیقی اصولوں سے کیا جاسکتا ہے، ان کے انتقال سے اُردو زبان و ادب کا ایسا نقصان ہوا ہے کہ جس کی بھرپائی ناممکن ہے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور کے کیے ہوئے کاموں کی حفاظت کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

(ہفت روزہ، ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا28 ستمبر 2006، شمارہ نمبر:33,34,35,36 جلد نمبر:65، صفحہ 13 تا14)

○○○

رشید حسن خاں: میرے مشفق، میرے اُستاد

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

اُردو زبان وادب کے عالم بے بدل محققِ نام ور اور چند ماہرِ لسانیات رشید حسن خاں صاحب کی رحلت اُردو زبان و ادب کا نقصان عظیم تو ہے ہی، یہ میرا ذاتی نقصان بھی ہے اور میرے لیے سانحۂ پُر ملال ہے۔ رشید حسن خاں صاحب سے میرے تعلقات 26 برسوں پر محیط ہیں ان سے تعلق اس طرح قائم ہوا کہ میں انگریزی میں ایم۔اے پاس کرنے کے بعد اُردو میں ایم۔اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اُسی زمانے میں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں رشید حسن خاں کی کتاب 'اُردو املا' نظر سے گزری۔ میں یہ کتاب گھر لے آیا اور مطالعہ کرنے لگا۔ کتاب پڑھ کر میں رشید حسن خاں صاحب کی علمیت اور منطقی اندازِ گفتگو سے بے حد متاثر ہوا۔ اُسی زمانے میں نے بہار ٹکسٹ بک کارپوریشن پٹنہ کی تیار کردہ نصابی کتابوں کو موضوع بنا کر ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''بچوں کی نصابی کتابوں میں املائی انتشار''۔ یہ مضمون روزنامہ ''صدائے عام'' پٹنہ میں شائع ہوا تو میں نے اخبار سے مضمون کا تراشہ لے کر ایک خط کے ساتھ رشید حسن خاں صاحب کے پتے پر دہلی ارسال کیا۔ خاں صاحب نے میرے خط کا فوراً جواب دیا اور اپنے خط میں میرے مضمون کی تعریف کر کے میرا حوصلہ بڑھایا:

> ''آپ کے اس لطفِ خاص کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ کے مضمون کی داد دیتا ہوں۔ نہایت درجہ اہم موضوع کی طرف آپ نے توجہ کی ہے۔ غفلت کا عالم اس قدر گہرا ہے کہ آپ کو بار بار توجہ دلانا ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک دو مضمون اسی انداز کے آپ کو اور لکھنا ہوں گے۔ بہر حال، جس انداز سے آپ نے مضمون لکھا ہے، وہ داد طلب ہے۔ متوازن، سنجیدہ جذباتیت سے پاک اور دلائل سے آراستہ۔''
>
> (مورخہ 17 جولائی 1979)

اس خط کے بعد رشید صاحب سے مراسلت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ٹھیک اگلے سال جنوری میں کالج میں لکچرر مقرر ہو گیا تو لکھنے پڑھنے سے میرا تعلق مزید استوار ہوا۔ رشید حسن خاں صاحب کی خدمت میں قواعد، املا، تلفظ، فارسی تراکیب محاورہ وغیرہ سے متعلق بے شمار سوالات لکھ کر بھیجنے لگا۔ وہ نہایت مہربان اور مشفق نکلے۔ میرے ایک ایک سوال کا جواب خوب تفصیل سے سمجھا سمجھا کر لکھنے لگے۔ میرے سوالوں کے جواب وہ اس طرح سے لکھتے تھے جس طرح ایک طالبِ علم کو سامنے بٹھا کر صحتِ زبان کے اسرار و رموز سکھائے جاتے ہیں۔ ان کی شفقت و محبت اور ان کے علم و فضل نے مجھے ان کا گرویدہ بنا لیا۔ رشید حسن خاں صاحب میرے سوالوں کے جواب کس طرح لکھتے تھے اس کا اندازہ ان کے تحریر کردہ ایک خط کے اقتباس سے ہوگا، ملاحظہ فرمائیں:

> (3) خردہ، اصل لفظ ہے 'کھدرا' اس کا عوامی تلفظ ہے، سننے میں آیا ہے؛ لیکن فصحا اس لفظ کو استعمال نہیں کرتے، نہ تحریر میں نہ گفتگو میں۔ لوگوں کو بولنے دیجیے، آپ کیوں اس میں شریک ہوں۔ 'خردہ' نہیں تو 'ریزگاری' کہیے۔
>
> (4) 'جائزہ' اسی طرح لکھا جائے گا، یعنی مع ہمزہ۔ جیسے: طائفہ، لائقہ، فائدہ، مائدہ وغیرہ۔
>
> (5) 'محلّہ' عربی کے لحاظ سے م مفتوح ہے لیکن زبانوں پر بہ ضمِ میم 'مُحلّہ' ہے اور اب اسی طرح فصیح ہے۔
>
> (6) صحیح املا: سُموار۔
>
> (7) 'کرگس' یعنی کاف اور گاف، دونوں پر زبر۔ یہی فارسی میں ہے، یہی اُردو میں...
>
> (9) یوپی میں عموماً 'قبرُستان' کہتے ہیں، لیکن خواجہ حسن ثانی نظامی نے مجھے بتایا کہ دہلی میں کنداری 'قبرُستان' کہتے ہیں۔ بہ لحاظِ قواعد بھی ر پر زیر آنا چاہیے، جیسے: پرِستان، پاکِستان، شبنمِستان، فارِستان وغیرہ۔ میں بہ ذاتِ خود 'قبرِستان' کو مرجح سمجھتا ہوں۔
>
> (10) میں تو 'آتش' کہوں گا اور اس پر اصرار کروں گا۔ اب رہا 'تشنہ' 'نشتر' وغیرہ کا مسئلہ، تو صاحب! مدرسے کے اثر سے میری زبان پر 'نِشتر' اور 'تِشنہ' ہیں لیکن میں 'تشنہ' اور 'نشتر' کو غلط نہیں کہوں گا، کیوں کہ اب یہ تلفظ عام ہو گیا ہے، میرے سامنے اصل مسئلہ یہ تھا کہ اب اگر اُردو کا کوئی لغت مرتّب کیا جائے تو

اُس میں ایسی تبدیلیوں کا لازماً ذکر ہونا چاہیے اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ایسے الفاظ کے دونوں تلفظ قابلِ تسلیم مان لیے جائیں۔ اصل لفظ 'عِیاں' ہے تو اب آپ کیا 'عِیاں' کہیں گے؟ نہیں صاحب! میں تو قیامت تک عِیاں نہیں کہوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سے لفظوں میں تو مطلقاً تبدیلی ہو گئی ہے اور اب اصل حرکت گویا ساقط ہو گئی ہے اور کچھ لفظوں میں تلفظ بھی سیّال حالت میں ہے۔ اس صورتِ حال کو تسلیم کر لینا چاہیے۔

(مورخہ 3 فروری 1980)

میری ادبی شخصیت کی تعمیر میں جن بزرگوں کا حصہ ہے ان میں رشید حسن خاں صاحب کا نام بھی شامل ہے۔ خاں صاحب بڑے عالم اور محقق تھے، دہلی میں مصروف زندگی گزارتے تھے اس کے باوجود اُردو زبان و ادب کے مجھ جیسے معمولی طالب علم کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ زبان کے رموز جاننے کے سلسلے میں میری لگن کو دیکھ کر وہ مجھ سے خاص محبت رکھتے تھے۔ املا کے موضوع پر میرے دو مضامین (الف) 'ہمزہ اور املا کی غلطیاں' (ب) 'اصلاح املا سے متعلق تجاویز: مختصر جائزہ' وقفے وقفے سے رسالہ 'زبان و ادب' پٹنہ میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کو خاں صاحب نے پسند کیا اور حوصلہ افزائی کے کلمات لکھے۔ میں نے روزنامہ 'صدائے عام' پٹنہ میں املا کے مسئلے پر سلسلے وار جو مضامین لکھے تھے اُن کے تراشے بھی خاں کو بھیجے اور انھوں نے اپنی پسندیدگی ظاہر کی۔

مجھے رشید حسن خاں صاحب سے ملاقات کا شوق بہت تھا۔ اکتوبر 1980 کے اواخر میں دہلی گیا تو خاں صاحب سے ملنے کے لیے گوائر ہال گیا۔ وہ وہاں نہیں ملے تو دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ان کو ڈھونڈنے گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ حافظ محمود شیرانی سمینار میں شرکت کے لیے پٹنہ تشریف لے گئے ہیں۔ اس طرح بہت دنوں تک ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ 1989 میں خاں صاحب خدا بخش لائبریری کے ایک سمینار میں شرکت کے لیے تشریف لائے تو میں ان سے ملاقات کے لیے پہنچا۔ یہ میری ان سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ میں نے ان کے ساتھ کئی گھنٹے گزارے اور تفصیل سے بات چیت کی۔ 25 جنوری کو صبح کے وقت ناشتے کے بعد اُن سے اُردو تحقیق اور املا کے مسائل سے متعلق ایک طویل انٹرویو لیا جو ٹیپ ریکارڈر سے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو کر بہار اُردو اکادمی کے ''خبر نامہ' شمارہ 115، بابت مئی 1989 میں صفحۂ اوّل پر شائع ہوا۔

1994 میں خاں صاحب کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ اُن کی علمی و ادبی خدمات سے متعلق مضامین پر مشتمل رسالہ 'کتاب نُما' کا خصوصی شمارہ شائع ہونے والا ہے۔ میں نے ایک مضمون 'صحتِ املا اور رشید حسن خاں کی خدمات' کے عنوان سے لکھ کر خاں صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ بہت برسوں تک 'کتاب نُما' کے اس خصوصی شمارے کی اشاعت بہ وجہ معرضِ التوا میں رہی۔ اچانک 2002 میں جناب اطہر فاروقی کا مرتب کردہ یہ شمارہ شائع ہوا۔ مجھے انبساط و افتخار ہے کہ اس وقیع مجموعۂ مضامین میں ہندو پاک کے مشہور ادیبوں کے مضامین کے ساتھ خاک سار کا مضمون بھی ہے۔

رشید حسن خاں نے اپنی متعدد قیمتی کتابیں رجسٹرڈ ڈاک سے مجھے بھیجیں۔ ''فسانۂ عجائب''، ''باغ و بہار''، ''گلزارِ نسیم''، ''املاے غالبؔ''، ''تدوین تحقیق روایت''.... یہ پانچ کتابیں جن پر رشید حسن خاں کے دستخط ہیں، میرے ذخیرۂ کتب میں موجود ہیں۔ خاں صاحب سے میں آخر تک مربوط رہا۔ میرے نام ان کا آخری خط 17 نومبر 2005 کا تحریر کردہ ہے:

''شاہ جہاں پور

17 نومبر 2005

عزیز مکرم!

آج ہی آپ کا خط ملا؛ کس قدر مسرت ہوئی، اس کو بیان نہیں کر سکتا! جیتے رہیے اور خوش رہیے۔ آپ کی صحت کا احوال پڑھ کر تشویش ہوئی، خدا کرے آپ مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں۔ میری صحت کا احوال بھی اچھا نہیں۔ ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ گھر سے باہر نہ جاؤں کیوں کہ سانس کی رفتار اچانک بگڑ جایا کرتی ہے۔ کم و بیش ڈھائی برس سے ایک کمرے کا قیدی بن کر رہ گیا ہوں۔ آپ کے مضمون کا انتظار رہے گا۔ پرسش احوال کے لیے ممنون ہوں۔ اصل میں اسّی برس کے بعد دیوار سے دھوپ تیزی کے ساتھ اُترنے لگتی ہے۔ بہ ہر طور زندہ تو رہنا ہے جب تک اُدھر کا اشارہ نہ ہوا۔ خدا کرے آپ کے متعلقین بہ عافیت ہوں۔

رشید حسن خاں

رشید حسن خاں صاحب جیسے علم کے شناور روز پیدا نہیں ہوتے۔ وہ بڑے محقق و ادیب کے ساتھ اعلا درجے کے انسان تھے۔ اپنی وضع داری پر قائم رہے معیار کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ بڑے کھرے، بے باک اور بہادر تھے۔ ان کی اس روش سے بعض لوگ خوش نہیں تھے، مگر خاں صاحب کو کسی کی پروا نہ تھی۔ وہ کسی کی ذات پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی گرفت ہمیشہ اصولی اور علمی ہوتی تھی صاحبانِ علم و نظر کے نزدیک ان کی بڑی عزت تھی۔ پوری اُردو دُنیا ان کے تجرِ علمی کی قائل تھی۔ صحتِ زبان کے احساس کو عام کرنے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ ان کی رحلت پر اُردو دُنیا مغموم و ملول ہے اور میں بھی دم بخود ہوں، حیران و ششدر، افسردہ و رنجیدہ۔ اب کس سے تلفظ، محاورہ، املا و انشا کے رموز پوچھوں گا! ایسے محسن، مربی اور شفیق اُستاد کو کھو کر بہت تنہا اور اداس ہو گیا ہوں۔

(ہفت روزہ، ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 28 ستمبر، 2006 شمارہ نمبر: 33, 34, 35, 36 جلد نمبر: 65)

○○○

رشید حسن خاں: یادوں کے آئینے میں

ڈاکٹر ٹی. آر. رینا

غالباً، جولائی 1980 کا زمانہ ہوگا جب دہلی یونی ورسٹی کے ہوسٹل گوائر ہال کے کمرے میں بعد دوپہر خاں صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی۔ میرے ساتھ میرے عزیز ایم۔ ایل پروانہ بھی تھے۔ ہم دونوں پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری کر رہے تھے۔ دروازے پر دستک دی، اندر سے آواز آئی چلے آؤ دروازہ کھلا ہے۔ جوں ہی ہم کمرے میں داخل ہوئے دیکھا ایک خوب صورت شخص بش شرٹ پہنے، لنگی باندھے، چشمہ لگائے، بستر پہ بیٹھا دائیں بائیں کتابیں پھیلائے تھوڑا سا سر جھکائے لکھنے میں مصروف ہے۔ قلم ہاتھ سے چھوڑ، چشمہ اُتار ہماری طرف نظر اُٹھا کر سامنے کرسیوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوا: ''ہاں میاں بتاؤ کیسے آنا ہوا؟'' ہم دونوں نے اپنا تعارف کروایا کہ:

''ہم جموّں یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے ہیں اور ڈاکٹر شیام لال کالرا عابدؔ پیشاوری کے شاگرد ہیں، بسلسلہ ریسرچ ورک یہاں آئے ہیں''۔ انھوں نے پھر سوال کیا ''کیا کالرا صاحب تشریف نہیں لائے؟'' جی تشریف تو لائے ہیں لیکن کسی کام کی وجہ سے یہاں حاضر نہیں ہو سکے۔'' خاں صاحب نے پوچھا ''اچھا یہ بتاؤ آپ کے موضوعات کیا کیا ہیں؟'' پروانہ نے بتایا میں ''داستان ہفت سیاح'' ایڈٹ کر رہا ہوں''۔ ''واہ میاں بہت اچھا کام ہے، اس کام میں محنت کی سخت ضرورت ہے۔ آج کل ایسے موضوعات پر بہت کم کام ہو رہا ہے کیوں کی یہ خشک قسم کا کام ہے اس کے لیے تحقیقی مزاج لازم ہے۔''

پروانہ کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے ''آپ کا موضوع کیا ہے؟'' میں نے عرض کیا ''پنڈت میلا رام وفاؔ: حیات و خدمات۔'' ''ہاں بھائی وہ بہت اچھے شاعر، زبان داں اور بے باک صحافی تھے۔ پنجاب میں شاعروں کے دو ہی تو گروہ تھے، ایک جوشؔ ملسیانی کا اور دوسرا وفاؔ صاحب کا۔ ہاں تو اُن سے متعلق کچھ مواد دستیاب ہے؟'' ''جی''، بہت کم''۔ بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ ایسے موضوعات جن کے مواد کی فراہمی آسان نہ ہو ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ اگر آپ نے یہ رجسٹرڈ کروالیا ہے تو تلاش بھی کرنی پڑے گی۔ موضوع تو اچھا ہے کیوں کہ پنجاب میں اب نئی نسل کے کتنے لوگ ہوں گے جو ایسے لوگوں کو گمنامی کے اندھیروں میں جانے سے بچا پائیں گے۔'' دیر تک ہمیں وہ کام کی باریکیوں کے بارے میں بتاتے رہے۔ کہ کس کس طرح کام کرنا ہے۔ ہمارے موضوعات کے خاکوں کو دیکھا، آخر میں فرمایا'' کالرا صاحب کے ساتھ کام کرنا آسان بات نہیں''۔ ہم دونوں مسکرا دیے۔ انھوں نے کہا ''چلو آپ کو چاے پلاتے ہیں''۔ ہم نے انکار کیا کیوں کہ گرمی زیادہ تھی۔ انھوں نے دُعا دی ''اچھا میاں خوش رہو''۔ ہم سلام کہہ کر رخصت ہوئے۔

کافی وقت گزر گیا ہم اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ 1981 میں خاں صاحب جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کی دعوت پر یہاں تشریف لائے۔ ان کے قیام کا بندوبست یونی ورسٹی گیسٹ ہاؤس میں کیا گیا۔ جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو نے یونی ورسٹی اور کالج کے اساتذہ کے لیے تین ہفتے کا ایک تربیتی کورس منعقد کیا تھا جو یکم جنوری سے 21 جنوری تک مسلسل چلتا رہا۔ اس تربیتی کورس کے لیے اسکولوں کے اساتذہ کو بھی دعوت دی گئی تھی جس کی وجہ سے حاضری زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ہم دونوں (راقم و پروانہ) ایک

دن شام کے وقت کالرا صاحب کے ہم راہ خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پلنگ پر بیٹھے انگریزی اخبار پڑھ رہے تھے۔ اخبار کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولے ''کالرا صاحب یہ دونوں رینا اور پروانہ تو نہیں۔ دہلی میں، میں ان سے ایک بار مل چکا ہوں۔ ہاں تو یہ بتاؤ کام کی کیا نوعیت ہے، کہاں تک پہنچا ہے۔ کتنے باب لکھے ہیں''؟ میں نے دھیرے سے جواب دیا ''حضور مواد تو کافی جمع کر لیا ہے لیکن ترتیب دینے کا کام ابھی تک شروع نہیں ہوسکا''۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کالرا صاحب اپنی طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے کبھی ترتیب دینے کے لیے کہا نہیں اور ہماری پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ کالرا صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے خاں صاحب نے فرمایا: ''کالرا صاحب کیا وجہ ہے کہ انھوں نے ابھی تک کام ہی شروع نہیں کیا۔ آپ ان سے کام کیوں نہیں لیتے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب تک ان کا کام قریب قریب اختمام تک پہنچ چکا ہوگا کتنا وقت برباد ہو چکا ہے۔'' کالرا صاحب خاموش رہے، وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر کسی کی بات کاٹ دیتے تھے۔ چاہے سامنے والے کو بُرا ہی کیوں لگے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے دوست کم اور دشمن زیادہ تھے۔ میں نے انھیں صرف دو آدمیوں کا احترام کرتے دیکھا تھا۔ ایک ڈاکٹر قمر رئیس، دوسرے خاں صاحب۔ ڈاکٹر قمر رئیس ان کے اُستاد رہ چکے تھے اور خاں صاحب سے انھیں دلی محبت تھی۔

ہمارے ہی سامنے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کالرا صاحب سے کہنے لگے ''آپ نے اپنے پیچھے کون سا خزانہ جمع کیا ہے؟ کل آپ کو پروفیسر بننا ہے، ترقی کے منازل طے کرنے ہیں۔ آج ایک بھی طالبِ علم ایسا نہیں جس نے آپ کی زیرِ نگرانی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہو۔ یہ دونوں محنتی ہیں، کام کرنا جانتے ہیں آپ کو ان سے کام لینا چاہیے اور ان کی اچھی طرح رہنمائی کرنی چاہیے۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہوئے ''میاں پرسوں شام چار بجے تک اپنے موضوع کا پہلا باب لکھ کر میرے پاس لاؤ۔'' میں نے گھر آتے ہی کام شروع کر دیا۔ تیسرے دن پہلا باب مکمل کر کے وقتِ مقررہ پر ان کی خدمت میں ٹھیک شام چار بجے حاضر ہوا۔ دروازے پر دستک دی۔ کہا ''چلے آؤ''۔ میں اندر داخل ہوا۔ کہنے لگے ''کام لائے ہو؟'' میں نے کہا ''جی ہاں''۔ اچھا اسے یہاں میز پر رکھ دو میں اسے رات کو دیکھ لوں گا کل شام آ کر لے جانا۔'' میں کاغذ رکھ واپس چلا آیا۔ دوسرے دن شام کو حاضر ہوا۔ کالرا صاحب اور پروانہ پہلے سے موجود تھے۔ کالرا صاحب کے سامنے ہی کہنے لگے ''شروعات اچھی ہے محنت اور لگن سے کام کرو خدا تمھاری مدد کرے گا۔'' میں نے کاغذ اُٹھا کر دیکھے، ہر صفحے پر کہیں کہیں کالی روشنائی سے نشان لگے ہوئے تھے۔ کچھ جملے درست کیے ہوئے تھے۔ آخری صفحے پر نوٹ لکھا ہوا تھا ''اگر اسی طرح محنت سے کام کرتے رہو گے تو مجھے اُمید ہے تمھارا کام جلد مکمل ہو جائے گا۔'' نیچے ان کے دستخط تھے۔ طلبہ کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرنا کوئی اُن سے سیکھے۔ طلبہ چاہے ایم۔ اے کے ہوں یا نئے ریسرچ اسکالر، رہنمائی کرتے وقت بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ وہ اکثر کہتے کہ ''جن اداروں سے یہ آئے ہیں وہاں کی تعلیمی حالت اتنی اچھی نہیں ہیں۔'' تعلیمی اداروں اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ کی تعلیمی قابلیت کا انھیں احساس تھا۔ وہ کبھی کبھی افسوس بھی ظاہر کر دیتے تھے۔ کئی بار انھوں نے کالرا صاحب سے کہا ''اگر ان طلبہ کی مدد ہم نہیں کریں گے تو یہ لوگ کہاں جائیں گے۔ آنے والے دور میں ادبی کام کیوں کر ترقی کر پائیں گا۔''

جموں یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو میں وہ روزانہ لکچر دیتے۔ اس شعبے کے طلبہ و اساتذہ کے علاوہ دوسرے شعبوں سے بھی طلبہ و اساتذہ اُن کے لکچر سننے کے لیے حاضر ہوتے۔ لسانیات، تنقید، تدوین، قواعد و زبان، اُردو املا، عبارت کیسے لکھیں اور زبان میں تلفظ کی کیا اہمیت ہے، ان موضوعات پر کھل کر بات چیت کرتے۔ اساتذہ اور طلبہ کے سوالات کے جواب بڑے اطمینان سے دیتے۔ اگر کوئی بات صاف نہ ہوتی تو بعد میں کوئی طالبِ علم اُن سے ملنا اور پوچھنا چاہے تو وہ اُسے پورا وقت دیتے۔ بعض اوقات طلبہ یونی ورسٹی گیسٹ ہاؤس کے کمرے تک آ جاتے اور دیر تک اُن سے گفتگو کرتے۔ ادبی معاملے میں انکار کرنا ان کی طبیعت میں شامل نہیں تھا۔ طلبہ کے مسائل کو سلجھانا وہ عبادت سمجھتے تھے۔ ہم گھنٹوں ان کے پاس بیٹھتے، ہر وقت علمی باتیں ہو رہی ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی ادبی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ ''کبھی بھی مذہبی بحث نہیں کرنی چاہیے ہوسکتا ہے کہ اس سے کسی کے دل کو ٹھیس پہنچے۔'' تین ہفتے کا وقت کیسے بیت گیا معلوم ہی نہیں ہوا۔

دوسری مرتبہ اپریل 1983 میں تین ہفتوں کے لیے بہ حیثیت وزٹنگ فیلو جموں تشریف لائے۔ اس دفعہ اُردو شعبے میں اصولِ تحقیق، قواعدِ زبان اور مشرقی شعریات پر لکچر دیے۔ میں دوسری نشست میں مجھے ڈیوٹی جانا ہوتا تھا۔ شام یونی ورسٹی گیسٹ ہاؤس میں کافی دیر تک ان سے بات چیت ہوتی رہتی۔ انھیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرا کام مکمل ہونے کے قریب ہے۔ اُردو شعبے سے اور بھی نئے ریسرچ اسکالر اُن سے ملنے آتے۔ وہ ہر ایک کو اپنے مفید مشوروں سے نوازتے۔ جب ان کا لکچر شروع ہوتا تو کمرے میں مکمل خاموشی چھا جاتی۔ وہ بلیک بورڈ کا بھرپور استعمال کرتے تھے۔ تیسری مرتبہ ستمبر 1995 میں چار ہفتوں کے لیے وہ جموں تشریف لائے۔ اس بار انھوں نے متن کی قرأت، کلاسیکی ادب کی تفہیم، علوم بلاغت اور اصولِ املا پر لکچر دیے۔ اس دفعہ حاضرین کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی۔ بہت سے بزرگ اساتذہ جو ملازمت سے وظیفہ پا چکے تھے اور بعض مقامی شعرا و ادبا بھی حاضر ہوتے۔ ادب سے دل چسپی رکھنے والی خواتین بھی اُن کے علمی اور معلوماتی لکچر سننے کے لیے آتی تھیں۔ ایک دن شام کے وقت راقم اور پروانہ اپنی اپنی ڈائریاں ان کے پاس چھوڑ آئے کہ حضور اپنی مرضی سے ان پر لکھ دینا۔ پروانہ صاحب کی ڈائری پہ کیا لکھا مجھے یاد نہیں لیکن میری ڈائری پر انھوں نے درج ذیل دو شعر لکھے۔

توقع دوستوں سے کیوں وفاداری کی ہے تجھ کو
کسی کا کون اب شرمندۂ احسان ہوتا ہے
کسی کے ظرف سے بڑھ کر نہ کر مہر و وفا ہرگز

کہ اس بے جا شرافت سے بڑا نقصان ہوتا ہے

میں انھیں ماہرِ ادبیات ہی نہیں ماہرِ نفسیات بھی کہوں گا۔ وہ قدیم نسخوں کی طرح انسانی ذہنوں کو بھی پڑھنا جانتے تھے۔ انھوں نے ایک واقعے کا خود ذکر کیا کہ ''ایک بار میں پاکستان کے سفر میں تھا مری ہل اسٹیشن میں دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ شام کے وقت بہت سے لوگ ملنے آئے، ایک شخص کے ساتھ تھوڑی دیر گفتگو ہوئی۔ دوسرے دن وہ حاضر ہوا اور کہنے لگا ''صاحب مجھے کوئی ایسا تعویذ دے دیجیے جو زندگی میں میرے کام آئے''۔ باقی لوگ یہ سن کو ب ہنسے اور کہا'' خاں صاحب آپ پیر کب سے ہو گئے ہیں۔''...اب کی بار خاں صاحب کی صحت پہلے سے تھوڑی کمزور ہو گئی تھی۔ ان کی آنکھوں اور دل کا آپریشن ہو چکا تھا۔ کھانے میں احتیاط برتنے لگے تھے۔ بھاری غذا کا استعمال ترک کر چکے تھے۔ روغن ومسالے دار اشیا بالکل منع تھیں۔ ناشتے میں دلیا، دوپہر کے کھانے میں مونگ کی دال، ٹماٹر کا شوربہ، خشک روٹی اور سلاد کا استعمال کرتے تھے اور اسی طرح رات کا بھی کھانا ہوتا تھا۔ میں نے انھیں تمبا کو نوشی کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔

ان کے تحقیقی کاموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ خشک مسائل پر کام کرنے والا شخص بھی خشک طبیعت کا مالک ہوگا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ بڑے ملن سار اور خوش طبیعت انسان تھے۔ گوائر ہال کا ہر فرد اُن کے معمولات سے واقف تھا۔ طلبہ ان سے محبت کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وقتاً فوقتاً یہ سب کو اپنی شفقت سے نوازتے رہتے تھے۔ بہ قول خاں صاحب ''جب میری آنکھوں کا آپریشن ہوا تو ہوسٹل کے طلبہ میرے پاس تھے، جب مجھے دل کی تکلیف ہوئی تو طلبہ ہی مجھے اسپتال لے گئے اور آپریشن ہو گیا۔ ان میں رہ کر میں نے کبھی اکیلا پن محسوس نہیں کیا۔

وقت اپنی پوری رفتار سے بیتتا جا رہا تھا۔ آخر الوداعی نشست کا وقت آن پہنچا۔ پروفیسر ظہور الدین نے نشست کے اہتمام کے لیے راقم اور پروانہ صاحب کی ڈیوٹی لگائی۔ شعبے سے متصل ایک ہال میں انتظام کیا گیا۔ چاے سے پہلے شعبے کے لکچر روم میں ایک الوداعی نشست منعقد کی گئی۔ اس میں دوسرے شعبوں کے اساتذہ، مقامی بزرگ شعرا کے علاوہ سری نگر سے بھی ایک دو لوگ تشریف لائے تھے۔ وہاں سے فارسی شعبے سے ایک خاتون پروفیسر بھی اس مجلس میں شریک ہوئی تھیں۔ بہت سے حضرات نے اپنے اپنے خیلات کا اظہار کیا جن میں ہم بھی شامل تھے۔ لیکن پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر عابد پیشاوری اور پروفیسر ظہور الدین کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ آخر میں خاں صاحب نے فرمایا: ''اب ایک بحرِ بیکراں ہے۔ ہم ابھی تک اس کے کنارے پہ کھڑے ہیں۔ جب کوئی اس میں گہرا اُترے گا تو اس پر اس کے پوشیدہ رازوں کا انکشاف ہوگا'' لکچر روم کے اندر، ہال میں اور ہال سے باہر ان کی بہت سی تصویریں اُتاری گئیں۔ ایک تصویر میں خاں صاحب، عابد صاحب اور ڈاکٹر امریک سنگھ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تصویر خاں خاں صاحب، عابد صاحب پروانہ صاحب اور راقم موجود ہیں۔ بہت سے طلبہ نے بھی تصویریں کھنچوائیں۔ شام کے وقت کالرا صاحب، ظہور صاحب اور ہم دونوں (میں اور پروانہ) انھیں اسٹیشن چھوڑنے آئے۔ گاڑی چلنے سے پہلے تک کچھ اور لوگ بھی آ پہنچے۔ یہاں بھی وہ ادبی گفتگو میں ہی منہمک رہے۔ گاڑی کے اسٹیشن چھوڑنے تک ہم وہاں کھڑے رہے۔ جموں کا یہ ان کا آخری سفر تھا۔

خاں صاحب کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ عرصے سے تھا۔ جب بھی انھیں خط لکھا جاتا وہ فوراً جواب دیتے۔ ہمارا مقالہ مکمل ہوا تو یونی ورسٹی نے ایک کاپی خاں صاحب کو، ایک کاپی ڈاکٹر قمر رئیس کو اور تیسری کسی اور کو بھیجی۔ 1986 میں ہمیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض ہو گئی۔ میں نے خاں صاحب کو خط لکھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ میری رپورٹ اور کاپی نکلوا کر پڑھ اور دیکھ لینا۔ میں نے ان کی تحریر پر عمل کیا۔ رپورٹ اور کاپی دونوں نکلوائیں۔ رپورٹ میرے حق میں بہت اچھی لکھی تھی۔ جب میں نے مقالے کی ورق گردانی کی تو معلوم ہوا کہ انھوں نے اوّل تا آخر صفحہ پڑھا تھا۔ بہت سی جگہوں پر انھوں نے پنسل سے نشان لگائے تھے اور حاشیے میں ان سے متعلق نوٹ درج کیے تھے۔ بعد میں میں نے ان کی روشنی میں مقالے کو دوبارہ لکھ لیا۔

ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد وہ شاہ جہاں پور اپنے گھر منتقل ہو گئے۔ ممبئی یا دوسرے مقامات پر جہاں کہیں جانا ہوتا وہاں کا ایڈریس لکھ بھیجتے۔ جولائی 2003 میں مجھے اور بیگم کو کان پور گورو جی کے پاس جانا تھا کیوں کہ گورو پورنما 13 جولائی کو آ رہی تھی۔ ہم نے پروگرام بنایا کہ اب کی بار شاہ جہاں پور خاں صاحب کے ہاں حاضری دیتے ہوئے براستہ لکھنؤ کان پور چلیں گے۔ 9 جولائی 2003 کو ہم جموں سے روانہ ہوئے، دوسرے دن بعد دوپہر شاہ جہاں پور پہنچے۔ برسات کا مہینہ تھا، بارش زوروں کی ہو رہی تھی۔ اسٹیشن سے ہم سیدھے کنٹونمنٹ پہنچے۔ وہاں ہمارے ایک بھتیجے فوج میں صوبے دار تھے۔ شام انھیں کے ہم راہ خاں صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوئے۔ جوں ہی ہم نے اپنے آنے کی اطلاع دی فوراً اپنے اسٹڈی روم سے اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ پہنچے۔ ہم نے سلام کیا، جواب دیا ''خوش رہو''۔ جب انھیں یہ پتا چلا کہ میرے ساتھ بیگم بھی تشریف لائی ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ دیر تک ان سے باتوں میں مصروف رہے۔ جموں کا بار بار ذکر کرتے۔ تھوڑی دیر میں چاے کی ٹرے آ گئی۔ دو تین قسم کی مٹھائیاں بسکٹ اور نمکین۔ ان کے دونوں صاحب زادے خورشید حسن خاں اور خالد حسن خاں، دونوں بہوئیں، پوتے پوتیاں، ان سب کے درمیان ایسا لگا کہ ہم انہی کے افرادِ کنبہ ہیں۔ اجنبیت جاتی رہی۔ قریب تین گھنٹے ہم نے وہاں گزارے۔ خاں صاحب نے اپنا اسٹڈی روم دکھایا، اسٹڈی روم و ڈرائنگ روم کی الماریوں میں کتابیں نہایت قرینے سے رکھی ہیں۔ میز پر ''زٹل نامہ'' (کلیات جعفر زٹلی) کا مسودہ تیار رکھا تھا۔ اس پر صرف نظرِ ثانی کرنا باقی تھا (اسی سال اس کی اشاعت بھی ہو گئی) میں کیمرہ ساتھ لے گیا تھا، سبھی کے فوٹو اُتارے۔ پورے گھر والوں کے ساتھ ہمارا بھی فوٹو اُتارا گیا۔ باقی لوگ جب اندر چلے گئے تو میں نے خاں صاحب سے پوچھا اب آپ کیسا محسوس کرتے ہیں۔ کہنے لگے

''رینا صاحب میرے بیٹے اور بہوئیں بہت اچھے ہیں، میری خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ساری زندگی ہم نے اپنی شریکِ حیات کی طرف توجہ نہیں دی۔ عمر کا بیش تر حصہ دہلی میں گزار دیا۔ اب اس عمر میں ان کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتا ہوں۔ میری عادت ہے کہ دن غروب ہونے کے بعد کام نہیں کرتا، اُس وقت اکیلا پن محسوس ہوتا ہے۔ کس سے گفتگو کی جائے۔'' میں نے ان کے چہرے پہ ایک عجیب قسم کا تاثر دیکھا جسے میں اندر ہی اندر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ان سے شکایت کی ''خاں صاحب نہ تو آپ نے کسی خط میں اس الم ناک واقعے کا ذکر کیا اور نہ ہی کسی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی۔ کم از کم ہفت روزہ 'ہماری زبان' دہلی میں تو یہ خبر چھپ ہی جانی چاہیے تھی۔'' کہا ''رینا صاحب کس لیے۔ جانے والا تو چلا گیا۔ اب میں لوگوں کے خطوط کا کہاں تک جواب دیتا۔'' خاں صاحب نے اپنے لیے کچھ اصول وضع کر لیے تھے جن کی پابندی انھوں نے تمام عمر کی۔ اب کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ ہم نے رخصت چاہی۔ کہنے لگے ''کھانا یہیں کھا کے جاؤ''۔ ہم نے کہا ''وہاں بھی انتظار ہو رہا ہوگا۔'' چلتے وقت ہمیں بہت سی دُعائیں دیں۔ بیگم کے سر پر ہاتھ رکھا۔ سبھی افراد ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئے۔ خاں صاحب باہر نہیں نکلتے تھے، ان کے گھٹنے میں درد تھا۔ خالد سے کہا ''بیٹا باہر جاؤ اور انھیں گاڑی تک چھوڑ آؤ''۔ بیٹے نے حکم کی تعمیل کی اور ہم کنٹونمنٹ لوٹ آئے۔ آتے جاتے ہوئے راستے میں ہم اُس آرڈیننس فیکٹری کے گیٹ کے سامنے سے گزرے جس میں خاں صاحب نے سب سے پہلے 1939 میں ملازمت کی تھی۔ یہ آرمی ایریا کے اندر واقع ہے۔ دوسرے دن بیگم کے ہم راہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کان پور چلے آئے اور دو دن گرو جی کے پاس قیام کیا۔

وقت گزرتا گیا۔ کبھی کبھار میں خط لکھ دیتا، وہ فوراً جواب دیتے۔ جس میں بہت سی باتوں کے علاوہ بہت سی دُعائیں ہوتیں۔ میرے ذہن میں ایک انجان سا خیال گردش کرنے لگا۔ کیوں نہ خاں صاحب کا ایک ویڈیو انٹرویو لے لیا جائے۔ مجھے 6 نومبر 2005 کو کان پور سے ستر کلومیٹر دور مدار پور گنگا کے کنارے گورو جی کے آشرم میں پہنچنا تھا۔ اس دن گورو جی کی پہلی برسی تھی۔ انھوں نے 4 نومبر 2004 کو اپنا شریر چھوڑا تھا۔ میں نے پروگرام بنایا کہ براستہ شاہ جہاں پور چلو، خاں صاحب کا انٹرویو لے لیں گے سوال نامہ تیار کیا اور 2 نومبر 2005 کی شام میں روانہ ہو گیا۔ 3 نومبر کے بعد دوپہر شاہ جہاں پور پہنچا۔ اسٹیشن کے پاس ہوٹل پیراڈائز میں ایک کمرہ لیا۔ منھ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کیے اور نیچے بازار میں اُتر آیا۔ بازار میں آج کافی رونق تھی۔ چاروں طرف روشنی ہی روشنی نظر آ رہی تھی۔ بازار خوب سجے ہوئے تھے۔ مسجدوں کے مینارے اور گنبد جگمگا رہے تھے۔ مٹھائی کی دُکانوں پہ کافی بھیڑ تھی۔ لوگ سویّاں خرید رہے تھے۔ میں نے مٹھائی کا ایک ڈبّہ لیا۔ رکشہ کیا سیدھا خاں صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ دروازے پر دستک دی۔ ان کے پوتے نے آکر دروازہ کھولا۔ ان کا چھوٹا بیٹا خالد حسن خاں مجھے لینے آیا اور ہم سیدھے ڈرائنگ روم میں جا پہنچے۔ خاں صاحب گرم کپڑے پہنے، سر پہ ٹوپی لگائے، گلے میں مفلر لپیٹے اسٹڈی روم کی طرف سے وارد ہوئے۔ میں نے اُٹھ کر سلام کیا۔ کہنے لگے ''میں خوش رہو'' مجھے تمھارے آنے کی خبر تھی، آپ نے خط جو لکھا تھا۔'' ایسا لگ رہا تھا کہ انھیں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ بیگم اور بچوں کا حال چال پوچھا۔ پروانہ صاحب کی بیگم کا سال بھر پہلے آپریشن ہوا تھا اُن کے بارے میں پوچھا کہ اب ان کی صحت کیسی ہے؟ اُردو شعبے سے متعلق دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پُرانی یادوں کو دیر تک دہراتے رہے۔ کہا کہ میں نے ظہور صاحب کو پُرانے پتے پر خط لکھا تھا، کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ وہ اب اپنے نئے مکان میں منتقل ہو چکے ہیں۔ میں نے ظہور صاحب کا انھیں ٹیلی فون نمبر دیا۔ کہنے لگے میں انھیں فون کروں گا۔ یہاں سردی بڑھ گئی ہے، کام کا زکی رفتار سست ہو گئی۔ وہاں سردی کیسی ہے؟ اتنے میں چائے کی ٹرے آ گئی۔ میں نے اپنے لیے ایک پیالی چائے تیار کی۔ نہایت عمدہ قسم کی چائے تھی۔ تین چار قسم کی مٹھائیاں اور بسکٹ ساتھ تھے۔ خاں صاحب نے میرا ساتھ دینے کے لیے چوتھائی پیالی چائے بغیر شکر اور دودھ کے لی۔ انھوں نے بتایا کہ میں پچھلے چالیس سالوں سے بغیر دودھ اور شکر کی چائے پیتا ہوں۔ آج کل صرف صبح چائے پیتا ہوں۔''

میں نے خاں صاحب سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا کہ میں آپ کا ایک ویڈیو انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ یہاں نزدیک کوئی ویڈیو والا مل سکتا ہے؟ جواب دیا ''رینا صاحب کل عید ہے آج سبھی لوگ تہوار کی خوشی میں اپنے اپنے کام بند کر کے گھروں کو چلے گئے ہیں۔ میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا۔ بات کرنے میں تھوڑی تکلیف ہوتی ہے۔ سانس پھولنے لگتی ہے۔ ایسا کرتے ہیں یہ کام گرمیوں کے لیے اُٹھا کر رکھتے ہیں۔ اُس وقت میری طبیعت بہتر ہو جائے گی اور آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میں نے سوال نامہ سامنے رکھا، انھوں نے اُسے پڑھا۔ کہنے لگے ''بہت سوال لکھ رکھے ہیں، ان کے لیے وقت چاہیے۔'' اُٹھے اور ایک کتابچہ 'بازیافت' جنوری 2002 جس کے مدیر رفیع الدین ہاشمی شعبۂ اُردو پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج لاہور، لا کر مجھے دیا اور کہا اسے بھی رکھ لو اس کی روشنی میں بھی چند سوال شامل کر لینا۔''

میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''حضور میں نے خط کے ذریعے آپ کے شجرۂ نسب کے بارے میں پوچھا تھا؟

خاں صاحب: ''تحقیق میں کسی کے حسب نسب کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ تین صورتوں میں لوگ اکثر جھوٹ بولتے ہیں۔ مرید اپنے پیر کے لیے، بیٹا اپنے باپ کے لیے اور شاگرد اپنے اُستاد کے لیے۔'' خاں صاحب نے غالبؔ کے خان دان کی مثال دی جس کا ذکر خود غالبؔ نے کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ''ایسا کوئی خان دان سرے سے ہے ہی نہیں۔ پھر کوئی کیوں یقین کر سکتا ہے۔ ہمیشہ ادیب یا محقق کی شخصیت کو اس کے کام کے ترازو میں تولنا چاہیے۔''

راقم: خاں صاحب آج کل آپ کن پروجیکٹوں پر کام کر رہے ہیں؟

خاں صاحب: میں دو پروجیکٹوں پر کام کر رہا ہوں۔ پہلا ہے ''گنجینۂ معنی کا طلسم''۔ یہ غالبؔ کے الفاظ کا اشاریہ ہے۔ غالب نے ایک لفظ کو کتنی صورتوں میں استعمال کیا

ہے اور کہاں کہاں، یہ اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی کمپوزنگ شروع ہو چکی ہے۔ یہ دو جلدوں میں شائع ہوگا۔ دوسرا ''غرائب اللغات'' ہے یہ اُردو کا پہلا لغت ہے جو عالم گیر اورنگ زیب کے عہد میں پہلی بار ہریانہ میں لکھا گیا جو لفظ اُس وقت استعمال کیے جاتے تھے آج ان کی شکلیں بدل گئی ہیں۔ مثلاً ''ریوڑ'' جو بھیڑوں کے غول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ پہلے ''اریوڑ'' کی صورت میں لکھا جاتا تھا۔''

میں نے خاں صاحب سے ایک سوال اور کیا ''آپ نے بہت سا کام کیا ہے لیکن آپ کا سب سے اچھا کام کون سا ہے؟'' انھوں ے جواب دیا ''اُردو املا'' اور ''فسانۂ عجائب''۔ خاں صاحب اپنے کام کرنے کے طریقۂ کار سے متعلق کچھ بتائیں گے؟''

انھوں نے بتایا کہ ''ساری زندگی میں نے سورج غروب ہونے کے بعد لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کیا۔ میں ہر روز صبح پانچ بجے اُٹھ جاتا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر نہانا لازمی تھا۔ نہانے کے بغیر میں نے کبھی ناشتہ نہیں کیا۔ چھ بجے کے قریب لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیتا جو ایک بجے تک جاری رہتا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر لیٹ جاتا اور تین بجے تک آرام کرتا، تین بجے اُٹھنے کے بعد سیدھا کھیل کے میدان میں پہنچ جاتا یا کافی ہاؤس چلا جاتا۔ ملازمت کے دوران کام کاج معمول میں تبدیلی بھی آجاتی تھی۔ لیکن ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میں نے پہلے کی نسبت زیادہ کام کیا ہے۔ کیوں کہ اب میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ آج کل میں صبح چھ بجے سے ایک ایک بجے تک، پھر تین بجے سے چھ بجے شام تک کام کرتا رہتا ہوں۔''

راقم: ''خاں صاحب اس وقت آپ کی عمر کیا ہوگی اور آپ کی صحت کیسی رہتی ہے؟''

خاں صاحب: ''آنے والے دسمبر میں، میں 80 برس پورے کرلوں گا۔ تعلیمی اسناد میں 10 جنوری 1930 درج ہے لیکن اصل دسمبر 1925 ہے۔ آج کل موسم تبدیل ہو رہا ہے۔ سردی شروع ہونے پر میں کام کے لیے بیٹھ نہیں سکتا۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ کمرے میں بھی چلنا پھرنا نہیں ہوتا۔ تین سالوں سے میں نے باہر جانے کے لیے اپنی دہلیز پار نہیں کی۔ پراسٹریٹ کی تکلیف بھی ہے، پیٹ اکثر خراب رہتا ہے، صبح سے شام تک دوائیاں وقت پر لینی پڑتی ہیں۔ سانس پھولنے لگتا ہے۔ زیادہ حرکت کرنے کے لیے ڈاکٹروں نے سختی سے منع کیا ہے۔ اب گھر کی چار دیواری کے اندر مقید ہو کر رہ گیا ہوں۔ جب موسم گرما شروع ہوگا تو میں اچھی طرح کام کاج کرنے لگوں گا۔''

خاں صاحب جو لوگ زندہ اشخاص پر ایم۔ فل یا پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا راے ہے؟''

''ارے اسے سہل نگاری کہیں گے۔ یہ لوگ ادب کے ساتھ انصاف نہیں بل کہ ناانصافی کر رہے ہیں۔ کیا ایسا کوئی اسکالر ہے جو کسی زندہ شخص پر کام کر رہا تو وہ حقیقت نگاری سے کام لے سکتا ہے۔ آخر وہ بھی تو انسان ہے۔ اس میں بھی خوبیاں اور خامیاں ہوں گی۔ انھیں منظر عام پر لانا آسان کام نہیں۔ آج یہ کام صرف ڈگری حاصل کرنے کے لیے ہو رہا ہے۔ میں نے ایسے حضرات دیکھے ہیں جن پر بیک وقت دو دو اسکالر کام کر رہے ہیں۔ جب تک یہ حضرت زندہ ہیں ان کا کیا کہاں ختم ہوا۔ انسانی ذہن مسلسل اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتا رہتا ہے اور تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ آج جن نظریات کا وہ حامی ہے کل مخالف بھی ہو سکتا ہے۔ نئی نئی تحریکات سے وہ اثر قبول کرتا ہے تو پھر ہم کیوں کر اپنے کام کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں۔ سچ تو نہیں لکھ سکتے نا؟ تحقیق کا اصل مقصد سچائی کی تلاش ہے جس کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔''

راقم: مستقبل میں اُردو زبان کی ہندوستان میں کیا پوزیشن ہوگی؟''

خاں صاحب: ''دیکھو کوئی بھی ایسی زبان جس کا سیدھا تعلق عوام کے دلوں سے ہو، ہمیں اُس کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ایک بات مجھے مایوس کیے جا رہی ہے کہ جہاں جہاں یونی ورسٹیوں میں اُردو شعبے قائم ہیں وہاں پہلے جیسا معیار نظر نہیں آتا۔ تحقیقی کام بھی اس نوعیت کے نہیں ہو رہے۔ پُرانے متون کی تدوین کی کوئی کوشش نہیں کرتا، بل کہ ان کو ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں پاتے۔ ہمارا قدیم ورثہ الماریوں میں بند رہ کر دیمک کی نذر ہو جائے گا۔ آج کل ہلکے پھلکے موضوعات کو لے کر کام ہو رہے ہیں۔''

راقم: ''معیاری کام اور متون کی تدوین کے نہ ہونے کے لیے آپ کسے قصوروار مانتے ہیں۔ نئے اسکالروں یا اساتذہ کو؟''

خاں صاحب: ''دونوں کو، جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، سہل نگاری سب سے بڑی وجہ ہے اسکالروں کو کوئی راستہ دکھانے والا ہونا چاہیے۔ نئے اساتذہ سے آپ کتنی توقعات رکھ سکتے ہیں۔ میں اساتذہ کی مخالفت نہیں کرتا، میں بھی تو انہی میں سے ایک ہوں۔ لیکن جب یہ ملازمت حاصل کر لیتے ہیں تو لکھنے پڑھنے سے جی چُرانے لگتے ہیں۔ علم عبادت چاہتا ہے۔''

راقم: ''کیا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ادب میں بھی گروہ بندی جاری ہے؟''

خاں صاحب: ''ادبی گروہ بندیوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ سلسلہ تو زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ پہلے ادبی معارکے ہوا کرتے تھے اب سیاسی معرکے ہو رہے ہیں۔ ادبا و شعرا سیاسی جکڑ بندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آج کام کو نہیں سیاسی جوڑ توڑ کو سراہا جاتا ہے۔''

اس طرح خاں صاحب کا ایک مختصر انٹرویو ہو گیا۔ اندھیرا کافی ہو چکا تھا۔ میں نے اجازت چاہی۔ انھیں صبح ہونے والی عید کی مبارک باد دی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کھانے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور آپ جانتے ہیں میں ویزیٹرین ہوں اور آپ کے ہاں آج یہ ممکن نہیں۔ وہ ہنس دیے۔ میں سلام کے لیے جھکا۔ اُٹھ کر مجھے گلے لگایا۔ پھر وہی کلمات دہرائے ''خوش رہو میاں آپ کو پُرانی قدروں کا پاس ہے۔ آج کی نسل ان اقدار کو بھولتی جا رہی ہے۔'' یہ میری بڑی خوش نصیبی تھی۔ بیٹے خالد سے کہا

''ریناصاحب کو باہر سڑک تک چھوڑ آؤ''۔ میں اس اُمید کے ساتھ ہوٹل واپس لوٹ آیا کہ گرمیوں میں خاں صاحب کے ساتھ پھر ملاقات ہوگی۔4نومبر 2005 کی صبح کو میں براستہ لکھنؤ کان پور کے لیے روانہ ہوگیا اور چار دن کے بعد گھر لوٹ آیا۔

آنے کے بعد میں نے انھیں دو خط لکھے جن کا جواب انھوں نے دیا۔ ٹیلی فون پر بات چیت ہوئی، بہت خوش معلوم ہو رہے تھے۔ باری باری سب کی خیریت پوچھی۔ دُعائیں دیں۔13 فروری 2006 کو میں نے ایک اور خط لکھا جس میں یہ ذکر کیا کہ ڈاکٹر گیان چند جین امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر پورٹرِول کے ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہیں اور ان کی اہلیہ دماغی بیماری میں مبتلا ہیں اور اپنی بیٹی کے گھر میں رہتی ہیں۔ یہ باتیں ہمیں جین صاحب کے اُس خط سے معلوم ہو چکی تھیں جو''ہماری زبان'' دہلی کے 22 تا28 نومبر 2005 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ میں نے ڈاکٹر جین کے مضمون ''خدائے تدوین'' جو خاں صاحب سے متعلق ''کتاب نما'' کے خصوصی شمارے ''رشید حسن: حیات وادبی خدمات'' کے جولائی 2002 میں شائع ہوا تھا، کے حوالے سے لکھا کہ جین صاحب کو شکایت ہے کہ ''میں اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' انھیں پیش کی تھی۔ انھوں نے لکھا کہ میں اس کا ایک ایک لفظ پڑھوں گا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہیں لکھا۔ شاید کتاب کی ورق گردانی کی ہی نہیں۔'' اس لیے آپ ان پہ ایک مضمون لکھ دیجیے۔ اس کا جواب خاں صاحب نے اپنے خط مورخہ 17 فروری 2006 کو یوں دیا۔ خط پیش خدمت ہے۔

''شاہ جہاں پور

17 فروری 2006

عزیزم! تمہارا خط مجھے کل ملا تھا، جیتے رہو اور خوش رہو۔ تم جس خلوص اور تعلق خاطر کے ساتھ خط لکھتے ہو اور یاد رکھتے ہو، یہ بات اب کم یاب ہے۔ بہت سی دُعائیں۔ جین صاحب کو میں نے خط لکھا تھا، اُن کے دو خط آئے تھے اور دو بار انھوں نے فون بھی کیا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ فون پر الفاظ اُن کے منہ سے اس طرح نکلتے ہیں کہ گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ بات سمجھ میں نہیں آپاتی ہے۔ تحریر تو خیر پھر بھی پڑھ لی جاتی ہے۔ میں نے اپنی کتاب ''سحر البیان'' کا انتساب بھی انھی کے نام کیا ہے۔ وہ میرے حال پر بہت مہربان رہے ہیں۔ ''تحقیق کا فن'' پر کچھ نہ لکھنے کی شکایت انھوں نے مجھ سے بھی کی تھی۔ میں کرتا کیا، مرحوم کالرا صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ اس پر تبصرہ میں لکھوں گا۔ یوں میں نے کچھ نہیں لکھا، یہ بات میں نے جین صاحب کو بتادی تھی۔ وہ لکھتے ہی رہ گئے اور چلے گئے، پھر بات پُرانی ہوگئی۔ پونچھ کی زبان کے الفاظ کو حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ لکھو، پھر دیکھوں گا کہ ان کو کس طرح مرتب کیا جا سکتا ہے۔ ظہور صاحب نے فون کیا تھا، ان سے گفتگو ہوگئی، ان کا خط بھی آیا تھا تم کو عزیز رکھتا ہوں اور تمھاری یاد دل میں رہتی ہے۔ خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے اور تمھاری پریشانیوں کا دور ہونے کا کوئی وسیلہ پیدا کرے۔ بہت دُعاؤں کے ساتھ۔

رشید حسن خاں

مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ ان کا آخری خط ہوگا۔ دن گزرتے گئے میں نے انھیں ایک اور خط 20 مارچ 2006 کو لکھا۔ اس الم ناک سانحے کا مجھے علم ہی نہیں ہوا کہ خاں صاحب کی روح پرواز ہو چکی ہے ہفت روزہ ''ہماری زبان'' کا شمارہ یکم تا7 مارچ 2006 پہنچا، اس میں یہ خبر نہیں تھی۔ حالاں کہ 27 فروری کو اُردو گھر میں تعزیتی جلسہ منعقد ہو چکا تھا۔ شاید پرچہ ان کی وفات کے سے پہلے شائع ہو چکا تھا۔ یہ خبر ''ہماری زبان'' کے شمارہ 8 تا28 مارچ 2006 کے صفحہ 12 پر شائع ہوئی۔ یہ شمارہ ماہ نامہ ''شاعر'' کے خصوصی شمارہ کے طور پر شائع ہوا ہے۔ مضامین کی جو فہرست شائع ہوئی اس میں ''ایک دیا اور بجھا'' (رشید حسن خاں) پڑھ کر دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ یقین نہیں آیا۔ ان کے گھر شاہ جہاں پور فون کیا۔ فون خالد حسن نے اُٹھایا۔ تفصیل سے گفتگو ہوئی۔

ادبی حلقوں میں خاں صاحب سخت طبیعت کے ثابت ہوئے تھے۔ تحقیقی کاموں میں وہ کسی قسم کی کوتاہی یا غلطی کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ جو کہتے بلا روک ٹوک کہتے۔ مصلحت کوشی ان سے کوسوں دور تھی۔

گزرے ہیں جہاں میں ہم شہسواروں کی طرح
پیچھے اپنے ہم قدموں کے نشاں چھوڑ جائیں گے

(ہفت روزہ، ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا28 ستمبر 2006، شمارہ نمبر 33,34,35,36 جلد نمبر: 65، صفحہ 18-19 اور 32-33)

○○○

رشید حسن خاں: کچھ یادیں، کچھ باتیں

تسلیم غوری بدایونی

رشید حسن خاں صاحب نہیں رہے، مجھے یہ خبر جب خاں صاحب کے ہم محلّہ اور میرے کرم فرما جناب فہیم القدر نے فون پر دی تو میرے پیروں تلے کی زمین کھسک گئی، اس لیے نہیں کہ خاں صاحب کو مرنا نہیں تھا بل کہ اس لیے کہ 28 روز قبل ہی میں اُن سے مل چکا تھا، ہشاش بشاش تھے، نہ کوئی مرض نہ کوئی تکلیف، تقریباً دو گھنٹے تک میری اور ان کی بالمشافہ گفتگو ہوئی تھی۔ میرے تو سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ خاں صاحب اتنی جلد ہم سب کو چھوڑ کر چلے جائیں گے مگر قدرت کے کارخانے میں کس کو دخل ہے۔ بقول شخصے

سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

خاں صاحب سے میرے تعلقات اس زمانے سے تھے جب وہ دہلی میں مقیم تھے اور دہلی یونی ورسٹی کی لائبریری سے وابستہ تھے۔ میں دہلی میں ان سے متعدد مرتبہ مل چکا تھا مگر جب وہ رٹائر ہو کر اپنے وطن شاہ جہاں پور آ گئے تب تو ملاقاتیں اور فون پر گفتگو عام بات ہوگئی تھی۔ میں 29 جنوری 2006 کو بھی خاں صاحب سے ملنے ان کے دولت قدے پر گیا تھا جہاں تقریباً دو گھنٹے تک اُن سے مختلف ادبی اور سماجی موضوعات پر گفتگو ہوئی تھی۔ جب میں نے اُن سے چلنے کی اجازت مانگی تو کہنے لگے دل نہیں ہو رہا ہے مگر آپ بضد ہیں اس لیے آپ کو بے دلی سے جانے کی اجازت دیتا ہوں مگر یہ بتاؤ کہ اب کب آؤ گے۔ میں نے کہا میں 16 اپریل کو حاضر ہوں گا تو کہنے لگے میں 16 اپریل تک انتظار کروں گا۔ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئے حالاں کہ میں منع کرتا رہا مگر واہ رے وضع داری نہ ماننا تھا نہ مانے، کہنے لگے چل میں رہا ہوں اور تکلیف آپ کو ہو رہی ہے۔ اس ملاقات میں انھوں نے مجھ سے اپنے ایسے چند بدایونی دوستوں کے بارے میں پوچھا جن کو بدایوں والے بھی بھول چکے ہیں یا جو پاکستان یا قبرستان کو آباد کیے ہوئے ہیں اس لیے میں نے گھر آ کر اُن لوگوں کے عزیزوں سے معلومات حاصل کیں اور جیسا مجھے بتایا گیا میں نے ویسا ہی خاں صاحب کو لکھ دیا۔ میرے اس خط کا جواب خاں صاحب نے مجھے 12 فروری 2006 کو دیا جس میں مجھے تاکید کی گئی تھی کہ جب میں 16 اپریل کو شاہ جہاں پور آؤں تو ضرور ان سے ملوں۔ میں ابھی اس خط کا جواب خاں صاحب کو نہ دے پایا تھا کہ 26 فروری 2006 کی شام کو فہم القدر صاحب نے اطلاع دی کہ رات خاں صاحب کا انتقال ہوگیا۔ یہ سُن کر میں پریشان ہوگیا۔ کر بھی کیا سکتا تھا، صبر کرنا پڑا۔ کاش فہم القدر صاحب مجھے اطلاع کر دیتے تو میں اپنے محسن کے آخری دیدار کر سکتا تھا اور اُن کی آخری رسومات میں شریک ہو کر دُعائے مغفرت کر سکتا تھا اور مرزا ذاکر حسین ثاقب لکھنوی کے اس شعر کو حقیقت کا رنگ دے سکتا کہ

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

میرے نام خاں صاحب کا جو آخری خط آیا اس کو یہاں نقل کرتا ہوں:

''شاہ جہاں پور

12 فروری 2006

عزیز تسلیم صاحب

آپ کا خط ملا، شکر گزار ہوں۔ آپ کی تحریریں پڑھتا رہتا ہوں اور لطف اندوز ہوتا ہوں۔ جی خوش ہوتا ہے یہ دیکھ کر آپ نے لکھنے پڑھنے سے اپنا رابطہ برقرار رکھا ہے۔

بدایوں کے اصلی پیڑوں کا تحفہ میرے لیے تو بہت قیمتی تھا۔ دنوں کے بعد ایسے پیڑے کھائے ورنہ دوسرے کئی صاحبان بازار میں بکتے ہوئے پیڑے لے آئے یہ کہہ کر کہ اب خان دانِ ممّن کی تو کوئی دکان رہی نہیں اب ایسے ہی پیڑے ملتے ہیں وہاں۔ آپ یہ تحفہ نہ لاتے تو میں ان اصلی پیڑوں سے محروم ہی رہتا۔ اپریل میں آپ نے آنے کی بشارت دی ہے میں منتظر رہوں گا۔ توقع کرتا ہوں آپ مع متعلقین بہ عافیت ہوں گے۔

رشید حسن خاں

آج جب خاں صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے تو مجھے ان کی باتیں رہ رہ کر یاد آ رہی ہیں۔

خاں صاحب علم کا بحرِ ذخار تھے، اُن سے بات کرتے وقت اس بات کا دھیان رکھنا پڑتا تھا کہ کوئی لفظ یا فقرہ یا جملہ غلط منہ سے نہ نکل جائے، وہ غلط بات پر فوراً ٹوک دیتے تھے۔ حالاں کہ خاں صاحب کسی یونی ورسٹی یا جامعہ سے کوئی ڈگری یافتہ نہ تھے مگر انھوں نے اپنے مطالعے سے فارسی اور اُردو زبانوں پر دسترس حاصل کر لی تھی جس کے بل پر پوری ادبی دُنیا ان کا لوہا مانتی تھی۔ قدیم متن کو جدید شکل میں تبدیل کرنے میں ان کو ملکہ حاصل تھا، انھوں نے ساری زندگی علم و عمل کے درمیان گزاری۔ اُن کی مرتب کی ہوئی کتابیں اُن کے تجرِ علمی پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد اب میدان بالکل صاف ہے، دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیتا۔

خاں صاحب اپنے علم کے بوتے پر علم کے بڑے بڑے پہاڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، اس قبیل میں چاہے اُن کا کوئی محسن ہی کیوں نہ ہوتا۔ خواجہ احمد فاروقی جنھوں نے خاں صاحب کو ذاتی دل چسپی لے کر دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت دلوائی لیکن ان سے بھی خاں صاحب کی نہ بنی۔ اس طرح پروفیسر آل احمد سرور سے بھی اُن کی پٹری نہ بیٹھی حالاں کہ وہ پروفیسر آل احمد سرور کی علمیت کے قائل تھے مگر اُن کی تنقیدی بصیرتوں کے قائل نہ تھے، کہتے تھے کہ ان کے مضامین ناول کا انداز لیے ہوتے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ سرورؔ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ میں نے پوچھا کہ سرورؔ صاحب سے آپ کب سے خفا تھے، کہنے لگے اُن کا دوسرا شعری مجموعہ ''ذوقِ جنوں'' پر میں نے تبصرہ کیا تھا جس میں یہ لکھ دیا تھا کہ شعری مجموعہ کا نام ہی غلط ہے۔ یہ بات سرورؔ کو نا گوار گزری اور پھر راستے الگ الگ ہوئے۔ سونے پر سہاگہ تاریخ ادب اُردو کی پہلی جلد جو پروفیسر سرورؔ کی زیرِ نگرانی شائع ہوئی، اس پر میں نے تبصرہ کیا جو حقیقت پر مبنی تھا، اس تبصرے کے شائع ہوتے ہی جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ خاں صاحب سرورؔ مرحوم کے مطالعۂ کتب کے معترف تھے۔

رشید حسن خاں صاحب سے میں نے ایک مرتبہ پوچھا کہ آپ نے بہت سے لوگوں کو ادبی ڈاکٹر بنا دیا کیا آپ پر بھی کسی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کی کوشش کی۔ کہنے لگے میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ کسی زندہ شخصیت کو پی۔ ایچ۔ ڈی کا موضوع بنایا جائے۔ جب ایک شخص زندہ ہو تو اس کی شخصیت مکمل کہاں ہوئی تو اس پر تحقیقی کام مکمل کیسے ہو سکتا ہے کیوں کہ زندہ شخصیت کبھی بھی اپنا نظریہ، اپنے خیالات اور اپنا کردار بدل سکتی ہے۔ ہاں جب کوئی اس دُنیا سے چلا جائے تو اس کی شخصیت مکمل ہو جاتی ہے چاہے وہ کسی پلّے کا کیوں نہ ہو۔ کہنے لگے پاکستان کے متعدد اسکالرز نے مجھے طلب کی مگر میں نے سب کو منع کر دیا۔ خاں صاحب کی یہ بات میرے لیے گلے اُترتی چلی گئی۔

خاں صاحب بہت صاف گو تھے۔ وہ کھری کھری کہتے تھے چاہے کسی کو بُرا لگے یا اچھا۔ ایک مرتبہ میں نے کہا خاں صاحب آپ نے دُنیائے ادب میں شاہ جہاں پور کو آپ کا جشن منانا چاہیے۔ ضلع انتظامیہ کو آپ کے نام پر کسی شاہ راہ کا نام رکھنا چاہیے کیوں کہ آپ سے کہیں کم درجے والے ادیبوں اور شاعروں کے نام پر جلسے ہوتے ہیں اور ان کے نام پر سڑکوں کے نام رکھے جاتے ہیں۔ کہنے لگے مجھے شاہ جہاں پور میں جانتا ہی کون ہے جو میرا جشن منائے گا۔ ایک عرصے تک یہاں سے غائب رہا اور پھر جب سے دہلی سے آیا ہوں گھر سے باہر نہیں جاتا۔ کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادبی یا سماجی تقریب میں شرکت نہیں کرتا، ایسے میں میرا جشن کون منائے گا اور کون میرے نام پر سڑک منسوب کرے گا۔ کہنے لگے یہ کتابیں میرا پیچھا چھوڑیں تو کہیں آؤں جاؤں۔ وہ یہ بھی کہنے لگے کہ جب سے دہلی سے آیا ہوں اپنے بھائی تک کے گھر نہیں گیا ہوں جن کا مکان بالکل برابر میں ہے۔ واقعی خاں صاحب ادب اور کتابوں میں کھوئے رہتے تھے کبھی کسی موضوع پر کسی کو خط لکھ رہے ہیں، کسی کو فون پر کچھ بتا رہے ہیں، کبھی کسی ادیب سے استفسار کر رہے ہیں، کبھی دوسروں کے سوالوں کے جواب دے رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں ان کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ مشاعروں یا دوسری ثقافتی پروگراموں میں شرکت کرتے۔ وہ تو پوری طرح کتابوں کے ہو کر رہ گئے تھے اور پھر ان کو نام و نمود کی چاہت بھی نہ تھی۔ ان کا نام تو اُردو ادب میں ہمالیہ کی چوٹی کو چھوتا ہے۔ وہ مشاعروں سے تو بہت دور رہتے تھے۔ کہتے تھے آج کل کے مشاعرے وقت ضائع کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ پوچھا کہ دیکھا گیا ہے کہ جو ادیب ہوتا ہے اس کو شعری ذوق بھی ضرور ہوتا ہے اور وہ ذوقِ طبع کی خاطر کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا ہے۔ کہنے لگے آپ نے صحیح کہا، کیا مجھے شاعری کی ابجد نہیں آتی، ضرور آتی ہے۔ بحر، وزن سے بھی واقف ہوں مگر میری طبیعت اس جانب نہیں آتی۔ ٹھونس ٹھانس کر میں بھی شعر کہہ سکتا ہوں مگر ایسے شعر کو میں شعر نہیں کہتا، شعر وہ ہوتا ہے جس میں آمد ہو جس کی آواز دل سے نکلے اور میرا دل اس طرف مائل نہیں ہوتا۔

خاں صاحب کے مزاج میں کمیونزم کا اثر تھا۔ چوں کہ ابتدائی زندگی میں جب وہ شاہ جہاں پور کی آرڈیننس فیکٹری میں ملازم تھے اس وقت وہ ٹریڈ یونین سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ جس نے ان کے ذہن کو اشتراکی بنا دیا تھا اور وہ کام میں یقین رکھنے لگے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں ان کی کسی بات پر انشاءاللہ کہتا تو ٹوک دیتے کہ اللہ میاں کو بیچ میں کہاں سے لے آئے، اس کے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ وہ آپ کے کاموں یا آپ کو دیکھے، اسے اور کام بھی ہیں۔ لفظ انشاءاللہ کہنے پر انھوں نے مجھے کئی مرتبہ ٹوکا۔

29 جنوری کو جب میں ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا تھا تو دیکھتے ہی کہنے لگے بھئی کہاں رہتے ہو، میں نے آپ کو فون کیا تو آپ کی بیگم صاحبہ نے بتایا کہ ہیں نہیں۔ میں نے جواباً کہا مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ آپ کا فون آیا تھا۔ بولے ابھی پوچھواؤں۔ میں نے کہا نہیں، یہ بتایئے کام کیا تھا۔ کہنے لگے کوئی کام نہیں تھا، بہت دنوں سے خیریت نہیں ملی تھی سوچا فون پر ہی خیریت لے لی جائے۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی اور وہ برابر والے کمرے میں فون رسیو کرنے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو از راہِ تمسخر کہنے لگے یہ بدایوں والے بھی خوب ہیں جب پریشان کرتے ہیں تو ایک ساتھ پریشان کرتے ہیں۔ میں نے کہا مطلب۔ کہنے لگے ابھی آپ آئے اور آپ کے پیچھے پیچھے

پروفیسر حنیف نقوی کا فون آ گیا اور یہ کہہ کر مسکرانے لگے۔ وہ قہقہہ لگا کر تو شاید کبھی ہنستے ہو، مسکراہٹ ہی ان کا قہقہہ تھا۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے تھے بولے میں نے اُن کی کتاب پر تبصرہ کیا تھا جو پچھلے دنوں ہماری زبان میں چھپا ہے، اس کے متعلق بات کر رہے تھے۔

دورانِ گفتگو چائے آ گئی خاں صاحب کے گھر میں جب بھی گیا، ہمیشہ چائے ٹی کوزی سے ڈھک کر آئی، یہ پُرانی وضع داری کی نشانی تھی۔ انھوں نے کبھی خالی چائے نہیں پلائی، ساتھ میں کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور تھا۔ جب میں نے دو پیالوں میں چائے بنانا چاہی تو مجھے روک دیا، بولے صرف آپ اپنے لیے بنائیے۔ کہنے لگے اب میں صرف صبح کو چائے پیتا ہوں۔ پھر بولے آج آپ کو ایک بات اور بتاؤں میں نے ساری زندگی مغرب کے بعد کبھی کسی قسم کا مشروب استعمال نہی کیا سوائے پانی کے اور یہ بھی بتایا کہ صبح کا ناشتہ کبھی کسی موسم میں بغیر نہائے نہیں کیا۔ میں نے کہا ناشتے والی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر مغرب بعد چائے، دوددھ، شربت لسّی نہ پینے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کہنے لگے نیور (Never) سب ممکن ہے آپ کر کے تو دیکھیے۔ بچپن سے بزرگوں سے ایک مثال سُنتے آئے ہیں کہ کسی گھوڑے کے نعل ٹُھک رہے تھے، کہ کوئی مینڈک بھی یہ منظر دیکھ رہا تھا اس نے گھوڑے سے پوچھا، بھیا اس سے کیا ہوتا ہے۔ گھوڑے نے کہا نعل ٹُھکنے سے چال بڑھ جاتی ہے۔ مینڈک بولا تو میں بھی نعل ٹُھکواؤں گا، یہ کہہ کر اس نے بھی اپنے پیر نعل بندی کی طرف بڑھا دیے۔ جیسے ہی نعل بند نے نعل ٹھونکا مینڈک کے پران نکل گئے۔ یہی حال کچھ ہمارا ہوا، ہم نے بھی 29 جنوری سے ٹھان لیا کہ ہم بھی بعد مغرب کسی قسم کا کوئی مشروب استعمال نہیں کریں گے اور خاں صاحب کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ دیکھیے کہاں تک راہِ راست پر رہتے ہیں۔ ہماری اس نئی عادت سے گھر والے اور باہر والے سبھی حیران اور پریشان ہیں اور ہم سے پوچھتے ہیں کہ یہ عمل کس کے کہنے سے شروع کیا ہے۔ ہم نے اپنی بیگم کو تو سب بتا دیا ہے مگر ہر کسی کو کیا بتائیں کہ ہم رشید حسن خاں جیسے علم و عمل کے پہاڑ کی اتباع کر رہے ہیں۔

میں نے اُسی روز خاں صاحب سے پوچھا کہ آج کل کس موضوع پر کام چل رہا ہے تو انھوں نے بتایا کہ آج کل میں غالبؔ پر کام کر رہا ہوں۔ میں نے کہا کیا؟ میں ایک قسم کی لغت تیار کر رہا ہوں کہ غالبؔ نے ایک لفظ کو کہاں کہاں کتنی مرتبہ کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس لغت کا نام ہی میں نے غالبؔ کے شعر سے اخذ کیا ہے ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' اور تقریباً تین چوتھائی کام ہو چکا ہے مجھے اُمید ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم رشید حسن خاں صاحب کی اس آخری معنوی اولاد کو بھی حیات، نو دے کر ان کو خراجِ عقیدت پیش کریں گے کیوں کہ خاں صاحب کی زیادہ تر کتابیں انجمن ترقی اُردو (ہند) نے ہی شائع کی ہیں۔

آج یہ سطریں لکھتے وقت مجھے خاں صاحب کی ایک ایک بات رہ رہ کر یاد آتی آ رہی ہے، ان کا مجھے دروازے تک چھوڑنے آنا اور بار بار یہ کہنا کہ 16 / اپریل کو ضرور آنا یاد آ رہا ہے، مگر افسوس اب صرف ان کی یادیں ہی باقی رہ گئیں، جانے والا چلا گیا۔ بقول سکندر علی وجدؔ

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

(ہفت روزہ 'ہماری زبان' انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 28 ستمبر 2006، شمارہ نمبر 36, 35, 34, 33 جلد نمبر: 65، صفحہ 32 اور 14)

○○○

ممتاز محقق اور متنی نقاد: رشید حسن خاں

خلیق انجم

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف تو بہت اہلِ علم نے کیا ہے لیکن اُردو زبان و ادب کی ترقی و فروغ کے لیے انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے تھے اس کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی ہے۔ خواجہ صاحب کی زندگی کا ہر لمحہ اسی فکر میں گزرتا تھا کہ اُردو زبان کی بقا، ترقی اور فروغ کے لیے وہ اور کیا کریں۔ اس سلسلے میں ان کا ایک عظیم الشان کارنامہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے دلّی یونی ورسٹی میں اس زمانے میں شعبۂ اُردو قائم کرایا جب اُردو کا نام لینے والوں اور اُردو کی ترقی کے خواہاں حضرات پر اچھے خاصے سنجیدہ لوگ بھی پاکستانی ہونے کا الزام لگاتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اس الزام کی کوئی فکر نہیں کی اور دن رات اُردو کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے۔ جب وہ دہلی کالج میں ایک اُستاد کی حیثیت سے مقرر ہوئے تو دہلی یونی ورسٹی میں عربی فارسی کا مشترکہ شعبہ تھا۔ خواجہ صاحب نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے کام لے کر وائس چانسلر کو اپنے

خطوط لے کر مختلف اراکین پارلیمنٹ اور اس وقت کی مرکزی حکومت کے ذمہ داروں کے پاس لے کر جاتے۔ خواجہ صاحب ایک عظیم مقصد کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس لیے انھیں ڈاک پر زیادہ بھروسا نہیں تھا، متعلقہ حضرات کو خطوط بھیجتے تھے تو وہ ڈاک سے نہیں بل کہ ہمارے ہاتھ بھیجتے تھے۔ خواجہ صاحب کے خلوص، لگن اور زبان وادب سے بے پناہ محبت اور کچھ کر دکھانے کے جذبے سے ہی دہلی یونی ورسٹی میں اُردو کا شعبہ قائم ہوا۔ شعبہ قائم ہوتے ہی خواجہ صاحب نے اُردو ادب کی ترقی کے لیے طرح طرح کے پروگرام بنائے مثلاً انھوں نے اُردو ہندی لغت کا ایک پروجیکٹ شروع کیا جس میں ہمارے اس عہد کے بہت بڑے عالم اور فارسی داں مولانا ضیاء احمد بدایونی کا تقرر کیا، اس خیال سے کہ لغت میں اغلاط نہ رہ جائیں۔ خواجہ صاحب نے ہندی کے دو بڑے اسکالرز کو بھی اس پروجیکٹ میں شامل کر لیا۔ اس اُردو ہندی لغت پر خاصا کام ہو چکا تھا کہ خواجہ صاحب ریٹائر ہو گئے اور یہ کام ہمیشہ کے لیے رُک گیا۔ انھوں نے اُردو کے کلاسیکی ادب کی ترتیب و تدوین کے لیے بھی ایک پروجیکٹ شروع کیا۔ اس پروجیکٹ کے لیے انھیں ایک ایسے اسکالر کی ضرورت تھی جس میں تحقیقی کام کی صلاحیت اور جو اس پروجیکٹ کو صحیح طریقے سے چلا سکے۔ اسی زمانے کی بات ہے، ایک دن خواجہ صاحب نے مجھ سے فرمایا: ''آپ رشید حسن خاں صاحب کو جانتے ہیں۔ آپ نے ان کی کون سی تحریریں پڑھی ہیں''۔ میں نے کہا کتاب تو ابھی تک غالباً ان کی کوئی بھی نہیں ہے لیکن ان کے چند مضامین شائع ہوئے ہیں اور ان کے وہ مضامین قابلِ ذکر ہیں جو انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سہ ماہی رسالے 'اُردو ادب' میں شائع ہوئے ہیں۔

خواجہ صاحب نے دریافت کیا کہ ان کی کون سی تحریر آپ کو پسند آئی، میں نے کچھ مضامین کے نام بتائے اور عرض کیا کہ دراصل وہ اس میدان کے آدمی ہیں جس کی الف ب سے میں واقف نہیں ہوں، یعنی عروض وقواعد۔ خواجہ صاحب نے پھر پوچھا، آپ نے ان کا کوئی مضمون تو پڑھا ہوگا؟ عرض کیا کہ میں نے ان کا مقالہ 'ملائی بالائی' پڑھا ہے لیکن یہ پتھر اتنا بھاری تھا کہ میں نے اُٹھا کر رکھ دیا۔ خواجہ صاحب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی: ''خواجہ صاحب بہت کم ہنستے یا مسکراتے تھے''۔

کہنے لگے وہ ایک عالم آدمی ہیں۔ آپ کو ان کے تمام مضامین پڑھنے چاہئیں۔ میں خواجہ صاحب کے سنجیدہ لب و لہجے سے خائف ہو گیا اور بہت ہی سنجیدگی سے عرض کیا دراصل وہ جن موضوعات پر لکھتے ہیں ان میں میری دل چسپی نہیں ہے۔ میرے اس جواب سے خواجہ صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گیا۔ کہنے لگے کوئی اور یہ بات کہتا تو مجھے بُرا نہ لگتا مگر آپ کا یہ کہنا مجھے پسند نہیں آیا، آپ ان چند لوگوں میں ہیں جن کے مستقبل سے مجھے بہت اُمیدیں وابستہ ہیں۔ میں خاموش ہو گیا اور جب خواجہ صاحب کے پاس سے آیا تو لائبریری جا کر رسالوں میں رشید حسن خاں کے جو دو چار مضامین ملے وہ پڑھ ڈالے۔ دراصل مجھے خوف تھا کہ جب بھی خواجہ صاحب سے ملاقات ہوگی وہ ان مضامین کے بارے میں ضرور پوچھیں گے۔

میں نے خاں صاحب کے مضامین پڑھے، وہ میرے بہت کم سمجھ میں آئے لیکن اتنا ضرور سمجھ میں آ گیا کہ خاں صاحب بہت عالم آدمی ہیں نیز میں اس موضوع پر خواجہ صاحب سے بات کرنے کے قابل ہو گیا۔ ایک دو ہفتے بعد خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے رشید حسن خاں کے مضامین کا ذکر کیا۔ میں نے اپنی معلومات بڑھا چڑھا کر اس طرح پیش کیں کہ خواجہ صاحب مطمئن ہو گئے۔

کچھ دن بعد میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز یونی ورسٹی کے کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے، میں نے دیکھا کہ ہمارے محترم اُستاد پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ایک خوش شکل اور لباس کے اعتبار سے خوش سلیقہ نوجوان کے ساتھ کافی ہاؤس میں داخل ہوئے۔ ظہیر صاحب اس نوجوان کو لے کر ہماری میز پر آ گئے۔ تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ رشید حسن خاں صاحب ہیں اور ہمارے شعبۂ اُردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا ہے۔ دُعا سلام کے بعد جب رشید حسن خاں صاحب بیٹھ گئے تو ظہیر صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ انھیں جانتے ہیں، میں نے بتایا کہ خوب جانتا ہوں بل کہ میں تو ان کا زبردست مداح ہوں اور میں نے ان کے سارے مضامین پڑھے ہیں۔ خواجہ صاحب کے خوف سے میں نے خاں صاحب کے مضامین پڑھ کر جو معلومات حاصل کی تھیں وہ ایک ہی سانس میں اُگل دیں۔ رشید حسن خاں صاحب مجھ سے متاثر ہو گئے اور اس دن سے میری ان کی ایسی دوستی شروع ہوئی کہ مرتے دم تک ہم ایک دوسرے پر جان چھڑکتے رہے۔

اس مختصر سی ملاقات میں، میں نے خاں صاحب کا دل جیت لیا، اگرچہ میں اُن کے مضامین پڑھے تھے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ لکھتے کیا ہیں، لیکن دہلی والا ہونے کی وجہ سے گفتگو کے فن پر قدرت حاصل تھی اور بات خاں صاحب سے اس طرح کی کہ خاں صاحب سمجھے کہ واقعی میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں۔ اُس دن سے لے کر ان کی وفات تک خاں صاحب سے میرے تعلقات ہمیشہ انتہائی خوش گوار رہے۔ میرے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ مخلصانہ رہا۔

اُن کے تقرر کے کچھ ہی دن بعد میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز جامع مسجد پر مولانا سمیع اللہ کی دکان پر بیٹھتے تھے۔ اس دکان کی ادبی اہمیت یہ تھی کہ وہاں بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر آتے تھے اور ہم جیسے نوجوانوں کی ایک تربیت گاہ بھی یہی دکان تھی۔ یہیں ایک دن میں نے خاں صاحب کو دیکھا۔ انھیں گوپال متل یہاں لے کر آئے تھے۔ گوپال متل اُن دنوں 'تحریک' کے اڈیٹر تھے اور انھیں ہر وقت اہلِ علم حضرات کی ضرورت رہتی تھی۔ کسی محفل میں متل صاحب کی ملاقات خاں صاحب سے ہو گئی اور پھر اُن کے دوستانہ مراسم ہمیشہ کے لیے قائم ہو گئے۔ خاں صاحب نے گوپال متل صاحب کے ماہنامہ 'تحریک' میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ چوں کہ قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی سے خاں صاحب کے تعلقات بہت اچھے تھے اس لیے انھوں نے اپنے تعلقات کا استعمال کر کے اُن سے مضامین منگوائے جو 'تحریک' میں شائع ہوئے۔

میں ذکر کر رہا تھا مولانا سمیع اللہ کی دکان کا۔ وہاں ممتاز شاعر اور ادیب جمع ہوتے اور پھر چنڈو خانہ چلے جاتے۔ چنڈو خانہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ایک ایسا ریستوراں

تھا جہاں ادیب اور شاعر شام کو اکٹھا ہوتے تھے۔ بعض وجوہ سے شاعروں نے اس چائے خانے کا نام چنڈو خانہ رکھ دیا تھا۔ حالاں کہ اس کا اصل نام تھا Friends Tea Stall اور ظہیر نام کے ایک صاحب اس کے مالک تھے۔ شروع شروع میں تو ظہیر صاحب اپنے ریستوراں کا نام چنڈو خانہ سن کر بھڑک اٹھتے لیکن آہستہ آہستہ اتنے عادی ہو گئے کہ خود بھی اسے چنڈو خانہ کہنے لگے۔

رشید حسن خاں صاحب نے اپنی نسل میں خود سے کم عمر لوگوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اُن میں غالباً ڈاکٹر اسلم پرویز اور میں سرِ فہرست تھے۔ خاں صاحب سے دُنیا بھر کی باتیں ہوتیں۔ ادبی، سیاسی اور سماجی مسائل پر گفتگو کرتے اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ خاں صاحب جو بالکل روایتی قسم کے محقق تھے، اپنے عہد کے مسائل سے کیسے واقف ہیں؟

اگر چہ ان کی تعلیم دینی مدارس میں ہوئی تھی جہاں اُستاد اور شاگرد دونوں روایت کے کھول میں بند ہوتے ہیں لیکن خاں صاحب بہت زیادہ آزاد فکر، روشن خیال اور دور اندیش انسان تھے۔ وہ انگریزی اور اُردو کے اخبارات بڑی پابندی سے پڑھ کر سیاسی حالات کے بارے میں اپنی رائے قائم کرتے۔ اگر چہ چنڈو خانے میں سیاست پر گفتگو ہوتی تو خاں صاحب اپنی رائے مدلل طریقے سے اس طرح پیش کرتے کہ دوسرے لوگوں کو کچھ کہنے کی گنجایش نہ رہتی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں خاں صاحب کی ابتدائی زندگی کے کچھ حالات بیان کر دوں۔ شاہ جہاں پور میں ایک صاحب تھے امیر حسن خاں، یہ خاں صاحب کے والد تھے۔ تعلیمی اسناد کے مطابق خاں صاحب 10 جنوری 1930 کو پیدا ہوئے مگر انھوں نے ہمیں بتایا تھا کہ اُن کی تاریخ ولادت میں سنہ غلط لکھا گیا ہے، یہ سنہ 1930 نہیں 1925 تھا۔

خاں صاحب نے شاہ جہاں پور کے مشہور عربی مدرسے بحر العوم میں داخلہ لیا اور 1939 تک اس مدرسے میں تعلیم پاتے رہے لیکن گھر کے مالی حالات کچھ ایسے خراب ہوئے کہ انھیں تعلیم ترک کر کے ملازمت کرنی پڑی۔ انھوں نے شاہ جہاں پور میں قائم آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں بہت ہی معمولی مشاہرے پر ملازمت کر لی۔ یہاں مزدوروں کا بڑے پیمانے پر استحصال کیا جاتا تھا۔ خاں صاحب نے کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر مزدوروں کی ایک یونین قائم کیں، اس یونین کے جلسے میلاد شریف یا کیرتن کے بہانے فیکٹری کے ملازمین کے گھروں پر ہوتے اور پھر کچھ عرصے بعد یونین کی باقاعدہ سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ چند سال بعد یونین نے اس فیکٹری میں ہڑتال کر دی جو اپنی نوعیت کی پہلی ہڑتال تھی۔ اس ہڑتال کے محرکوں میں خاں صاحب بھی تھے۔ وہ اس وقت یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ اس ہڑتال سے ناراض ہو کر فیکٹری کے ذمہ داران نے کچھ مزدوروں کو بر طرف کر دیا۔ چوں کہ خاں صاحب ہڑتال میں پیش پیش تھے اس لیے انھیں بھی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔

خاں صاحب نے بحر العلوم میں عربی کا جو علم حاصل کیا تھا وہ کام آیا اور خاں صاحب مدرسہ فیض عام عربی اور فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لیے ملازم رکھ لیے۔ خاں صاحب پر الزام تھا کہ وہ کمیونسٹ ہیں ایک خدائی فوج دار مولوی صاحب نے شہر کی بڑی مسجد میں اپنے خطبے میں یہ اعلان کیا کہ جو شخص بے دینوں کے ساتھ رہتا ہے اور خود بھی بے دین ہے، اُسے اس مدرسے میں ملازمت نہیں ملنی چاہیے۔ مدرسے میں خاں صاحب کے کچھ ہمدرد بھی تھے، اُن کی وجہ سے خاں صاحب کو ملازمت سے تو نہیں نکالا گیا لیکن بڑی کلاسیں لے کر انھیں چھوٹے بچوں کو پڑھانے کا کام سونپ دیا گیا۔ اس کے بعد خاں صاحب اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول میں ملازم ہو گئے اور یہیں انھوں نے عروض و قواعد پر مضامین لکھے جن کی وجہ سے خواجہ احمد فاروقی کی اُن پر نظرِ انتخاب پڑی اور خواجہ صاحب انھیں دہلی یونی ورسٹی کے اُردو شعبے میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر لے آئے۔

یونی ورسٹی میں شعبۂ اُردو کے سامنے ایک عمارت تھی جس کا نام تھا ٹیٹوریل بلڈنگ۔ اس میں خاں صاحب کو ایک کشادہ کمرہ ملا، کمرے میں چند الماریاں تھیں جن میں اُن کی کتابیں رکھی رہتی تھیں۔

رشید حسن خاں محقق ضرور تھے لیکن خشک آدمی نہیں تھے۔ اُن کی گل افشانی اس وقت ہوتی تھی جب صرف وہ دو چار لوگ موجود ہوتے جن سے بقول خود اُن کی پٹری بیٹھتی تھی۔ یعنی جو لوگ ان کے مزاج شناس تھے۔ ایسے موقع پر خاں صاحب دل چسپ لطیفے سناتے اور دوسروں کے لطیفوں پر دل کھول کر قہقہے لگاتے۔ یہاں یہ بات بتانی ضروری ہے کہ خاں صاحب عام محفلوں میں بہت سنجیدہ رہتے، اگر کسی کی کوئی دل چسپ بات پسند آتی تو بس اُن کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آجاتی۔

خاں صاحب بعض محققوں سے بہت خوش تھے اور بعض کو وہ بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ جنھیں وہ پسند نہیں کرتے تھے ان میں عرصے تک مالک رام صاحب بھی شامل رہے۔ ایک واقعہ سنیے: ایک دفعہ غالب انسٹی ٹیوٹ میں غالبؔ پر سمینار ہو رہا تھا۔ مالک رام صاحب نے مقالہ پڑھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ لیکن رشید حسن خاں صاحب نے کھڑے ہو کر دو تین اعتراضات کر دیے۔ مالک رام صاحب کو یہ بات ناگوار گزری، ہال کے برابر میں سکریٹری کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، مالک رام اٹھ کر اُس کمرے میں چلے گئے۔ میں ان کے پیچھے گیا انھیں پانی پلایا اور لٹا دیا۔ جب انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ سو گئے ہیں تو میں سمینار ہال میں واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر میں مالک رام زور سے چیخے 'خلیق انجم'! میں بھاگا ہوا گیا، میں نے دیکھا کہ اُن کی حالت خاصی خراب ہے۔ انھیں دل کی شکایت تھی اور میں نے اکثر انھیں شیروانی کے اوپر کی جیب سے ایک شیشی نکال کر دوا کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک دفعہ میرے پوچھنے پر مالک رام صاحب نے بتایا تھا کہ وہ دوا ''سیبوٹاٹ'' ہے، انھیں جب دل کی شکایت ہوتی ہے تو وہ آدھی گولی زبان کے نیچے رکھ لیتے ہیں۔ میں نے فوراً ہی ان کی جیب سے وہ شیشی نکالی، ایک ٹیبلیٹ کو رومال میں رکھ کر توڑا اور آدھی گولی ان کی زبان کے نیچے رکھ دی، دس پندرہ منٹ میں

انھیں سکون ہوگیا اور کار میں بٹھا کر انھیں ان کے گھر چھوڑ آیا۔

خاں صاحب میرے ساتھ ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ میں نے غالب کے خطوط مرتب کر کے اشاعت کے لیے غالب انسٹی ٹیوٹ کو پیش کیے۔ جب یہ مسودہ ادبی کمیٹی میں پہنچا تو ایک صاحب جو بہ ظاہر میرے بڑے کرم فرما تھے لیکن اندر ہی اندر میرے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے، اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ انھوں نے میرے مسودے کی طباعت کے خلاف ایک بہت لمبی تقریر کی، رشید حسن خاں بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے، انھیں ان صاحب کی باتیں ناگوار گزریں۔ جب وہ میرے خلاف اپنی پوری بات کہہ چکے تو رشید حسن خاں نے اُن سے پوچھا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، مجھ سے اس سے بالکل اتفاق ہے لیکن میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، کیا آپ نے پورا مسودہ دیکھ لیا ہے؟ انھوں نے کہا جی ہاں بالکل۔ خاں صاحب نے پوچھا کہ خلیق انجم کے اس مرتبہ اڈیشن میں غالب کے خطوط کی کل تعداد کیا ہے؟ خلیق صاحب نے یہ خطوط کہاں کہاں سے لیے ہیں؟ کیا خلیق انجم نے ان خطوط پر مقدمہ بھی لکھا ہے؟ وغیرہ۔ وہ صاحب ان سوالوں کا کوئی جواب نہ دے سکے اور ہکلا کر کہنے لگے میں نے یہ مسودہ شروع سے آخر تک پڑھا ہے۔ خاں صاحب نے کہا کہ اور لوگ مانیں یا نہ مانیں میں آپ کو ولی اللہ مانتا ہوں کیوں کہ خلیق صاحب نے یہ مسودہ کل صبح انسٹی ٹیوٹ میں داخل کیا تھا اور یہ مسودہ انسٹی ٹیوٹ سے باہر کہیں نہیں گیا، حیرت ہے کہ آپ نے پورا مسودہ پڑھ لیا۔ خاں صاحب کو غصّہ کم آتا تھا اور جب آتا تھا تو وہ اپنے دل کی پوری بات کہے بغیر نہ رہتے تھے۔ انھوں نے ان صاحب سے کہا کہ کھایئے قسم کہ آپ کو اس مسودے کے خلاف خلیق انجم صاحب کے سب سے بڑے دشمن فلاں صاحب نے بہکایا تھا۔ خاں صاحب کے غصّے اور اندازِ گفتگو سے وہ صاحب ڈر گئے۔ پروفیسر نذیر احمد نے کہا کہ کمیٹی یہ مسودہ رشید حسن خاں صاحب کو دیتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ وہ اسے پڑھ کر اپنی رائے دیں۔ جیسا کہ مجھے اُمید تھی کہ خاں صاحب نے کچھ دن بعد میرے حق میں رائے دی اور غالب کے خطوط کی پانچوں جلدیں غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوئیں۔

خاں صاحب بہت کم گو اور کم آمیز تھے۔ صرف ان ہی سے ملتے جن سے ان کا مزاج ملتا تھا اور ایسے لوگ بہت کم تھے۔ خاں صاحب سازشوں سے دامن بچاتے تھے اور یونی ورسٹیوں کے شعبوں میں سازشوں کے بغیر کام نہیں چل سکتا، اس لیے خاں صاحب کی زندگی ایک گوشہ گیر فقیر کی سی تھی۔ ہاں، خاں صاحب کو جو لوگ بہت زیادہ پسند تھے وہ تھے ایسے ریسرچ اسکالر جو سنجیدگی سے اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ خاں صاحب ان کی ہر ممکن مدد کرتے تھے کتابوں کے حوالے دیتے، مسائل پیش کرتے، ادیب یا شاعر کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے وغیرہ وغیرہ۔ خاں صاحب کو ریسرچ اسکالرز نے اس حد تک قربت ہوگئی تھی کہ ان کے بارے میں بعض دشمنوں نے یہ مشہور کر دیا کہ دو چار اسکالرز کے تحقیقی مقالے اُن ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ایک نوجوان خاتون کو خاں صاحب سے بہت قربت حاصل ہوگئی تھی، اُن کے بارے میں کچھ سنجیدہ حضرات کو بھی یہی یقین تھا کہ اس خاتون کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ خاں صاحب کا لکھا ہوا ہے۔

خاں صاحب کی زندگی کے حالات اگر لکھنے بیٹھوں تو سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہوں گے۔ یہاں میں صرف خاں صاحب کی علمی خدمات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز عروض اور قواعد پر مضامین لکھ کر کیا، جو اس زمانے کے مقتدر ادبی رسالوں اور خاص طور سے انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سہ ماہی رسالے 'اُردو ادب' میں شائع ہوئے۔ خاں صاحب نے زبان اور قواعد پر بہت کچھ لکھا بل کہ اس موضوع پر ایک عالمانہ کتاب بھی لکھی۔ چوں کہ خاں صاحب کا موضوع زبان تھا، اس لیے ان کی کتابیں 'اُردو املا'، 'زبان اور قواعد'، 'انشا اور تلفظ' وغیرہ بہت اہم کتابیں ہیں۔ انھوں نے بڑوں کے لیے ہی نہیں نوجوانوں اور چھوٹوں کے لیے بھی کئی کتابیں لکھیں مثلاً 'اُردو کیسے لکھیں'، 'عبارت کیسے لکھیں' وغیرہ۔

خاں صاحب تحقیق کرتے کرتے تدوین کے میدان میں بھی آ گئے۔ انھوں نے متنی تنقید کے بنیادی مسائل پر اہم کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس میدان میں ان کی پہلی کتاب 'فسانۂ عجائب' ہے جس کی طباعت میں میرا بھی دخل تھا اور انجمن ترقی اُردو (ہند) نے اس عالمانہ کام کو شائع کیا تھا۔ اس کے بعد خاں صاحب نے 'باغ و بہار'، 'مثنوی گلزارِ نسیم'، 'مثنوی سحر البیان' اور 'مثنویات شوق' جیسی اہم کلاسیکل ادب کی کتابوں کے تنقیدی اڈیشن تیار کیے اور یہ سب مولوی عبدالحق سیریز کے تحت انجمن ترقی اُردو (ہند) سے شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ خاں صاحب نے 'انتخابِ ناسخ'، 'انتخابِ سودا'، 'انتخابِ شبلی'، 'انتخابِ نظیر اکبر آبادی' اور 'انتخابِ مراثی انیس و دبیر' وغیرہ بھی مرتب کر کے شائع کیے۔

خاں صاحب کے جو تنقیدی اڈیشن انجمن سے شائع ہوئے ہیں وہ سب خاں صاحب نے میری درخواست پر تیار کیے تھے۔ اس سلسلے کی دو کتابیں اور ہیں، 'مصطلحاتِ ٹھگی' اور 'زٹل نامہ'۔ انجمن بعض وجوہ سے یہ کتابیں شائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ سے 'مصطلحاتِ ٹھگی' کا ذکر کیا، انھوں نے ادبی کمیٹی سے اس کتاب کے لیے فوراً مالی تعاون منظور کرا دیا تو پھر میں نے خاں صاحب کی کتاب 'زٹل نامہ' کے لیے بھی بھٹ صاحب سے مالی تعاون حاصل کیا۔ میں بھٹ صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست قبول کر لی۔ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان اور انجمن ترقی اُردو (ہند) کے مالی تعاون سے یہ کتابیں بھی شائع ہوگئیں۔

آج کل خاں صاحب ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' نام سے ایک کتاب مرتب کر رہے تھے۔ 'گنجینۂ معنی کا طلسم' ایک قسم کی 'دیوانِ غالب' کی فرہنگ ہے، اس میں خاں صاحب نے بتایا ہے کہ غالب نے کون سا لفظ کہاں پر اور کس شعر میں استعمال کیا ہے۔ اب تک اس کتاب کے ساڑھے آٹھ سو صفحات کمپوز ہو چکے ہیں اور ابھی اس کا کافی حصہ باقی ہے۔ میں خاں صاحب کے صاحب زادوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ باقی مسودہ بھی دے دیں، مگر انجمن کی ایک مشکل یہ ہے کہ کمپوزنگ خاں صاحب نے پڑھی تھی

کیوں کہ وہ کسی اور کی پروف ریڈنگ سے کبھی مطمئن نہیں تھے۔اب جو صفحات کمپوز ہوں گے انھیں کون پڑھے گا اور اگر پڑھے گا تو خاں صاحب کا علم کہاں سے لائے گا۔پھر بھی میری کوشش ہے کہ یہ کتاب ضرور چھپ جائے اور انشاءاللہ ضرور چھپے گی۔

ایک دفعہ میں نے علامہ اقبالؔ سمینار کے لیے ایک مقالہ لکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اقبال کا اُردو کلیات ابھی تک صحیح طریقے سے مرتب نہیں ہوا اور ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی عالم اور متنی نقاد اسے ترتیب دے۔میں نے رشید حسن خاں سے درخواست کی۔میں مرحوم کا شکر گزار ہوں کہ انھیں یہ کام پسند آیا اور انھوں نے کہا کہ میں رفیع الدین ہاشمی صاحب کو بھی تیار کرلوں تاکہ وہ دونوں مل کر یہ کام کرسکیں۔رفیع الدین ہاشمی صاحب سے درخواست کی، انھوں نے بہ خوشی میری درخواست قبول کرلی۔ابھی یہ کام ہو ہی رہا تھا، میں خاں صاحب کو اس سلسلے میں مواد فراہم کر رہا تھا اور رفیع الدین ہاشمی صاحب بھی خاں صاحب سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے کہ 26 فروری 2006 کو خاں صاحب خدا کو پیارے ہوگئے۔

(ہفت روزہ، ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 28 ستمبر، 2006، شمارہ نمبر: 33,34,35,36 جلد نمبر: 65، صفحہ 5,4,3 اور 30)

○○○

رشید حسن خاں: چند یادیں

یعقوب میراں مجتہدی

23 فروری 2006 کی صبح تھی۔فون کی گھنٹی بجی، میں نے فون اُٹھایا تو دوسری طرف سے رشید حسن خاں صاحب کی آواز آئی، کہنے لگے بہت دنوں سے آپ کی آواز سنائی نہیں دی اور پھر ڈکشنری سے متعلق پوچھنے لگے۔میں ہر پندرہ بیس روز میں انھیں فون کرتا تھا، اس مرتبہ بہت تاخیر ہوگئی۔چوں کہ ان کے پاس STD نہیں ہے اس لیے انھوں نے باہر سے مجھے فون کیا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مجھ سے اور ڈکشنری سے کتنا لگاؤ تھا۔

میں انھیں شخصی طور پر نہیں جانتا تھا، البتہ رسالوں اور ہفت روزہ 'ہماری زبان' سے ان کے نام اور کام سے واقف ہوا۔وہ کتنے قابل تھے اس کا اندازہ پروفیسر گیان چند جین کے بیان سے ہوتا ہے۔انھوں نے کہا کہ ''رشید حسن خاں کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور پچاس اساتذہ کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو رشید حسن خاں کا پلڑا ہی جھک جائے گا۔''

آٹھ سال پہلے ایک خط میں، میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میری اُردو۔انگریزی کی ڈکشنری کا اُردو Portion ایک نظر دیکھیں۔انھوں نے کہا کہ وہ بہ خوشی اس کام کو کریں گی۔یہ ان کے لیے زحمت نہیں رحمت ہے۔اس وقت میری ڈکشنری دس ہزار ٹائپ شدہ صفحات پر مشتمل تھی۔(بعد میں Computerise کرنے پر اس ڈکشنری کے 2812 صفحات ہوگئے) میں ان تین تین سو ٹائپ شدہ صفحات بہ ذریعہ رُجسٹرڈ پوسٹ بھیجا کرتا اور وہ دیکھ کر انھیں واپس کردیتے۔ان سے ربط ضبط بڑھا۔پھر میں نے انھیں فروری 2000 میں میری لڑکی عفت فاطمہ کی شادی کی دعوت دی۔انھوں نے اسے بہت خوشی سے قبول کرلیا اور 26 فروری 2000 کو شام میں سکندرآباد اسٹیشن پہنچے، میں نے اور چند دوسرے حضرات نے ان کا استقبال کیا۔میں نے انھیں ملک پیٹ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا۔میرا لڑکا صبح کار میں جاکر انھیں میرے گھر لاتا اور پھر ان کی دن بھر کی مصروفیات کے بعد انھیں ہوٹل چھوڑ آتا۔انھوں نے آتے ہی کہا کہ وہ زینت ساجدہ سے ملنا چاہتے ہیں، ان سے ان کے پُرانے روابط ہیں۔میں نے دوسرے دن یعنی 27 فروری کو رشید حسن خاں صاحب کو زینت ساجدہ صاحبہ کے گھر لے گیا۔وہ دونوں مل کر بہت خوش ہوئے۔رشید حسن خاں صاحب تیس سال پہلے ریسرچ کے سلسلے میں سالار جنگ میوزیم آئے تھے۔

وہ 27 فروری 2000 کی شام میں بچّی کی شادی میں شریک ہوئے۔وہاں بھی کئی لوگوں نے ان سے ملاقات کی۔وہ دس دن تک میرے مہمان رہے اور ان دس دنوں میں وہ بے حد مصروف رہے۔چاروں یونی ورسٹیوں (عثمانیہ، حیدرآباد، اوپن اور اُردو) میں انھیں لکچر دینے بلایا گیا۔پروفیسر لئیق صلاح، پروفیسر انور معظم اور پروفیسر افضل محمد نے انھیں کھانے پر مدعو کیا۔یونی ورسٹیوں کے علاوہ ایوانِ اُردو اور اُردو ہال میں بھی ان کی تقریریں ہوئیں۔اُردو ہال میں انھوں نے بیگ احساس صاحب کی کتاب کی رسم اجرا انجام

دی۔ وہ جب تک میرے پاس رہے کئی اساتذہ اور دوسرے لوگ ان سے ملنے آتے رہے۔ ہر کوئی ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔ ان دس دنوں میں تمام اخبارات میں انہی کا تذکرہ رہتا تھا۔ شاہ جہاں پور واپس ہونے کے بعد انھوں نے مجھے ایک شکریے کا خط لکھا تھا کہ میری عزت افزائی میں آپ نے جو سعی فرمائی ہے اس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔

'کتاب نما' میں میری ڈکشنری پر پروفیسر اشرف رفیع کا ایک طویل مضمون چھپا تھا۔ اس مضمون کو پڑھ کر انھوں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ ''ڈاکٹر اشرف رفیع کا مضمون واقعی خوب ہے۔ ایک تو اس معنی میں کہ اسے پڑھنے کے بعد پہلا تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرمائشی تحریر نہیں ہے، اپنی رائے ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ یہ محض ستائشی تحریر نہیں، مقالہ نگار نے پڑھ کر بہت سی کتابیں دیکھ کر اور لغت نویسی کے مسائل سے آگہی کے بعد یہ تحریر لکھی ہے۔ انھوں نے مستشرقین کے لغات کے جو حوالے دیے ہیں، حروف اور علامت تلفظ کے تحت یہی ایک بات ان کی واقفیت اور ان کے مطالعے کی شہادت دیتی ہے۔ وہ جو روایتی انداز کے عالمانہ مضامین لکھے جاتے ہیں، یہ مضمون ان سب سے بالکل مختلف ہے اور اسی لیے قابل توجہ ہے۔'' میں نے ان سے ڈکشنری پر مضمون لکھنے کی خواہش کی تھی تو انھوں نے لکھا کہ اشرف رفیع کے مضمون کے بعد میرے مضمون کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی کی بھی تعریف کرنے میں بہت محتاط رہتے تھے، مگر انھوں نے اشرف رفیع کے مضمون کی دل کھول کر تعریف کی۔

پوری ڈکشنری دیکھنے کے بعد انھوں نے اپنے خط میں لکھا:

> ''دیکھیے صاحب اس پورے ملک میں تو مجھے کوئی شخص اب نظر آتا نہیں جو تنِ تنہا اتنا بڑا کام کر سکے اور کام بھی ایسا جس کی افادیت اور اہمیت کے سبھی قائل ہیں اور مانتے ہیں۔ آپ کا یہ کام تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔''

میرے نام ان کے بے شمار خطوط آئے، میری بچی کے تعلق سے انھوں نے لکھا تھا بیٹی ''تمھارے طفیل میں تو میں حیدرآباد آیا۔''

وہ 'مصطلحاتِ ٹھگی' مرتب کر کے شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ آندھرا پردیش اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری میں اس کا اصل نسخہ موجود ہے، اس کی زیروکس کی انھیں ضرورت تھی، میں نے اس کی زیروکس حاصل کر کے انھیں بھیج دی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر اس کو مرتب کر کے شائع کر دی۔ ایک کاپی مجھے بھجوائی۔ اس کے دیباچے میں چار مرتبہ میرا ذکر کیا۔

23 فروری کی صبح ان کا فون آیا تھا اور 26 ر فروری کی شام میں ان کے انتقال پُر ملال کی خبر ملی۔ آفتابِ علم و ادب میں 81 سال کی عمر میں غروب ہو گیا۔ وہ مجھ سے بہت قریب تھے۔ ان کا انتقال میرا شخصی نقصان ہے۔ ان کو میری ڈکشنری کی طباعت کی بہت فکر تھی۔ افسوس یہ ان کی زندگی میں نہ چھپ سکی۔ اب انشاء اللہ چھپ جائے گی۔

(ہفت روزہ، ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 28 ر ستمبر، 2006، شمارہ نمبر: 33، 34، 35، 36، جلد نمبر: 65، صفحہ 12)

○○○

رشید حسن خاں

سیّد مشہود جمال

98-1997 کی تعلیمی میقات میں پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج لاہور کی ایک طالبہ نے ''رشید حسن خاں: احوال و آثار'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا کام شروع کیا۔ مقالہ نگار نے ایک خط کی صورت میں یکم ر اپریل، 1998 کو سوانحی حالات سے متعلق ایک سوال نامہ خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کیا۔ خاں صاحب نے مختصر طور پر تمام سوالات کے جواب لکھ کر بھیج دیے۔ جنوری 2002 میں پنجاب یونی ورسٹی، اورینٹل کالج لاہور کے شعبۂ اُردو کی جانب سے ''بازیافت'' کے نام سے ایک کتاب کی اشاعت عمل میں آئی جس میں رشید حسن خاں صاحب کی اس تحریر کو ''کچھ اپنے بارے میں'' کے عنوان کے تحت شائع کیا گیا۔ زیرِ نظر مضمون میں خاں صاحب کی سوانحی حوالے اسی تحریر کی روشنی میں ترتیب دیے گئے ہیں۔

رشید حسن خاں صاحب 1925 میں شاہ جہاں پور کے ایک معزز خان دان میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش کے سلسلے میں خاں صاحب لکھتے ہیں:

''تعلیمی کاغذات میں تاریخ ولادت 30 رجنوری، 1930 لکھی ہوئی ہے۔ یہ تاریخ کس نے لکھائی؟ مجھے نہیں معلوم۔ صحیح سال ولادت 1925 ہے۔ دسمبر کا مہینہ، تاریخ کا علم نہیں۔''

خاں صاحب کے والد جناب امیر حسن خاں محکمۂ پولیس میں ملازم تھے لیکن تحریک عدم تعاون کے زمانے میں ملازمت سے قبل از وقت ریٹائر منٹ لے لیا تھا۔ وہ ایک کٹر قسم کے مذہبی آدمی تھے۔ اور انگریزی تعلیم کو خلاف مذہب خیال کرتے تھے۔ اسی وجہ سے خاں صاحب کو کسی انگریزی اسکول میں داخل کرنے کے بجائے عربی پڑھنے کے لیے دیا گیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد 1934 میں شہر کے مشہور مدرسہ بحر العلوم میں درس نظامی کے لیے داخل کیا گیا جہاں وہ 1939 تک زیر تعلیم رہے۔ لیکن درس نظامی کی تکمیل نہ کر سکے۔ متوسطات تک کتابیں پڑھی تھی کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ گھر کی معاشی حالت بہتر نہ تھی اس لیے چودہ برس کی عمر میں مقامی آرڈ نینس کلوڈنگ فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ اسی فیکٹری میں خاں صاحب کی ٹریڈ یونین سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ جنگ عظیم دوم جاری تھی۔ آرڈ نینس کارخانوں میں یونین بنانے کی اجازت نہ تھی۔ 1940 میں چھپ چھپا کر یونین بنا لی گئی۔ 1945 میں فیکٹری میں 33 دن کی تاریخی اسٹرائک ہوئی اس وقت خاں صاحب یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ یونین بازی کی پاداش میں 1946 میں خاں صاحب کو فیکٹری سے نکال دیا گیا۔ اس دور کا محاسبہ کرتے ہوئے رشید حسن خاں راقم طراز ہیں:

''یہ زمانہ انتہا پسندی کا تھا۔ سیاسی سطح پر مفاہمت نام کی ان دنوں کوئی چیز نہیں تھی۔ ٹریڈ یونین سے مزدوروں کے مسائل حل کرنے سے زیادہ پارٹی کی آیڈیا لوجی کو پھیلانے کا کام لیا جاتا تھا۔ یونین میں تین چار لوگ ایسے تھے جو اس پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ میں بھی ان میں سے تھا۔''

آپسی اختلافات اور ذہنی اور عملی تضادات کی وجہ سے آپسی کش مکش کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ برصغیر میں ترقی پسند تحریک کی ناکامی کا بنیادی سبب بھی شاید یہی تضادات رہے نجی گفتگو میں خاں صاحب نے کئی بار اس کا اظہار خیال کیا کہ رہنماؤں کے ذہنی تضاد کی وجہ سے ترقی پسند تحریک عوامی سطح پر اپنے مقصد میں ناکام رہی۔ ترقی پسند تحریک کے تقریباً تمام بڑے رہنما ذہنی اور عملی زندگی میں مکمل بورژوا تھے، صرف دانش ورانہ سطح پر یہ لوگ انقلاب کی باتیں کرتے رہے۔ کلام جعفر زٹلی (زٹل نامہ) کو مرتب کرتے ہوئے خاں صاحب نے جو طویل مقدمہ رقم کیا ہے اس میں کلام جعفری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کچھ اس طرف بھی اشارہ کیا ہے:

''وہ ریختے کا پہلا شاعر تھا جو بے جھجک رائے اور تلخ نوائی کی بنا پر مقتول ہوا۔ اس لحاظ سے وہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ہمارے زمانے کے بعد ایسے مبینہ انقلاب پسند شاعروں سے برتر نظر آئے گا جن کو ہر سیاسی موسم راس آتا رہا۔''

آرڈ نینس کلوڈنگ فیکٹری سے برطرفی کے بعد خاں صاحب نے دو تین چھوٹی چھوٹی نوکریاں اور کیں، پھر 1949 میں شہر کے عربی مدرسہ فیض عام میں اُستاد کے طور پر تقرر ہو گیا۔ 1956 سے 1959 تک خاں صاحب مقامی اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول میں اُردو فارسی ٹیچر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اگست 1959 میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریسرچ اسسٹنٹ ہو کر چلے گئے اور پھر وہیں سے ریسرچ ایسوسی ایٹ کے طور پر دسمبر 1989 میں ریٹائر ہوئے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہوگی کہ خاں صاحب نے جب اسلامیہ اسکول میں اور بعد میں دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت اختیار کی اس وقت تک (اور آخر وقت تک) ان کے پاس کسی اسکول، کالج کی کوئی سند یا کسی یونیورسٹی کی کوئی ڈگری نہیں تھی۔ محض فارسی زبان و ادب پر ان کی بے پناہ قدرت اور خداداد صلاحیت کے سبب تمام اصول و قوانین کو نظر انداز کر کے دونوں جگہ ان کا انتخاب کیا گیا۔ اپنے دہلی یونی ورسٹی میں تقرر کے سلسلے میں ایک روز میرے استفسار پر خاں صاحب نے ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کے تعاون کا ان الفاظ میں ذکر کیا تھا:

''خواجہ احمد فاروقی (صدر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی) مجھ سے ذاتی طور واقف نہیں تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے قمر رئیس صاحب سے مشورہ کیا۔ اگر قمر رئیس صاحب میرے خلاف ایک لفظ بھی کہہ دیتے تو میرا دہلی پہنچنا ناممکن ہو جاتا۔ قمر صاحب سے نظریاتی اختلاف رہا لیکن ذاتی طور پر وہ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔''

خاں صاحب کی ابتدائی تعلیم عربی فارسی میں ہوئی تھی۔ ''آب حیات'' اور ''طلسم ہوش ربا'' پڑھ کر اُردو سے تعارف ہوا۔ اسلامیہ اسکول کی ملازمت نے ان کی زندگی کا بالکل بدل دیا۔ یہیں ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اسکول کی ملازمت کے دوران ہی ان کے ادبی اور تنقیدی مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

خاں صاحب کا زیادہ تر کام اصول تحقیق و تدوین، زبان اور املا پر ہے۔ خاص طور پر تدوین و تحقیق کے شعبے میں انھوں نے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے ہیں۔ تحقیق سے ان کے مزاج کو جو خاص مناسبت تھی اس کے نقش بچپن سے ہی مختلف وقتوں میں ان کے ذہن پر مرتسم ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام خاں صاحب کے مدرسہ کے ایک اُستاد مولوی مجتبیٰ حسن خاں صاحب کا ہے جو ایک جید عالم باعمل اور انتہائی روشن خیال تھے۔ وہ اپنے طلبہ و فروعات میں الجھنے اور سنی سنائی باتوں کو ماننے سے منع کرتے اور ہر بات اور ہر قول کی تصدیق پر زور دیتے۔ بقول رشید حسن خاں:

''میرے ذہن پر تحقیق کے پہلے نقش انہیں کی تعلیم کا نتیجہ تھے۔''

اس کے علاوہ گھر اور شہر کے ماحول نے بھی اپنا اثر دکھایا۔ خاں صاحب کے والد قدرے متشدد قسم کے انسان تھے، جس کو اپنے نزدیک درست سمجھتے اس کو علی الاعلان کہہ

دیتے۔اس دور میں پٹھانوں کی بستی میں اکثریت کا یہی احوال تھا۔خاں صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اس ماحول کا اس طرح ذکر کیا ہے:

''ان کے دل اور ان کی زبان میں فاصلہ نہیں تھا۔میں دہلی کے مذہب اور شائستہ لوگوں کے ساتھ 36 سال رہا ہوں اور اس پوری مدت میں آخر تک یہ معلوم نہیں کر سکا کہ کسی شخص کی حقیقی رائے کیا ہے جب کہ اس زمانے میں میرے گھر میں اور محلے میں اور شہر میں ہر شخص کو خوب معلوم تھا کہ کسی کی رائے کیا ہے...وہ بے پڑھے لوگ تھے،ضدی تھے،ہٹیلے تھے ناعاقبت اندیش بھی مگر کھرے لوگ تھے جن کے دل آئینے کی طرح روشن اور زبان میں تلوار کی دھار ہوتی تھی کہ کوئی لگی لپٹی رہتی ہی نہیں تھی۔''

یہی وہ ماحول تھا جس نے خاں صاحب کے اندر بے جھجک بات کہنے کی عادت ڈالی اور مصلحت اندیشی اور منافقت سے انھیں ناآشنا رکھا۔ادبی تحقیق کے عمل میں یہ ابتدائی ترتیب بہت کام آئی۔اس کے علاوہ علامہ نیاؔز فتح پوری کی تحریروں اور رسالہ ''نگار'' نے بھی تحقیق کی طرف خاں صاحب کی رہنمائی کی۔یہ وہ دور تھا جب اقدار،عقائد اور تحفظات نے ذہنوں پر پردے ڈال رکھے تھے۔اس وقت نیاؔز صاحب اپنی طاقت ور نثر اور دلائل سے نوجوانوں کی بڑی تعداد کو متاثر کر رہے تھے۔تشکیک، دلائل کا مطالبہ، شہادت کا تصور اور روایت کے جھوٹے سچے ہونے کا ابتدائی شعور خاں صاحب کو نیاؔز صاحب کی تحریروں سے ہی ہوا۔بہ قول خاں صاحب:

''اس زمانے میں نیاؔز کی تحریروں نے میرے ذہن میں بہت سے سوالیہ نشان پیدا کیے تھے جب بالآخر تحقیق کے عمل میں میرے کام آئے۔''

اپنے نوجوانی کے دنوں میں خاں صاحب بھی ان تمام مرحلوں سے گزرے جو ایک خوش ذوق اور ذہین انسان کی فطرت کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔1950 سے 1959 تک شاہ جہاں پور میں تحقیقی سرگرمیوں کے علاوہ خوش ذوقی وخوش نظری، ہاکی کے کھیل میں انہماک، مقامی نشستوں اور شاعروں میں جملے بازی اور شام کو حضرت عابؔد بینائی کے یہاں جناب اختر تاہری کے ساتھ ادبی محفل آرائیوں کے لیے بھی خاں صاحب کو یاد کیا جاتا ہے۔1959 میں دہلی جانے کے بعد ان کے معمولات صرف لکھنے پڑھنے تک محدود ہو گئے اور انھوں نے سب کچھ چھوڑ کر اپنے آپ کو مکمل طور پر علمی اور ادبی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مذہب کی طرح ادب میں بھی شرک حرام ہے۔

دہلی میں قیام کے دوران انھوں نے ساری زندگی ایک ہی نظام الاوقات کے تحت گزار دی۔صبح پانچ بجے اٹھتے، چھ بجے سادہ چائے خود بنا کر پیتے، چھ سے آٹھ بجے تک لکھتے پڑھتے،آٹھ بجے ناشتہ، پھر نو بجے سے ایک بجے تک لکھنا پڑھنا۔رات نو بجے بستر پر آرام کے لیے لیٹ جاتے۔

1989 میں ریٹائرمنٹ کے بعد شاہ جہاں پور میں بھی ان کے اس ٹائم ٹیبل میں آخر وقت تک کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔سوائے اس کے کہ صبح کی چائے اب انھیں خود نہیں بنانا پڑتی تھی۔محفل آرائی اور سماجی تقریبات میں وہ یہاں بھی کبھی شرکت نہ کرتے۔میرے علاوہ دو تین حضرات اور تھے جنہیں گھر آنے کی خاص اجازت تھی لیکن ایک دن پہلے ٹیلی فون پر وقت طے کر لینے کی ہدایت کر رکھی تھی۔یہ ملاقات عموماً دس اور گیارہ بجے کے درمیان ہوتی تھی۔اپریل 2002 کو دل کا دورہ پڑا، لگ بھگ ایک مہینہ صاحب فراش رہے۔کمزوری بہت بڑھ گئی تھی۔گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے کہیں بھی آنے جانے سے معذور ہو گئے تھے۔فرش پر نشست بھی نہیں کر سکتے تھے،ساری زندگی احتیاط بن کر رہ گئی تھی لیکن لکھنے پڑھنے کا کام بدستور جاری رہا۔اس دوران وہ کلام جعفر زٹلی (زٹل نامہ) اور لفظیات غالب پر ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔زٹل نامہ تو شائع ہو چکا ہے'لفظیات غالب' بھی خاں صاحب کا بہت اہم کام ہے اس میں خاں صاحب نے کلام غالب کے مفرد اور مرکب الفاظ کو مکمل گوشوارہ اس طرح پیش کیا ہے کہ بیک نظر یہ معلوم کیا جا سکے کہ غالؔب نے مختلف الفاظ کو کن کن نسبتوں اور کون کون سی معنوی جہتوں کے ساتھ استعمال کیا ہے۔یہ آخری کام بھی وہ مکمل کر گئے اور اس وقت کمپوزنگ کے مرحلے میں ہے۔اُمید ہے کہ خاں صاحب کا یہ کارنامہ بھی ''غالبیات'' میں ایک اہم اضافے کی حیثیت سے سامنے آئے گا۔''لفظیات اقبال'' اور ''غرائب اللغات'' کی تدوین ان کے آیندہ پروگرام میں شامل تھی۔لیکن افسوس ان کا وقت ختم ہو چکا تھا۔

خاں صاحب کا سب سے بڑا امتیاز شہرت پسندی اور منافقت کے اس دور میں ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر حق گوئی اور دیانت کے راستے پر مسلسل چلتے رہنا تھا۔زندگی کے راستے ان کے سامنے بھی کھلے ہوئے تھے۔اگر وہ مصلحت کوشی اور خوشامد پرستی کا راستہ اختیار کرتے تو آسائشوں کا حصول ان کے لیے کچھ ایسا مشکل نہ تھا لیکن اپنے ضمیر کے اطمینان کے لیے انھوں نے جان بوجھ کر گھاٹے کا سودا کیا۔اپنے ادبی سفر کے بالکل ابتدائی دور سے ہی خاں صاحب نے اپنی راہ کا تعین کر لیا تھا۔جس بات کو،جس کام کو انھوں نے غلط سمجھا، واضح طور پر اس پر گرفت کی۔اس سلسلے میں انھوں نے کبھی کسی مصلحت کی پروا کی اور نہ تعلقات کی۔علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کی ''تاریخ ادب اُردو'' کی پہلی جلد پر جس وقت 1962 میں انھوں نے گرفت کی اور جن لوگوں پر اس کی چوٹ پڑی اس وقت ان لوگوں کے ہاتھ میں اُردو ادب کی طنابیں تھیں۔خاں صاحب کا پورا مستقبل داؤ پر تھا۔لیکن خاں صاحب نے اس کی پروا نہ کی۔وہ نہ تو مالک رامؔ،جمیؔل جالبی اور ابواللیث صدیقی جیسے بڑے ناموں سے مرعوب ہوئے اور نہ ہی بڑے اداروں سے، جس کام کو غلط سمجھا اس کی سخت گرفت کی۔ہندوستان اور پاکستان کے بیش تر لوگ ان سے خوش نہیں رہے لیکن انہوں نے کسی کی خوشی یا ناراضگی کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔کمرشیل نقطۂ نظر اور سہل پسندی کی بنا پر کسی بھی کام کو بے گار سمجھ کر سرسری انداز میں نپٹا دینے اور سستی شہرت کے حصول کو خاں صاحب نے کبھی گوارا نہیں کیا اور نہ ہی ایسا کرنے والے لوگوں کو اچھی نظر سے دیکھا۔

خاں صاحب ہمیشہ غیر معمولی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ کام کرنے کے عادی تھے۔سہل انگاری سے انھوں نے کبھی کوئی کام نہیں لیا، چاہے کتنی ہی مشکلوں کا سامنا

کرنا پڑے اور چاہے جتنا وقت صرف ہو۔ چناں چہ ''باغ و بہار'' کی تدوین میں انھیں تقریباً بیس سال کا طویل عرصہ لگ گیا۔ ان کی ایمان داری، محنت اور ذمہ داری کے ان اوصاف نے انھیں اپنے ہم عصروں میں ہمیشہ سرخ رو رکھا اور امتیاز بخشا۔ بہ قول محترم رفیع الدین ہاشمی:

> '' جناب رشید حسن خاں میرے نزدیک بڑے آدمی ہیں ۔ اور ان کی بڑائی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ذات اور اپنے ضمیر سے جو محکم تعہد (Commitment) کیا تھا وہ اس سے کبھی منحرف نہیں ہوئے۔ اگر وہ ربع صدی (یا شاید اس سے زائد عرصے) تک 'گائر ہال' دہلی یونی ورسٹی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں گوشہ گیر نہ رہتے تو اُردو کا تحقیقی سرمایہ چند اعلا پائے کی تصنیف سے تہی دامن رہتا''۔

(اقبالیات: تفہیم و تجزیہ۔ اقبال اکادمی پاکستان، 2004)

(ماہ نامہ نیا دور، لکھنؤ، جلد 62، نمبر 9، دسمبر 2007، صفحہ 35 تا 38)

○○○

اپنی بات

وضاحت حسین رضوی

رشید حسن خاں بڑے تیکھے نقاد اور محقق تھے۔ ان سے بیش تر لوگوں کو اختلاف رہا اور آج بھی ہے۔ اس کے باوجود انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خود وہ لوگ بھی انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے جنھیں ان سے شدید اختلاف تھا اور ہے۔ کیوں کہ خاں صاحب نے جو کچھ بھی لکھا وہ ہوا میں نہیں لکھا۔ وہ جو بات بھی کہتے تھے، ایک ٹھوس بنیاد پر کہتے تھے انھوں نے جو تحقیقی و تنقیدی کام کیا وہ ستائش اور شہرت کے لیے نہیں کیا، بل کہ سچائی کو سامنے لانے کی غرض سے کیا۔ قدیم متون کی تدوین ان کا خاص میدان تھا اور اس میدان کے وہ شہسوار تھے۔ انھوں نے تحقیق و تدوین کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں اُردو زبان و ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ خاص طور سے اُردو کا تحقیقی ادب مالا مال ہوا۔ اُردو املا پر بھی انھوں نے جو کام کیا، اس کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے جو کام کیا وہ پورے خلوص، لگن اور انہماک کے ساتھ کیا۔ وہ تن

آسانی سے سخت نفرت کرتے تھے اور محنت وریاضت کے قائل تھے۔ ان کی تحریریں ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔

ان کی سوانح عمری پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلتا ہے کہ وہ سخت حالات ومسائل اور معاشی دشواریوں میں بھی ہمیشہ اپنے کام میں لگے رہے اور کہیں بھی، کسی بھی سطح پر انھوں نے نہ تو مصلحت سے کام لیا نہ کسی سے سمجھوتہ کیا، نہ اپنی تحریروں سے انھوں نے ذاتی منفعت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ صلے اور ستائش سے بے نیاز اپنے کاموں میں لگے رہے اور خود کو پروجیکٹ یا اُجاگر اور نمایاں کرنے کی کوشش سے بھی اپنا دامن انھوں نے ہمیشہ پاک وصاف رکھا۔

بغور دیکھا جائے تو وہ ایک افسانوی شخصیت نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ یہ عہد موقع پرستی اور مفاد پرستی کا ہے۔ اس عہد میں سچائی یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ الگ الگ گروپ بنائے ہوئے ہیں اور خود کو نمایاں کرنے کے سلسلے میں ہر طرح کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ اور یہ بھی سچائی ہے کہ زبان وادب کے نام پر غیر ادیب اور غیر شاعر جتنا فائدہ اُٹھا رہے ہیں وہ رشید حسن خاں اور ان جیسے قلم کاروں اور دانش وروں نے نہیں اُٹھایا۔ اس طرح رشید حسن خاں جیسی شخصیتیں ہمارے لیے ایک آدرش کی حیثیت رکھتی ہیں۔

چناں چہ ہم نے چاہا تھا کہ ''نیا دور'' کا ایک ضخیم نمبر ان پر شائع کیا جائے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ایسا نہیں ہو سکا لیکن ایک شمارہ ان کے لیے مخصوص کر کے ہم نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کی بہر حال ایک کوشش کی ہے۔ جس کے تحت خاں صاحب کی شخصیت اور ان کے گراں قدر کاموں کا ایک تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اب اس کوشش میں ہم کہاں تک کامیاب ہو سکیں ہیں، اس کو فیصلہ آپ کو یعنی نیا دور کے قارئین ومعاونین کو کرنا ہے۔ چناں چہ اس شمارے کے سلسلے میں آپ کی رائے، آپ کے تاثرات کا ہمیں بہر حال انتظار رہے گا۔

(اداریہ ماہ نامہ نیا دور، لکھنؤ، گوشۂ رشید حسن خاں، جلد 62، نمبر 9، دسمبر 2007)

○○○

آہ! رشید حسن خاں

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری

رشید حسن خاں 10 جنوری 1930 کو شاہ جہاں پور میں پیدا ہوئے تھے۔ 26 فروری 2006 کو وطن مالوف ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ اُردو زبان وادب میں تحقیق و تنقید کی ایک نام ور شخصیت تھے۔ وہ درسِ نظامی کے فارغ التحصیل اور لکھنؤ یونی ورسٹی سے رہبر کامل کے سند یافتہ تھے۔ 1947 کے بعد وہ ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے دلّی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہوئے اور تقریباً 1990 تک وابستہ رہ کر اور ایک بھرپور اور ہنگامہ خیز ادبی زندگی گزارنے کے بعد اپنے وطن شاہ جہاں پور واپس چلے گئے تھے اور گذشتہ تقریباً دس سال سے گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس زمانے میں تصنیف وتالیف اور تحقیق سے ان کا بہت کم تعلق رہ گیا تھا۔ شاہ جہاں پور دہلی جیسی کوئی علمی وادبی صحبت بہم نہ تھی۔ ان کا ایک خط آیا تھا جو فروری کے شروع میں موصول ہوا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے زندگی کی بے کیفی عیاں تھی۔ ان کا انتقال اُردو ادب اور تحقیق وتنقید کا بہت بڑا سانحہ ہے۔ اُردو

زبان، لسانیات لغات میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ تنقید میں وہ تیغِ بے نیام تھے، جس کی کاٹ بے پناہ تھی۔

انھوں نے اپنی چند تالیفات کی تدوین کی ترتیب یہ بیان کی ہے:

- انتخابِ ناسخ 1972 مکتبہ جامعہ، دہلی
- اُردو املا 1974 ترقی اُردو بورڈ، دہلی
- اُردو کیسے لکھیں 1975، مکتبہ جامعہ، دہلی
- زبان اور قواعد 1976، ترقی اُردو بورڈ، دہلی
- ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ 1978، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

انھوں نے سوداؔ کا دیوان اور جعفر زٹلّی کی کلیات، نسیم دہلوی اور شوقؔ لکھنوی کی مثنویاں مدون کیں اور ان پر تحقیق اور تنقیدی تحریرات سے ادب ولسانیات میں ان کے مقام کو بلند اور ان سے استفادے کا دروازہ کھولا اور ان کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ نثر کے متون میں میر امّنؔ دہلوی کی ''باغ و بہار'' اور رجب علی بیگ سرورؔ کا ''فسانۂ عجائب'' ایڈٹ کیا۔ تدوین کے ان کاموں کے معیار، ان کے خصائص کے تنوع اور اور ان کی افادیت دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان متون کی اہمیت کا ہم پر پہلی بار انکشاف ہوا ہے۔ اُردو کی ابتدائی تاریخ، اُردو لسانیات کی بنیاد کے قیام اور اسلوب بیان کی تحقیق میں ان کی اہمیت کو اس طرح نمایاں کیا ہے کہ گویا ان پہلوؤں سے ان کے مطالعے کے ایک نئے دور کا ظہور ہوا ہے اور ادبی تحقیق اور تنقید میں اپنے ذوق وکاوش کے نقوش و آثار کو ہمارے لیے رہنما چھوڑ گئے ان کے مطالعے سے لسانیات، لغات، قواعد اور تنقید کے مسائل سے ان کی ذہنی مناسبت، ستھرے ذوق اور گہری نظر کا پتا بھی چلتا ہے۔

انھوں نے پچاس برس کی بھر پور علمی زندگی بسر کی اور تقریباً اتنی ہی تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں۔ اگر چہ یہ تعداد بھی کم نہیں، لیکن ان کے کام کی اصل خوبی کتابوں کی تعداد اور ان کے صفحات کی ضخامت میں نہیں تحقیق کے معیار اور تدوین کے خصائص میں تلاش کرنی چاہیے۔

اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ تحقیق کے جس پائے کی ان کی تحقیقات وتنقیدات ہیں ان کے لیے جس فرصت اور غور وفکر کی جس مہلت کی ضرورت ہوتی ہے اور تحقیق کے مواد کی فراہمی اور مآخذ تک رسائی کے لیے جن وسائل اور تنقید کے نکات کی ترتیب کے لیے اس بلند درجے کی تحقیقات وتنقیدات کے لیے یہ رفتار بھی کم نہیں کی جا سکتی۔

ادبی تنقید ان کا پسندیدہ ترین موضوع تھا۔ تنقید میں ان کے قلم نے کسی کی شہرت کی پروا کی، نہ کسی کی رورعایت سے کام لیا۔ ان کا قلم ہمیشہ غیر جانب دار رہا۔ تنقید میں ان کے تیور اور ان کی پکڑ دیکھ کر وقت کے نام ور اہلِ قلم چوکنّے ہو گئے۔ ان کے کام کا دلوں پر سکّہ بیٹھ گیا۔ ان کی تنقیدات سے بقول ایک صاحب کے، دہشت پھیل گئی تھی۔ ان کے قلم سے بہت سی تنقیدیں نکلیں۔ لیکن علی گڑھ تاریخ ادب اُردو پر ان کی تنقید کی بہت شہرت ہوئی۔ ان کی تنقید کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونی ورسٹی نے اس کی اشاعت روک دی۔ ترقی اُردو بورڈ (کراچی) کے لغت کی پہلی جلد پر تبصرہ بھی بہت مشہور ہوا۔ اس تنقید کا بھی کسی سے جواب نہ بن پڑا۔

انھوں نے تحقیق اور ادبی تنقید میں جو بیش قیمت سرمایہ یادگار چھوڑا ہے وہ اپنے معیار اور افادیت میں بے مثال ہے اور اس سے ہمیشہ استفادہ کیا جائے گا۔ اب وہ اس مقام پر فائز تھے کہ کسی شخص کی علمی قابلیت اور کسی تصنیف کے ادبی اور تحقیقی معیار کے بارے میں ان کی رائے بہ طور سند پیش کی جائے۔ ان کے لیے کسی ادارے کا ایوارڈ ان کی قابلیت اور ان کے تحقیقی کاموں کے معیار کی سند نہیں بن سکتا تھا۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان میں کسی صاحبِ علم کی خدمات کا اعتراف اسی طرح کیا جاتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق ذیل کے اداروں نے اپنے علمی ایوارڈ سے ان کی علمی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

- غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی
- انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی
- امیر خسرو نیشنل کونسل، دہلی
- ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ، دہلی
- میر ایوارڈ، لکھنؤ
- غالب ایوارڈ، دہلی
- یوپی اُردو اکیڈمی ایوارڈ، لکھنؤ

وہ ہندوستان کے کئی اداروں کے مشیر علمی بھی رہے۔

رشید حسن خاں ایک کھلے ذہن کے مہذب شخص تھے، ہر دائرۂ فکر میں ان کے بے شمار دوست تھے۔ لیکن وہ کسی مکتبِ فکر یا اس کی کسی تنظیم سے وابستہ نہ تھے۔ وہ اخلاق و

سیرت کی بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کا آخری خط جو میرے نام آیا، اس میں انھوں نے لکھا کہ گذشتہ دسمبر (2005) میں ''زندگی کے اسّی برس پورے ہو گئے'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مشہور تاریخ پیدائش (10 جنوری 1930) صحیح نہیں ہے۔ صحیح تاریخِ پیدائش کی جستجو میں ہمیں چار پانچ سال پیچھے جانا پڑے گا۔

ہندوستان کے پچھلے سفر میں دو ماہ گزارنے کے باوجود شاہ جہاں پور نہیں جا سکا تھا۔ جن عزیزوں کی دید و ملاقات کی حسرت دل میں رہ گئی ان میں سرِ فہرست سب سے محترم شخصیت رشید حسن خاں کی تھی، جو مرحوم ہو چکے ہیں۔ اب اس عالم رنگ و بو میں ان سے ملاقات کی کوئی اُمید نہیں۔

❖ ❖ ❖

مرحوم کا ایک خط ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کے نام

شاہ جہاں پور

7 جنوری 2006

برادرِ عزیز و جاں برابر! سلام شوق

ربابؔ نے لکھنؤ سے آپ کے خط کی عکسی نقل بھیجی جس سے حالات معلوم ہوئے اور آپ کی بیماری کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ کیسے دکھ کی بات ہے کہ آپ یہاں آ کر اس طرح مبتلائے پریشانی ہوئے مجھے بہت افسوس ہے، دعا کرتا ہوں کہ آپ جلد تر مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں۔

کس بے چینی سے آپ کا انتظار رہا! جی میں تھا کہ آپ سے بہت سی باتیں کروں گا پچھلا احوال کہوں گا۔ آپ کی سرگزشت سنوں گا۔ وہ سب حسرت میں بدل کر رہ گیا۔ افسوس صد افسوس!

میرا مختصر احوال یہ ہے کہ ایک چھوٹے سے کمرے کا قیدی بن کر رہ گیا ہوں۔ ڈاکٹر نے چلنے پر اور اور گھر سے نکلنے پر سخت پابندی لگا دی ہے۔ قلب کی رفتار اچانک بگڑ جایا کرتی ہے۔ 1998 میں دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا تھا، اس کے بعد ٹوٹ کر رہ گیا ہوں۔ پہلے کو تو جھیل کر رہ گیا تھا پھر میری بیوی کا انتقال ہوا۔ اس عمر اور ان حالات میں شریک زندگی ک اُٹھ جانا کیسا پریشان کُن ہوگا۔ اس کو آپ خوب سمجھ سکتے ہیں۔ بہر حال! خدا کا شکر ہے کہ زندہ ہوں اور اس بیماری کے باوجود اچھی گزر رہی ہے۔ آپ یہاں آ جاتے تو زندگی کچھ اور بڑھ جاتی۔ اب اس بھرے شہر میں میرا اشنا سا ایک بھی نہیں رہا۔ دسمبر کے ختم پر زندگی کے اسّی برس پورے ہو گئے، یعنی بہت جی لیا، اور کیا چاہیے۔ کاش ایک بار آپ سے ملاقات ہو سکتی، مگر آپ بھی مجبور اور میں بھی۔ بہر طور یہ توقع کرتا ہوں کہ اب احوال پُرسی کا سلسلہ جاری رہے گا اور نصف ملاقات کا لطف ہوتا رہے گا۔

آپ کی علمی فتوحات کا احوال پڑھتا رہا ہوں اور خوش ہوتا رہا ہوں۔ بس یہ حسرت ہے کہ پُرانا زمانہ ہوتا تو اشفاق اللہ خاں سے متعلق کتاب بھی دیکھ لیتا۔ دہلی میں ہوتا تب بھی دیکھنے کو مل جاتی۔ اس جہالت کدے میں تو کتابوں کا پڑھنے والا کوئی نہی رہا اب۔ کیا کروں؟

ازراہِ لطف اپنی صحت و عافیت سے مطلع کیجیے۔ چشم براہ رہوں گا۔

رشید حسن خاں

(ماہ نامہ نیا دور، لکھنؤ، جلد 62، نمبر 9، دسمبر 2007، صفحہ 3 تا 4)

○○○

رشید حسن خاں کی یاد میں

ڈاکٹر تابش مہدی

رشید حسن خاں کا نام سب سے پہلے میں نے اپنے اُستادِ محترم مولانا ابوالوفاء عارفؔ شاہ جہاں پوریؒ کی زبانی شاہ جہاں پور میں ہی سُنا تھا۔ یہ 1975 کے کسی مہینے کی بات ہے۔ میں مولانا کی عیادت کے لیے شاہ جہاں پور حاضر ہوا تھا۔ ایک دن میری کسی بات پر ہلکی سی ہنسی کے ساتھ فرمایا ''میاں تم تو رشید حسن خاں بننے جا رہے ہو۔''

اس کے بعد انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ رشید حسن خاں صاحب کے کاموں اور ان کے علمی و تحقیقی فتوحات کا تذکرہ فرمایا۔ مجھ پر اس تعارف کا اتنا اثر ہوا کہ میں نے امروہے کی نیشنل لائبریری سے نکلوا کر ان کی تمام کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ جو وہاں نہیں مل سکیں وہ خرید لیں یا دوسرے ذرائع سے حاصل کیں۔ پھر تو میرا یہ معمول بن گیا کہ جہاں بھی ان کی کوئی چیز کسی اخبار یا رسالے میں دیکھنے کو ملتی اسے پہلی فرصت میں حاصل کر کے پڑھنے کی کوشش کرتا۔ گاہے گاہے خط و کتابت کا بھی سلسلہ رہا لیکن ان سے ملاقات اس وقت ہوئی جب میں نے امروہہ پھر دیو بند کو خیر باد کہہ کر دلّی کو اپنا مسکن بنایا۔ لیکن چند ملاقاتوں کے بعد انھوں نے دلّی کو خیر باد کہہ دیا۔ یہاں تک کہ 26 فروری 2006 کو انھوں نے اس جہانِ فانی کو بھی خیر باد کہہ کر ہمیشہ کے لیے داغ جدائی دے دیا۔

علم و ادب کی دُنیا میں رشید حسن خاں کئی اعتبار سے اپنی پہچان رکھتے تھے۔ وہ لسانیات کے ماہر تسلیم کیے جاتے تھے۔ لغات پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ قواعد سے انھیں خصوصی مناسبت تھی۔ املا کے فن وہ مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ گر چہ وہ شاعر نہیں تھے، لیکن ان کی شعر فہمی مثالی تھی اور ان کی تحریروں میں بلا کا بانک پن تھا۔ بیسویں صدی عیسویں کے نصف آخر میں نقد و تحقیق کے حوالے سے جو اہم نام سامنے آئے ہیں، ان میں رشید حسن خاں کا نام نہایت نمایاں اور ممتاز ہے۔ وہ تنقید و تحقیق کے درمیان خطِ فاصل کے قائل تھے۔ ان کی رائے میں تنقیدی صداقت تنقیدی تعبیرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالعلوم تنقید میں ایک ہی مسئلے میں دو مختلف ناقدین کی مختلف رائیں ہوتی ہیں۔ جب کہ تحقیق میں اس طرح کا تضاد نہیں ملتا۔ اس لیے کہ تحقیق ایک مسلسل علم ہے۔ حالات و ذرائع کے اعتبار سے معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور نئی نئی دریافتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی حقیقت کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ ان کی اس رائے سے اتفاق بھی کیا جا سکتا ہے اور اختلاف بھی۔ اس لیے کہ دونوں کی پوری گنجایش ہے۔ لیکن جس محنت و عرق ریزی کے بعد انھوں نے یہ رائے قائم کی ہے، وہ بہر حال قابلِ تحسین بھی ہے اور لائقِ تقلید بھی۔ میں اسے نئی نسل کے لیے ایک بڑا عطیہ تصور کرتا ہوں۔

رشید حسن خاں تحقیق و جستجو کی اس روایت کے امین و پاس دار تھے جس کا سرا حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی سے ملتا ہے۔ بل کہ بعض پہلوؤں سے انھوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ دراصل تحقیق ان کی کوئی پیشہ ورانہ مجبوری نہیں تھی۔ وہ اسے اپنی علمی و روحانی تسکین کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے انھیں بے پناہ وسعتِ مطالعہ قابلِ، قابل رشک حافظہ اور غیر معمولی قوت استحضار سے نوازا تھا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ادبی تنقید و تحقیق کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان کے بغیر اس وادی پُر خار میں ایک قدم بھی نہیں چلا جا سکتا تھا۔

رشید حسن خاں ہمارے ان محققوں اور متنی ناقدوں میں تھے، جن کے بارے میں صفِ اوّل کے ناقدوں اور محققوں کی رائے ہے کہ تدوینِ متون کے سلسلے میں ان سے زیادہ نکتہ رس محقق اب تک نگاہ سے نہیں گزرا۔ ہو سکتا ہے اس رائے میں کسی کو مبالغہ نظر آئے لیکن یہ بات بہر حال مسلم ہے کہ وہ ایک یگانۂ روزگار ناقد و محقق تھے اور لوگوں کی یہ رائے بعض لوگوں کی نظر میں غلو آمیز ہونے کے باوجود بے حقیقت یا بے بنیاد نہیں ہے۔

رشید حسن خاں نے زندگی کے آخری دور میں اپنی پوری توجہ ادبی تحقیق و تدوین کی طرف مرکوز کر دی تھی۔ رجب علی بیگ کی کتاب ''فسانۂ عجائب'' اور میر امنؔ دہلوی کی ''باغ و بہار'' کی تاریخ تدوین ان کے اسی دور کی یادگار رہے۔ ان کی تدوین کی وجہ سے یہ دونوں کتابیں اس قابل ہو سکیں کہ موجودہ نسل کی قرأت کر سکے۔ رشید حسن خاں اس تنقید

اختیار کیا گیا ہو۔ علمی دُنیا کے اس رویے کے وہ شدت سے شاکی تھے کہ صاف اور بے آمیز تحقیق یا تنقید کو منفی اندازِ نظر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ صاف اور واضح بات کہنے کے عادی تھے۔ خواہ اسے کوئی منفی اندازِ نظر سے تعبیر کرے، خواہ مثبت اسلوب اظہار سے۔ وہ کہتے تھے کہ تحقیق کو سچ کی تلاش رہتی ہے۔ جھوٹ کس نے بولا، کیوں بولا اور کیسے بولا کی تلاش و جستجو ہی دراصل تحقیق ہے۔

رشید حسن خاں تحقیق میں حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی عرشی کو اپنا معنوی اُستاد تسلیم کرتے تھے۔ شروع میں نیاز فتح پوری سے بھی متاثر تھے۔ لیکن محمود شیرانی عبدالستار صدیقی، عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی کے مطالعے کے بعد ان کا عقیدت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ ناقدین میں اگر چہ وہ کلیم الدین کے معترف تھے، لیکن ان سے جو شکایتیں بعض دوسرے علمائے ادب کو ہیں وہ انھیں بھی تھیں۔ سید احتشام حسین بہ حیثیت انسان تو انھیں پسند تھے لیکن ان کے تنقیدی رویے کو وہ قطعی معترف نہیں تھے۔ اسی طرح آل احمد سرور کی ذہانت اور مطالعہ نے انھیں کافی متاثر کیا لیکن ان کی تنقید ان کے نزدیک انشائیے کا پرتو تھی، البتہ مجنوں گورکھپوری کی شعری فہمی کے قائل تھے۔

مجھے ان لوگوں سے سخت اختلاف ہے جو رشید حسن خاں کی تنقید میں مزاج کی سختی اور لہجے کے کھرے پن کی شکایت کرتے ہیں۔ ہر صنف کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے اور اس کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ افسانے کی زبان الگ ہوتی ہے، شاعری کی الگ۔ شاعری میں بھی نظم اور غزل کی شعریات میں بین فرق ہوتا ہے۔ تنقید و تحقیق کی بھی اپنی زبان ہوتی ہے۔ یہ کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے کا فن ہے۔ ایسی صورت میں یہاں جو زبان استعمال ہوگی وہ اپنے اثرات کے لحاظ سے سخت ہی ہوگی۔ خواہ الفاظ کو کتنا ہی نرم اور سبک کر کے استعمال کیا جائے۔ تنقید یا تحقیق عجز، انکسار سوزِ جگر، شگفتہ بیانی یا شیریں کلامی کا نہیں بل کہ صاف گوئی، بے آمازی، اعتماد ہمّت، جرأت اور صلاحیت کا تقاضہ کرتی ہے۔ ناقد یا محقق کو اپنے فائدے یا نقصان کی فکر نہیں ہوتی۔ اسے سب سے بُرا بننا پڑتا ہے۔ گالیاں سننی پڑتی ہیں اور طنز و ملامت کے پتھر برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

رشید حسن خاں کسی یونی ورسٹی کے فیض یافتہ ایم۔اے پی۔ ایچ۔ ڈی یا کسی دارالعلوم کے فارغ التحصیل عالم و فاضل نہ تھے۔ ان کی ساری تعلیم ان کے وطن شاہ جہاں پور کے ایک چھوٹے سے مقامی مدرسے (مدرسہ بحر العلوم) میں ہوئی تھی۔ وہاں بھی انھوں نے صرف 9 برس کی عمر تک پڑھا۔ عمر کے دسویں برس میں داخل ہوتے ہی انھوں نے 1939 کے اواخر میں شاہ جہاں پور کی آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں مزدور کے طور پر ملازمت کر لی۔ اس لیے کہ گھر کی معاشی حالت بہتر نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ اس چھوٹی سی عمر میں وہ کتنا یا کیا پڑھ سکے ہوں گے، لیکن انھوں نے شب و روز کی مسلسل محنت، لگن اور جد و جہد سے علم و ادب کی دُنیا میں جو شہرت و نام وری حاصل کی، وہ محیر العقول ہے۔ اس کی دوسری کوئی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ آج وہ علم و تحقیق کا ایک معتبر حوالہ بنے ہوئے ہیں۔ زندگی میں متعدد علمی و تحقیقی اعزازات حاصل کیے۔ کئی یونی ورسٹیوں نے انھیں وزیٹنگ فیلو شپ کا اعزاز بخشا۔ ان کی تحقیقوں اور دریافتوں پر یونی ورسٹیوں میں ریسرچیں ہو رہی ہیں۔ موجودہ عہد کے بڑے بڑے ناقدوں، محققوں اور دانشوروں نے انھیں خراج پیش کیا ہے۔ کسی نے موجودہ دور میں اُردو کا محسن قرار دیا ہے تو کسی نے ایک منفرد محقق کے طور پر دیکھا، پرکھا اور ان کی تعین قدر کی ہے اور کسی نے انھیں اُردو اصولِ تدوین کا مجدد یا مجتہد قرار دیا ہے۔ آج کی نسل کے لیے وہ ایک مینارۂ نور تھے۔

(ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ، جلد 62، نمبر 9، دسمبر 2007 صفحہ 31 تا 32)

○○○

بیاضِ غم کا ایک ورق

رئیس احمد نعمانی

شاہ جہاں پور
9 فروری 2005
بھائی مولانا!

کئی دن پہلے آپ کا خط ملا تھا۔ جواب میں تاخیر کے لیے معذرت خواں ہوں۔ وجہ تاخیر محض میری بگڑی ہوئی صحت ہے۔ ہاں بھائی! خط پڑھ کر جیسا احساسِ مسرّت ہوا، اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ کیا اچھی غزل کہی ہے آپ نے! بے اختیار جی چاہا کہ کاش یہ غزل میں نے کہی ہوتی! جذبے اور احساس نے اشعار کو تاثیر سے معمور کر دیا ہے۔ جی خوش ہو گیا، دنوں کے بعد ایسے عمدہ اشعار پڑھ کر، واہ۔ واہ!

آپ جس تعلق خاطر کے ساتھ مجھے یاد رکھتے ہیں، اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ اب وضع داری اور بے ریا ربط وضبط گویا کہانی بنتا جا رہا ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور ایسے مزید اشعار کہنے کی توفیق عطا کرے۔

توقع کرتا ہوں کہ متعلقین بہ عافیت ہوں گے۔

رشید حسن خاں

اس خط میں جس غزل کا ذکر ہے اس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

آنکھوں سے یوں چُرا کے کوئی خواب لے گیا
جیسے سکونِ شہر کو سیلاب لے گیا
محفل سے کون ہو کے خفا یوں اُٹھا، کہ سب
لطف و نشاطِ حلقۂ احباب لے گیا
اب زندگی ہے کیا فقط اک ساز بے صدا
وہ ساتھ اپنے نغمہ و مضراب لے گیا
اس کے بغیر شہر میں کیوں روشنی نہیں
خورشید لے گیا، نہ وہ مہتاب لے گیا

یہ غزل کسی اور تناظر میں کہی گئی تھی۔ مگر رشید حسن خاں صاحب کے انتقال کے بعد محسوس ہوا جیسے ان کی وفات سے ایک سال قبل ہی میرے قلم نے ان کا مرثیہ لکھ کر محفوظ کر دیا ہو۔

رشید حسن خاں کی وفات کی خبر 27 فروری 2006 کے ایک اخبار میں نظر سے گزری تھی۔ مگر ہفتوں بل کہ مہینوں تک دل یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ رشید صاحب واقعتاً فوت ہو گئے ہیں۔ پھر ذہن میں قرآن پاک کی یہ آیت اُبھری:

ترجمہ: ''ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔''

(سورۃ آلِ عمران: 185)

اور پھر: ''تم چاہے کہیں بھی ہو، موت تو تم کو آنی ہی ہے۔''

(سورۃ النسا: 78)

لیکن، موت اور موت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک موت نباتات اور حیوانیات کی بھی ہوتی ہے۔ پھر حیوان اور حیوان کی موت میں بھی امتیاز کا ایک پہلو ہوتا ہے اور انسان کی موت تو ان سب سے مختلف ہوتی ہے۔ پھر ایک انسان اور دوسرے انسان کی موت بھی یکساں نہیں ہوتی۔ کسی عام آدمی کی موت اس کے اہل وعیال، خان دان اور برادری کو متاثر کرتی ہے مگر ایک ممتاز عالم ودانش مند کی موت انسانوں کے ایک بڑے طبقے پر اثر انداز ہوتی ہے۔

رشید حسن خاں صاحب بلاشبہ اُردو زبان وادب کے ایک عظیم دانش منداور صاحب علم وقلم تھے۔ وہ اُردو زبان وادب کے تعلق سے گونا گوں علمی کمالات کے حامل تھے اور تحقیق وتدوین کے فن میں تو ان جیسا دوسرا مردِ میداں غالباً آج تک وجود پذیر ہی نہیں ہوا۔ وہ باغ و بہار، فسانۂ عجائب، سحرالبیان، گلزارِ نسیم وغیرہ میں سے کسی ایک کو ہی مرتب و مدون کر جاتے تو اُردو میں متنی تحقیق وتدوین کے قافلہ سالار کہلانے کے حق دار تھے۔ صرف ''علی گڑھ تاریخِ ادب اُردو'' پر اپنا مشہور طویل تبصرہ لکھ کر فوت ہو جاتے تو اُردو کے بڑے

اُردو ادب کو تفویض کر جاتے تو اپنے عہد کے معتبر ترین لغت نویس قرار پاتے۔ صرف ناسخ اور سودا کے کلام پر اپنے مقدمے ہی اگر وہ اپنی یادگار کے طور پر چھوڑ جاتے تو ادبی دُنیا کو ان کی شعر سنجی، ناقدانہ اور زبان شناسی کا قائل ہونا پڑتا۔

رشید حسن خاں سے میری اولین ملاقات 1967 میں (موجودہ شاہ جہاں پور کے ممتاز شاعر برادرم رباب رشیدی کی معیت میں) خاں صاحب مرحوم کے مکان پر ہوئی تھی۔ اس وقت ان کا مستقل قیام دہلی میں تھا لیکن کبھی کبھی شاہ جہاں پور تشریف لاتے رہتے تھے اور ان کی آمد وہاں کے جوان اور نوجوان باشعور وذی استعداد ادبا وشعرا کے لیے نعمت غیر مترقبہ کی مانند ہوا کرتی تھی اور ہم سب نوجوان کی سالہا سال کے مطالعات اور علمی تجربات وحالات سے مملو گفتگو سے مستفید ہوتے تھے۔

ایک یا دو بار مزید ان سے شاہ جہاں پور میں ان کے مکان پر ملاقات ہوئی۔ پھر 1994-1992 میں دو بار ان سے دہلی یونی ورسٹی کے ہوسٹل میں ملاقات ہوگئی اور آخری ملاقات 31 جنوری 2006 کو پھر ان کے مکان پر ہی محلّہ بارزوئی دوم شاہ جہاں پور میں ہوئی۔ جس کا مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ آخری ملاقات ہوگی۔ ورنہ میں اس ایک گھنٹے کی ملاقات کو زیادہ طویل ومکرر کرنے کے لیے مزید ایک دو روز شاہ جہاں پور میں قیام کرسکتا تھا۔ اس آخری ملاقات میں بھی حسبِ معمول ان سے ادبی، مذہبی اور گھریلو مسائل پر گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر خاں صاحب نے مجھے نصیحت فرمائی کہ ''بھائی، بیوی کی قدر کرنا، اس کی اہمیت وضرورت کا اندازہ آپ کو بڑھاپے میں ہوگا۔''

مذہبی مسائل میں ان سے جب گفتگو ہوتی تو وہ میرے سامنے کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ رکھتے جو ان کے نزدیک کچھ پیچیدہ قسم کا ہوتا۔ چناں چہ اس آخری ملاقات میں بھی انھوں نے ایک فقہی مسئلے اور ایک روایت حدیث میں تعارض کا ذکر کیا۔ چوں کہ ان کا مذہبی مطالعہ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس موضوع روایت کو درست سمجھ کر کنفیوزن میں مبتلا تھے۔ بہر حال اس سے یہ تو معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ ان میں زندگی کے آخری ایام تک علم کی سچی طلب اس وقت بھی قائم رہی جب اُردو ادب کے ہزاروں طلبہ بل کہ اساتذہ بھی ان کی تصنیفات وتالیفات سے استفادہ کررہے تھے۔ اس آخری گفتگو کے دوران شعر وشاعری کے ذکر میں میں نے ان سے کہا کہ آپ نے بھی کبھی شعر کہے ہوں گے؟ انھوں نے جواب دیا ''بھائی میں شعر کہتا نہیں، ہاں شعر بنا سکتا ہوں۔''

وہ شاعری کے رموز ونکات، وزن وآہنگ کے مسائل اور شعر کی لفظی ومعنوی پرکھ کا بھی کامل ملکہ رکھتے تھے۔ شعر کی خامیوں پر بڑی باریک بینی سے ٹوکتے اور اگر چہ خود کوئی اصلاح نہیں دیتے تھے۔ مگر جہاں واقعتاً اصلاح کی ضرورت ہوتی اس کی بالکل صحیح نشان دہی کرتے کہ فلاں مصرعے میں فلاں جگہ ترمیم کی ضرورت ہے۔ معنوی خوبیوں کے ساتھ وہ شعر کے ساتھ وہ شعر کے وزن کے معاملے میں بڑے حساس تھے۔ وزن میں ذرا سی برائے نام ناہمواری بھی ان کو ناپسند تھی۔

میں نے اپنے ایک خط میں ان کو لکھا تھا کہ میں اپنی اُردو غزلوں کا ایک مجموعہ مرتب کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے گا۔ اس ملاقات میں مرحوم رشید صاحب نے اس کو بھی یاد دلایا اور تاکید کی کہ اپنی غزلوں کا مجموعہ جلد مرتب کرلیجیے۔ میرے مدون کیے ہوئے تذکرہ ''طور معنی'' کی اشاعت کا ان کو بہت انتظار تھا۔ فرماتے تھے کہ میں اس پر ایک مفصل تبصرہ لکھوں گا۔ افسوس کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ تقریباً چالیس سال کے عرصے میں رشید حسن خاں صاحب سے میری گنتی کی چند ملاقاتیں ہوئیں لیکن خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا اور 1967 سے 2006 تک کے لکھے ہوئے ان کے تقریباً دو سو خطوط میری الماری میں رکھے ہوئے ہیں اور ان کی وفات کے غم کو تازہ کررہے ہیں اور شاید زندگی بھر تازہ کرتے رہیں گے۔ اُردو کی ادبی دُنیا میں مجھے اب کوئی دوسرا نظر نہیں آتا جس کی ادبی تحقیقی بصیرت اور شعر فہمی کی فراست پر میں اعتماد کرسکوں۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

(ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ، جلد 62، نمبر 9، دسمبر 2007ء 33 تا 34 اور 44)

○○○

حیات اور شخصیت: چند پہلو

شبیر عباسی

رشید حسن خاں نے جب اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا، وہ زمانہ دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں، ہولناکیوں اور بربادیوں کے ٹھیک بعد کا زمانہ تھا۔ شاہ جہاں پور میں ایک

والدمحترم جناب امیر حسن خاں صاحب فوج کی ملازمت سے ''ریٹائر'' ہو چکے تھے اور اُن کو پندرہ روپے دو آنے بہ طور پینشن مِلا کرتے تھے جو پانچ افرادِ خانہ کے لیے ناکافی تھے۔ فیکٹری تین شفٹ میں کام کرتی تھی۔ رشید حسن خاں کو رات کی شفٹ میں کام کرنا پڑتا تھا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق شروع سے تھا۔ لہٰذا وقت نہ ملنے کے سبب ''انٹرول'' میں جب سارے ورکر آرام کرتے تھے، یہ ''آبِ حیات'' اور ''طلسم ہوش رُبا'' پڑھتے تھے۔ کتابیں خرید کر پڑھنے کی استطاعت نہیں تھی۔ بہادر گنج میں واقع ''شوقین بُک ڈپو'' سے کتابیں کرایے پر لاتے تھے۔ شوقین بُک ڈپو کے مالک صغیر احمد صاحب، ان کے بچپن کے دوست شفیق احمد کے برادرِ نسبتی ہونے کی وجہ سے ان سے کرایہ نہیں لیتے تھے۔

رشید حسن خاں نے کسی اسکول میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم مدرسہ بحرالعلوم میں حاصل کی۔ اُن دنوں یہ مدرسہ ملک گیر شہرت کا حامل تھا اور دور دراز سے طلبۂ حصولِ علم کے لیے یہاں آتے تھے۔ ان کے اُستاد مولوی مجتبیٰ حسین خاں صاحب بڑے پائے کے عالم بزرگ تھے۔ رشید حسن خاں نے اپنے کئی مضامین میں ان کی بزرگی اور علمیت کا ذکر کیا ہے۔ ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ لو، دھوپ کی جلتی دوپہر میں مدرسے سے پیدل آنا ان کا روز کا معمول تھا۔ اس زمانے میں شاہ جہاں پور میں آمد ورفت کے لیے نہ تو کسی سواری کا چلن ہوا تھا اور نہ ہی بجلی وغیرہ کا کوئی معقول بندوبست تھا۔ سڑکوں پر روشنی کے لیے میونسپل بورڈ کی جانب سے لالٹین لگی ہوتی تھیں۔ گھر میں بھی روشنی کے لیے کوئی مناسب انتظام نہیں تھا۔ ان کی والدہ پڑھائی کے شوق کو دیکھتے ہوئے کڑوے تیل کے چراغ میں موٹی سی بتّی ڈال کر جلا دیتی تھیں۔ دورانِ گفتگو رشید صاحب نے بتایا کہ مجھے جلدی جلدی سارے سبق یاد کر لینا پڑتے تھے کہ مُبادا چراغ کا تیل ختم نہ ہو جائے۔

ایسے ناموافق اور صبر آزما حالات میں انھوں نے اپنی تعلیم پوری کی۔ مزید تعلیم کے لیے کسی اسکول میں داخلہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ یہی وجہ کہ کم عمری میں انھیں ملازمت کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ آرڈیننس کلوذنگ فیکٹری کی ملازمت گویا خوش حالی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی لیکن رشید صاحب نے اس کو منزل نہیں سمجھا۔ ان کے لیے ستاروں سے آگے جہاں اور بھی تھے۔ ملازمت کو ابھی قلیل عرصہ ہی گزرا تھا کہ ''کامریڈ'' کے لقب سے نوازے گئے اور ملازمت سے علاحدہ کر دیے گئے۔ اب پھر معاش کا پریشان کُن مسئلہ منھ پھاڑے سامنے تھا۔ مجبور ہو کر آٹا پیسنے والی چکی پر منشی گیری کرنا پڑی۔ وہاں بھی کام نہ چلا تو راشن کی دکان پر غلّہ تقسیم کرنے کی ملازمت کی۔ اسی درمیان چند دوستوں نے ''فاضل'' اور ''دبیر کامل'' کے امتحانات پاس کرنے کا مشورہ دیا۔ چناں چہ حکیم سلیم صاحب نے فارم بھروا دیا۔ فارم پُر کرتے وقت تاریخِ پیدائش کا سوال آیا۔ باقاعدہ کسی اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی کہ سرٹی فکیٹ یا ٹی۔ سی، پر تاریخِ پیدائش درج ہوتی۔ ان کے والدین بھی اتنے تعلیم یافتہ نہ تھے کہ میونسپل بورڈ آفس میں اندراج کرایا ہوتا۔ لہٰذا اندازاً 10 جنوری 1930 درج کر دی گئی جو ہر جگہ یہی لکھی جاتی رہی۔ میرے دریافت کرنے پر صحیح تاریخِ پیدائش 10 جنوری 1925 بتائی تھی۔

1953 میں اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول (موجودہ انٹر کالج) میں معلم فارسی کی جگہ خالی ہوئی۔ چند بہی خواہوں کی خواہش پر انھوں نے بھی درخواست دے دی۔ شہر کے معزز عالم دین مولوی یوسف صاحب اس جگہ کے اُمیدوار تھے جو وضع قطع کے لحاظ سے بھی موزوں اور مناسب تھے۔ انھوں نے رشید حسن خاں کی دہریت کا خوب پروپگینڈا کیا۔ لیکن خدا کی مرضی و مصلحت کہ تمام مخالفتوں کے باوجود رشید حسن خاں صاحب کا تقرر عمل میں آ گیا۔

اسلامیہ اسکول کی ملازمت کے بعد معاش کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا اور پڑھنے لکھنے کا مشغلہ اب ذرا سکون واطمینان سے ہونے لگا۔ یہی وہ دور ہے جب چند چونکا نے والے معرکۃ الآرا مضامین کی تخلیق و تحقیق عمل میں آئی جو ان کی ملک گیر شہرت و شناخت کا سبب بنے۔ معلّمی کے ساتھ ساتھ اسکول کی لائبریری کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد کر دی گئی۔ لائبریری میں کتابیں برائے نام تھیں اور جو بھی تھیں وہ بیش تر نصابی کتابیں تھیں۔ انھوں نے اپنے ذوق اور معیار کے مطابق کتابیں منگوانا شروع کیں اور مطالعے میں غرق رہنے لگے۔ نیاز فتح پوری ''نگار'' نکالتے تھے۔ وہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ لیکن رشید حسن خاں کے مضامین ''نگار'' میں باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ اسی محنت لگن اور شہرت کا خاطر خواہ نتیجہ سامنے آیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان کی شہرت و مقبولیت ملک اور بیرونِ ملک پہنچ چکی تھی۔ چناں چہ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر جناب خواجہ احمد فاروقی کی خواہش پر ڈاکٹر قمر رئیس جو رشید حسن خاں کے دیرینہ دوست تھے، ان کو اپنے ساتھ دہلی لے گئے اور جولائی 1959 میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ تحقیق سے وابستہ کرانے میں معاون ومددگار ثابت ہوئے۔

شاہ جہاں پور کے لحاظ ومعیار سے ان کی علمیت وقابلیت مثالی تھی۔ لیکن دہلی پہنچنے پر حقیقت معلوم ہوئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ادبی تحقیق کے بہت سے متعلقات کی تحصیل ابھی باقی ہے۔ لہٰذا انھوں نے دہلی کی رنگینیوں میں کھونے اور دوستوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کتابوں کو اپنا دوست بنا لیا۔ دہلی جیسا علمی وادبی مرکز جہاں روز کوئی نہ کوئی تقریب منعقد ہوتی رہتی ہے، شرکت کرنا بند کر دیا۔ سوائے مخصوص مواقع کے۔ نہ وہ کسی کے وہاں جاتے تھے اور نہ کسی کو اپنے یہاں بُلانا پسند کرتے تھے۔ وہ بلا ناغہ کافی ہاؤس جاتے تھے لیکن کبھی کسی کو نہ تو اپنی میز پر بُلایا اور نہ ہی کسی کی میز پر جانا پسند کیا۔ لوگ انھیں مغرور ومتکبر سمجھنے لگے۔ لیکن وہ کسی کی پروا کیے بغیر حصولِ مقصد میں لگے تھے۔ دہلی ان کی معاش کا وسیلہ نہیں گویا ایک امتحان گاہ تھی اور بالآخر 1963 میں وہ حیرت انگیز کارنامہ وجود میں آ گیا جب ''تاریخِ ادبِ اُردو'' (علی گڑھ) کی فروخت پر پابندی لگا دی گئی اور مشاہیرِ ادب نے ان کی عظمت اور اہمیت کو تسلیم کیا۔ ادبی حلقوں میں ان کا نام ادب واحترام سے لیا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ ''فکر و تحقیق'' علی گڑھ سے شائع ہونے والے رسالے میں رشید حسن خاں کے مضمون ''گم شدہ وراثت'' کے جواب میں خاک سار کا لکھا ہوا مضمون ''وراثتِ گم شدہ'' کو چھاپنے سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے اڈیٹر نے اصرار کیا تھا کہ

مضمون سے رشید حسن خاں کا نام حذف کر دیا جائے۔اس مضمون کو کتاب نما، دہلی اور پھر ماہنامہ ''انشا'' نے شائع کیا۔

ایک اور حیرت انگیز بات یہ کہ وہ بیک وقت کئی موضوعات پر ایک ساتھ کام کرتے تھے۔جس موضوع پر کام ہو رہا ہے،اس وقت اسی کے متعلق غور وفکر اور مطالعہ جاری رہتا۔مجال ہے کہ دوسری میز پر پڑے ہوئے دوسرے موضوع سے متعلق مواد کی طرف نظر اُٹھا کر بھی دیکھیں۔''تلاش وتحقیق اور احتیاط کا یہ عالم کہ''باغ و بہار'' کی تدوین 26 سال میں مکمل ہوئی۔''مثنویاتِ شوق'' کے سلسلے میں آرکیالوجیکل ڈپارٹمنٹ لکھنؤ جا کر خود ساری معلومات حاصل کیں۔کبھی قیاس آرائیوں کا سہارا نہیں لیا۔اسی لیے کالی داس گپتا رضا نے انھیں اُردو کا سب سے بڑا زندہ محقق کہا تھا(حیات میں)اور گیان چند جین کو انھیں''خدائے تدوین'' کہنے پر مجبور ہونا پڑا۔

رشید حسن خاں تحقیقی متن کو تیار کرنے میں تمام ضابطوں کا لحاظ کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔یہ بات بھی انھیں دوسرے محققین وناقدین میں ممتاز کرتی ہے۔وہ تحقیق و تدوین کو مختلف دائرے مانتے تھے بل کہ دوسرے تدوین کو تحقیق کا ذیلی شعبہ سمجھتے ہیں۔

(ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ، گوشۂ رشید حسن خاں، جلد 62 نمبر 9 دسمبر 2007 صفحہ 45 تا 46)

○○○

رشید حسن خاں...شجر سایہ دار

ڈاکٹر علی احمد فاطمی

اپنی تیس برسوں کی طالب علمانہ اور مدرسانہ زندگی میں متعدد اکابرینِ ادب کی خدمت میں حاضر ہونے،ان سے گفتگو کرنے اور بہت کچھ سیکھنے کے مواقع ملے۔ابتدا میں رشید احمد صدیقی،مسعود حسن رضوی ادیب،کلیم الدین احمد،عبدالماجد دریابادی،قاضی عبدالودود،میکش اکبرآبادی جیسے بزرگ وعظیم شاعروں وادیبوں کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا لیکن ان پر لکھنے کا حوصلہ کبھی نہ ہو سکا۔اول تو ان سے ملاقاتیں کم ہوئیں،پھر ان حضرات کی شخصیت کا غیر معمولی جلال اور رعب بھی لکھنے نہ دیتا۔اس کے بعد کی نسل میں بھی کچھ ایسے بزرگ ہیں جن سے بہت بار ملاقاتیں رہیں،قربتیں بھی تھیں،ان سے بہت کچھ سیکھا بھی لیکن لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ایسی اہم وبرگزیدہ شخصیتوں میں محترم رشید حسن خاں بھی ایک ہیں۔

خاں صاحب کے بارے میں میں نے کئی بار لکھنا چاہا۔اس وقت جب وہ ملازمت سے ریٹائر ہوئے،اس وقت جب انھیں ایک نہیں یکے بعد دیگرے کئی بڑے انعامات واعزازات ملے۔اس وقت وہ جب دہلی چھوڑ کر اپنے وطن شاہ جہاں پور چلے گئے۔لیکن ہر بار کئی کئی بار دل نے ہچکولے کھائے۔دماغ نے گرم گرم سانسیں لیں،آنکھیں بھی نم ہوئیں اور قلم بھی سرنگوں ہوا لیکن ان سب پر احترام کی ایسی دبیز چادر چڑھی ہوئی تھی جو کم وبیش تیس سال سے میرے سر پر سایۂ عاطفت کا کام کر رہی تھی۔خاں صاحب کی زندگی میں ہر ملاقات پر میں سوچتا تھا کہ اس عزت واحترام کی کوئی حد ہوگی لیکن ہر بار خاں صاحب اس حد میں اضافہ کر دیتے اور میرے لیے یہ مشکل ہوتی کہ اس حد کو میں کن سرحدوں میں سمیٹوں پھر تھک ہار اور غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ علم میں اپنے آپ وہ طاقت نہیں ہوتی جو صداقت اور جرأت کے ساتھ اظہارِ علم میں ہوتی ہے۔مصلحت آمیز

سچے اور اچھے ہوتے ہیں۔ کسی فلسفی نے کہا بھی ہے کہ حسن کی انتہا خوف پر ہوتی ہے اور حسن حقیقی صداقت میں ہوتا ہے اور اسی لیے صداقت میں بھی خوف ہوتا ہے اور صداقت اکثر حقیقت کے مختلف لبادے اوڑھ لیا کرتی ہے۔ یہاں یہ بات اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ رشید حسن خاں زندگی بھر حقیقت کی تلاش میں رہے اس لیے ادبی اصطلاح میں محقق کہلائے ۔نہایت معتبر ومخدوم محقق۔لیکن تلاشِ حقیقت اور اظہارِ حقیقت کا رویہ صرف ادب تک محدود نہ تھا بل کہ زندگی کے معاملات،معمولات اور تعلقات میں بھی تھا۔ بالکل سچا اور کھرا جیسے سورج کی شعاعیں جن میں حرارت بھی ہوتی ہے اور سخاوت بھی۔

1974 میں 'ایم اے' کرنے کے بعد میں نے عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں پر تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔فل لکھنے کا کام شروع کیا۔ وظیفہ ملتا تھا اس لیے مختلف شہروں اور لائبریریوں کو دیکھنے کے اتفاقات ہوئے۔ علی گڑھ،دہلی کچھ زیادہ ہی آنا جانا ہوا۔ دہلی میں قمر رئیس صاحب جو فکشن کے بڑے ناقد اور میرے اُستاد (پروفیسر سیّد محمد عقیل) کے دوست ہیں،ان سے ملاقاتوں کے سلسلے پہلے قائم ہوئے۔ محمد حسن،شارب ردولوی،ظہیر احمد صدیقی،خلیق انجم،شریف احمد،معین الدین فریدی وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں اور خوب ہوئیں۔ انھیں دنوں انھیں لوگوں میں سے کسی کے یہاں خاں صاحب کی بھاری بھرکم کتاب ''اُردو املا'' دیکھی۔ بس دیکھی،چھونے تک کی ہمت نہ کر سکا۔ ان دنوں اس کتاب کے بڑے چرچے تھے اور املا کے نئے نئے زاویے اور رشتے پر تذکرے تھے۔ میں ان سب سے ناواقف تھا اس لیے کہ بچپن سے ہی میری ہر طرح کی گرامر غلط رہی ہے۔ اس کے باوجود خاں صاحب نے مجھے شفقت دی۔ یہ ان کی گرامر کا معاملہ تھا۔

کسی نے کہا کہ رشید حسن خاں سے ضرور ملو۔ انھوں نے شرر کی کتاب 'گذشتہ لکھنؤ' پر بہت معرکے کا مقدمہ لکھا ہے۔ پھر وہ تحقیق کے آداب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ تحقیق سے وابستہ تھے اور گوائر ہال میں رہتے تھے۔ میں ان سے ملنے ان کے کمرے پر گیا۔ تعارف ہوا۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ تحقیق کا موضوع سنا تو گرم ہوئے لیکن جب نگراں کا نام سنا تو نرم ہوئے۔ شفقت سے بولے:

''میاں آپ کو معلوم ہے کہ شرر نے کتنے ناول لکھے ہیں؟''

''غالباً پینتیس (35)!''

''یہ غالباً کیا ہوتا ہے... تحقیق کا یہ مزاج نہیں...''

''پھر کیا مزاج ہوتا ہے؟'' میں نے جسارت کی۔ کس طرح کی یہ خود مجھے نہیں معلوم۔

مسکرائے...''اچھا سوال ہے لیکن طالب علمانہ... ٹھیک ہے اسی طرح طالب علم بنے رہیے کبھی اُستاد نہ بننا...'' پھر مڑے اور فرمایا:

بس یہی جملہ یاد رہا حالاں کہ وہ خاصا زیادہ بولے تھے، کچھ اتنا زیادہ کہ میں خود انھیں شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا لیکن خاں صاحب ایک زندہ حقیقت تھے جس پر سیکڑوں شک پلک جھپکتے قربان ہو جاتے۔ پھر اچانک بولے:

''تم نے کھانا کھایا...؟''

''جی نہیں!''

''چلیے میرے ساتھ ہاسٹل کے ڈرائنگ ہال کی طرف، شاید آپ کا بھی کھانا مل جائے''۔

پھر وہ مجھے لے کر گوائر ہال کی طرف چل پڑے۔ کھانا مل گیا۔ خالص شاکاہاری۔ کھانے کے بعد وہ وہ مجھے اپنے کمرے کی طرف لے گئے ....اسے دکھایا اور پھر باہر ہی سے لوٹا دیا اور کہا: ''یہ میرے آرام کا وقت ہے۔ آپ چار بجے آئیے گا....''

میں بیرنگ واپس لوٹ آیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ خاں صاحب کس قسم کی شخصیت ہیں لیکن پھر بھی مسرت کا ایک بے نام جذبہ طاری تھا کہ آج ایک بڑے محقق سے ملاقات ہو گئی۔ اب میری تحقیق کی راہیں تو آسان ہوں گی شاید زندگی کی راہیں بھی۔

میں نے چار بجے حاضری دی، وہ تیار تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے مجھے لے کر یونی ورسٹی کافی ہاؤس گئے جہاں انھوں نے نہایت کالی سی کافی پی اور میں نے نسبتاً گوری،لیکن جو گفتگو کی اس سے ان کی شخصیت کا اُجلا پن مجھ پر ظاہر ہونے لگا اور میں گوری کافی پی کر بھی من کی سیاہی دور نہ کر سکا۔ کافی ہاؤس میں انھوں نے ادب و تحقیق کے بارے میں کوئی گفتگو نہ کی۔ وہ فٹ بال کے بارے میں بتاتے رہے۔ میں حیران تھا کہ ادب کا اتنا بڑا اسکالر فٹ بال کے میدان کا گول کیپر۔ مجھے فٹ بال سے زیادہ دل چسپی نہ تھی۔ یہ بات ان کو پسند نہ آئی اس لیے وہ کافی ہاؤس سے نکلنے کے بعد فٹ بال میچ دیکھنے چلے گئے اور مجھ سے رسماً بھی نہیں کہا۔ کیوں کہتے، مجھے فٹ بال پسند جو نہ تھا۔ وہ رسمیات کے قائل نہ تھے، کوئی دوسرا رسمی باتیں کرے یہ بھی انھیں پسند نہ تھا فوراً ٹوک دیتے، ذرا بھی مروت نہ کرتے۔ عجیب انسان تھے خاں صاحب، کم از کم عام اُردو والوں سے بالکل عجیب اور آج کے اُردو والوں سے بالکل غریب۔ اس زمانے میں اُردو دُنیا میں خواجہ احمد فاروقی، آل احمد سرور، خورشید الاسلام کا طوطی بول رہا تھا اور بڑے بڑوں پر (حالاں کہ وہ لوگ چھوٹے تھے) ان کا رعب طاری تھا لیکن خاں صاحب ان چیزوں سے بے نیاز تھے بل کہ یہ بزرگ حضرات خائف رہتے کہ کب شاہ جہانی پٹھان دہلی علی گڑھ کی طرف رُخ کر لے۔ کبھی کبھی وہ کر بھی لیتے تھے جس کی اپنی نفسیاتی وجہیں بھی تھیں اس لیے وہ ایک انسان بھی تھے۔ وہ پروفیسر نہ تھے۔ کسی ادارے کے ڈائرکٹر بھی نہ تھے لیکن وہ اسکالر

تھے۔ بہت بڑے اسکالر جس کی گردن خم تھی اور تھوڑی ترچھی...وہ جانتے تھے کہ علم وادب کا رشتہ پروفیسر اور ڈائرکٹر سے بہت بڑا ہوتا ہے۔ وہ اکثر کہتے اور ایک بار انھوں نے مجھے ایک خط میں بھی لکھا تھا...؛

''میاں! جو گھر کے اندر سر جھکا کر کام کرتا ہے وہ گھر کے باہر سر اٹھا کر چلتا ہے۔ ذرا اُردو کے پروفیسروں کو دیکھوں زیادہ تر کی نظریں جھکیں اور کمر خمیدہ رہتی ہے''۔

''یہ علم کا بوجھ بھی ہو سکتا ہے...''

''نہیں یہ جہالت کا بوجھ کا ہے۔ جہالت کا بھی اپنا بوجھ ہوتا ہے جو علم کے مقابلے از خود زیادہ اظہار کے راستے اختیار کر لیتا ہے...کیوں کہ علم بردباری اور سنجیدگی لاتا ہے اور جہل شوخی اور بے حجابی...'' کچھ اور باتیں ہوئیں۔حق کے بندوں پر حق کا فضل نازل ہوتا رہا۔شریفوں پر بھی بوچھار رہی۔ کچھ اس انداز سے کہ ہم سرور میں آ گئے...اب اس کی تفصیل کیا بیان کروں کیوں کہ ان میں بیش تر لوگ اب اس دُنیا میں نہیں رہے اور اب تو خاں صاحب بھی نہیں رہے۔

انھیں ملاقاتوں میں ایک دن انھوں نے اپنی ترقی پسندی اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی کا ذکر کیا اور پھر علاحدگی کا۔ وہ جو اسباب بتاتے تھے اس سے میں کبھی متفق نہ ہو سکا اور میں یہی نتیجہ نکالتا تھا کہ خدا نے خاں صاحب کو کچھ دوسرے کاموں کے لیے بنایا تھا اور وہ کام انھوں نے کیے اگرچہ کافی بعد میں کیے لیکن بلا شک وہ غیر معمولی اور یادگار کام ہیں جو انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔اس ضمن میں خلیق انجم صاحب کی بھی تعریف کرنی ہوگی کہ انھوں نے خاں صاحب سے کچھ اہم اور بڑے کام کرا لیے۔ وہ خود اچھے ادیب محقق اور خاں صاحب کی غیر معمولی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔

شرر پر کام کرتے وقت خاں صاحب نے مجھے تحقیق کے آداب سکھائے اور ساتھ ہی زندگی کے بھی (جو میں ٹھیک سے نہ سیکھ سکا) لیکن آدابِ تحقیق تو اس وقت بہت کام آئے۔مسعود حسن رضوی ادیب سے ملنے کی ہدایت کی۔لکھنؤ میں ناولوں کی تلاش کرنے کے مناسب مقامات بتائے پھر اچانک سوال کیا:

''آپ کو معلوم ہے شرر کی جائے پیدایش کیا ہے؟''

''لکھنؤ ہے۔انھوں نے خود لکھا ہے کہ وہ لکھنؤ کے جھوانوائی ٹولہ میں پیدا ہوئے''۔ میں نے عرض کیا۔

''نہیں، وہ لکھنؤ میں نہیں پیدا ہوئے، وہ بارہ بنکی کے قصبہ کرسی میں پیدا ہوئے چوں کہ کرسی بے وقوفوں کے لیے مشہور تھا اس لیے انھوں نے یہ بات چھپائی...''

''لیکن آپ کو یہ سب کیسے معلوم؟''

''پھر کی حماقت کی بات.... تحقیق میں یہی سب معلوم کرنا پڑتا ہے۔آپ بھی کرسی جائیے ان کی نواسی کی اولادیں ہیں، ان سے ملیے کچھ اور تفصیل لے کر آئیے''۔

چناں چہ خاں صاحب نے ہی مجھے کرسی بھیجا اور میں گیا۔کرسی میں مجھ پر کیا گزری یہ ایک الگ داستان ہے جس کا ذکر پھر کبھی...وہاں مجھے کچھ ہاتھ نہ آیا سوائے شرر کا ایک گھریلو قسم کا ایک معمولی سا خط جو انھوں نے لندن سے اپنی نواسی کو لکھا تھا۔لیکن شرر کی تحریر دیکھ کر ضرور خوشی ہوئی۔ میں نے اپنے مقالے میں شرر کی پیدایش کرسی ہی میں بتائی اور ثبوت کے طور پر رشید حسن خاں کا نام لکھ دیا، ظاہر ہے کہ اتنے بڑے محقق کا کہہ دینا ہی میرے لیے کافی تھا۔ پھر انھوں نے اس کی بھی ہدایت کی کہ لکھنؤ کے حکیموں کے محلے میں جا کر میں شرر کا مزار تلاش کروں۔ مجھے فکر ہوئی کہ کہیں وہ بھی کرسی میں نہ ہو لیکن وہ مجھے اسی محلے کے قبرستان میں ملا جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں میری آنکھیں نم ہو گئیں...کیسے کیسے بڑے بڑے لوگ بڑے بڑے کام کر کے اب زمین کے نیچے دفن ہیں۔ سچ ہے کہ انسان کا کام زندہ رہتا ہے، اس کی نیکیاں زندہ رہتی ہیں۔اس مضمون کو لکھتے وقت کم و بیش یہی جذبہ خاں صاحب کے لیے اُمڈ رہا ہے کہ انھوں نے مجھے کیسے کیسے مشورے دیے، کیسی راہ دکھائی۔ اگر وہ نہ ملے ہوتے تو میں تحقیق کی خار دار راہ کس طرح طے کر پاتا۔ یہی نہیں، وہ زندگی کی نرم و نازک باتیں بھی سکھاتے۔ایک بار ایک اور ایسی ہی بات کہی جو میرے دل میں نقش ہو گئی۔ اُستادِ محترم سیّد محمد عقیل کے تئیں میری عقیدت دہلی کے سمیناروں میں ان کے ساتھ آمد و رفت اور تھوڑی بہت خدمت دیکھ کر ایک بار بڑی محبت اور سنجیدگی سے بولے:

> ''آپ اپنے اُستاد کی کی اتنی عزت و خدمت کرتے ہیں، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی اس دور میں اُستاد اور شاگرد کے ایسے رشتے اب کہاں...آپ ان کی خوب عزت کیجیے۔عقیل صاحب لائق اور شریف انسان ہیں...لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اگر آپ کو اپنی پہچان بنانی ہے تو برگد کے سایے سے نکلنے کی بھی کوشش کیجیے...''

اس سلسلے میں اکثر وہ مجھے سمجھاتے، ہدایتیں دیتے، اکثر ڈانٹتے بھی تھے۔مضامین کی کمزوریوں اور بالخصوص زبان کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے۔آج مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ میری زبان کو درست کرنے اور نفسِ مضمون کو خاص ڈھنگ سے پیش کرنے کا ہنر جیسا مجھے خاں صاحب نے سکھایا کسی اور نے نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نالائق اتنا سیکھ نہ سیکھ سکا جتنا کہ سیکھ لینا چاہیے تھا۔

ڈی۔فل کی ڈگری ملنے کے بعد جب مجھے پہلی ملازمت سینٹ جانس کالج آگرہ میں ملی تو وہ بہت خوش ہوئے اور بتایا کہ یہ کالج اور اس کا اُردو شعبہ بڑا تاریخی ہے۔ یہاں مولانا حامد حسن قادری اُردو کے پروفیسر تھے۔انھوں نے اس شعبے کو زندہ کیا جسے بعد میں فریدی نے ڈبو دیا۔اب تم اسے زندہ کرو اور میکش صاحب کی خدمت میں حاضری دو۔شعبہ بہت کمزور تھا طلبہ ندارد اس لیے جوائن کرنے کے بعد میں نے چاہا کہ اسے متحرک کروں۔ میں نے پہلے ہی سال اکبر آباد کے شاعروں پر ایک سمینار اور مشاعرے کا

اہتمام کیا۔ اس سلسلے میں بھی خاں صاحب نے میری بڑی مدد کی، وہ اس وقت یو پی اُردو اکادمی کے مجلس انتظامیہ کے اہم رُکن تھے اور علی جواد زیدی صدر تھے جو خاں صاحب کو بہت مانتے تھے۔ دونوں حضرات نے اکادمی سے دس ہزار روپے دلوائے جو اس وقت اچھی رقم تھی اور دونوں حضرات تشریف بھی لائے۔ اس سمینار میں کافی لوگ آئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس، سیّد محمد عقیل، شبیہ الحسن، عنوان چشتی وغیرہ۔ شعرا میں جذبی، واقف، تاباں اور میکش وغیرہ۔ بعد میں کسی اور تقریب میں آل احمد سرور بھی آئے، وہ بھی اسی کالج کے طالب علم رہے ہیں۔ بہرحال وہ پروگرام بہت کامیاب رہا جس سے شعبۂ اُردو کو بڑی تقویت پہنچی۔ اس پروگرام میں جس قدر رُخ ان صاحب نے دل چسپی لی میں نے اس کے بعد کہیں نہیں دیکھا۔ اس کامیابی کے بعد انھوں نے ہی مجھے اکیڈمی کا ممبر بنوایا۔

پروگرام کے بعد عقیل صاحب اور خاں صاحب نے دو ایک دن اور قیام کیا۔ میرے کرایے کے مکان پر تشریف لائے۔ دعوت قبول کی، بیوی اور بیٹی سے ملاقاتیں کیں۔ بیٹی کو گود میں لیے رہتے۔ چوں کہ میں وہاں اکیلا تھا اور کوئی بزرگ ساتھ نہ تھا چناں چہ میری بیٹی دونوں بزرگوں سے گھل مل گئی اور ہر وقت دادا کہتی رہتی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ وہ ایک بڑے محقق اور دانش ور ہیں بل کہ خان دان کے ہی ایک بزرگ چچا بابا کی طرح کچھ یہ بھی کہ کھرا انسان باہر سے جتنا مختی اور بے باک ہوتا ہے اندر سے اتنا ہی نرم، شفیق اور پیارا۔ اس کا دل آئینہ کی طرح ہوتا ہے جس میں دور دور تک غبار کا نام نہیں۔ شاد عظیم آبادی کا شعر ہے:

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شاد پیری میں
کہ جس کو منھ نہ دکھانا ہے یہ آئینہ اسی کا ہے

خاں صاحب نہ منھ دکھانے پر یقین رکھتے تھے اور نہ ہی پیری پر.... تاہم کدورت سے پاکیزگی ان کے ایمان وایقان کا بنیادی حصہ تھا۔ ان معنوں میں وہ بالکل صوفی کی طرح تھے جہاں سے پاکیزگی کے سبق سیکھے جاسکتے تھے۔ میں آگرہ میں تقریباً تین سال رہا، اس مدت میں میں نے دو بڑے مذاکرے اور مشاعرے کیے۔ اس درمیان میں نہ جانے کتنی بار دہلی گیا اور ان سے ملا۔ اس کا کوئی حساب کتاب نہیں۔ وہ ایک بار اور آگرہ آئے بالکل اکیلے۔ وہ اکیلے آنا بھی چاہتے تھے۔ مقصد آگرے کا تاج محل دیکھنا نہ تھا بل کہ ادب کے قطب مینار میکش اکبرآبادی سے ملاقات کرنا اور تنہائی وسکون کے چند دن گزارنا۔ جو دہلی میں الگ تھلگ زندگی گزارنے کے باوجود ممکن نہ تھا کچھ وہ حساس بھی زیادہ تھے اور بے باک تو تھے ہی لیکن بہ حیثیت مجموعی طبیعت اس قدر نفیس اور شفاف پائی تھی کہ علم وادب کی ذراسی پراگندگی انھیں جلد کوفت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ حالات بھی کچھ ایسے بن گئے تھے کہ علمی واخلاقی معیار واقدار روز بہ روز گرتا ہی جا رہا تھا۔ یونی ورسٹیوں میں لکھے جانے والے تحقیقی مقالوں سے وہ سخت نالاں رہتے جس انداز سے ان مقالات کے محققین اپنی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے یہ خاں صاحب کیا کسی بھی شریف النفس اور ذی علم انسان کے لیے اذیت ناک ہوسکتا ہے۔ مجھے ہدایت کرتے کہ ''تم اپنا مقالہ شائع ضرور کرو لیکن اس پر نظرِ ثانی ضرور کرنا اس کے بعد ہی شائع کرنا۔'' افسوس اس وقت آگرہ میں میرے پاس مقالہ نہ تھا ورنہ دو چار دن جو انھوں نے میرے ساتھ یا میں نے ان کے ساتھ آگرے میں گزارے اس پر مزید اصلاح لے لیتا، وہ کچھ اور معتبر ہو جاتا۔ اس قیام کے درمیان انھوں نے سیماب اکبرآبادی کا محلّہ ومکان دیکھا جہاں وہ اور شاعر پیدا ہوئے۔ میکش صاحب کے آستانے پر کئی بار گئے جہاں فانؔی، جوشؔ وغیرہ کی خوب خوب باتیں ہوئیں۔ حیرت انگیز انکشاف ہوئے مثلاً فانی کی دل چسپی رمل سے اور جوشؔ کی تصوف سے، ان سے متعلق واقعات۔ میکش صاحب نے بتایا انھوں نے اکبر اور سیماب کی رقابتیں جذبی اور مجاز کی شرارتیں، فانی اور مانی کے ادارے۔ صبا اکبرآبادی کے مرثیے۔ اکبرا کبرآبادی کے گھر والوں سے ملاقاتیں اور اس دور میں بھی اکبرآباد کی گھاتیں۔ یہ سب کی سب میرے سامنے آئیں اور ان سب سے بے نیاز سلسلۂ قادریہ کو مضبوط کرنے میں مصروف رہا۔ اسی دوران میں نے تحقیقی نوعیت کے کئی مضامین نظیر اکبرآبادی پر لکھے جو میں نے پہلے خاں صاحب کو دکھائے اور جو انھیں قدرے پسند آئے اور چھپوائے۔ اسی سلسلے میں نظیر پر میرے ایک مضمون میں میں نے قیاساً نظیر کو غالب کا اُستاد ثابت کیا تھا۔ خاں صاحب تحقیق میں قیاس کے قائل نہ تھے۔ ایک خط میں صاف طور پر لکھا:

''غالب کے تلمذ نظیر سے متعلق کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بہ ظاہر یہ گپ باطن کی اُڑائی ہوئی ہے۔ نظیر کا سالِ پیدایش بھی صحیح طور پر معلوم نہیں۔ شہباز نے جو لکھا ہے محض قیاس آرائی ہے اور کچھ نہیں۔ بعض اور لوگوں کی طرح نظیر کا سالِ ولادت اب تک معلوم نہیں ہوسکا۔''

ڈھائی تین سال آگرے میں گزارنے کے بعد امکانات ہوئے کہ میں علی گڑھ یا الٰہ آباد چلا جاؤں۔ خاں صاحب نے سختی سے علی گڑھ جانے کو روکا اور الٰہ آباد جانے کو کہا۔ علی گڑھ کی ڈھیر ساری برائیاں کیں۔ آل احمد سرور کی کچھ زیادہ، پھر جب میرا تقرر الٰہ آباد یونی ورسٹی میں ہوگیا تو مبارک باد کا پہلا خط خاں صاحب کا آیا:

''یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ کا انتخاب الٰہ آباد کے لیے ہوگیا۔ اب اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ عقیل صاحب کو آپ جیسے مخلص کی واقعتاً شدید ضرورت محسوس ہوگی.... لیکن اب اصل مسئلہ آپ کے جاں نشین کا ہے اس کے لیے کچھ کیجیے ورنہ بڑا نقصان ہوگا۔''

جہاں ان کو یہ فکر تھی کہ سینٹ جانس کالج کے شعبۂ اُردو کا کیا ہوگا وہ اس بات پر خوش تھے کہ الٰہ آباد میں مجھے آسانیاں ہوں گی اور پڑھنے لکھنے کے مواقع زیادہ ملیں گے۔ اب ملاقاتیں کم ہوئیں، خط وکتابت زیادہ تھی۔ میں زیادہ لکھتا، ان کے جواب میں اکثر تاخیر ہو جاتی لیکن جب جواب آتا تو اس میں روکھی پھیکی تحقیق نہ ہوتی پیار بھرے دل چسپ جملے ہوتے، محبت وشفقت ہوتی جو بڑا مزہ دیتی۔ ایک خط کے یہ جملے دیکھیے:

''میاں! میں تمہارا گنہ گار ہوں کہ خط کا جواب اب لکھ رہا ہوں حالاں کہ خط بہت پہلے ملا تھا۔ معذرت کیا طلب کروں تاخیر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ تم اگر

ناراض ہو تو اس کا حق پہنچتا ہے لیکن چوں کہ وہ بہت مہذب اور وضع دار اس لیے دل یہ کہتا ہے کہ جلدی ہی مان جاؤ گے۔ یہ دیکھ اس قدر اور اس طرح کا اعتماد ہر ایک پر تو نہیں ہوتا... توقع کرتا ہوں کہ بیگم اب بہ خیریت ہوں گی۔ عقیل صاحب سے خیریت معلوم ہوگئی تھی۔ مقالے کی کتابت غالباً شروع ہو چکی ہوگی اور توقع کرتا ہوں کہ جلد ہی آنکھیں اس سے روشن ہو سکیں گی۔ بھائی! کبھی کبھی خط ضرور لکھا کرو۔ میں ہر ایک سے دل نہیں لگاتا۔ نہ توقع قائم کرتا ہوں اور نہ فرمایش کرتا ہوں جب خط ملتا ہے تو کچھ دیر کے لیے جی خوش ہو جاتا ہے اور اب یہ نعمت کم یاب ہے۔

بھائی! وہ آگرے میں کتب خانہ محمد یہ قائم کب ہوگا۔ میں نے کہا تھا کہ جب تم ادھر آؤ تو میں بھی آجاؤں۔ اب تو سردی شباب پر ہے۔ اگر ممکن ہو تو اواخر فروری میں اس کام کو کر ڈالو ثواب ملے گا اور کیا کہوں ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ تھوڑا سا پیٹھا کھانے کو مل جائے گا۔

بہت سی دعاؤں کے ساتھ

رشید حسن خاں (دستخط)

29-12-1983''

ایک اور خط کی زبان اور لہجہ ملاحظہ کیجیے۔ الہ آباد کے کسی سمینار میں میں نے مدعو کیا تو جواب آیا:

''عزیزم!

تم تو آرام جاں تھے، یہ دشمن کیسے ہو گئے؟ بوڑھا بیمار شخص اس کو زمین کا گز بنانا چاہتے ہو اور اس عالم میں جب کہ یہاں کوئی قاعدے کی ٹرین نہیں گزرتی۔ اب میں دہلی جاؤں، وہاں کسی کو لکھ کر رزرویشن کرواؤں وہ صاحب بھی اس ناروا زحمت کو گوارا کر لیں۔ تب الہ آباد کی گاڑی میں بیٹھوں۔ کتنے اگر مگر ہیں اس میں... اچھے بچے اچھی باتیں کیا کرتے ہیں تم بھی ویسی ہی باتیں کیا کرو... وہاں مجھ سے کہیں بہتر لوگ آئیں گے جو واقعی روشن خیال ہوں گے اور زمانہ شناس (شاید زمانہ ساز بھی ہوں) ایسے میں میری ضرورت نہ گنجایش اور پھر غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ میاں! میری معذرت قبول کرو۔ خدا (جس کے متعلق یہ نہیں معلوم کہ وہ ہے تو کہاں ہے) تم کو جنت دے گا اور بہت سی حوریں۔ اگر اچھے دل سے مان لو گے یہ بات۔ برے دل سے مانو گے تو وہاں حوروں کی جگہ غلمان ملیں گے۔ یہ یاد رکھو!

نئے شمارے کا منتظر ہوں۔

رشید حسن خاں

23 مارچ 1998''

ان تحریروں کو ملاحظہ کیجیے۔ کیا یہ وہی خاں صاحب ہیں جو اپنی خاں صاحبیت کے لیے دور دور تک شہرت رکھتے تھے۔ ان جملوں میں غیر معمولی شفقت و اپنائیت جھلک پڑتی ہے۔ مجھے خیال آرہا ہے کہ سمینار کا موضوع سماجی اور سیاسی نوعیت کا تھا جس سے ان کو اتنا لگاؤ نہ تھا۔ حالاں کہ خط کے آخری جملے میں مذہب سے بے نیازی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے ان سے مذہب کے موضوع پر گفتگو نہیں کی لیکن اتنا یقین تھا کہ وہ مذہب دل پر یقین رکھتے تھے۔ ایک بار انھوں نے مجروح کی ایک غزل کی بہت تعریف کی اور اس شعر کی بطور خاص:

ہم سے کہا جبرئیل جنوں نے یہ بھی وحیِ الٰہی ہے
مذہب تو وبس مذہب دل ہے باقی سب گمراہی ہے

وہ بڑی دیر تک جبرئیل جنوں کی ترکیب کی تعریف کرتے رہے حالاں کہ وہ تعریف بہت کم کرتے تھے خاص طور پر ترقی پسندوں کی لیکن وہ تعریف سننا بھی بہت پسند نہ کرتے تھے۔ میں نے خاں صاحب کو اپنی تعریف کرتے کبھی نہیں سنا بل کہ کوئی دوسرا بھی ہوتا تو ٹال جاتے اور کوئی مذاق بھرا جملہ نکال کر بات کا موڑ دیتے۔ میں نے کبھی انھیں غیر سنجیدہ نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی غیر سنجیدہ سے کوئی سنجیدہ گفتگو کرتے دیکھا۔ ان کے اپنے اصول تھے اور اصولوں سے بھرا رویہ جس کی وجہ سے وہ 'چوزی (Choosy) تھے جیسا کہ اس خط کی تحریر سے بھی اندازہ ہوتا ہے۔

1986 میں میرا تحقیقی مقالہ 'عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار' نصرت پبلشرز لکھنؤ سے عابد سہیل صاحب نے شائع کر دیا۔ مقالہ اچھا نہ چھپا تھا اس لیے خاں صاحب نے جب دیکھا تو اس کی اشاعت پر تو خوش ہوئے لیکن خراب طباعت پر ناراض بھی ہوئے۔ پیچھے میری تصویر تھی اور عابد سہیل کا لکھا ہوا تعارف اور تھوڑی سی تعریف۔ یہ بھی خاں صاحب کو ناگوار گزرا۔ میں نے دہلی جا کر مقالے کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ بولے:

''یہ تصویر اور تعارف کیوں ہے؟''

اب میں کیا جواب دیتا۔ چپ رہا۔ پھر فرمایا:

''یہ تعریف۔ یہ نمایش انسان کو بے ضمیر بناتی ہے۔سنجیدہ لوگ اس سے پرہیز کرتے ہیں۔تمہارا کام خوب تعارف کرائے گا اور شہرت بھی دے گا۔''

اس کے بعد میں نے عہد کیا کہ آیندہ کتابوں میں ان باتوں سے پرہیز کروں گا۔

اس درمیان ان سے کئی سمیناروں میں ملاقاتیں ہوئیں۔اگر وہ سمینار تحقیق لسانیات یا اس قسم کے ملتے جلتے موضوع پر ہوتے تو خاں صاحب کے آگے کسی کا چراغ روشن نہ ہو پاتا لیکن اگر خالص ادبی یا شعری موضوع پر ہوتا تو بات ذرا الگ سی ہو جاتی۔کسی سمینار میں فیضؔ پر پر مقالہ پڑھا تو فیضؔ کے خلاف چلا گیا۔لوگوں نے خوب بحث کی۔اسی طرح فانیؔ،فراقؔ پر پڑھے گئے مقالات میں وہ بات نہ تھی جس کے لیے خاں صاحب شہرت رکھتے تھے۔دراصل ان کا میدان ہی مختلف تھا۔متن،زبان اور املا پر ان کی گہری نظر تھی ،ان سب پر وہ غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔کلاسیکی ادب اور کلاسیکی زبان،اس کی نوک کی پلک،تفصیلات،محاورات اور لب و لہجے پر ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔جس شخص نے 'باغ و بہار'،'سحر البیان'،'گلزارِنسیم'،'زہرِعشق'،وغیرہ کی تدوین کا کام کیا ہو اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔یہ کام ہی الگ نوعیت کے ہیں اور شاعری کے رجحانات،میلانات،جمالیات ونفسیات کے معاملات کی دُنیا الگ ہوا کرتی ہے۔

شررؔ والی کتاب کی اشاعت کے کئی سال بعد میں نے شررؔ پر ایک مونوگراف پڑھا جسے ساہتیہ اکادمی،دہلی نے شائع کیا تھا اور جو ہمارے شہر الٰہ آباد کے ہی ایک ادیب کے ذریعے لکھا گیا تھا۔میں اس کو پڑھ کر حیران ہو گیا۔اس مونوگراف میں جا بہ جا میری کتاب سے اقتباسات لیے گئے تھے اور اس کا کہیں کوئی حوالہ نہیں اور کتابیات میں بھی میری کتاب کا ذکر تک نہیں۔میں نے یہ تکلیف دہ بات خاں صاحب کو لکھی،فرمایا دونوں کتابیں لے کر دہلی آجاؤ میں بغیر دیکھے کوئی فیصلہ نہیں لے سکتا۔کچھ ہی دنوں کے بعد میرا دہلی جانا ہوا تو میں نے خاں صاحب کو دونوں کتابیں دکھائیں۔انھوں نے بغور دیکھا تو حیران رہ گئے۔چہرا تمتمایا،کہا''آپ دونوں کے اقتباسات کا ایک خاکہ تیار کیجیے اور بتائیے کہ کس صفحے پر آپ کی کیا تحریر ہے اسی کے سامنے اس کی تحریر بھی پیش کیجیے۔دہلی سے واپس آنے کے بعد میں نے یہ ناپسندیدہ کام انجام دیا۔ایسے نشانات کی تعداد تقریباً بیس تھی جہاں میری کتاب سے سرقہ کیا گیا تھا۔مضمون خاصا طویل ہو گیا تھا تاہم میں نے اسے خاں صاحب کو بھیجا،انھوں نے پورے غور وخوض کے بعد اسے خلیق انجم صاحب کو برائے اشاعت دے دیا۔جلد ہی وہ تین قسطوں میں 'ہماری زبان' میں شائع ہوا۔لوگوں نے مجھے داد دی اور سرقہ بردار نے بے داد،جو ہونا ہی تھا۔کچھ مقامی لوگوں نے یہ بات بھی کہی کہ یہ سراسر چوری ہے اور غیر دیانت داری۔آپ مقدمہ دائر کیجیے ۔میں نے پھر خاں صاحب سے مشورہ کیا۔ڈانٹا کہ بس ہو گیا مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ادبی معاملات عدالتوں میں طے نہیں ہوتے۔بس خاموش ہو جائیے۔اور میں خاموش ہو گیا۔

اس درمیان خاں صاحب ریٹائر ہو گئے تو کام کی بھیڑ اور زیادہ ہو گئی۔ہمہ تن مصروف ان دنوں خاں صاحب کے نام کا طوطی بول رہا تھا۔ہند و پاک میں ان کے،نام کی غیر معمولی شہرت وعزت تھی۔احترام وادب سے ذکر ہوتا۔جا بجا بلائے بھی جاتے لیکن وہ ہر جگہ کہاں جانے کو تیار ہوتے۔یہی وہ مقام ہے جب خلیق انجم صاحب نے انھیں بڑا سہارا دیا اور انجمن ترقی اُردو (ہند) سے وابستہ کر کے ان سے بہت اچھے اور بڑے کام کروائے۔میں تحقیق کا آدمی نہ تھا اور نہ ہوں لیکن نظیر سے متعلق مضامین اور شرر والی کتاب نے نہ جانے کیا تاثر دے رکھا تھا کہ وہ اکثر مجھے تحقیقی نوعیت کا کام سونپنے اور رائے مشورے بھی کرتے۔'زہرِعشق' سے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

''عزیزم!

ایک ضروری بات اور:

> میں نے نواب مرزا شوق کی تینوں مثنویوں (فریبِ عشق،زہرِعشق،بہارِعشق) کو مرتب کرنے کا خاکہ بنایا ہے۔کام بھی شروع کر دیا ہے۔مجھے ان مثنویوں کے قدیم اڈیشن کی ضرورت ہے یعنی 1260ھ سے لے کر 1280ھ تک کے چھپے ہوئے۔ذرا میرے کرم فرما عقیل صاحب سے پوچھو ان کو کسی نہ کسی نسخے کا احوال ضرور معلوم ہوگا اصل نسخے کی ضرورت نہیں اس کا عکس بہ آسانی بن سکتا ہے اور وہاں لائبریری میں ضرور ہونا چاہیے۔میری خاطر ایک دن خراب کر ڈالو اور لائبریری میں تلاش کر لو میں بہت شکر گزار رہوں گا۔
>
> 'گلزارِنسیم' چھپنے چلی گئی دس بارہ دن میں چھپ کر آجائے گی (724) صفحے بنے ہیں۔اس میں چکبست و شرر کے پورے معرکے کا احاطہ کیا گیا ہے۔چوں کہ اس کے بعض مباحث کا تعلق شرر سے یعنی تم سے ہے اس لیے یہ ارادہ ہے کہ ایک جلد بھیج دوں گا تمھارے لیے اگر تم کو اس قدر ضخیم کتاب سے وحشت نہ ہو۔انتساب کی بشارت سے خوش ہونا قدرتی بات ہے مجھے بھی مسرت ہوگی۔شکریہ پیش گی۔
>
> رشید حسن خاں
>
> 12مارچ1995''

میرے پاس 'زہرِعشق' کا ایک پُرانا نسخہ تھا جو مصور تھا،میں نے آگرے سے حاصل کیا تھا وہ پورا بھیج دیا ظاہر ہے کہ اس بات پر وہ خوش ہی ہوئے لیکن ان سے زیادہ میں خوش تھا کہ خاں صاحب کی خدمت کرنا میرے لیے عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔خوب دعائیں ملتی تھیں۔چند ماہ کے بعد ڈاک سے ایک موٹی سی کتاب ملی یہ 'گلزارِنسیم' کا جدید ترین

اڈیشن تھا جسے ترتیب دیا خاں صاحب نے اور شائع کیا انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی نے۔ اس کے پہلے ورق پر لکھا تھا: عزیز فاطمی کے لیے...اسی طرح بعد میں انھوں نے اپنی اس زمانے (1978) کی کتاب 'ادبی تحقیق' بھی اس شفقت اور جملوں کے ساتھ عنایت کی تھی، 'گذشتہ لکھنؤ' کا نسخہ بھی ان کی دستخط کے ساتھ موجود اور محفوظ ہے۔ گاہے بگاہے ان کتابوں کو، اس مضمون کو لکھتے ہوئے بطورِ خاص جب میں نے ان کتابوں کو الٹا پلٹا، ان کے قلم سے اپنا نام لکھا دیکھا تو آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ آج خاں صاحب ہم میں نہیں لیکن مجھے ہمیشہ یہ فخر رہے گا کہ اتنا بڑا محقق اعظم ادیب میرا محسن رہا ہے اور اس نے مجھے بے پناہ شفقتوں سے نوازا ہے۔ اولاد کی طرح چاہا مانا ہے۔ 1999 کے کسی ماہ میں مجھے خاں صاحب کا ایک خط بمبئی سے ملا جس میں علالت و علاج کا تفصیلی ذکر تھا۔ مجھے تشویش ہوئی کہ وہ بار بار بمبئی کیوں جا رہے ہیں۔ ایک بار وہ جب بمبئی میں تھے تو اتفاق سے میرا بمبئی جانا ہو گیا۔ فون پر بات کی۔ وہ اپنے کسی غیر مسلم دوست کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے جو سانتا کروز میں تھا۔ میں اپنے دوست الیاس شوقی کے ساتھ ان سے ملنے گیا۔ وہ ہم لوگوں کو پا کر بہت خوش ہوئے لیکن میں ان کی صحت دیکھ کر بجھ سا گیا۔ وہ کمزور سے لگے، ان کے چہرے پر نقاہت تھی بہر حال ہم لوگوں کو پا کر جیسے ان میں جان آ گئی ہو۔ بمبئی میں کالی داس گپتا رضا، دلوی اور ان دونوں سے زیادہ ذہنی طور پر باقر مہدی سے بہت قریب تھے۔ دونوں کا قارورہ ملتا تھا کھرے پن کا قارورہ۔ خاں صاحب ذات کے پٹھان تھے تو باقر مہدی ادبی پٹھان، کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے جب جس کو چاہیں علم کی قلابازی سے ادب کے دنگل میں چت کر دیتے۔ جھوٹ اور مکر و فریب کو دونوں سخت ناپسند کرتے تھے۔ اسی لیے دونوں میں خوب پٹتی تھی۔ خاں صاحب نے اپنی کوئی کتاب باقر مہدی کے نام سے معنون کی تھی شاید باقر مہدی نے بھی۔ اب یاد نہیں۔ بمبئی اور شاہ جہاں پور کے کئی چکّر لگے تو مجھے کچھ زیادہ ہی فکر ہوئی۔ ہر بار بمبئی جانا ممکن نہ تھا اس لیے شاہ جہاں پور جانے اور ملنے کی خواہش ہوئی۔ عقیل صاحب بھی تیار ہوئے۔ فون کیا تو کمزور سی آواز آئی۔ شاہ جہاں پور آنے سے منع کر دیا۔ دہلی کے غالب سمینار میں ملاقات ہوگی اور غالب سمینار میں ملاقات ہوئی۔ کچھ بہتر لگے شاید اسی لیے سمینار میں شرکت کر سکے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز کے یہاں پُرانی دہلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں پتا نہیں یہاں سے مجھ پر یہ جنون سوار ہوا کہ میں کلیاتِ نظیرؔ اکبر آبادی ترتیب دوں۔ جب یہ خواہش میں نے قومی اُردو کونسل دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کے سامنے رکھی تو وہ تیار ہو گئے۔ میں نے جب اس کا ذکر خاں صاحب سے کیا تو وہ سوچتے رہے پھر بولے... ''یہاں نہیں گھر آیئے وہاں اطمینان سے باتیں ہوں گی''۔ شام کو میں اسلم پرویز صاحب کے گھر گیا، وہ میرے منتظر تھے۔ جب اس منصوبے پر گفتگو ہوئی تو صاف طور پر کہا:

''یہ کام تم نہ کر سکو گے۔ کسی دیوان یا کلیات کی ترتیب معمولی کام نہیں اگر آپ سیدھے طریقے سے ایک مقدمہ کے ساتھ کلیات شائع کرنا چاہتے ہیں تو کر لیجیے لیکن یہ کام بڑا نہ ہوگا...لیکن اگر آپ پورے متن، لفظیات اور حواشی کے ساتھ کریں گے تو یہ کام آپ کے بس کا نہیں۔ یہ کام کوئی آگرہ یا برج کا باسی ہی کر سکتا ہے۔ ایسے کام میں ہاتھ مت لگایئے جسے آپ کر ہی نہ سکیں...''

خاں صاحب کے اس سچائی سے بھرے مشورے سے وقتی طور پر میرے جوش و جذبے پر اوس پڑی لیکن سچ یہ ہے کہ انھوں نے بالکل سچی اور کھری رائے دی تھی جس کا احساس مجھے بعد میں ہوا۔ پھر میں نے اس کام سے توبہ کر لیا اور بھٹ صاحب سے معذرت کر لی۔ وہ خوش ہوئے اور کہا کہ آپ میں اتنی جرأت و ہمت ہے یہ سچ بات محسوس کر سکے۔ یہاں اُردو کا ہر کام ہر ادیب کرنے کو تیار ہے۔ کام بعد میں کرتا ہے معاوضے کا مطالبہ پہلے کرتا ہے۔ آپ کی ایمان داری مجھے پسند آئی اس لیے آپ میرے لیے ضرور کوئی کام کریں۔ کونسل اُردو کے گیان پیٹھ ایوارڈ یافتگان کا کلیات شائع کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ اس میں ایک نام علی سردار جعفری کا ہے۔ آپ تو ترقی پسند ہیں۔ جعفری کا کلیات آپ ہی ترتیب دیجیے، نظم و نثر سب۔ سلطانہ جعفری سے اجازت دلوانے کا کام بھی آپ کو کرنا ہوگا۔ اجازت بھی مل گئی۔ دو جلدیں بھی چھپ گئیں باقی زیرِ طبع یا زیرِ ترتیب ہیں...غور کیجیے کیا ان کاموں کا سہرا خاں صاحب کے صحیح مشوروں سے جا کر نہیں ملتا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو کچھ دوسرے ہی مشورے دیتا۔ یہ تھے ہمارے خاں صاحب۔ جس کو چاہتے ٹوٹ کر چاہتے۔ سچے مشوروں اور ہدایت سے نوازتے۔ ان کے مشورے، ان کی باتیں سونے میں تولے جانے والی ہوتیں، ان کا صداقت بھرا اظہار، ان کا عاجزانہ بھرا اعتراف، ان کی عرق ریزی، ان کی ایمان داری، ان کی حق گوئی، زریں حروف میں لکھے جانے والے واقعات ہیں جو اس دور میں کمیاب ہی نہیں نایاب ہیں۔ اس دور میں سچی کھری اور ایمان دارانہ باتیں اب کہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

غالب صدی کے موقعے پر میں نے 'نیا سفر' کا غالب گوشہ نکالنے کا ارادہ کیا۔ خاں صاحب سے گزارش کی، جواب آیا:

''غالب پر مضمون ضرور لکھوں گا۔ وعدہ کیا ہے تم سے۔ مگر جب تم غالب پر نمبر نکالو گے یا وہاں کسی مذاکرے کا انتظام کرو گے۔ اب کچھ لکھنے کے لیے کسی تقریب یا بہانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ سارا وقت تو اصل کام یعنی 'سحر البیان' کی تدوین میں لگ جاتا ہے۔ بمبئی میں بھی اسی کام میں لگا رہا۔ دو سال ہو گئے ہیں اور ابھی شاید ڈیڑھ سال اور لگے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا اس کا احوال معلوم نہیں۔ شاید پھر کچھ نہ ہو۔ عقیل صاحب سے میرا سلام کہو۔ ان کو کبھی کبھی ضرور یاد کرتا ہوں۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔

رشید حسن خاں

11 مارچ 1998''

ان کا مضمون نہیں مل سکا بہر حال گوشہ نکلا تو اس میں میرا مضمون تھا 'غالب اور سیکولرزم' جس کے عنوان سے ہی چونکے پورا مضمون پڑھ کر دو تین جملوں کا ایک خط لکھا:

''اس عنوان کے تحت تم نے حیرانی میں ڈال دیا۔ یہ نیا گوشہ نکالا تم نے مضمون اچھا ہے۔ مبارک باد قبول کرو۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔''

بلا شبہ خاں صاحب ایک بڑے محقق تھے۔ بڑے ادیب تھے۔ میں ان کے معیارِ تحقیق کے بارے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا یہ میرا میدان نہیں ہے۔ پتا نہیں کیسے ایک بار جانے کس رو میں ایک مضمون ''تحقیق کی محرومیاں' لکھ گیا، مضمون 'نیا دور' لکھنؤ میں شائع ہوا۔ مضمون پڑھنے کے بعد خاصے ناراض ہوئے۔ ناراض تو خلیق انجم بھی ہوئے اور آیندہ اس نوع کے مضامین نہ لکھنے کی تاکید کی۔ کئی اور ہوتا تو ان حضرات کی ناراضگی سے ناراض ہو جاتا لیکن میرے ناراض ہونے کا سوال ہی نہ تھا وہ بھی خاں صاحب سے جن کی شفقتوں، مہربانیوں تلے میں دبا ہوا ہوں اور تا زندگی دبا رہوں گا۔ خوش نصیب ہیں وہ خود جنھیں ایسے بزرگوں کی صحبتیں ہی نہیں دعائیں بھی ملی ہوں۔

میرے لکچرر سے ریڈر بننے میں دیر ہو رہی تھی۔ دیر کی وجہ 'ہماری زبان' میں تین قسطوں والا مضمون تھا۔ خاں صاحب کو میری ترقی کی بے حد فکر تھی لیکن وہ یہ کہتے تھے کہ حق بات کہنے میں خسارہ تو ہوگا اس کی پروانہ کرو تم بہت جلد پروفیسر بھی ہو گے۔ جب فلاں فلاں ہو سکتا ہے تو تم کیوں نہیں۔ جب میں ریڈر ہو گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ یہ بات بھی میں نے دہلی میں بتائی تو گلے سے لگا لیا۔ لیکن جب پروفیسر ہوا تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ کاش کہ وہ کچھ دن اور جی لیتے۔ میرا پروفیسر ہونا کوئی ادبی واقعہ نہیں ہوتا لیکن ذاتی طور پر خاں صاحب کے حوالے سے میرے لیے ضرور تھا، کیوں کہ وہ میرے لیے ایسے ہی تھے جیسے اپنے خان دان کا کوئی چچا بالکل اپنا، ترقی سے خوش ہونے والا ، دعائیں دینے والا، بات بات پر 'جیتے رہیے' کہنے والا۔ انھوں نے بعض معاملات میں میری بڑی تربیت کی۔ معاونیت کی جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ ان سے ہر بار ملنا ایک خوش گوار احساس اور تجربہ ہوتا تھا اور اپنائیت و توانائی کا احساس ہوتا۔ ان کے چلے جانے سے ادبی دُنیا میں ایک محقق، ادیب اور دانش ور کا جانا تو ہے ہی، میرے لیے ایک مشفق ، مہربان بزرگ اور رہنما کا چلا جانا ہے۔ میرا ذاتی نقصان ہے۔

انھوں نے داستانیں ترتیب دیں، انھوں نے مثنویاں ترتیب دیں جہاں تکلف، تصنع، مبالغہ اور جھوٹ ہوا کرتا ہے لیکن خاں صاحب ان سب سے کوسوں دور تھے۔ وہ ایک زندہ حقیقت تھے ایک بڑی صداقت اور میرے لیے ایک بہت بڑی طاقت اور ایک شجر سایہ دار:

رہتے تھے داستانوں کے ماحول میں مگر
کیا لوگ تھے کہ جھوٹ کبھی بولتے نہ تھے

(ماہ نامہ ''سب رس'' حیدر آباد، مدیر مغنی تبسم، صفحہ 3 تا 12، جنوری 2007)

(رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے، مرتبین ڈاکٹر محمد اشرف، جاوید رحمانی، مکتبہ الحرا، در بھنگا، اشاعت 2008، صفحہ 101 تا 117)

OOO

بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد
رشید حسن خاں کی شخصیت کے چند پہلو

ارجمند آرا

میرا یہ منصب نہیں کہ محقق، نقاد اور بہترین اُستاد رشید حسن خاں کی علمی بصیرت اور ادبی فتوحات، پر مضمون لکھوں۔ البتہ اپنے طالب علمی کے دور میں اور بعد میں بھی، ان سے جو رہنمائی، توجہ اور شفقت اس کی طرف کچھ واقعات اور کچھ خطوط کی مدد سے اشارہ کر کے ان کی شخصیت کے چند پہلوؤں کا عکس اُتارنے کی کوشش کروں گی۔ اس کے علاوہ میں نے ان کے تئیں اپنے تئیں اپنے شعبے کے رفقائے کار کے جو رویے دیکھے، دوسرے لوگوں سے ان کے بارے میں جو کچھ سنا اس کی بنیاد پر یہ دیکھنے کی بھی کوشش کروں گی کہ اُردو دُنیا کے لیے اُس 'علمی' حلقے میں خاں صاحب کی امیج کیا ہے جسے یونی ورسٹی کی دُنیا کہتے ہیں۔ خاں صاحب کے ساتھ میرا رشتہ اُستاد شاگرد کا سا رہا ہے، حالاں کہ رسمی طور پر وہ

میرے اُستاد نہیں تھے۔ لیکن یہ رشتہ اس سے بھی بڑھ کر تھا اور وہ اتنا ہی خیال کرتے تھے جتنا اپنے بچوں کا کرتے رہے ہوں گے۔ اس لیے یہ میرا فرض بھی ہے اور مجھ پر ان کا قرض بھی کہ خاں صاحب کی شخصیت کے بارے میں اپنے محسوسات اور تاثرات میں ان کے مداحوں کو بھی شریک کروں۔ اس کوشش میں اگر کوئی کمی رہے تو اس کو میرا عجزِ بیان سمجھا جائے، خاں صاحب کی شخصیت کا سقم نہیں۔

اس عالمِ رنگ و بو سے رشید حسن خاں کو رخصت ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا (جس میں انھوں نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ، اپنی زندگی میں بھرپور دل چسپی لی اور اسی طرح بسر کی جس طرح غالب نے کی تھی۔ لیکن ان کے دب دبے کا آج بھی یہ عالم ہے کہ ہر ہر لفظ پر قلم رُک رہا ہے کہ اب گرفت ہوئی، بس اب گرفت ہوئی۔ اچھی طرح معلوم ہے کہ خاں صاحب کا نہ تو اب کوئی خط آنے والا ہے، نہ فون پر رابطے کا امکان ہے اور نہ ہی ملاقات کا... اور یوں میرا ہر لفظ ان کی گرفت سے آزاد ہے مگر پھر بھی....!

خاں صاحب سے ملاقات سے پہلے میں نے ان کی چند کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ 'ادبی تحقیق: مسائل و تجزیہ' لفظ بہ لفظ 'تلاش و تعبیر' کے چند مضامین، 'باغ و بہار' اور 'فسانۂ عجائب' کا ان کا مرتب کردہ پورا متن۔ حواشی اور ضمیمے لغت کی طرح سے حسبِ ضرورت دیکھے تھے۔ ان کی علمی بحثوں کو مکمل طور پر پڑھنے اور سمجھنے کا نہ تو مجھ میں صبر تھا اور نہ استطاعت۔ 1992 میں جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں ایم۔ اے کی طالب علم کے طور پر داخلے سے پہلے میں ان کی کئی کتابیں پڑھ چکی تھی۔ غالباً دوسرے سیمسٹر میں ہم کو ایک ٹرم پیپر لکھنے کے لیے دیا گیا تھا جس میں سبھی طالب علموں کو فیض کے مجموعۂ کلام 'سرِ وادیِ سینا' پر تبصرہ لکھنا تھا۔ فیض کی شاعری مجھے یوں تو بہت پسند تھی لیکن شاعری پر لکھنے کے لیے اس کا صرف پسند یا ناپسند ہونا کافی نہیں ہوتا۔ چناں چہ ضروری تھا کہ میرے پاس شاعری کو پرکھنے کے کچھ اصول اور کچھ معقول دلیلیں ہوں۔ چناں چہ تبصرہ کرنے سے پہلے سوچا کہ فیض کی شاعری پر چند مضامین پڑھ لیے جائیں تاکہ ذہن میں ایک خاکہ مرتب کیا جا سکے۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ کون کون سے مضامین پڑھے تھے لیکن ان میں خاں صاحب کا وہ مضمون بھی شامل تھا جس میں انھوں نے فیض پر بڑھ بڑھ کر حملے کیے ہیں۔ یہ مضمون میرے نزدیک جرأت مندانہ تھا اور مدلل بھی۔ اندھے کو کیا چاہیے، دو آنکھیں۔ میرے ذہن میں مضمون نویسی کا جو ایک دقیانوسی تصور تھا کہ پہلے خوبیاں گنواؤ، پھر خامیوں کی طرف اشارہ کرو، اس کے لیے مجھے لائن مل گئی۔ میں نے خاں صاحب سے تحریک پا کر انھی کے سے انداز میں 'سرِ وادیِ سینا' میں نامانوس الفاظ، اجنبی تراکیب، دور از کار تشبیہوں اور استعاروں کی فہرست بنا ڈالی اور فیض کی زبان میں خوب مین میخ نکالی۔ ٹرم پیپر خورشید انور نے چیک کیا جو ان دنوں جے این یو میں عارضی طور پر اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ خورشید نے جے این یو ہی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی۔ ڈاکٹر اسلم پرویز کی نگرانی میں۔ وہ سی پی آئی کی طلبہ تنظیم آل انڈیا اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے بڑے سرگرم رکن تھے اور پارٹی ممبر بھی تھے۔ یوں ان کی بنیادی تربیت میں طلبہ سے فاصلہ بنانا شامل ہی نہیں تھا اور ہم طالب علموں کے ساتھ وہ اور ان کی بیگم، میناکشی سوندریال خاصے گھل مل کر رہتے تھے (میناکشی جے این یو ہی میں ہسپانوی زبان پڑھاتی ہیں)، ایک دن گوداوری ہوسٹل کے بس اسٹاپ سے 615 نمبر کی بس میں چڑھتے ہی خورشید سے ملاقات ہو گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد پوچھنے لگے، فیض کی شاعری پر کس کس کے مضمون پڑھے تھے؟ میں ان کا منشا سمجھ گئی اور پہلے ہی جملے میں اقرار کر لیا کہ رشید حسن خاں صاحب کا مضمون بھی پڑھا تھا۔ ''ہوں!'' ایک لمبی سی ہنکار، اور پھر، ''اتنی Damaging چیزیں پڑھنے کی ابھی تمھاری عمر نہیں ہے، اور اتنی قطعیت کے ساتھ دعوے کرنا تو بالکل مناسب نہیں۔'' میں شرمندہ ہو گئی۔ واقعی رشید حسن خاں کی نقل کرنا، جو علم کا سمندر ہیں، مجھ ایسی طالب علم کو کہاں زیب دیتا تھا۔ میں نے پڑھا ہی کیا تھا؟

انھیں دنوں (ایم اے کے دوسرے سال میں) ہمارے شعبے (ہندوستانی زبانوں کا مرکز) نے خاں صاحب کے تین خصوصی لیکچر علمِ بیان پر رکھے۔ اس سے قبل میں ان سے ان کی رہایش گاہ پر مل چکی تھی، اپنے دوست اطہر فاروقی کی وساطت سے۔ اطہر کا ان کے ساتھ نیاز مندانہ رشتہ برسوں پرانا تھا۔ خیر جے این یو میں ان کے لیکچر ہوئے۔ تین دن میں تین گھنٹے کی یہ کلاسیں مجھے کم از کم تین برسوں کے مطالعے کا نچوڑ لگیں۔ ایم فل کے زمانے میں بھی انھوں نے تحقیق اور تدوینِ متن پر بھی لیکچر دیے۔ ان کے یہ لیکچر میرے ذہن پر ایک ایسے اُستاد کا نقش مرتسم کر گئے جس سے تعلیم حاصل کرنے کی بس حسرت ہی رہ جاتی ہے۔ بہت تھوڑے عرصے کے لیے ہی سہی، ان کی تدریس سے فیض اٹھانے والے طلبہ زندگی بھر ان کے ممنون کرم رہیں گے۔

ایک بار جو خاں صاحب سے شاگردی کا رشتہ استوار ہوا تو گویا عمر بھر کے لیے میں ان کی دست نگر ہو گئی۔ ایم فل کا موضوع انھوں نے طے کرایا اور بنیادی مواد فراہم کیا۔ میرے نگراں، مشفق اُستاد اسلم پرویز تھے۔ ان دونوں نے مل کر گویا طے کر دیا کس موضوع پر اور کن خطوط پر کام کرنا ہے۔ یہی طریقہ پی ایچ ڈی کے لیے بھی اختیار کیا گیا۔ کون کون سی کتابیں پڑھنی ہیں، کون کون سی لائبریریاں مفید ہوں گی، نوٹس کس طرح لینے ہیں۔ مہینے دو مہینے میں خاں صاحب سے ضرور ملتی۔ وہ کام کی رفتار کا جائزہ لیتے اور مشورے دیتے۔ اچھا کام کرنے کے لیے حوصلہ بڑھاتے اور نصیحتیں کرتے۔ میں ان سے ملنے کے لیے اکثر دہلی یونی ورسٹی کے گائر ہال جاتی تھی۔ گائر ہال ویسے تو ریسرچ کے طالب علموں کا ہاسٹل ہے لیکن اس کا ایک حصہ انیکسی کی طرح ہے جس کے دس کمرے اساتذہ اور ریسرچ ایسوسی ایٹس کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ حصہ ٹیچرز کورٹ کہلاتا ہے۔ جن دنوں میں نے گائر ہال جانا شروع کیا، خاں صاحب اسی کے نو نمبر کمرے میں رہتے تھے۔ بعد میں (غالباً 1995 میں) جب وہ اپنے آبائی وطن شاہ جہاں پور چلے گئے تو ایک عرصے تک یہ سلسلہ رہا کہ وہ جب بھی دہلی آتے اسی کمرے میں ٹھہرتے رہے۔ ان دنوں یہ کمرہ دہلی یونی ورسٹی میں تاریخ کے اُستاد سید ظہیر حسین جعفری کے تصرف میں تھا۔ وہ روایت کے ایسے پاس دار تھے اور اس قدر محتاط رہتے کہ خاں صاحب کے پرانے معمولات میں کسی طرح سے مخل نہ ہوتے۔ رشید صاحب کے آنے کے بعد جعفری صاحب اپنے ہی گھر سے ایسے غائب ہو جاتے گویا وہی عارضی منتظمِ خانہ ہوں اور اب صاحبِ خانہ کے آنے کے بعد وہاں ان کا کوئی عمل دخل نہ رہا ہو۔ اس طرح خاں صاحب غالباً سنہ 1999 یا

2000 تک گائر ہال ہی میں ٹھہرتے رہے۔ جب اسلم پرویز صاحب نے اپنے مکان میں ایک مہمان خانہ تعمیر کرا لیا تو خاں صاحب ان کے مکان واقع ترک مان گیٹ ٹھہرنے لگے۔ اسلم صاحب نے یہ مہمان خانہ بطورِ خاص خاں صاحب کی پریشانیوں اور سہولتوں کے مدنظر بنوایا تھا۔

خیر یہ تفصیلات ضمنی تو تھیں لیکن بتانی بھی ضروری تھیں۔ ذکر تھا گائر ہال کا۔ خاں صاحب عموماً صبح کے وقت ملاقات کے لیے بلاتے تھے۔ اکثر اطہر فاروقی کو بھی بلاتے۔ ہم دونوں نو بجے تک وہاں پہنچ جاتے۔ خاں صاحب نہائے دھوئے، پینٹ بش شرٹ میں ملبوس، سینڈل یا جوتا پہنے بالکل تیار ملتے۔ ناشتے کے لیے اپنے ساتھ میس میں لے جاتے۔ میس میں ان کی کرسی پر کوئی نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ اپنی مخصوص جگہ جا بیٹھتے اور بیرا فوراً ہی پورے احترام کے ساتھ موجود ہوتا۔ جتنی دیر تک خاں صاحب میس میں ہوتے مجھ کو ایک مخصوص رعبیلی فضا کا احساس رہتا۔ ناشتے سے لوٹ کر کام کی باتیں ہوتیں۔ اسی ملاقات میں اگلی ملاقات کا وقت بھی طے کر دیتے یا پھر اسلم صاحب کی وساطت سے یا اطہر فاروقی کے ذریعے کہلوا دیتے کہ آیندہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت ملو اور کام دکھاؤ۔ گویا مقالہ لکھنا میری ذمہ داری نہ ہو بل کہ خاں صاحب خود ریسرچ کر رہے ہوں۔

خاں صاحب کا کام کرنے کا اپنا انداز اور مزاج، بل کہ سخت ڈسپلن اور محنتِ شاقہ کے عادی، اور میں عام سی طالب علم جس کی ریسرچ میں بس واجبی ہی سی دل چسپی تھی۔ سوجھیلے جوتھے زندگی کے۔ مجھے کیمپس کے اسٹوڈنس پالیٹکس میں بھی دل چسپی تھی، احتجاجی اور سیاسی مظاہروں میں نعرے بھی لگانے ہوتے تھے، سیاسی جلسوں میں شرکت بھی ضروری سمجھتی تھی، یونین کے الیکشن میں پوسٹر بھی چپکانے ہوتے تھے، اپنی تنظیم کے اُمیدواروں کے لیے ہر ہوسٹل اور میس میں جا کر ووٹ مانگنی بھی ہوتی تھی اور دوستوں اور دوستیوں کے مطالبات بھی اپنی جگہ تھے۔ ایسے میں ریسرچ ویسرچ کا کام کتنی سنجیدگی سے ہوسکتا تھا، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چناں چہ حال یہ تھا کہ خاں صاحب میرے پیچھے۔ پیچھے۔ کبھی یاد دہانی، کبھی تنبیہہ، کبھی حوصلہ افزائی، کبھی ناراضگی۔ خاں صاحب جب شاہ جہاں پور چلے گئے تو ان سے ملاقاتیں تو کم ہوگئیں لیکن اب باقاعدہ خط و کتابت کے ذریعے وہ میری رہنمائی کرنے لگے، بل کہ گارجین کی طرح ہر وقت میرے کام کا حساب رکھنے لگے۔ چناں چہ اس زمانے کے ان کے جو خطوط میرے پاس محفوظ ہیں (جو تعداد میں کم از کم پچاس ساٹھ ہیں)۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کام کے معقول رفتار سے آگے نہ بڑھنے کے نئے نئے جواز میں ان کو لکھتی رہتی تھی۔ وہ کچھ دن صبر کرتے، برداشت سے کام لیتے اور پھر سخت جھلا جاتے۔ لیکن پھر سنبھلتے اور سمجھاتے کہ دیکھو ہانڈی چولہا تمھارے بس کا رہا نہیں، اس کے مقابلے میں تحقیق آسان کام ہے، سو وقت گنوائے بغیر کر ڈالو۔ میں سعادت مندی سے اور سچے دل سے ڈسپلن قائم کرنے کا وعدہ کرتی، اس پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کا عزم بھی کرتی لیکن غالباً کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہوگی جو گاڑی پھر سے پٹری سے اتر جاتی تھی۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ مسلسل کام نہ کرنے کی کیا وجہیں میں ان کو لکھتی تھی لیکن ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ میں نے ان کو پریشان بہت کیا۔ پھر سچ یہ ہے کہ وہ جس رفتار سے مجھ سے کام لینا چاہتے تھے، وہ ہماری نسل کے طالب علموں کی استطاعت سے باہر تھا۔ اس ضمن میں چند خطوط سے اقتباسات پیش کروں گی جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس کسی طالب علم میں وہ ذرا بھی صلاحیت محسوس کرتے، اس کو پڑھنے لکھنے کی راہ پر لگانے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ علم و ادب کے فروغ سے ایسی دل چسپی رکھنے والا استاذ اور اُردو کے سرمایے کو محفوظ کرنے کی ایسی لگن اور اُردو کی بقا کے لیے ایسا درد رکھنے والا مجاہد شاید ہی کوئی پیدا ہو۔ 11 ستمبر 1996 کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''تمھارا خط ملا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ اب تک بہت کچھ کرتی رہی ہو، یعنی کچھ کام نہیں کیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تم کو کام نہ کرنا آتا ہے۔ یہ بڑی صفت ہے، سب کو نہیں ملتی..... میں 16 ستمبر کو دہلی میں ہوں گا مگر اسی دن بمبئی روانہ ہو جاؤں گا..... بمبئی سے واپس آکر اپنے حاضری کے رجسٹر سے تمھارا نام کاٹنے پر غور کروں گا۔ اسلم صاحب سے دہلی میں میں نے 6 ستمبر کو فون پر بات کی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ تمھارا خانہ اب تک خالی ہے کام کے لحاظ سے۔ یوں مجھے صورتِ حال کا زیادہ علم ہوسکا۔''

میں نے اس خط کا جواب گھبرا کر شتم پشتم دیا ہوگا، بمبئی کے پتے پر۔ ڈسپلن میں رہنے کا وعدہ بھی کیا ہوگا اور کچھ مجبوریاں بھی بتائی ہوں گی کیوں کہ اس کے جواب میں جو خط انھوں نے بمبئی سے 30 ستمبر کو بھیجا اس کا موڈ مختلف ہے، اس میں انھوں نے پی ایچ ڈی کے ایک باب کے لیے بہت سی کتب کے حوالے لکھے، اس کی نہج کا تعین کیا اور وقت بھی طے کر دیا کہ ایک مہینے میں یہ باب ختم کرلو۔ مگر میرے مزاج کو جتنا جانتے تھے، اسی حساب سے آخر میں نصیحتیں بھی کر ڈالیں:

> ''ایک بات سمجھ لو۔ اس بار کاہلی یا مصروفیت کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہو سکے گا۔ رات تھوڑی ہے اور سوانگ بہت۔ دل لگا کر کام کرو اور پیر توڑ کر بیٹھو۔ آنکھوں کا تیل ٹپکائے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ باقی فرائض ادا کرنے کی عمر پڑی ہے۔ مثل مشہور ہے: موچی کو عرش پر بھی بے گار ہی کرنا ہوگی۔ وہی احوال ان سب مسلمان لڑکیوں کا ہے جن کا تعلق چھوٹے شہروں یا علاقوں سے ہے؛ مشقِ سخن بھی اور چکی کی مشقت بھی؛ اسی لیے اس سلسلے میں مناجاتِ بیوہ قسم کی فریاد بے کار ہے۔ اس کا کچھ حاصل نہیں۔''

اس کے جواب میں نے ان کو مقالے کا خاکہ اور غالباً کچھ صفحات روانہ کر دیے تھے۔ خاں صاحب جب بمبئی سے 25 اکتوبر کو دہلی لوٹے تھے اور 26 کی صبح انھوں نے مجھے گائر ہال بلایا تھا۔ اس کے ان سے سے اگلی ملاقات 5 دسمبر کو اُردو گھر میں ہوئی اور پھر دسمبر ہی کے آخری عشرے میں بھی جب وہ غالب سمینار کے موقع پر غالب انسٹی ٹیوٹ آئے۔ اس دوران میں نے کچھ نہ کچھ کام ضرور کیا ہوگا کیوں کہ اپریل 1997 تک ان کا کوئی تنبیہی خط مجھے نہیں ملا۔ ان دنوں ویسے خاں صاحب بھی بیمار تھے اور میرے والد بھی، جس کی وجہ سے میں تقریباً ہر ہفتے یا دو ہفتے میں، دو دن کے لیے گھر چلی جاتی تھی۔ خاں صاحب کے ٹسٹ بمبئی میں ہو رہے تھے اور علاج بھی، جس کے لیے انھیں بار بار بمبئی

جانا پڑتا تھا۔ جولائی 96 میں وہ بمبئی تھے، پھر ستمبر میں گئے اور اکتوبر میں لوٹے۔ ڈاکٹر نے دواؤں کا چھ مہینے کا کورس تجویز کیا تھا۔ مئی یا جون 1997 میں ان کو پھر جانا پڑا۔ فروری، مارچ 1998 کا عرصہ انھوں نے بمبئی میں گزارا اور پھر اگست، ستمبر 1998 میں ایک بار پھر ان کے بہت سے چیک اپ ہوئے۔ ریڈیو گرافی، سی اے ٹی اسکین، خون کے کئی طرح کے ٹسٹ اور نہ جانے کیا کیا الم غلم جس میں ان کے ہزاروں روپے خرچ ہوئے۔ 19 اپریل 1997 کو شاہ جہاں پور سے لکھا:

''...تمھاری قدر تمھاری ذہانت کی بنا پر کرتا ہوں۔ تمھاری جذباتیت کی یوں قدر کرتا ہوں کہ ایسا شخص اور جو بھی ہو، منافق نہیں ہوسکتا اور یہ صفت اب کم یاب ہے...بس ذرا سی بات یہ ہے کہ تم میں استقامت کی کمی ہے۔ اگر تم ایک بار اس صفت کو پیدا کرلو تو تمھارا کام بہ آسان ہوسکتا ہے۔ عارضی طور پر ہی سہی، دل کو ذرا سخت کرلو اور آنکھوں کو بے نم۔ رونا محرم زدہ لوگوں کو راس آتا ہے، تم کو کیوں راس آئے...۔ میرا دہلی آنا ذرا سا وقت طلب ہے۔ آؤں گا تو ضرور مگر ایک دہ ماہ کے بعد، جب تم یہ لکھوگی کہ تم نے سو صفحے مکمل کر لیے ہیں۔ جب تک نہیں لکھوگی، ادھر کا رُخ نہیں کروں گا۔ اگر آؤں گا بھی تو تم کو مطلع نہیں کروں گا۔ جب تم میری بات نہیں مانتی ہو تو میں تمہاری بات کیوں سنوں اور کیوں مانوں۔ جب تم خط لکھوگی، تو خواہ ہاں کوئی کام ہو یا نہ ہو، میں دو چار دن کے لیے آ جاؤں گا، ضرور آؤں گا...تم اگر یہ چاہتی ہو کہ مجھے تمھاری طرف سے تکلیف پہنچے اور میرا دل دکھے، تو ٹھیک ہے کام نہ کرو۔ اگر نہیں چاہتی ہو تو کام میں لگ جاؤ۔''

یہ وہ دن تھے جب میرے والد زیادہ ہی بیمار تھے چناں چہ کام پھر رکا رہا۔ کچھ اپنی الجھنوں کے سبب اور کچھ خوف کے مارے میں نے خاں صاحب کو خط لکھنا بھی چھوڑ دیا۔ غالباً اسی سے پریشان ہو کر انھوں نے 30 جون 1997 کو لکھا: ''تم کہاں کھو گئی ہو؟ کیا پولس میں گم شدگی کی رپورٹ لکھانا ہی ہوگی۔ کام نہ کرو خط تو لکھو۔'' خدا خدا کر کے اپریل 1998 تک میں نے دیوانِ بیان کی تدوین کا خاصا کام نمٹا لیا اور مقدمے کے تین ابواب خاں صاحب کے ملاحظے کے لیے بھیج دیے۔ دیوانِ بیان کا تصحیح شدہ متن بھی آخر تک بھیج دیا جو چار خطی نسخوں کی مدد سے تیار کیا گیا تھا۔ ایک بہت ہی ناقص مطبوعہ نسخہ بھی عبرت کے لیے میرے سامنے تھا۔ ثاقب رضوی کا مرتبہ یہ نسخہ تدوین متن کی بدترین مثال تھا اور رشید صاحب کا خیال تھا اگر یہ کام سوویت یونین میں ہوا ہوتا تو اس کے مرتب کو ضرور سائبیریا بھیج دیا جاتا۔ اگست میں خاں صاحب بمبئی میں قیام پذیر تھے۔ وہیں انھوں نے یہ تمام کام چیک کیا اور ستمبر کے پہلے ہفتے میں واپس بھیج دیا۔ لیکن انھیں دنوں ایک بڑا سانحہ یہ ہوا کہ میرے والد 17 ستمبر 1998 کو فوت کر گئے اور اس غم نے پھر سے میرے دل کو ریسرچ کے کام سے اچاٹ دیا۔ والد کے انتقال کے چند مہینے بعد، فروری 1999 میں مجھے قومی اُردو کونسل میں ماہنامہ ''اُردو دُنیا'' کی ادارت کا کام مل گیا اور ایک بار پھر زندگی معمول کی طرف لوٹنے لگی۔ میں نے نوکری کی اطلاع دیتے ہوئے خاں صاحب کو دفتر کے کام کاج میں زیادہ مصروف ہو جانے کے بارے میں ضرور لکھا ہوگا کیوں کہ 25 فروری 1999 کے اپنے خط میں انھوں نے لکھا: ''آج ہی تمھارا خط ملا۔ یہ پڑھ کر اطمینان ہوا اور مسرت بھی کہ تم کو زیادہ کام دیا گیا ہے۔ یہ قاعدہ ہے سدا کا کہ گریز پا قیدی کو ہتکڑیوں کے ساتھ بیڑیاں بھی پہنائی جاتی ہیں۔'' بہر حال خاں صاحب نے مزید ابواب کا تقاضا نہیں کیا۔ میں بھی دفتر کا کام کاج سیکھنے میں بے طرح مصروف ہو گئی۔ مارچ میں خاں صاحب نے دو خط لکھے، میں نے جواب نہیں دیا، وجہ یاد نہیں۔ انھوں پریشان ہو کر تیسرا خط لکھا 25 مارچ کو۔ ان کا اگلا خط یکم مئی کو بمبئی سے ملا جس میں 21 مئی کو دہلی پہنچنے کی اطلاع دی گئی تھی۔ اسی دن ان کو شاہ جہاں پور کے لیے دوسری ٹرین سے روانہ ہونا تھا۔ میں ملنے کے لیے ضرور گئی ہوں گی کیوں کہ یہ معمول بن گیا تھا کہ اگر خاں صاحب دہلی سے گزریں اور چند گھنٹے کا وقت ان کے پاس ریلوے اسٹیشن پر گزارنے کے لیے ہو تو میں ان سے ملنے ضرور چلی جاتی تھی۔ اپنے آنے کی اطلاع وہ خواہ اطہر کو دیں یا مجھے۔ خیر پی ایچ ڈی کے کچھ ابواب میں نے ان کو ستمبر 1999 میں، کچھ جنوری 2000 میں اور آخری باب جون تک بھیج دیا۔ 24 جنوری کے اپنے خط میں انھوں نے لکھا: ''آج تمھارا پیکٹ ملا۔ تم نے بہت اچھی عبارت لکھی ہے۔ میرا جی خوش ہوا۔ سب کام کی باتیں ہیں، فضول بات کوئی نہیں۔ حوالے بھی سب مناسب ہیں۔ اب جلدی سے اس کا دوسرا حصہ بھیجو، جو آخری حصہ ہوگا۔'' 28 جنوری تک ان کو دوسرا پیکٹ بھی مل چکا تھا۔ انھوں نے خوش ہو کر لکھا: ''تم تو اب واقعی کام کرنے لگی ہو۔ خدا برکت دے اور مزید توفیق بھی کہ تم 'اجے چند نامہ' بھی اسی طرح مکمل کرلو۔ تین بار آمین کہو''۔ اور اس طرح خدا خدا کر کے پی ایچ ڈی کا کام ختم ہوا۔ سارا کام ٹائپ کرا کے ہی بھیجتی تھی، یوں تصحیح کرا کے کے اسلم صاحب کو دکھانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ کام میں جو کمزوری اور کمیاں رہ گئیں تھیں انھیں اسلم صاحب کے مشوروں کے مطابق درست کر کے ڈگری کے لیے جمع کر دیا۔

اس کے بعد میں نے تدوین کے کسی کام کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں کی۔ خاں صاحب مشورے دیتے رہے کہ فلاں کام کرلو یا پھر فلاں کام، آسانی سے ہو جائے گا، سارے سورسیز لکھ بھیجوں گا، وغیرہ۔ مگر اب میں کہاں ان کے جھانسے میں آنے والی تھی، سو نسبتاً آسان کام پکڑ لیا یعنی ترجموں کی طرف متوجہ ہوئی۔ خط و کتابت بھی بس واجبی سی رہ گئی کیوں کہ اس کی جگہ اب فون لے چکا تھا۔ فون کا کوئی رکارڈ تو ہوتا نہیں، باتیں بھی یاد نہیں رہتیں۔ سو ان دنوں کی یادیں بڑی دھندلی دھندلی سی ہیں۔ اُردو کونسل کی نوکری چھوڑ کر جب نومبر 2002 میں دہلی یونی ورسٹی میں اُردو پڑھانے کا کام ملا تو اس کی اطلاع بھی فون پر ہی دی۔ جے این یو کے اپنے سابق اُستاد، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کی عیادت کے لیے جب دسمبر میں لکھنؤ گئی تو پھر خاں صاحب سے ملنے کے لیے شاہ جہاں پور کا بھی پروگرام بنا لیا۔ ان دنوں خاں صاحب زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) مرتب کر رہے تھے اور غالب کی فرہنگ پر بھی کام کر رہے تھے۔ ان کے گھر دو دن کے قیام کی یادیں آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ ان کی دونوں بہوئیں بے حد محبت سے ملیں۔ انھوں نے ہر طرح سے آرام کا خیال رکھا۔ شام کو ہم لوگ خاں صاحب کی اجازت سے شاہ جہاں پور کے ایک معروف پارک (نام تھا غالباً شہید پارک) گھومنے گئے۔ اجازت لینے کا کام ان کے

پوتے سعود کو سونپا گیا جو اس وقت چھے سات برس کا بڑا ہی شریر قسم کا پیارا سا بچہ تھا۔ خوب چاٹ پکوڑے کھائے گئے۔ بچے اپنے جیب خرچ سے میری تواضع کرنا چاہتے تھے، سو کی۔ بڑا لطف آیا، اور یہ سوچ کر اور زیادہ مزہ آیا کہ خاں صاحب نے بچوں پر بھی ویسے ہی رعب جما رکھا ہے جیسے وہ ہم جیسے نیاز مندوں پر جماتے ہیں۔ لیکن میں نے گھر میں دیکھا کہ وہ اپنی بیٹھک میں بیٹھ کر کام کرتے ہوئے ہر بات سے بے نیاز ہونے کا بہانہ ضرور کرتے ہیں۔، بچوں کی شرارتوں سے چشم پوشی کرتے نظر آتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ انھیں اپنے علمی کاموں کے علاوہ کسی چیز سے کوئی دل چسپی نہیں۔ لیکن اپنی بے نیازی اور لاپرواہی کے پیچھے میں نے ان کو چپکے سے مسکراتے ہوئے دیکھا، اپنی پوتیوں اور پوتے کے لیے ان کی آنکھوں میں بے پناہ محبت دیکھی اور فخر اور خوشی کا احساس۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ سعدیہ اور صدف اپنے دادا کی اس قدر کیوں گرویدہ ہیں، سعود کیوں اس قدر خودسر اور شرارتی ہے اور ساری ضدیں دادا سے پوری کراتا ہے، ان کی بہوئیں کیوں پاپا کے آگے پیچھے گھومتی ہیں اور ان کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہنا چاہتی ہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ اپنی آل اولاد سے خاں صاحب کو بہت محبت ہے لیکن اس کی شدت اور رشتوں کی مضبوطی کا احساس ان کے گھر میں رہ کر ہی ہوا۔ خیر شاہ جہاں پور سے بہت سی محبتیں سمیٹ کر میں دہلی واپس لوٹی۔ خاں صاحب نے زٹل نامے کے پروف بھی لے کر آ گئی کہ پہلا پروف میں پڑھ دوں گی تا کہ وہ اتنے دنوں میں کوئی دوسرا کام کر لیں۔ ان دنوں خاں صاحب غالب کی فرہنگ پر کام کر رہے تھے۔ ہزار ہا کارڈ تیار تھے۔ یہ سب کام بھی انھوں نے مجھے دکھایا۔ ان کے سامنے جتنے منصوبے تھے، اتنی عمر نہیں تھی، اور اس کا انھیں اچھی طرح احساس تھا۔ اس لیے وہ اپنے وقت کا ہر لمحہ صرف اور صرف اہم ترین کاموں کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے۔ شاہ جہاں پور سے میرے واپس آنے کے کچھ دن بعد خاں صاحب نے 14 جنوری 2003 کو خط بھیجا اس میں لکھا: ''یہاں بچے بڑے سب تم کو پوچھ رہے ہیں۔ تم خوب آئیں کہ دن بھر میں سب کو جادو کی چھڑی سے اپنا لیا و شیدا بنا لیا۔ یہ کام تو میں ستر برس میں نہیں کر سکا۔ جیتی رہو اور خوش رہو اور فون کرتی رہو۔'' میں واقعی بھابیوں اور بچوں کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتے میں بندھ گئی تھی۔ آج خاں صاحب نہیں ہیں، لیکن اس چھوٹی سی ملاقات کے سبب ان کا گھر آج بھی میرا اپنا گھر ہے، اس کی یادوں میں آج بھی محبت کی وہی پرانی حرارت ہے۔

اس سفر کے بعد خاں صاحب کے صرف چھے خط میرے پاس محفوظ ہیں۔ زیادہ تر باتیں فون پر ہی طے ہو جاتی تھیں۔ جب میں رالف رسل کی آپ بیتی کے ترجمے کو فائنل کر کے جولائی 2004 میں لندن سے لوٹی تو خاں صاحب کو طویل خط لکھا تھا 21 جولائی کو، پورے پانچ صفحے، فل اسکیپ۔ اس میں رالف کے ساتھ قیام کی تفصیلات لکھی تھیں۔ خط کے خاتمے تک آتے آتے مجھے اپنی محنت کا خیال آیا اور خط کو فوٹو کاپی کرا لیا۔ یوں یہ خط محفوظ رہ گیا۔ اسی کی بنیاد پر میں نے رالف رسل پر ایک مضمون لکھا جو ان کی آپ بیتی کے ترجمے 'جوئندہ یابندہ' کے ساتھ کراچی سے اجمل کمال نے شائع کیا ہے۔ خاں صاحب بہت خوش ہوئے تھے خط پڑھ کر اور 26 جولائی کو جواب میں لکھا تھا کہ پچھلا کفارہ ادا ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی اطلاع دی تھی کہ وائرل نے بری طرح پکڑ لیا تھا، ساری طاقت نچوڑ لی اور نقاہت بیان سے باہر ہے۔ خاں صاحب کا 10 اگست 2005 کا خط ایسا تھا جس نے مجھے اداس کر دیا تھا اور مضطرب بھی۔ شاید دل کے کسی گوشے میں کسی خدشے نے سر اُبھارا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا:

''عزیزہ ارجمند! دن ہو گئے کہ نہ تمھاری آواز سنی اور نہ تحریر دیکھی؛ یعنی کان بھی محروم اور آنکھیں بھی شکوہ گزار۔ میں بھی ان دنوں بس یوں ہی سا رہا اور مرزا صاحب کے اس شعر کو دہراتا رہا:

اب اپنے ختم سفر میں کچھ ایسی دیر نہیں
جو دیر ہے تو فقط تھک کے بیٹھ جانے کی

مگر قلم ہے کہ کسی آواز کو سنتا ہی نہیں، چلے جاتا ہے۔

تم کیسی ہو؟ 'آج' کے دونوں شمارے مل گئے تھے، رسید نہیں بھیج سکا، اس کی معذرت۔ ترجمہ (رالف رسل کی آپ بیتی کا) دیکھ کر جی خوش ہو گیا اور دل سے دعائیں نکلیں۔ جیتی رہو اور خوش رہو۔''

اس کے بعد کا خط 8 ستمبر کا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیماری اپنی جگہ، موسم کی زیادتی، شدید گرمی اور بجلی کی کٹوتی نے خاں صاحب کو بے حال کر رکھا تھا لیکن پریشانیوں کے باوجود خاں صاحب کی شگفتگی ویسے ہی برقرار تھی۔ پورا خط نقل کرتی ہوں:

''شاہ جہاں پور، 8 ستمبر (ستمگر)، 2005

ارجمند! دعائیں (با اثر ہوں گی یا بے اثر، اس کا احوال مجھے نہیں معلوم)۔ فارم اور پاس بک بھیج رہا ہوں۔ انھیں احتیاط سے رکھ لو اور اکتوبر میں فارم جمع کر دینا اور تبھی پاس بک مکمل کرا لینا اور رجسٹری سے موٹے لفافے میں رکھ کر بھیجنا۔

14 گھنٹے کی بجلی کٹوتی نے چین آرام کو حرام بنا دیا ہے۔ کس کو کیا کہا جائے، سبھی اللہ میاں کے بندے ہیں اور انھی کی طرح بے نیاز۔ یہ بھی دن یاد رہیں گے۔ کسی دن فون کر لینا تو اطمینان ہو جائے گا کہ میرا لفافہ تم کو مل گیا... رشید حسن خاں''۔

اپنی پینشن کے سلسلے میں ایک فارم ہر سال اکتوبر کے مہینے میں بینک میں جمع کرانا ہوتا تھا جو اس بات کا ثبوت ہوتا تھا کہ پینشنر زا بھی زندہ ہے۔ مندرجہ بالا خط میں اسی فارم کا ذکر ہے۔ پاس بک جب پُر کرا کے بھیجی تو گھبرا کر انھوں نے فون کیا کہ شاید کوئی غلط اینٹری ہو گئی ہے اس میں تقریباً تیرہ ہزار روپے زیادہ جمع ہو گئے ہیں، اور اتنے روپے تو

میرے کھاتے میں کبھی جمع نہیں رہے۔ مجھے ہنسی بھی آئی اور دکھ بھی ہوا۔ تیرہ ہزار روپے کیا واقعی اتنی بڑی رقم ہے کہ یک مشت ان کے ہاتھ میں نہ رہے۔ میں نے یونی ورسٹی جا کر معلوم کیا تو پتا چلا کہ Arriers جمع ہو گئے تھے۔ خاں صاحب کو بتایا تو بڑے خوش ہوئے کہ روپوں کی بڑی ضرورت تھی، اور یہ غیبی مدد کی طرح پہنچے۔

خاں صاحب کو دہلی سے اپنا کھاتا چلانے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ پینشن اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی دہلی یونی ورسٹی شاخ میں آتی تھی۔ اگر خاں صاحب ہر مہینے شاہ جہاں پور کے اپنے بینک میں چیک ڈالتے تو اس کو کلیر ہونے میں ہفتہ بھر سے زیادہ لگ جاتا اور گھر کا نظام بگڑ جاتا۔ گذشتہ کئی برسوں سے اس کا یہ علاج کیا گیا تھا کہ میں مہینے کے آخر میں تین ہزار روپے کا ڈرافٹ ان کو بھیج دیتی تھی تا کہ پہلی تاریخ تک انھیں پیسا مل جائے، خاں صاحب سال بھر کے اڈوانس چیک مجھے بھیج دیتے تھے اور میں ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو یا اس کے بعد ایک چیک اپنے کھاتے میں جمع کرا دیتی تھی۔ اس سے پہلے ان کے لیے یہ کام حبیب خاں کرتے تھے جو انجمن ترقی اُردو ہند میں کتاب دار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تھا تو میں یہ خوشی اس خدمت کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ غالباً 2001 تک یہ سلسلہ چلا تھا، پھر انھوں نے کوئی اور انتظام کر لیا۔ کچھ عرصے سے میں نے انھیں اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اے۔ ٹی۔ ایم کارڈ بنوا لیں تا کہ بینک جانے کی جھنجھٹ سے نجات ملے۔ ویسے بھی اے ٹی ایم مشینیں اب سب شہروں اور قصبوں میں آتی جا رہی تھیں۔ آخری خط جو انھوں نے مجھے 17 فروری 2006 کو لکھا، انھیں سب معاملات سے متعلق ہے۔ لیکن یہ چوں کہ ان کا آخری خط ہے اس لیے تبرک کے طور پر پورا نقل کرتی ہوں:

''عزیزہ ارجمند! بہت سی دعائیں۔

ATM کے کاغذ بھیج رہا ہوں۔ احتیاطاً انھیں متعلقہ فرد کو دے دینا۔ بینک کی پاس بُک اکتوبر میں بھیجو گا، اسی وقت ''ابھی زندہ ہوں'' والا فارم بھی بھیجوں گا۔ مگر وہ فارم میرے پاس نہیں؛ جلدی نہیں، اکتوبر تک کسی وقت بھیج دینا۔ ہاں بس یہ ضرور کرنا کہ بیلنس معلوم کر کے مجھے فون پر بتا دینا۔ DA کی کوئی زائد قسط شاید ملی ہو مجھے بھی۔ اگر ملی ہوگی تو کام آ جائے گی۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم وہاں نہ ہوتیں تو میرا کیا احوال ہوتا! کبھی ماننا ہی پڑتا ہے کہ کوئی ان دیکھی طاقت کہیں ہے ضرور جو مجھ جیسے ناکارہ لوگوں کے کام بنانے کے لیے ایسے وسیلے پیدا کر دیتی ہے۔ ہائے یگانہ، کیا بات کہی ہے:

شش جہت میں ہے ترے جلوۂ بے فیضی دھوم
کان مجرم ہیں مگر آنکھ گنہ گار نہیں

جیتی رہو اور شاد کام رہو۔

رشید حسن خاں''

یہ خط مجھے غالباً 22 یا 23 فروری کو ملا ہوگا۔ چھبیس فروری کی صبح 5:00 بجے خاں صاحب کے بیٹے، خالد حسین خاں کا فون آ گیا کہ پاپا نہیں رہے۔ رات کے تیسرے پہر، دو بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ ایک دن پہلے تک ٹھیک تھے، بل کہ اس دن، دن میں اطہر فاروقی سے دیر تک فون پر بات چیت بھی ہوئی تھی۔

دہلی یونی ورسٹی کے اُردو شعبے میں تعزیتی جلسہ ہوا، مجھ سے بھی اظہارِ خیال کے لیے کہا گیا۔ مجھے یاد آیا کہ ہفتہ بھر ہی گزرا ہوگا جب خاں صاحب سے فون پر بات ہوئی تھی اور وہ اپنے بینک کے کھاتے میں تیرہ ہزار کی اس رقم پر بوکھلائے ہوئے تھے جو ان کے خیال میں غلطی سے کہیں سے آ گئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ان کی باتوں میں جو کھرا پن تھا، جو عالمانہ دبدبہ تھا، جو قطعیت تھی، جو اعتماد تھا وہ بس ایسے ہی ذی علم اور اپنے کام سے ایسے ہی والہانہ وابستگی رکھنے والے شخص میں ہو سکتا تھا جیسے خاں صاحب تھے۔ علم کی دیوی جس کے قدموں کی باندی ہو اسے بھلا روپوں سے کیا غرض اور کیوں غرض ہو؟ میں نے اس جلسے میں ان کی شخصیت کے حوالے سے تھوڑی سی باتیں کیں، ان کی نوازشوں اور شفقتوں کا ذکر کیا اور فون پر ان سے آخری بات چیت کا ذکر کر کے بیٹھ گئی۔ جتنی باتیں کیں ان سے زیادہ پر غور کرتی رہی، دیر تک غور کرتی رہی۔ کیسی ستم ظریفی تھی ہمارے سماجی نظام کی، تہذیبی قدروں کے زوال کی۔ ایک پروفیسر ہر مہینے چالیس ہزار کی تنخواہ اپنے ضمیر پر شمہ بھر یہ بوجھ ڈالے بغیر اٹھا سکتا ہے کہ اس نے اس مہینے میں کوئی ایک کلاس بھی پڑھائی، کوئی ایک مضمون لکھا، یا کوئی اور علمی کام کیا یا نہیں۔ ترتیب دی ہوئی غیر معیاری کتابوں کے ڈھیر، سمیناروں میں بے سر پیر کی تقریریں اور کئی کئی سال پرانے پرچے اسے علم و فضل کے منصب پر بٹھا دیتے ہیں۔ اس کا عہدہ، اس کی پوزیشن، اس کی تنخواہ اسے ہر قسم کے احتساب سے مبرا کر دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں رشید حسن خاں جیسے آدمی کی کیا حیثیت؟ ان 'اعلا حیثیت' لوگوں کے درمیان ایک حقیر سا شخص، اُردو شعبے کا ایک معمولی سا ریسرچ اسسٹنٹ۔ پروفیسر صاحبان کے ساتھ بھلا ایسے شخص کا نام کیسے لیا جا سکتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ اُردو شعبے کے کئی لوگ ان کا نام تحقیر سے لیتے ہیں اور ان کا ذکر آنے پر ہمیشہ یاد دلاتے ہیں کہ وہ یہاں ایک معمولی عہدے پر تھے، ہم سے نہیں تھے۔ میں دل میں سوچتی ہوں، خوش قسمت تھے جو ان میں سے نہیں تھے۔ اگر ان میں سے ہوتے تو سارے برصغیر میں ان کی علمیت کا ڈنکا نہ بج رہا ہوتا۔

اس جلسے میں شعبے کے ایک سابق اُستاد ڈاکٹر شریف احمد بھی تشریف لائے تھے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے اس زمانے کی بہت سی یادوں کا ذکر کیا جب وہ شعبے میں ساتھ ساتھ تھے، ان کی دوٹوک رائے سے شعبے کے بہت سے لوگ انھیں ناپسند کرنے لگے تھے اور یہ بھی افسوس کے ساتھ بتایا کہ جب خاں صاحب رٹائر ہوئے تو ان سے گائڈ ہال والا

کمرہ خالی کرانے کے لیے باقاعدہ محاذ بن گیا،ان کے خلاف یونی ورسٹی انتظامیہ کو خطوط بھیجے گئے تا کہ کمرہ خالی کرایا جا سکے۔ یہ بغض غالباً اس لیے تھا کہ خاں صاحب ان کی علمیت کا تجزیہ اکثر علی الاعلان کر دیتے تھے۔علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کے پروجیکٹ کو اپنے تبصرے کے سبب ضبط کرا دینے والے خاں صاحب سے اب یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی تھی کہ اپنے شعبے کے معاملے میں منافقانہ رویہ اختیار کرتے۔ایسے میں اگر ان سے اکثر اساتذہ کو شکایت پیدا ہوگئی تھی تو وہ اس میں حق بجانب تھے۔قصور تو خاں صاحب ہی کا تھا کہ اپنی 'حیثیت' سے بڑھ کر وہ 'باحیثیت' لوگوں کے ساتھ جھگڑے مول لیتے تھے۔اس کے بعد خاں صاحب کو اپنے شعبے کا افتخار سمجھنے کے بجائے یہ صاحبان اگر ان کو نکلوانے کے در پے تھے، اور اس طرح ذلت اور کم نصیبی کا داغ یہاں کے اساتذہ کو ملنا تھا تو اس کو وقت کی ستم ظریفی ہی کہیں گے۔ بھلا فرعون کو اور نمرود کو کب معلوم تھا کہ خدائی کہ تمام دعوں کے باوجود تاریخ ان کے نصیب میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ اور نہیں لکھے گی!

جولائی 2004 میں کراچی سے اجمل کمال کا ایک ای میل مجھے ملا تھا جس میں انھوں نے پوچھا تھا کہ خاں صاحب کا ای میل ایڈریس لکھ بھیجو تا کہ ان سے مراسلت کا سلسلہ چل نکلے۔اجمل کمال اچھے لکھنے والوں کے قدر دان ہیں اور کوشش کرتے ہیں کسی نہ کسی طور ان سے رابطہ رکھیں اور ان کی تحریریں اپنے سہ ماہی جریدے 'آج' میں چھاپیں۔اجمل کے استفسار پر مجھے ہنسی آ گئی۔خاں صاحب جیسا صوفی منش آدمی جس نے اپنی پوری زندگی ہاسٹل کے ایک کمرے میں کتابوں کی رفاقت میں گزار دی، نہ وہاں فون لگوایا نہ گھر پر شاہ جہاں پور میں۔اتنی آمدنی بھی نہیں تھی، ہوتی بھی تو دوسری ضرورتوں کو ترجیح حاصل ہوتی۔ایسا بے نیاز بوریا نشین اور ای میل؟ میں نے اجمل کو جواب میں حقیقتِ حال سے واقف کرایا تو انھوں نے حیرت کا اظہار کیا۔وہ ان حالات سے بالکل بھی واقف نہیں تھے، خاں صاحب کے علمی کاموں کے قدر دان تھے، بس۔میرا خط پڑھ کر لکھا کہ اب میرے دل میں ان کی قدر و منزلت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

رشید حسن خاں نے خود تو بے نیازی کی زندگی گزاری لیکن اپنے نیاز مند طالب علموں کی روزگار کی فکر میں خوب گھلتے تھے۔یہ ضرور تھا کہ ان کے روزگار کے لیے کوئی جوڑ توڑ کرنے کے بجائے ہمیشہ یہی تلقین کرتے کہ محنت سے پڑھو لکھو اور اپنے لیے مقام بناؤ۔غالباً اپنی زندگی کو اپنے نیاز مندوں کے لیے بھی آئیڈیل مانتے تھے۔رٹائرمنٹ تک وہ گائر ہال کے دو کمروں پر مشتمل TC-9 میں رہے۔ان کی بنیادی ضرورتوں کی اشیا تھیں۔دیوار سے دیوار تک لگے کتابوں کے شیلف، پڑھنے لکھنے کے لیے ایک میز کرسی، ملاقاتیوں کے لیے چند کرسیاں۔اندر والے کمرے میں ایک بستر اور چائے بنانے کے لیے ایک پرکیولیٹر۔اس سادہ سی زندگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ زندگی سے خاں صاحب کے کچھ مطالبات ہی نہ تھے۔اچھے معیارِ زندگی کا ان کا تصور تھا جس پر وہ کوئی مفاہمت نہیں کر سکتے تھے۔آپ کو ان کی میز پر کوئی عام فاؤنٹین پین یا کوئی بال پین نظر نہ آ سکتا تھا۔وہ ہمیشہ شیفر یا پارکر سے لکھتے تھے۔خصوصاً ان دو برانڈوں کے پین ان کے پاس اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ان کے تمام دوستوں اور نیاز مندوں کو ان کے شوق معلوم تھے۔چناں چہ جو کوئی بھی یورپ و امریکہ کے سفر سے لوٹتا ایک اچھا پین خاں صاحب کے لیے خریدنا نہ بھولتا۔خراب پینوں کی مرمت فتح پوری کی مسجد کے پاس، چاندنی چوک واقع Coronation والے کی دکان پر کراتے تھے۔غیر ملکی برانڈ کے پینوں کی مرمت کے لیے بس یہی ایک مشہور دکان تھی۔

ایسا ہی شوق اچھی چائے پینے کا بھی تھا۔ ہمیشہ گولڈن اورنج پیکو استعمال کرتے۔اگر یہ برانڈ نہ ملے تو اورنج پیکو سے کام چلاتے۔اس کے سوا کوئی دوسری چائے نہیں پیتے تھے۔کناٹ پلیس میں پالیکا بازار سے بائیں جانب والے وِنگ میں واقع جانکی داس ڈپارٹمنٹل اسٹور میں یہ چائے ملتی تھی۔ایک ہی دکان تھی۔جب بھی دہلی آنا ہوتا اور وقت کم ہوتا تو پہلے ہی خط لکھ دیتے کہ چائے بھی خریدنی ہے۔جب ملنے کے لیے آؤ تو خریدتی ہوئی آؤ۔آدھا دن بچ جائے گا۔آدھا کلو کا پیکٹ 144 روپے کا ملے گا، فوراً ہی قیمت ادا کر دوں گا۔

خاں صاحب لباس کے معاملے میں بھی بڑے خوش مذاق تھے۔نہایت سادہ مگر خوش وضع، اور رنگوں کے انتخاب میں بھی باذوق۔یہی سلیقہ ان کی زندگی کے ہر پہلو میں دیکھنے کو ملتا تھا۔سچے اسپورٹس مین کی طرح ڈسپلن میں رہتے۔فٹ بال کے اچھے کھلاڑی اور میچ دیکھنے کے شوقین تھے۔یہی ذوق وشوق اور سخت ضابطہ ان کی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی نظر آتا تھا۔خاں صاحب کتنے بجے ناشتے کی میز پر ہوں گے، کب سے کب تک ٹیوٹوریل بلڈنگ میں اپنے آفس میں ہوں گے، کتنے بجے کافی پیتے ملیں گے، کتنے بجے کھانا کھائیں گے، کب سے کب تک آرام کریں گے، کب کافی ہاؤس جائیں گے، غرض ہر بات کا وقت مقرر تھا۔آپ انھیں دیکھ کر گھڑی ملا سکتے تھے۔خوشامد پسندی طبیعت میں نام کو نہ تھی۔انھیں بالکل پسند نہیں تھا کہ کوئی بلا وجہ بات چیت کے لیے تعریفیں شروع کر دے، جیسا کہ اکثر ادبی محفلوں اور سیمناروں میں ہوتا ہے۔مجھے ایک بار کا واقعہ یاد ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے غالب سمینار میں اپنا پرچہ پڑھ کر خاں صاحب نے اپنے چند احباب کے ساتھ کافی پینے جانے کا پلان بنایا۔ طے ہوا کہ بہادر شاہ ظفر مارگ پر اخباروں کے دفاتر کے سامنے والی سڑک پر جو سب وے ہے، اس میں واقع ریستراں میں کافی پی جائے۔جب باہر آ کر رکشہ میں سوار ہونے کو تھے تو ایک صاحب آگے بڑھ کر ان سے بڑی نیاز مندی سے ملے اور پوچھ بیٹھے کہ حضرت اب دوبارہ دہلی کب تشریف لائیں گے۔خاں صاحب نے پوچھا کیوں؟ فرمانے لگے اگر معلوم ہو جایا کرے کہ آپ تشریف لانے والے ہیں تو ہم ایسے طالب علم استفادے کے لیے حاضر ہو جایا کریں۔خاں صاحب کے چہرے پر درشتی ظاہر ہوئی۔کہنے لگے، میں ساری زندگی گائر ہال میں مقیم رہا، آپ کتنی بار استفادے کے لیے گائر ہال تشریف لائے؟ اس پر وہ صاحب سکپکا گئے اور خاں صاحب نے رکشہ والے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔ایسا کئی بار ہوا جب خاں صاحب کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ ان کو جو بات کہنی ہوتی ہے کمالِ سادگی اور صاف گوئی سے کہہ دیتے ہیں، چاہے بات کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو، ان کے لہجے میں معمولی سی بھی لغزش نہیں آتی، ان

کے تیور ذرا نہیں بدلتے۔جس طرح ان کے لکھے ہوئے الفاظ حق وصداقت کا اعلان کرتے ہیں، اسی طرح وہ آمنے سامنے کی گفتگو میں بھی بے باک تھے۔ یہ ایسا وصف ہے جو بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے، خصوصاً اُردو کی دُنیا میں تو اس کی مثال شاذ ہی ملے گی۔

اب سوچتی ہوں کہ مجھ ایسی کاہل الوجود، کام چوروں کی سچی جانشین نے خاں صاحب پر مضمون کیوں لکھا۔ پلان ایک سال سے کر رہی تھی لیکن پر یشر کوئی نہیں تھا اس لیے قلم اٹھاتی ہی نہیں تھی۔اب جاوید رحمانی نے (جو خاں صاحب پر کوئی کتاب مرتب کر رہے ہیں) ہر ہفتے دو ہفتے میں یاد دلانے کی ذمہ داری لے لی تو بس دوسرے غیر ضروری کاموں کو پسِ پشت ڈالنا پڑا۔ اس سے قبل ایک مضمون رالف رسل پر لکھا تھا۔ سوچتی ہوں کیسا عجیب اتفاق ہے کہ دونوں حضرات جن پر قلم اٹھانے کو میں نے اپنے دل کو آمادہ پایا ، کچھ نہ کچھ ایسی مشترک قدروں کے حامل ہیں جن کو میں بھی سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہوں۔ یہ مشترک اقدار ہیں۔ ان کا کھرا پن۔ بغیر لاگ لپیٹ کے سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کہنے کا حوصلہ۔ اپنے کام کے لیے بے پناہ لگن۔ زندگی پر اعتماد اور انسان دوستی پر قامل یقین۔ کاش ان جوہروں کا عشر عشیر بھی ہماری سرشت کا حصہ بن جائے تاکہ اُردو دُنیا سانس لینے کی ایک بہتر جگہ بن سکے۔

(ماہ نامہ ''سب رس'' حیدر آباد، مدیر مغنی تبسم، صفحہ 10 تا 18، ستمبر 2007)

(رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے، ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، صفحہ 111 تا 134، مکتبہ الحرا، دربھنگہ، بہار 2008۔ اس کتاب میں یہ مضمون ''رشید حسن کی شخصیت کے چند پہلو، بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔)

○○○

نابغہ محقق اور زبان داں رشید حسن خاں

افتخار امام صدیقی

(مدیر ماہ نامہ 'شاعر' ممبئی)

جنت مکانی رشید حسن خاں کی شخصیت اور ان کے کارو افکار اتنے ہمہ جہت ہیں کہ اُردو کا ہر بڑا محقق یا تو ان کے قد کے برابر ہے یا پھر کوتاہ ہے، یوں بھی اُردو کے ثقہ محققوں کے اس چل چلاؤ کے آخری کمانڈر رشید حسن خاں تھے۔ اب جو بچ رہے ہیں ہمیں ان کی سلامتی کے لیے دعا گو ہو جانا چاہیے کہ اُردو زبان اپنے جاں نثاروں سے محروم ہوتی جارہی ہے۔

رشید حسن خاں مرحوم نے قدیم متون کی تدوین جس دیدہ ریزی اور جانکاہی کے ساتھ کی تھی، اس کی کوئی دوسری مثال کم ہی ملے گی۔ ان متون میں 'فسانۂ عجائب' (1990)، باغ و بہار (1992) گلزارِ نسیم (1995) مثنویاتِ شوق (1998) سحر البیان (2000) دہلی کی آخری شمع (2000) اسی طرح انتخابِ سودا (1976) اور 'انتخابِ نظیر اکبر آبادی (1977) میں شائع ہوئیں۔ یہ ساری کتابیں کم وبیش ہندوستان کی تقریباً تمام یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہیں، بقول خلیق انجم:

> ''رشید حسن خاں کا شمار اُن محققوں میں ہوتا ہے جن کے لیے ادبی مصروفیات عبادت کا درجہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی ساری زندگی علم وادب کی خدمت میں گزار دی ہے۔ لگاتار محنت اور دیدہ ریزی کا نتیجہ ہے کہ ان کا شمار اعلا ترین محققوں اور متنی نقادوں میں ہوتا ہے۔'' (پیش لفظ گلزارِ نسیم)

انجمن ترقی اُردو (ہند) کے خلیق انجم صاحب (جو خود بھی متون کی تدوین کا ذوق رکھتے ہیں) نے بجا طور پر ایک غیر معمولی عالم کے فلک قد سے احترام کے ساتھ اُردو والوں کے لیے

گراں قدر کتابیں عطا کروائیں۔

حیرت انگیز امر ہے کہ متون کی تدوین کے ساتھ انھوں نے زبان وصحت زبان پر بھی خصوصی توجہ دی، اُردو املا، اُردو کیسے لکھیں اور توقیت نگاری کے بھی موضوع پر مرحوم کا معرکہ آرا مضمون ''شاعر'' میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

ان کا آخری (غالبًا) کارنامہ 'کلاسیکی ادب کی فرہنگ' (2003) ہے، اس کی پہلی جلد انجمن ترقی اُردو (ہند) نے شائع کی تھی، ابھی دو جلدیں مزید شائع ہوں گی۔ ہر ایک کتاب کے ایک سے زائد نسخے شائع ہو چکے ہیں۔

خاک سار سے مرحوم کی مراسلت تھی۔ وہ جب بھی ممبئی تشریف لاتے مجھے فون ضرور کرتے، ان کا قیام مشہور افسانہ نگار انور قمر کے یہاں ہوتا تھا، وہ اپنے علاج کے لیے ممبئی آتے تھے۔ ایک بار وہ آں جہانی کالی داس گپتا رضا سے ملاقات کے لیے خاک سار کے ہم راہ گئے تھے۔ دو بزرگ عالم اور محقق جن کا مشترکہ موضوع غالب تھا، ایسی گفتگو میں نے شاذ ہی سنی ہوگی۔ دونوں بزرگ اپنے اپنے دلائل وشواہد اور حوالوں کے ساتھ غالبؔ کو عقیدت بھرا خراج دے رہے تھے اور یہ ہیچمداں اپنی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا ۔لیکن درمیان میں بے ادبی ضرور کر جاتا تھا اور کوئی نہ کوئی سوال غالبؔ سے متعلق ضرور کرتا، جس کا جواب دونوں یا تو بہ یک وقت دیتے تھے یا پھر یکے بعد دیگرے اور میں اپنے 'علمی خزانے' میں نوادرات جمع کر رہا تھا۔

غالبؔ ہر شاعر اور ادیب کا دل چسپ موضوع ہے۔ میں 'شاعر' کا غالب انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنا چاہتا تھا۔ گپتا جی مددگار ہو جاتے لیکن نہ معلوم کیوں انھوں نے مجھے گول مول رکھا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ کاش مذکورہ ساری گفتگو صدا بند ہو جاتی۔

غالبؔ کو میں نے اپنے طور پر سوچا اور کچھ کر گزرنے کی سعی کی ہے۔ اس ضمن میں ایک خاص موضوع تو 'کلام غالب اور ذہن شارح' ہے۔ غالبؔ کی کئی ایک شرح کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ہر شارح نے اپنی پسند ناپسند، مزاج ومعیار کے مطابق شاعری کی تشریح وتوجیہ پیش کی ہے۔ بعض نے تو سیدھے اور صاف شعر کو محض اپنی علمیت بگھارنے کے لیے چستیاں بنادیا، بعض خود ہی غالبؔ کے جال میں پھنس کر نکل نہیں سکے اور ایران توران کی لکھ گئے۔ ہر قاری کا اپنا ذہن، علم اور نفسیات ہوتی ہے۔ پھر یہ کوئی زندہ اور ضرب المثل شعر اس پر منکشف ہوتا ہے تو جس کا جتنا فہم ہے وہ شعر بھی اسی تناظر میں اس پر کھلتا ہے، لیکن افسوس کہ غالب شناسوں نے اور تو سارے کام کر ڈالے صرف یہی ایک کام نہیں کیا۔

قرآن مجید کی تفاسیر، ہر دور میں لکھی گئی ہیں، تراجم کے ساتھ ساتھ تفاسیر کی بھی کمی نہیں، تفسیر ابنِ کثیر ایک اہم ترین مآخذ ہے جس میں تمام تفاسیر کو سامنے رکھ کر تفسیر تحریر کی گئی ہے۔ منجملہ تفاسیر کے ساتھ کلام پاک کا ہر قاری، عالم اس غیر معمولی تفسیر کا مطالعہ ضرور کرتا ہے۔

تو کیا غالبؔ کی شاعری پر لکھی گئی تمام شرحیں کسی ایک یا دو جلدوں میں مکمل محاکے کے ساتھ دستیاب ہیں؟ کیا غالبؔ کی شاعری کی کوئی علاحدہ سے فرہنگ ہے؟ (معلوم ہوا ہے کہ رشید حسن خاں صاحب نے یہ کام بھی کر لیا ہے)۔ کیا غالبؔ کی شاعری کے اثرات اس کے معاصرین، متقدمین اور متاخرین کی شاعری میں دیکھے گئے؟ غالب ایک 'کائنات بھر' تحقیق کا موضوع ہے۔

خاک سار نے رشید حسن خاں صاحب کو لکھا تھا کہ ''کلامِ غالب اور ذہن شارح' کے موضوع پر کہیں کوئی تحقیقی کام ہوا ہے تو مرحوم نے اس کا جواب تحریر کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''تشریحِ غالبؔ کے سلسلے میں، میں آپ سے متفق ہوں۔ یار لوگوں نے اب تو اپنے خیالات کو مرزا صاحب کے حوالے کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے۔ اس موضوع پر میں اپنے خیالات وضاحت کے ساتھ اپنے مضمون میں پیش کر چکا ہوں۔''
>
> (9 دسمبر 2003، شاہ جہاں پور)

اس خط کا عکس 'شاعر' کے آثار لفظ لفظ میں شائع کیا جا چکا ہے۔

رشید حسن خاں ایک قاموس شخصیت کے مالک کھرے مزاج کے محقق اور تدوین کار تھے۔ انھیں اُردو شاعری سے بھی شغف تھا، وہ معاصر اُردو شاعری کے قاری اور تدوین کار تھے۔ اپنے سے چھوٹوں کو شفقت تقسیم کرتے اور احترام پاتے رہے۔ ممبئی کے اہم شاعروں اور افسانہ نگاروں میں انور قمر انھیں بے حد عزیز تھے، میرے اور انور قمر کے خاص دوست انور خاں بھی مرحوم کو عزیز تھے۔ اس کا ثبوت ان کی معرکہ آرا کتاب 'کلاسیکی ادب کی فرہنگ' (جلد اول) ہے۔ اس کے صفحہ نمبر 5 پر لکھا ہوا ہے؛

''اچھے افسانہ نگار اور بہت اچھے انسان انور خاں (مرحوم) کی یاد میں اقبال کے اس شعر کے ساتھ ؎

جو ہر اِنسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں''

مرحوم رشید حسن خاں خود ہی مذکورہ شعر کی تفسیر بن گئے ہیں۔

سے ایوارڈ جاری کریں۔ ہندوستان کی کسی یونی ورسٹی میں 'رشید حسن خاں چیئر' قائم کیا جائے۔ شاہ جہاں پور میں ان کے نام سے کوئی اسکول، کالج یا سڑک منسوب کی جائے۔ ان کے خطوط کی جمع آوری ہو اور انھیں حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام مکتوب علیہ اپنے پاس موجودہ مرحوم کے خطوط کو مرتب کر کے مع حواشی تو خود شائع کریں یا پھر کسی اہم ادارے کو اشاعت کے لیے دیں۔ ان کی تقاریر کے آڈیو ویڈیو کیسیٹ اور سی ڈی جاری کیے جائیں۔ ان کی تصاویر کے البم، مشاہیر بنام رشید حسن خاں (کئی جلدیں) اور ادبی رسائل رشید حسن خاں نمبر شائع کریں۔

آخر میں کیا یہ ممکن ہے کہ ساہتیہ اکادمی مرحوم کو پس مرگ ایوارڈ سے نوازے؟ شاہ جہاں پور میں 'رشید حسن خاں اکادمی' قائم کی جائے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سارے اہم کام اور ضروری کام کون کرے؟

وقت　　کم　　ہے　　کام　　زیادہ

کام　　کم　　اور　　نا　　م　　زیادہ

رشید حسن خاں صاحب کے ادبی معرکوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ انہی میں سے ایک 'تاریخ ادب اُردو علی گڑھ' مرتبہ آل احمد سرور (مرحوم) ہے۔ اس پر خاں صاحب نے ایک طویل تحقیقی محاکمہ 'سوغات' (بنگلور) میں شائع کروایا تھا اس کے بعد تو گویا چاروں طرف سرگوشیاں گونج بن کر ابل پڑیں، آخر کو وہ تحقیقی کام واپس لے لیا گیا۔ اور بھی ادبی معرکے ہوں گے، انھیں بھی مرتب کر کے مع حواشی و تعلیقات شائع کیا جا سکتا ہے۔

(ہفت روزہ ہماری زبان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 7 جنوری 2007، شمارہ نمبر: 1، جلد نمبر 66، صفحہ اول اور 7)

○○○

خاں صاحب
رشید حسن خاں

شمیم حنفی

تعلیمی اداروں کے سامنے سے جو سڑکیں گزرتی ہیں اُن پر اسپیڈ بریکر ضرور لگا ہوتا ہے۔ یہ ایک احتیاطی تدبیر ہے غیر محتاط سواریوں پر روک لگانے کی۔ دن کے اُجالے میں تو خیر اپنی جان پر کھیلے بغیر راہ گیروں کی جان کھیلنے والے حوصلہ مند ڈرائیور بھی اسپیڈ بریکر کا کچھ لحاظ رکھتے ہیں، لیکن شام ہوتے ہی سڑک پر آمد و رفت کم ہونے اور اندھیرا پھیلنے کے ساتھ جی داروں کی سوئی اُمنگیں اور دبی ہوئی قوتیں جاگ اُٹھتی ہیں۔ وہ چوری چھپے اسپیڈ بریکرز کے دائیں بائیں جہاں گنجایش نظر آئی، اپنی رفتار کم کیے بغیر پہلو بدل کر تیزی سے نکل جاتے ہیں۔ انھیں بس اپنی منزل پر پہنچنے کی دُھن ہوتی ہے۔ راہ گیروں کے جان مال کی پروا کرنا، ہو نہ ہو، اپنی پیشہ ورانہ مہارت پر شک کرنا ہے۔

ہمارے تعلیمی اداروں میں علم اور فضیلت کے مناصب پر فائز اکثر اصحاب ان ڈرائیورز سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ پاؤنڈ کا کہنا تھا کہ ناقص اور بے اثر دوائیاں بنانے والا تو سماجی مجرم سمجھا جاتا ہے، مگر ناقص رویوں اور خیالات اور معلومات کی اشاعت کرنے والے 'عالم اور دانش ور' صاف بچ نکلتے ہیں، جب کہ اُن کا وار منافع خور دوائی کمپنیوں کے وار سے آگے جاتا ہے۔ یہ اصحاب ہر معنی میں 'اُستاد' ہوتے ہیں۔ سینے پر پتھر رکھ کر جلسوں جلوسوں، سازشوں۔ خشامدوں اور نمائشی تقریبوں جیسے نشہ آور مشغلوں سے وقت نکال کر یہ اصحاب جو بے مثال کتابیں لکھتے (لکھتے کم ترتیب دیتے زیادہ) یا چھپواتے رہتے ہیں ان کی حیثیت بقول ہمارے خاں صاحب کے اینٹ پتھر کی ہوتی ہے۔ ان پر پاؤں رکھ کر یہ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ انھیں رُک رُک کر چلنے، سوچنے اور اپنے عمل کا محاسبہ کرنے کی عادت نہیں ہوتی۔ ڈی.ٹی.سی. کے ڈرائیورز کی طرح یہ مخلوق بھی اسپیڈ بریکرز سے شدید نظریاتی اختلاف رکھتی ہے۔ انھیں خاطر میں نہیں لاتی، چناں چہ تیزی سے ترقی کرتی جاتی ہے۔ اور اسی لیے ہماری تعلیمی اور فکری معاشرے میں اسپیڈ بریکرز کم ہیں، ڈرائیورز بے شمار۔ یہ دور ترقی کا ہے۔

رشید حسن خاں کے بارے میں جب بھی سوچا، خیال آیا کہ ہماری دانش گاہوں کی تعداد اور علما کی آبادی جس بے مہار طریقے سے بڑھ رہی ہے اس کے حساب سے صرف ایک خاں صاحب کافی نہیں۔ مگر کیا کیا جائے؟ ایک تو یہ خاں صاحب کا ثانی ملنا مشکل، دوسرے یہ کہ بھولے بھٹکے ایسا کوئی معجزہ ظہور میں آ بھی جائے تو خاں صاحب اُس سے

چھوٹ دینے کے نہیں۔ خاں صاحب ان لوگوں میں ہیں جو اپنی غلط کاری پر بھی 'بزن' کہنے سے نہ چوکیں گے۔

ہم نے پست معیاری، کم علمی، دنیا داری اور کاروباری ذہنیت سے سمجھوتے کا ایک دنداں شکن جواز مہیا کر لیا ہے۔ یہ کہ سب چلتا ہے۔ یا یہ کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہوتے رہنا بہتر ہے چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ بزرگوں کی خطا کو خطا ماننے میں تو خیر ہمارے قومی اخلاق وآداب پر حرف آتا ہے، معاصرین کی کوتاہی پر گرفت کو بھی ہم تنگ دلی سمجھنے لگے ہیں، یہ خیال کیے بغیر کہ بعض کوتاہیاں صرف ذاتی نہیں ہوتیں اور ان کا عذاب اجتماعی ہوتا ہے۔ روایت کی یہ پاس داری اور کشادہ ظرفی، علم کی اخلاقیات کے منافی ہو تو ہو، ترقی بازی اور دنیا سازی سے خوب میل کھاتی ہے۔

خاں صاحب ذاتی ترقی کے دشمن ہیں، اپنی ذات تک شاید اسی لیے باقر مہدی سے ان کی دوستی ہے۔ مجھے دونوں پسند ہیں۔ اس لیے بھی کہ دونوں ایک دوسرے کے قائل ہیں۔ دونوں دوست دشمن کسی سے سمجھوتے کے قائل نہیں اگر معاملہ اصول کا ہو۔ دونوں کا نام لیتے ہم نے کئی لوگوں کو اکثر اس طرح دیکھا ہے گویا شاک لگ گیا ہو۔

یہ شاک ٹریٹمنٹ ناگزیر ہے۔ ہماری ذہنی اور اجتماعی کلچر کی ضرورت بھی ہے۔ ہمارے حواس سُن ہوتے جا رہے ہیں۔ عام زندگی کی طرح علم اور ادب کے معاملات میں بھی ہم صحیح اور غلط، نیک اور بدی کی تمیز کھوتے جا رہے ہیں۔ تشویش یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ اس خسارے کا احساس بھی روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارا اُردو معاشرہ اگر ان ایک خاں صاحب اور ایک باقر مہدی سے بھی محروم ہوتا تو کیا ہوتا؟

رشید حسن خاں سے جب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی، میں سوچتا تھا کہ کوئی سرکہ جبیں محقق ہوں گے۔ دنیا سے بیزار، اپنے آپ میں گرفتار، کرم خوردہ کتابوں کے ہجوم میں بیٹھے 'بزن بزن' کرتے رہتے ہوں گے۔ ہمارے یہاں محقق کا امیج ہی جرائم تفتیش کرنے والے پولیس آفیسر کا ہے۔ یوں قبلہ مسعود حسن رضوی صاحب اور عرشی صاحب جیسے محقق اور عالم بھی تھے جن کی نرم خوئی اور خوش ذوقی مسلم ہے۔ مسعود صاحب کی باتیں تو میں نے گھنٹوں سُنی ہیں اور سوچتا رہا کہ معلومات سے قطع نظر زبان کے رس اور جس کا جو مزہ اس گفتگو میں ہے، اسی سے زبان کے ذوق کی تربیت ہو سکتی ہے۔ لیکن بعض محققوں کا اپنا تجربہ یہ بھی تھا کہ کتبے تو صحیح پڑھ لیتے تھے۔ شعر غلط پڑھتے تھے۔ زندہ شعر اور جاگتی ہوئی کتاب کو منھ نہیں لگاتے تھے۔ کسی اخبار یا رسالے کو بھی اسی وقت لائق مطالعہ سمجھتے تھے جب کاغذ مٹ میلا ہو جائے اور اس سے کچھ کافور کی سی بو آنے لگے۔ انھیں اپنے زمانے کے ادبی مسئلوں سے زیادہ کباڑیوں کی دکانیں اپنی طرف کھینچتی تھیں۔

لیکن یہاں ایک اعتراف۔ ایلیٹ کے اس قول پر میرا یقین بہت پختہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی تحقیق بھی ادب کو اور ادب کی تاریخ کو سمجھنے میں کسی نہ کسی طور پر معاون ہو سکتی ہے۔ کم سے کم ہمارے ذوق کو بگاڑتی تو نہیں، اسی لیے محقق کے وجود سے مجھے کوئی بے کلی نہیں ہوتی۔ وحشت ہوتی ہے تو اس نقاد سے جس کی بے توفیقی کا صدمہ بعض اوقات ادیبوں کی اور ادب پڑھنے والوں کی پوری نسل کو جھیلنا پڑتا ہے۔ یوں بھی چوں کہ مجھے تحقیق کا ہنر نہیں آتا اس لیے استفادے کی خاطر میں تحقیقی تحریریں ضرور پڑھتا ہوں، سوچ کر کہ اس دانائے راز کو وہ کچھ معلوم ہے جو مجھے نہیں معلوم۔

اور خاں صاحب سے تو پہلی ہی ملاقات میں یہ رشتہ قائم ہوا تھا کہ محقق ہوں تو ہوں، ادب سے ان کا رشتہ بہت سچا ہے۔ خاں صاحب کی زندہ دلی، خوش مذاقی اور وسیع المشربی کی بنیادیں اتنی پکّی ہیں کہ تحقیق کا جوش بھی انھیں ہلا نہیں پاتا۔ دلّی آنے کے بعد ایک روز جامعہ کی کسی تقریب میں دوستوں سے غپ شپ جاری تھی۔ ادھیڑ عمر کے ایک بزرگ، بند گلے کا ایک کوٹ، پتلون پہنے، نک سک سے درست، نکھرے اور بشاش صورت ان منڈلی میں شامل ہو گئے، ہم ایک دوسرے سے روشناس نہیں تھے۔ کچھ دیر ایک کو دوسرے کی خبر نہیں ہوئی۔ پھر اچانک خاں صاحب نے کہا ''بھئی! سنا ہے شمیم حنفی صاحب علی گڑھ سے یہاں آ گئے ہیں، ان سے ملاقات نہیں ہوئی''۔ ہم خاں صاحب کی رواداری پر حیران ہوئے۔ خوش بھی ہوئے کہ اُن پر محقق ہونے کا گمان تک نہ تھا۔ ہما شما کا کیا ذکر، ایسے ایک بزرگ کو میں نے عسکری صاحب کے نام سے بھی ناواقف پایا تھا۔

ہم دوستوں کے حلقے سے ذرا ہٹ کر باتیں کرنے لگے۔ خاں صاحب کی ہر بات میں ذہانت اور خوش طبعی کا اظہار اور ایک رچی ہوئی، شائستہ خود اعتمادی جو لجلجے انکسار کے مقابلے میں ہمیشہ بہتر نظر آتی ہے۔ وہ جو بیش تر نادیدہ اصحاب کی کتابیں پڑھ کر ان سے دوبدو مل کر ایک پریشان کُن فرق محسوس ہوتا ہے۔ خاں صاحب کے سلسلے میں محسوس بھی ہوا تو ایک دوسری سطح پر۔ مجھے ان کی تحریریں اچھی لگتی تھیں۔ عام محققوں کے برعکس یہ تحریریں گُند نہیں ہوتی تھیں۔ مجھے ان میں اُس پُرکشش قوت کا احساس ہوتا تھا جو شخصیت کے کھرے پن اور فکر کی دیانت داری سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ خاں صاحب کی تحقیقات کا مقصد دوسروں کو بے حرمت کرنا نہیں بل کہ علم وادب کی حرمت کو بچائے رکھنا ہے۔ لیکن ان کا جو خاکہ ذہن میں تھا وہ کچھ ڈراؤنا بھی تھا۔ یہ ڈر نہیں تھا کہ خاں صاحب ہماری کسی تحقیق کو رد کر دیں گے۔ ہم سے ایسا کوئی کارنامہ سرزد نہیں ہوا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ خاں صاحب جس اُردو املا کے وکیل ہیں اس کی رو سے ہمارا املا درست نہیں تھا۔ ہم سوچتے تھے کہ پُرانی وضع کے بزرگ ہوں گے۔ زیادہ تر پینک میں رہتے ہوں گے۔ ادب پر باتیں کرتے ہی نہ ہوں گے اور کرتے بھی ہوں گے تو اس طرح جیسے ریاضی کا فارمولہ بیان کر رہے ہوں (بعض علمائے ادب کتاب میں اعداد، الجبرا اور اقلیدس کے نشانات، گراف کا استعمال بہت کرتے ہیں) کسی کو خاطر میں نہ لاتے ہوں گے۔ مردم آزاد نہ سہی مردم بیزار ضرور ہوں گے۔ مگر یہاں تو قصہ ہی دوسرا تھا۔ خاں صاحب فٹ بال کے کسی ٹورنامنٹ کی روداد لے بیٹھے۔ اندازہ ہوا کہ کھیل سے بھی دل چسپی ہے، کھلاڑیوں سے بھی۔ ہاکی، فٹ بال، والی بال غرض کہ مردانہ کھیل خاں صاحب کی طبیعت سے بہت مناسبت رکھتے ہیں۔ میں نے اس وقت تک ایسا ایک ہی شخص دیکھا تھا۔ بلراج مینرا، جو اسپورٹس اور ادب سے یکساں باخبر ہو اور کرکٹ کا میچ اس سنجیدگی سے دیکھتا ہو جس طرح وہ دستوئیفسکی کی

کتاب پڑھتا ہے۔ خاں صاحب اس نوعیت کی دوسری مثال تھے۔ کھیلوں کے سلسلے میں ان کی معلومات وسیع تھی تحقیق کی طرح وہ ان کے داؤ پیچ بھی جانتے تھے۔

ایک بار کسی ادبی مذاکرے میں خاں صاحب پاس ہی کی نشست پر بیٹھے ملے۔ مقرر یا مقالہ نگار نے ڈھنگ کی باتیں کیں تو سنجیدگی سے سنتے رہے۔ جہاں اول فول شروع ہوئی خاں صاحب نے بھی رننگ کمنٹری شروع کر دی۔ پھر جلدی جلدی پرچے پر کچھ لکھا۔ پرچہ میری طرف بڑھایا۔ حالاتِ حاضرہ پر منظوم تبصرہ تھا، اس زبان میں جسے سننے کی تاب بقول جوش پلپلے معاشرے میں نہیں ہوتی۔ اس روز یہ راز کھلا کہ خاں صاحب طبیعتوں کی طرح شعر بھی موزوں کر سکتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ حد سے بڑھتی ہوئی صاف گوئی (جو بہتوں کو جارحیت دکھائی دیتی ہے) کے باوجود خاں صاحب کی شخصیت میں موزونیت بہت ہے۔ بے ڈھنگا پن ان کی تحریر و تقریر، بود و باش میں کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ دلّی یونی ورسٹی کے گوائر ہال کے ایک ایسے حصے میں رہتے ہیں جس کی گرد و پیش کا سارا ماحول دفتری ہے۔ ایک شام تاباں صاحب، صدیق الرحمٰن قدوائی اور انور صدیقی کے ساتھ ہم وہاں گئے تو خیال آیا کہ یہ جگہ خاں صاحب جیسے نستعلق اور مشرقی مزاج رکھنے والے اسکالر کو کیا راس آتی ہوگی۔ دو کمرے خاں صاحب کی تحویل میں تھے۔ پہلا کمرہ خاں صاحب کا کتب خانہ، دوسرا کمرہ بھی کتاب خانہ۔ سردیوں کے دن تھے، خاں صاحب کوٹ پتلون اوور کوٹ میں ملفوف ملے، جیسے دفتر میں بیٹھے ہوں۔ اس ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ۔ اُردو املا، تحقیق، یونی ورسٹیوں کے شعبے، فسانۂ عجائب، اثر لکھنوی، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالودود اور حافظ محمود شیرانی۔ ایسی کئی سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے ہم بالآخر اپنے حال کو پہنچے تو وہاں بھی خاں صاحب اتنے ہی نیچرل۔ غزل، پھر ہزل، پھر یہ قافیہ اور آگے تک گیا۔ شام اچھی گزری۔ خاں صاحب نے اہتمام بہت سلیقے سے کیا تھا۔ واپسی پر راستے میں ایک شعر یاد آیا۔

تمام عمر مجرد رہا ابو ریحاں
کہ کارِ لوح و قلم میں کہیں خلل نہ پڑے

تاباںؔ صاحب نے فرمایا ''خاں صاحب بال بچوں والے آدمی ہیں، بچے شاہ جہاں پور میں رہتے ہیں اور خاں صاحب دلّی میں۔''

خاں صاحب کا علمی انہماک اور کام سے ایسا شغف جو دُنیا کی کسی فکر کو غالب نہیں آنے دیتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ۔

منعم بہ کوہ و دست و بیاں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بار گاہ ساخت

ایک زمانے میں خاں صاحب خاصے سرگرم کارکن تھے۔ کہاں ٹریڈ یونینزم کے وہ ہنگامے جو خاں صاحب کا ماضی تھا، کہاں علمی تلاش و تحقیق کی تنہا سرگرمی جو جو خاں صاحب کا حال ہے۔ مگر خاں صاحب کتابوں کے ہجوم میں باہر سے اور اندر سے اتنے آباد نظر آئے کہ ایک پل کے لیے بھی کسی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ ان کی شخصیت اتنی مرتّب ہے کہ اس پر ایسے کسی سفر کا گمان تک نہیں ہوتا۔ یوں بھی ہم یہی سمجھتے ہیں کہ شاعر و ادیب چاہے لوگ اپنی مشقت اور دوسروں کی مروت سے بن جاتے ہوں، محقق ہمیشہ پیدائشی ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے ایک خاص ذہنی رویے کی۔ خاں صاحب علم و ادب ہی نہیں، ہر معاملے میں متشکّک ہیں اور تشکیک بہر حال علم کی اساس ہے۔ کارل مارکس کا سب سے پسندیدہ مقولہ یہی تھا کہ ہر حقیقت پر شک کرنا سیکھو۔ یہ اور بات کہ خود مارکس کے مقلدوں نے مطلقیت کے چکر میں یہ دولتِ اضطراب کھو دی۔ اب اپنے آپ میں آسودہ ہیں، مگر خاں صاحب ٹریڈ یونینزم کے پھیر میں پڑنے کے بعد بھی اپنے تئیں یا کسی بیرونی جبر کے تئیں خوش گمانی میں مبتلا ہونے سے بچے رہے اسی لیے آزاد دکھائی دیتے ہیں۔

اپنی آزادی کے سلسلے میں خاں صاحب ہمیشہ چوکنے رہتے ہیں۔ میں نے انھیں کبھی نے جا مفاہمت یا مصالحت کا طور اپناتے نہیں دیکھا۔ سچ بولنے کے دعوے دار تو بہت ہیں، مگر سچ کا مول چکانے کی گھڑی آتی ہے تو اچھے اچھوں کو پٹری سے اُتار دیتی ہے۔ خاں صاحب کے لیے سچ اتنی بڑی قدر ہے کہ اس کی خاطر وہ روایتی آداب کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ چلن پُرانا ہے کہ شخصیات پر جو جلسے یا سمینار ہوتے ہیں ان میں متعلقہ شخصیت ہر بشری کمزوری سے دور فرض کر لی جاتی ہے۔ خاں صاحب ایسے موقعوں پر بھی روایت اور رواج کے حصار سے باہر ملے۔ انھیں سچ اپنی عافیت سے زیادہ عزیز ہے۔ اور تو اور ایک بار کسی مذاکرے میں تدریس کے مسئلے زیرِ بحث تھے، ایسی بحثوں میں اساتذہ پیش پیش رہتے ہیں۔ سو یہاں بھی بڑا جلیل القدر اُستاد موجود تھا۔ دو تین مقرروں کے بعد خاں صاحب نے مائک سنبھالا۔ متن کی صحیح قرأت کے سوال پر انھوں نے بہت دوٹوک انداز میں کہا کہ ''ابھی جو تقریریں ہوئیں اور مقالے پڑھے گئے ان میں تلفظ کی کم سے کم بیس غلطیاں میں نے نوٹ کی ہیں۔ جب حال یہ ہے تو ہم کیا پڑھائیں گے اور طلبہ کیا سیکھیں گے۔''

وہ تو کہیے کہ جس طرح رنج کا خوگر ہونے سے رنج کا احساس جاتا رہتا ہے، اسی طرح حوصلہ منداصحاب خاں صاحب کی ایسی باتوں کے بھی عادی ہو چکے ہیں۔ لوگوں نے سن لیا، کچھ جھینپے، کچھ ہنسے، پھر اپنی پرانی ڈگر پر چل نکلے۔ شیخ بھی ہے آدمی کردار کا۔ خاں صاحب اپنی وضع پر قائم، شیخ اپنی وضع پر۔ یہ تماشا سدا یوں ہی چلتا رہے گا۔

کئی بار ذہن میں یہ بات آئی کہ رشید حسن خاں جیسے منتخبات کا مقدر کیا ہے، سوائے ایک بے بسی کے۔ یہ واقعہ بجائے خود عبرت کے لیے کافی ہے کہ ہمارا عہد، جو کمالِ بے ہنری کے اعتراف میں فیاض ہے۔ یہاں خاں صاحب جیسوں کی حیثیت بس ایک آؤٹ سائڈر (Out-sider) کی ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہ افسوس کرتے رہو اپنے آپ پر

اور دوسروں پر کہ یہ شہر شہر افسوس ہے۔ ابھی کچھ روز پہلے خاں صاحب سے ملاقات ہوئی تو خلافِ معمول دوسرے عالم میں تھے، کہنے لگے ''اب سے پہلے متعلقین یا عزیزوں میں کوئی گلہ کرتا تھا کہ میں اپنی ذاتی ذمہ داریوں کے سلسلے میں بے پرواہ رہا ہوں تو بات آئی گئی ہو جاتی تھی۔ لیکن اب عمر کی اس منزل پر کسی کسی وقت بے چینی سی ہوتی ہے۔ جو وضع اختیار کی تھی، اس کے نتائج سامنے ہیں۔''

سچ مچ انسان خسارے میں ہے۔ اور جانتا ہے کہ خسارے میں ہے اور نہیں چاہتا ہے کہ اس خسارے سے باہر آئے۔ اور نہیں چاہتا کہ اُس جرگے میں شامل ہو جائے جو خسارے میں نہیں ہے۔

(رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے، مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، صفحہ 60-54، مکتبہ الحرا، دربھنگہ بہار 2008)

○○○

ہمارے خاں صاحب

کالی داس گپتا رضا

میری کتاب 'سلطان الشعرا خاقانیِ ہند، شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی (معتبر حالات، مستند کلام)' پر انتساب ان لفظوں میں ہے: ''رشید حسن خاں کے نام جو ہمارے زمانے کے ممتاز محقق ہیں اور تدوین میں آج جن کا مدِّمقابل کوئی نہیں۔''

میں نے یہ کتاب اپریل 1997 میں مکمل کی تھی۔ ابھی چند روز پہلے خاں صاحب کی تازہ کتاب 'مثنویاتِ شوق' مجھے ملی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پیش لفظ میں جناب خلیق انجم نے میرے انتساب کی تائید اور بھی زوردار الفاظ میں کی ہے، اگرچہ انداز مختلف ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اُردو میں رشید حسن خاں کے پایے کا کوئی اور متنی نقاد ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ خاں صاحب کو متنی تنقید کے سائنٹفک طریقوں پر قدرت حاصل ہے وہ املا اا ور تلفظ کے ماہر ہیں، اسی لیے وہ متن کا جس طرح تنقیدی اڈیشن تیار کرتے ہیں وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔''

رسالہ 'کتاب نما' کے ستمبر کے شمارے میں خاں صاحب کی تازہ تصنیف 'مثنویاتِ شوق' پر ڈاکٹر گیان چند جین کا تبصرہ چھپا ہے، اُس میں انھوں نے رشید حسن خاں کو 'خدائے تدوین' کے لقب سے پکارا ہے۔ ظاہر ہے کہ تبصرے کے عنوان میں 'صحیفہ' کا لفظ اسی لقب کی رعایت سے ہے۔ عنوان ہے:

> ''خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ: مثنویاتِ شوق''

میں اس عنوان سے قطعی متفق ہوں تاہم اس عمدہ تبصرے میں ایک مقام پر اُن سے سہو ہو گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''وہ (رشید حسن خاں) رشکؔ کی لغات کا نام 'نفس اللغۃ' لکھتے ہیں... اس کا نام تاریخی ہے جو 'نفس اللغۃ' ہے اس سے تاریخِ تصنیف 1256ھ برآمد ہوتی ہے۔ اگر آخری حرف کو 'ت' لکھا جائے تو 1651ھ تاریخ نکلے گی جو صحیح نہیں ہے...''

عرض ہے کہ نفس اللغۃ میں لمبی 'ت' نہیں ہے جس کے 400 عدد لیے جائیں، یہ گول ت (ۃ) ہے جو (ہ) کے برابر نہیں مانی جائے گی جس کے پانچ ہی عدد لیے جائیں

گے۔ گویا نفس اللغتہ کے برابر نہیں بل کہ نفس اللغتہ ہی کے برابر ہے۔

میں خاں صاحب کی اعلا درجے کی تحقیق سے تو واقف تھا مگر فنِ تدوین میں اُن کی مہارت سے بہ خوبی آگاہ نہ تھا۔ دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد اور کلامِ ذوق کے بعض دوسرے مآخذ میں تحریف کے قصے زبان زدِ عام ہیں۔ اس لیے مدت سے میری تمنا تھی کہ ذوق کا وہ کلام شائع کیا جائے جس کے مستند ہونے میں کوئی کلام نہ ہو۔ اس کے لیے میں نے بیش تر 'کلیاتِ ذوق' تنویر احمد علوی اور کچھ تذکروں ہی کو پیشِ نظر رکھا کیوں کہ اُس وقت دیوانِ ذوق مرتبہ ویرانؔ و ظہیرؔ اور نگارستانِ سخن میری دسترس میں نہ تھے۔ ان ماخذوں کے بغیر کلامِ ذوق کو معتبر و مستند کیوں کر تسلیم کیا جائے! اس اثنا میں رشید حسن خاں کسی کام کے لیے ممبئی تشریف لائے اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ یہاں مہینہ بھر کے لیے رُکنے والے ہیں، میں نے موقع غنیمت اور ضعفِ بصارت کا بہانہ کر کے (جو واقعی تھا) اُنھیں کلامِ ذوق (دوڈھائی ہزار اشعار) بغیر کسی ماخذ کے بھیج دیا جو کچھ دنوں کے بعد اُنھوں نے دیکھ کر اس نوٹ کے ساتھ لوٹا دیا کہ چوں کہ کوئی کتاب (ماخذ) ان کے پاس نہیں، اس لیے اس میں غلطیاں رہ سکتی ہیں۔ اصل ماخذ سے مقابلہ کر لیجیے۔ کچھ عرصے کے بعد 'دیوانِ ذوق' مرتبہ ویرانؔ و ظہیرؔ اور نگارستانِ سخن مجھے مل گئے۔ میں نے خاں صاحب کی ترامیم کو ان ماخذوں سے ملا کر دیکھا تو اسّی فی صد ترکیبوں اور اُن پر کی گئی ترمیموں کو درست پایا اور پورے کلام پر تدوین کا کام تو اس پائے کا تھا کہ خود اُستادِ ذوقؔ بھی اُس پر ناز کرتے۔

میں خاں صاحب کا شکریہ 'پیش لفظ' میں ادا کرنا چاہتا تھا مگر وہ نہ مانے۔ تب میں نے ذیل کے انتساب میں اُن کے احسان کا کچھ بدلا چکانے کی ٹھانی اور لکھا:

''رشید حسن خاں کے نام

جو ہمارے زمانے کے ممتاز محقق ہیں اور تدوین میں آج جن کا مدِّ مقابل کوئی نہیں''

رشید حسن خاں نے بہت سے دیگر کاموں کے علاوہ پانچ عظیم کارنامے انجام دیے ہیں جن سے وہ فنِ تدوین کے شہنشاہ تسلیم کر لیے گئے، مگر یہ کام انھوں نے دم زدن میں مکمل نہیں کر لیے تھے، اِن کی تکمیل میں برسوں لگے۔ اُنھوں نے کبھی ثانوی ماخذ پر سمجھوتا نہیں کیا اور اصل ماخذ تک پہنچنے میں سالہا سال انتظار کیا۔ اُنھوں نے اس میں جو مصیبتیں اُٹھائی ہیں انھیں فرہاد بھی نہ اٹھا پاتا۔ ان کے پانچ کام یہ ہیں:

- فسانۂ عجائب
- باغ و بہار
- مثنوی گلزارِ نسیم
- مثنویاتِ شوق
- مثنوی سحر البیان (جو اس وقت زیرِ طبع ہے)

ان میں سب سے زیادہ دل چسپی مجھے 'مثنوی گلزارِ نسیم' سے تھی کیوں کہ چکبستؔ کے سلسلے میں اس کے بہت سے حوالے میرے کام میں بھی موجود ہیں۔ میں نے اُس کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خاں صاحب میں جانب داری ایسی کوئی چیز نہیں۔ جہاں انھوں نے چکبستؔ کو اُن کی غلطی پر لتاڑا ہے، ہوا شررؔ بھی اُسی سختی کا شکار ہوئے ہیں بل کہ بعض مقامات پر چکبستؔ کی حد سے زیادہ تعریف کی ہے۔ مثلاً مثنوی گلزارِ نسیم' (ص 141) پر چکبستؔ کی سخن سازی، غلط بیانی اور طرف داری کی نشان دہی کرنے سے پہلے لکھا ہے:

> ''اس بات کا اعتراف کیا جانا چاہیے کہ متعدد اعتراضات کے جواب میں چکبستؔ نے بہت تلاش کے ساتھ اسناد فراہم کیں، اس سے ان کے مطالعے کی وسعت کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض اشعار کے مفاہیم کے سلسلے میں سخن فہمی کی عمدہ صلاحیت سامنے آتی ہے اور بعض اشعار کے سلسلے میں انداز، بیان سے متعلق جو توجیہات کی ہیں وہ بھی ان کی ذہانت پر دلالت کرتی ہیں...''

23 سالہ چکبستؔ کے لیے رشید حسن خاں ایسے سخت گیر نقاد اور محقق کے یہ جملے خود میرے لیے داد کا درجہ رکھتے ہیں اور اطمینان کا باعث ہوئے ہیں کہ میں نے اگر چکبستؔ پر پانچ کتابیں تصنیف کی تھیں تو میں نے کسی غلط شاعر، نقاد اور ادیب کا انتخاب نہیں کیا تھا۔

خاں صاحب کی تازہ تصنیف 'مثنویاتِ شوق' پر ایک دوراز کار بحث اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ یہ نازیبا ہی نہیں بل کہ غلط بھی ہے کیوں کہ اُنھیں کسی شہر، کسی علاقے، کسی ملک، کسی تہذیب سے ذرہ بھر کھٹک نہیں۔ اُنھیں تو وہی لکھنا ہے جو مآخذ اور قرائن سے ثابت ہے اور بس۔

اس وقت میرے سامنے خاں صاحب کی مرتب کی ہوئی مثنوی 'گلزارِ نسیم' ہے۔ یہ کتاب 724 صفحات پر محیط ہے جب کہ نظم (مثنوی) کے کل اشعار 1531 ہیں جو کتاب کے محض 85 صفحوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ باقی ماندہ 639 صفحوں میں اس مختصر مثنوی پر کیا لکھا گیا ہوگا۔ سو عرض ہے کہ ان لگ بھگ ساڑھے چھ سو صفحوں پر درج ایک حرف بھی ضرورت سے زیادہ نہیں۔ چاروں کتابوں کا یہی حال ہے تشریحات اور فرہنگیں اس درجہ عالمانہ ہیں کہ اگر اُنھیں الگ سے چھاپ دیا جائے تو وہ مستقل حوالے کی کتابیں بن جائیں۔

ایک بات بھی اور عرض کر دوں۔ میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سُنا ہے کہ خاں صاحب خشک انسان ہیں۔ اُنھیں شاعری سے کیا لینا دینا۔ وہ شاعروں پر کیوں لکھتے ہیں وغیرہ۔ مگر میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اُنھیں لطافتِ شعری سے گہرا لگاؤ ہے اور فنِ شعر سے گہری واقفیت ہے۔ وہ عروض کے غوامض و دقائق سے باخبر ہیں اور اُنھیں محاورہ، روزمرہ پر عبور حاصل ہے، اُن کی 'چُپ' سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

اُنھیں حال ہی میں مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے وہ اس سے زیادہ کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ دانشور طبقہ ہر عہد میں ان کے کاموں کی عظمت کا اعتراف و اقرار کرے گا اوراں صاحب کا احسان مند رہے گا۔

اس سے پہلے کہ مضمون ختم کروں خاں صاحب کے خطوں کے بارے میں بھی کچھ بات ہو جائے۔ اب یہ عام طور پر معلوم ہے کہ مکتوب الیہ خطوں کو سنبھال کر رکھتا ہے اور اُنھیں ضائع نہیں کرتا تاکہ بہ وقتِ ضرورت بطورِ سند یا شہادت استعمال کیا جا سکے۔ نتیجے میں مکتوب نگار بھی اُتنا ہی محیط ہو گیا ہے۔ وہ بھی اپنے خط میں صحیح صورتِ حال لکھنے سے گریز کرتا ہے۔ اس لیے اب خطوں کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی جو رہنی چاہیے تھی۔ چناں چہ خاں صاحب نے مجھے بتایا کہ اب وہ خطوں کو جمع نہیں کرتے بل کہ جواب لکھ دینے کے بعد تلف کر دیتے ہیں، کیوں کہ اب اُن کی قدر و قیمت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ بات دل کو لگتی ہے بل کہ ہر اُس شخص کے دل کو لگے گی جسے تحقیق کے فن سے مَس ہے۔ میں بھی اسی اصول پر عمل پیرا ہوں۔ میں اب اُنھی خطوں کو فائل میں رکھتا ہوں جن میں کوئی علمی ادبی نکتہ بیان کیا گیا ہو یا جو کسی لحاظ سے دل چسپ ہوں۔

خاں صاحب اپنی معلومات یا کسی عقدے کے حل کی تصدیق کے لیے ڈھیروں خط لکھ ڈالتے ہیں۔ ہر اُس شخص کو خط لکھ دیں گے جس سے معلومات میں ذرا سا بھی اضافہ ہونے کا امکان ہو۔ یہی انہماک ہے جو انھیں دوسرے محققوں اور مرتّبوں سے ممتاز کرتا ہے۔

ذیل میں خطوں کے چند اقتباس دیے جاتے ہیں جن سے اُن کا طریقۂ کار اور ان کی مختلف کیفیتیں سامنے آ جائیں گی۔

14 جولائی 1996 کے خط میں لکھتے ہیں: ''میں نے 'مثنویاتِ شوق' کو مکمل کر لیا، زیرِ کتابت ہے۔ اب کل سے 'سحر البیان' کو شروع کیا ہے۔ اِدھر اُدھر خطوں کے گھوڑے دوڑا رہا ہوں۔ آپ کے پاس کوئی خطی یا مطبوعہ نسخہ ہے؟''

ایک محقق کے نزدیک اس خط کی اہمیت یہ ہے کہ:

- رشید حسن خاں نے 'مثنویاتِ شوق' کو 14 جولائی 1996 سے پہلے مکمل کر لیا تھا اور اب اس کی کتابت ہو رہی ہے۔ دوسرے
- یہ کہ 'مثنوی سحرالبیان' کی ترتیب کا کام انھوں نے 15 جولائی (1996) سے شروع کیا ہوگا۔

درجِ بالا اقتباس میں نے ایک محقق کے نظریے کی وضاحت کے لیے شامل کیا ہے۔

5 دسمبر 1995 کے خط میں درج ہے:

''اب (گلزارِ نسیم) میں بعض مقامات تصحیح طلب رہ گئے ہیں اور کیا کہوں۔ بشریت۔ مندرجہ ذیل مقامات پر اپنے نسخے میں تصحیح کر لیجیے۔ ممنون ہوں گا:

ص405: حاشیہ: ''باپ اپنی بیٹی سے کہتا ہے''

صحیح صورت: ''ماں اپنی بیٹی سے کہتی ہے''

ص407: سطر 9: نسیمؔ کے اُستاد بھائی رشکؔ کا شعر

میں جزِ اوّل کو قلم زد کر کے صرف

''رشکؔ کا شعر رکھیے۔ رشکؔ تو ناسخؔ کے شاگرد تھے۔

معلوم نہیں کس دُھن میں اُستاد بھائی لکھ گیا...''

اس اقتباس میں کوئی علمی، ادبی نکتہ نہیں۔ یہ اُن کے لیے ہے جن کے پاس 'گلزارِ نسیم' مرتبہ رشید حسن خاں ہو۔ وہ براہ کرم اپنے نسخے میں تصحیح کر لیں۔

6 دسمبر 1995 کے خط سے ایک اقتباس دیکھیے:

''زبانی روایتوں نے اور بزرگوں اور واقف کاروں کی مبینہ روایتوں نے جو گُل کھلائے ہیں، اُن سے تو آپ بھی واقف ہیں۔ جب تک قابلِ قبول روایت نہ ملے، بات ناتمام اور مشکوک رہے گی۔ مجھے آپ سے مکمل طور پر اتفاق ہے کہ شہرت کی بے جا خواہش، اب ہوس میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے اور اس طرح کہ اُسے دیکھ کر عبرت ہوتی ہے۔ آدمی کو جو عزت و شہرت اُس کے کاموں کی بنا پر ملی ہو اُسی پر اکتفا کرنا چاہیے۔

محققین... کے حصے میں شروع ہی سے اور ہر جگہ بے قدری آئی ہے۔ یہ سخت جانی کا کرشمہ ہے کہ آپ اور ہم پھر بھی کام کیے جاتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ہم کو اور آپ کو شہرتِ عام ویسے بھی راس نہیں آ سکتی اور وہ ہمارے کام کی بھی نہیں...''

19 جون 1995 کے خط کی آخری سطریں ملاحظہ کیجیے:

''گلزارِ نسیم تو مدخولۂ ناشر اور مخزونۂ پریس ہے؛ معلوم نہیں کب چھپے۔ اس سے مجھے بہت کوفت ہوئی ہے، مگر وہی بات:
بندگی بے چارگی، کیا کرسکتا ہوں...''

خاں صاحب یوں تو قابل نوجوانوں کی حوصلہ افزائی ہی کرتے ہیں مگر کبھی کبھی جھلاّ بھی اُٹھتے ہیں۔ 3 جون 1995 کے خط کا اقتباس کسی ایسی ہی عارضی جھلاّہٹ کا غماز ہے:

''میں خود حیران تھا کہ دونوں شماروں کی رسید نہیں ملی۔ اب معلوم ہوا کہ کیا ہوا تھا۔ سخت بیزار ہوں مگر کیا کروں، چہ تواں کرد مرد ماں ایند۔ یہ نئی نسل حد سے زیادہ بے پروا ہے۔ انھیں تو جدیدیت کے سوا اور کچھ راس ہی نہیں آتا....

صاد	آنکھوں	کی	دیکھ	پسر	کی
بینائی	کے	چہرے	پر	نظر	کی

صاد چوں کہ مذکر ہے اس لیے مصرع میں 'صاد آنکھوں کے' کہنا چاہیے مگر 'صاد آنکھوں کی' مشہور ہو گیا ہے۔''

26 فروری 1993 کے خط کی آخری چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''اس شعر کی غلط قرأت نے لغت تک میں رسائی حاصل کر لی ہے۔ میں نے اس پر بہت مفصل حاشیہ لکھا ہے۔ داغؔ سے مجھے اتفاق ہے۔ پہلے ہی میں نے اسی طرح لکھا تھا۔ اطمینانِ کلی کے لیے مشورہ کرنا ضروری خیال کیا ہے...''

اس حزم و احتیاط کا جواب نہیں۔ اُن کے کام کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ خاں صاحب کسی کی تعریف نہیں کرتے مگر یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ آپ کوئی اچھا کام کر کے دکھائیے؟ ادھورے اور خام کام پر اُن سے داد لینا ممکن نہیں۔

28 مارچ 1992 کے ایک خط میں میری کتاب موصول ہونے پر لکھتے ہیں:

''انتخاب کا تحفہ مل گیا۔ اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں... آپ کی کاوش قابلِ داد اور سزاوارِ تحسین و آفرین ہے۔ جی خوش ہو گیا دیکھ کر...''

اس سے پہلے کا ایک خط مورخہ 24 جون 1993 بھی اسی زمرے میں آتا ہے، لکھتے ہیں:

''کتابوں کا تحفہ ملا تھا۔ افریقہ سے متعلق کتاب جو پڑھنی شروع کی تو دل چسپی نے اُسے ختم کرنے سے پہلے رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ جی خوش ہو گیا۔ اس لطفِ خاص کے لیے شکر گزار ہوں...''

اس سے بھی پہلے 22 ستمبر، 1992 کو لکھتے ہیں:

''بے صبؔر والی کتاب مل گئی۔ آپ کام تو ہمیشہ سلیقے سے کیا کرتے ہیں اور اس کی نمود اس میں بھی ہے اور خوب ہے...''

14 دسمبر کے خط سے بھی یہ چند سطریں دیکھ لیجیے:

''مجھے جوشؔ ملشیانی سے متعلق کتاب خاص کر پسند آئی۔ غالبؔ پر تو لکھا جاتا رہے گا، مگر ایسے باکمال اساتذہ کو ہم سب بے طرح بھلائے بیٹھے ہیں۔ آپ کی اس کتاب سے مرحوم کی یاد دلوں میں تازہ ہو جائے گی اور یہ بڑی بات ہے...''

2 مئی 1989 کے خط میں رقم طراز ہیں:

''بہ ہر طور، آپ کی عرق ریزی اور جاں فشانی کا تو پہلے سے قائل ہوں، اب ان کتابوں کو خاص کر 'دیوانِ غالب' پڑھ کر اور قائل ہو جاؤں گا۔ اب اس طرح کام کرنے والے ہمارے پاس کتنے آدمی ہیں؟ انگلیوں پر گنے جانے کے بہ قدر بھی تو نہیں...''

اب چند خطوں میں اس 'خشک انسان' کی زندہ دلی اور شوخی بھی ملاحظہ کیجیے:

8 جولائی 1992:

''ایک پیکٹ ملا تین کتابوں کا، جس پر تین نام لکھے ہوئے ہیں، یعنی میرا نام کسی دانے پر نہیں....''

10 دسمبر 1996:

''چوں کہ آپ آسمانی بزرگ وار اللہ میاں عرف بھگوان صاحب کی شرن میں رہتے ہیں، اس لیے یقین ہے کہ بہ عافیت ہوں گے...''

4 فروری 1997:

''آپ جیسے کام کرنے والوں کا یہ حال، مگر ایسا شروع سے ہوتا رہا ہے، شرفائے ادب پریشاں خاطر رہے ہیں یا پریشاں حال۔ میرے اور آپ کے

ممدوح کے مطابق: موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں...''

میں نے شاید لکھا ہوگا کہ مختلف عارضوں میں گھرا رہنے کی وجہ سے اب مزید کام سے دست بردار ہوا چاہتا ہوں۔ جواب میں 29 مئی 1997 کو تحریر فرماتے ہیں:

''دیکھیے صاحب! ادبی کاموں کی چشک لگ جائے تو پھر چھوٹتی نہیں اسے بھی آتشک کا مرض سمجھیے۔ آپ کیسا بھی عہد کر لیں اور پیمان باندھیں ،کریں گے وہی ادبی کام، ضرور بالضرور، آپ رہ نہیں سکتے میرا احوال بھی یہی ہے۔ اس لیے آپ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اُسے 'تصوف برائے شعر گفتن خوب ست' کے ذیل میں رکھتا ہوں: اُس پر یقین ہے....''

'مثنوی سحرالبیان' کی ترتیب کے دوران میں انھیں فنِ موسیقی کے باب میں بڑی کھیکھڑ اُٹھانی پڑی۔ 16 دسمبر 1997 کے ایک خط کا آخری حصہ پیش قارئین ہے (مثنوی سحرالبیان کا ایک شعر ہے)۔

''کوئی	فن	میں	سنگیت	کے	شعلہ	رو
برم	جوگ	کچھی	کی	لے	پر	ملو

یہاں میں بالکل پیدل ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن بھی موسیقی سے میری ہی طرح واقف تھے۔ برم اور جوگ کو تو معنی پہنا لیے کہ یہ طبلے کی دو تالیں ہیں، مگر 'کچھی' سمجھ میں نہیں آیا اور پُر ملو تو ایک کلاسکی رقص ہے۔ اس کا یہاں کیا کام...

ارے صاحب! میں تو پھنس گیا ہوں، کچھ سوچیے اور کچھ تاویل کیجیے اور ان لفظوں کے فصیح معنی اختصار کے ساتھ لکھ دیجیے۔ خاص کر کچھی کے۔ اور دوسرے مصرعے کے چول کیسے بیٹھے گی۔ آپ کے جواب کے لیے چشم بہ راہ ہوں۔ آپ کی ستارنوازی کب کام آئے گی...''

میں نے خاں صاحب کے ادبی خطوں کا عمداً ذکر نہیں کیا ہے کیوں کہ وہ خاصے طویل اور دقیق ہیں۔ یوں بھی 'رشید حسن خاں' ایک مستقل اور وسیع موضوع ہے۔ اُس پر تفصیلی گفتگو کبھی آیندہ کی جائے گی، فی الحال اتنا ہی۔

(سہ ماہی ترسیل بمبئی، گوشۂ رشید حسن خاں مشترک شمارہ 22-21 جنوری تا جون 1999، مدیر یونس اگاسکر، صفحہ 6۔13)

OOO

رشید حسن خاں

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی
(لاہور)

رشید حسن خاں سے میرا اوّلین تعارف، اِملا کے موضوع پر ان کی بے مثال کتاب 'اُردو اِملا' کے ذریعے ہوا، جو بالکل اتفاقیہ طور سے مالیر کوٹلہ کے مرحوم دوست ماسٹر محمد کفایت اللہ کے ذریعے ہاتھ لگی تھی۔ کفایت صاحب 1977 اور مابعد کے زمانے میں پاکستان کے سالانہ دورے میں بھارتی کتابوں کے لیے بہت سے دوستوں کی فرمائشیں پوری کیا کرتے تھے۔ میں اُن دنوں پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر رہا تھا اور میرا موضوع اقبال کے متنِ نظم و نثر کا مطالعہ اور اس کی تدوین سے متعلق تھا۔ چند ماہ بعد ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ بھی مل گئی۔ مجھے اپنے تحقیقی کام میں خاں صاحب کی دونوں کتابوں سے بیش بہا مدد ملی۔ مطالعۂ متن اور تدوینِ متن کے مسائل اور اس کی نزاکتوں کا صحیح شعور، خاں صاحب

ہی کی تحریروں سے حاصل ہوا اور مجھے ان کی علمی و تحقیقی بصیرت سے بہت راہ نمائی ملی۔

غالباً 1984 کے اوائل میں میں نے اپنا پی ایچ ڈی کا مطبوعہ مقالہ رشید حسن خاں کو ڈاک سے بھیج دیا۔ چند دن بعد ان کا بے حد حوصلہ افزا جواب آیا۔ (یہ خط زیرِ نظر مجموعے میں شامل ہے۔) اندازہ ہوا، وہ مقالے کے معیار سے مطمئن، بل کہ بہت خوش تھے۔ اکتوبر 1984 میں وہ پہلی بار پاکستان آئے۔ نقوش کے مدیر محمد طفیل مرحوم کے ہاں مقیم تھے۔ طفیل صاحب نے ایک شام چند احباب کو اپنے گھر (نیو مسلم ٹاؤن) مدّعو کیا۔

رشید حسن خاں سے بالمشافہہ یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس موقع پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن مرحوم، ڈاکٹر تحسین فراقی، محمد اکرام چغتائی اور عطاء الحق قاسمی بھی موجود تھے۔ نوائے وقت لاہور کے ادبی صفحے کے انچارج بیدار سرمدی نے خاں صاحب کا ایک تفصیلی انٹرویو لیا، جو 13 اکتوبر 1984 کو نوائے وقت میں شائع ہوا۔ اسی دورے میں وہ کراچی بھی گئے۔ علی حیدر ملک نے روزنامہ جسارت کراچی میں 14 اکتوبر 1984 کو ان کا انٹرویو شائع کیا۔ اصل میں یہ وہ موقع تھا، جب محمد طفیل مرحوم نے انھیں نقوش کے رسول نمبر کی تقریب (منعقدہ اواری ہوٹل) میں مدّعو کیا تھا۔ صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق اس تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے۔ جلسے کے بعد، چائے پر مہمانوں سے جنرل کا رسمی تعارف کرایا گیا۔ انھوں نے مہمانوں کو اسلام آباد آنے کی دعوت دی، چناں چہ خاں صاحب اور ڈاکٹر خلیق انجم وغیرہ سٹیٹ گیسٹ کے طور پر، پورے سرکاری اہتمام (پروٹوکول) کے ساتھ اسلام آباد گئے، جہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ صدر ضیاء الحق سے ملاقات کے موقع پر بھارت کے سفیر بھی موجود تھے۔ واپس لاہور آئے تو خاں صاحب صدر ضیاء الحق سے بہت متاثر نظر آتے تھے اور ان کے، ایک فوجی ڈکٹیٹر ہونے کے باوجود، ان کی شرافت، وضع داری اور اہلِ علم کی قدر افزائی کی تعریف کر رہے تھے۔ ضیاء الحق نے انھیں کچھ تحائف بھی دیے تھے، جن میں ایک ایک قالین بھی شامل تھا۔ ان قالینوں کو دہلی میں واقع پاکستانی سفارت خانے کے واسطے سے مہمانوں کے گھروں تک دہلی پہنچا دیا گیا۔

تقریباً دو سال بعد، اپریل 1986 میں مجھے عالمی اقبال سمینار میں شرکت کے لیے حیدر آباد دکن کا سفر درپیش ہوا۔ دلّی پہنچ کر میں نے فوراً رشید حسن خاں کو ایک پوسٹ کارڈ لکھ دیا کہ دکن سے واپسی پر ملاقات کے لیے حاضر ہوں گا۔

26 اپریل کو دہلی کے راؤز ایونیو پر واقع انجمن ترقی اُردو کے دفتر (اُردو گھر) پہنچا۔ چند منٹ بعد، (یہاں دو روز سے جاری) ایک سمینار کے خاتمے پر، بہت سے مشاہیر ادب کی زیارت ہوئی اور مختصر ملاقات بھی، بیش تر سے پہلی بار۔ (مالک رام صاحب، عبدالمغنی صاحب، عبداللطیف اعظمی صاحب، ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب، شارب ردولوی وغیرہ) خاں صاحب بھی موجود تھے۔

ہم تینوں (خاں صاحب، عبدالمغنی صاحب اور راقم) انجمن کے دفتر سے نکل چلے۔ دونوں حضرات کو ایک ہی سمت میں جانا تھا۔ عبدالمغنی صاحب آج شام کی پرواز سے پٹنہ جا رہے ہیں۔ کہنے لگے روانگی میں دو تین گھنٹے باقی ہیں۔ آپ میرے ساتھ آیئے، میں بہار بھون میں ٹھہرا ہوا ہوں، وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔

پیدل چلتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ تفصیل تو یاد نہیں، لیکن دونوں کی شگفتہ بیانی اور حاضر جوابی کا ایک نقش ضرور باقی ہے۔ دونوں بزرگ برابر کی چوٹ تھے۔ ترکی بہ ترکی جواب دینے میں ماہر۔ میں ان کی باتیں سُن سُن کر محظوظ ہوتا رہا۔ آخر ایک موڑ پر عبدالمغنی صاحب اور خاں صاحب کے راستے جدا ہو گئے۔ (ڈاکٹر عبدالمغنی سے اس ملاقات اور لاہور میں دوسری ملاقات (نومبر 1998) کی مختصر رُوداد میں اپنے ایک مضمون بعنوان ''ڈاکٹر عبدالمغنی: ایک جید نقاد اور اقبال شناس'' میں بتا چکا ہوں۔ یہ مضمون اورینٹل کالج میگزین لاہور، ہماری زبان، دہلی کے ڈاکٹر عبدالمغنی نمبر اور اُردو ڈائجسٹ لاہور میں چھپ چکا ہے۔)

ایک دو روز بعد محمد کفایت اللہ مالیر کوٹلہ سے دہلی پہنچے۔ میں نے بتایا کہ آج شام خاں صاحب سے ملاقات طے ہے، وہ بھی ساتھ ہو لیے۔ ہم گائر ہال پہنچے۔ ایک چار پائی پر کتابیں بڑے سلیقے سے اس طرح چنی ہوئی تھیں کہ ان کے پشتے نظر آ رہے تھے۔ شاید کچھ کتابیں دو ایک الماریوں میں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے ایک کتاب مالک رام: ایک مطالعہ از ایم شاہد کی تلاش تھی۔ خاں صاحب کے پاس ایک فاضل نسخہ موجود تھا، ازراہِ تلطف مجھے دے دیا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے کہا: آیئے! کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ طعام خانہ (ڈائننگ ہال) ان کے کمرے سے بالکل متصل تھا۔ ان کے ساتھ ہوسٹل کا لذیذ ویجی ٹیرین کھانا کھایا اور اس دوران میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔ کھانے کے بعد پھر کمرے میں بیٹھ گئے اور کچھ دیر بعد رخصت لی۔

1992 میں وہ ''نقوش اوارڈ'' کی تقریب میں شرکت کے لیے پھر پاکستان آئے۔ یہ تقریب اسلام آباد میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میں خاں صاحب کو بھی اوارڈ دیا گیا۔

محمد طفیل مرحوم کے لائق فرزند جاوید طفیل، تقریب کے بعد مہمانوں کو اسلام آباد سے لاہور لے آئے اور ایک روز پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں ''ملاقات کا ایک بہانہ'' کے عنوان سے خاں صاحب سے لاہور کے ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کی ملاقات کا اہتمام کیا۔ اگلے روز، اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو نے سینٹ ہال میں ان کے لیکچر کا اہتمام کیا، جس کا موضوع ''تحقیق'' تھا۔ اس جلسے کی صدارت معروف دانش ور اور ممتاز نقاد مظفر علی سید نے کی تھی۔ اسٹیج پر محترم میرزا ادیب اور جناب انتظار حسین بھی رونق افروز تھے۔ رشید حسن خاں کے بعض قارئین سمجھتے تھے کہ ان کی تحریروں میں خشک مزاجی اور ''پٹھانیت'' کا ایک عنصر پایا جاتا ہے: مگر اس جلسے میں ان کی صاف گوئی، کھری کھری باتوں، دل نشین لب و لہجے اور بحیثیت مجموعی عمدہ گفتگو نے اس تاثر کو ختم کر دیا اور ان کی باتوں نے ''دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے'' کے مصداق سامعین و حاضرین کے دِل پر دستک

دے کر، ہر طرح کی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا۔ تحقیق کے خشک موضوع پر ایسے خوب صورت لیکچر کے بعد، طلبہ اور طالبات ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ان سے بڑھ بڑھ کر آٹو گراف لینے لگے۔ کچھ دیر اورینٹل کالج کے ایوانِ اساتذہ میں چائے کی نشست پر بھی ملاقات رہی، سوال و جواب ہوتے رہے۔ اپنے چند روزہ قیام میں خاں صاحب لاہور کے علمی، تحقیقی اور ادبی حلقوں میں اپنی شخصیت کا بہت اچھا، مثبت اور خوش گوار نقش چھوڑ گئے۔

جون 1997 میں دہلی یونی ورسٹی کے اقبال سیمینار میں شرکت کے لیے دہلی گیا۔ (ہمراہ: ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر محمد ایوب صابر) رشید حسن خاں مستقلاً شاہ جہاں پور منتقل ہو چکے تھے، ہم دہلی یونی ورسٹی کے مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ شاہ جہاں پور جا چکے ہیں، پھر بھی ایک روز علی الصبح میرے قدم گائر ہال کی طرف اٹھ گئے۔ ہر سو ہو کا عالم طاری تھا۔ کمرہ نمبر 9 پر جسے رشید حسن خاں خالی کر گئے تھے، تالا پڑا ہوا تھا۔

1994 کے بعد ان سے رابطے کا واحد ذریعہ کتابت ہی رہ گیا۔ تبادلۂ خطوط نسبتاً زیادہ ہونے لگا، بایں ہمہ ان دنوں بھارت کا ویزا قدرے آسانی سے ملنے لگا تھا۔ سوچتا تھا کہ شاہ جہاں پور کا ویزا لوں اور ان سے مل آؤں، لیکن یہ سوچ، خواب و خیال سے آگے نہ بڑھ سکی۔ آخری دو برسوں میں فون پر ان سے بات ہو جاتی تھی، جس کا بڑا موضوع کلیاتِ اقبال، اُردو کی تدوین کے مسائل تھے۔

تیس بتیس سال کے تعلق میں اگرچہ رشید حسن خاں سے بالمشافہہ ملاقاتیں بہت کم رہیں، مگر میں نے انھیں ہمیشہ اپنے دل کے قریب پایا۔ 1984 میں جس تعلقِ خاطر کا آغاز ہوا تھا، اس کا اندازہ ان پچاس خطوں سے لگایا جا سکتا ہے، جو زیرِ نظر مجموعے میں جوں کے توں پیش کیے جا رہے ہیں۔

2

مشفق خواجہ کی وفات (21 فروری 2005) کے تقریباً سال بھر بعد (26 جنوری 2006) رشید حسن خاں کا سانحۂ ارتحال پیش آیا تھا۔ دونوں کی رحلت ہماری علمی اور ادبی زندگی کے چند المناک حادثات میں سے ہے۔ ایک برس کے وقفے سے یکے بعد دیگرے دُنیائے تحقیق و تدوین کے آفتاب و ماہتاب، دونوں ہی غروب ہو گئے۔

رشید حسن خاں اپنے بے باکانہ، سخت گیر اور کڑے مزاج کی وجہ سے جلال کا ایک نمونہ تھے اور خواجہ صاحب اپنی دل نواز شخصیت کے سبب ایک پیکرِ جمال تھے۔ جہانِ اُردو اور جہانِ تحقیق و تدوین میں دونوں سے اُجالا تھا، روشنی تھی۔ آفتاب و ماہتاب دونوں غروب ہو گئے۔ لگتا ہے، دونوں جہاں تاریکی میں ڈوب گئے ہیں۔

میں نے اپنے نام مشفق خواجہ کے 143 خطوط کا مجموعہ 2008 میں شائع کیا تھا اور خیال تھا کہ خاں صاحب کے خطوط جلد تر شائع کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ (محبی عبدالوہاب خاں سلیم بھی بار بار اشاعت کا تقاضہ کر رہے تھے) لیکن مکروہاتِ زمانہ، مصروفیاتِ منصبی، لکھنے پڑھنے کے مشاغل، گھریلو ذمہ داریاں اور کچھ صحت کے مسائل آڑے آتے رہے (ذرہ ذرہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے.... اقبال) چناں چہ تمام تر عزم و ارادے کے باوجود، مجموعہ تیار ہوتے ہوتے ان کی وفات پر تین سال گزر گئے۔ اب بھی اگر عزیز محترم ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد میری درخواست پر ان خطوط کی ترتیب و تیاری اور ان پر حاشیہ نگاری کی ذمہ داری نہ اٹھاتے تو مجموعے کی اشاعت، نہ جانے کب تک معرضِ تعویق میں رہتی۔

بھارت کے علمی و ادبی حلقوں میں رشید حسن خاں کا نام، ان کی شخصیت اور ان کے کارنامے محتاجِ تعارف نہیں۔ وہاں قریب قریب تمام علمی و ادبی حلقے، جامعات کے بیش تر اساتذہ و طلبہ، بل کہ دینی مدرسوں اور صوبائی اکادمیوں کے وابستگان بھی خاں صاحب کو بخوبی جانتے ہیں، لیکن پاکستان کے بیش تر علمی اور ادبی حلقے ان سے کماحقہٗ آشنا نہیں (نام ضرور سُن رکھا ہے) پاکستان کے چند ناشرین نے خاں صاحب کی بعض تصانیف کے غیر قانونی اور جعلی اڈیشن شائع کیے تو یہ ایک حد تک، رشید حسن خاں کے تعارف کا ذریعہ بن گئے، لیکن اب بھی مجھے یقین ہے کہ ہماری جامعات کے متعدد اساتذہ اور علمی و تحقیقی اداروں کے بہت سے تحقیق کاروں نے اُن کی کسی ایک کتاب کا بھی غور سے مطالعہ نہیں کیا ہوگا۔ سو مناسب ہوگا کہ یہاں رشید حسن خاں کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔ جو لوگ انھیں نہیں جانتے، وہ زیرِ نظر سطور پڑھ کر ان کا اجمالی تعارف حاصل کر لیں گے۔ جو خاں صاحب کو جانتے ہیں، وہ انھیں کچھ اور جان جائیں گے۔

3

رشید حسن خاں کا سالِ ولادت، ان کے بقول: ''1925 ہے' دسمبر کا مہینا تھا' تاریخ کا علم نہیں۔'' ان کے والد امیر حسن خاں پولیس کی ملازمت میں تھے، مگر کٹر قوم پرست تھے۔ تحریکِ عدمِ تعاون میں ''مولویوں کے بہکانے میں آکر نوکری چھوڑنے پر تیار ہو گئے۔'' لیکن پھر دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کے سمجھانے بجھانے پر استعفے کے بجائے، قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔

امیر حسن خاں طبیعت کے بہت سخت تھے، دل کے بہت صاف اور نرم تھے۔ اگرچہ نرمی کا اظہار بہت کم ہو پاتا تھا۔ وہ کٹر دیوبند مخالف تھے۔

''جب رشید حسن خاں نے قرآن پاک ختم کیا تو ان کے اُستاد نے اپنا باترجمہ قرآن پاک کا ذاتی نسخہ بطور انعام انھیں دے دیا۔ یہ مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمۂ قرآن تھا۔ خوش خوش گھر آکر دکھایا کہ مولوی صاحب نے یہ قرآن شریف انعام میں دیا ہے۔ والد نے کھول کر دیکھا تو بقول رشید حسن خاں: ''چہرے کا رنگ بدل گیا، بل کہ بگڑ گیا۔ انتہائے غضب میں کہنے لگے کہ اس وہابڑے کا ترجمہ میرے گھر میں بھیجا گیا ہے۔'' مگر کیا کرتے، قرآن شریف کی

بے ادبی تو کر نہیں سکتے۔'' کچھ دیر بل کھاتے اور بڑبڑاتے رہے، پھر والدہ کو آواز دی: قینچی لاؤ، وہ لے آئیں۔ میری آنکھوں نے سامنے سارے حاشیے کاٹ کر چولھے میں جلا دیے اور اس پر بل کھاتے رہے کہ ترجمہ تو باقی رہ گیا، اس میں تو کچھ کر نہیں سکتے تھے۔''

امیر حسن خاں سرکاری اسکولوں کی تعلیم کے خلاف تھے، کیوں کہ وہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی، اس لیے بیٹے کو دینی تعلیم کے لیے شاہ جہاں پور کے مدرسے بحرالعلوم میں داخل کرا دیا۔ وہ پانچ سال تک (1939-1934) یہاں زیرِ تعلیم رہے۔ درسِ نظامی کی تکمیل نہ کر سکے، کیوں کہ گھر کے حالات بہت پریشان کن تھے۔ ذریعۂ آمدن صرف والد کی پنشن (5 روپے 2 آنے) تھا، اس لیے تعلیم ادھوری چھوڑ کر ایک معمولی مزدور کی حیثیت سے آرمی کی آرڈیننس کلودنگ فیکٹری میں بھرتی ہو گئے۔ اُس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی۔ فیکٹری کے مزدور صاحبانِ اختیار کے ظلم و زیادتی اور احتصال کا شکار تھے۔ 1940 کے وسط میں مزدوروں میں سے چند لوگوں نے مل کر چھپ چھپا کر ٹریڈ یونین قائم کر لی۔ فیکٹری میں ایسی سرگرمیوں کی کلی ممانعت ہوتی ہے، اس لیے یہ بڑی جرأت کی بات تھی۔ اسی اثنا میں یوپی کے بعض کمیونسٹ لیڈر وہاں آنے لگے۔ خاں صاحب کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ ان لیڈروں میں دوغلا پن ہے۔ ان کا نعرہ یہ تھا کہ ''دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ'' مجھے یہ بڑا کھوکھلا نعرہ اور محض ایک سیاسی ہتھکنڈا محسوس ہوتا تھا، کیوں کہ ہر ملک، بل کہ ہر کارخانے کے مسائل یکساں نہیں۔ پھر وہ سب ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ بہر حال ان لیڈروں کے طرزِ عمل سے رشید حسن خاں صاحب بہت بددل ہوئے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی یہ سب، بقول خاں صاحب: اَپر کلاس سے آئے تھے۔ ان کی توجہ مزدوروں کے مسائل حل کرنے سے زیادہ، پارٹی کی آئیڈیالوجی پھیلانے پر ہوتی تھی۔ رشید حسن خاں مزدوروں کی یونین کے جوائنٹ سکرٹری تھے۔ یونین نے ایک موقع پر فیکٹری میں ہڑتال کرائی۔ جو ''کسی بھی آرڈنینس فیکٹری میں پہلی باضابطہ سٹرائیک تھی۔'' یہ ہڑتال مسلسل 33 روز چلی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد، فیکٹری میں چھٹنی شروع ہوئی۔ نکالے جانے والے مزدوروں کی پہلی ہی فہرست میں رشید حسن خاں کا نام بھی شامل تھا اور کیوں نہ ہوتا، وہ ہڑتال کرنے اور کرانے والوں میں پیش پیش تھے۔ بہر حال انھیں ملازمت سے نکال دیا گیا۔ یہ 1946 کی بات ہے۔

خیال رہے کہ رشید حسن خاں فقط اس ملازمت پر قانع نہیں رہے، ان کے اندر حصولِ تعلیم کا جو ایک طبعی رجحان تھا، اس کے تحت وہ ملازمت کی پابندیوں اور ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ، اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کے لیے بھی برابر کوشاں و سرگرداں رہے۔ وہ اس غربت، خودداری، محنت پیہم اور حصولِ علم کی لذتوں کو باہم آمیز کر کے جادۂ حیات پر کس طرح آگے بڑھے، یہ حکایتِ لذیذ خود انھیں کی زبانی سنیے:

> ''1945 تک (فیکٹری میں) کام کرتا رہا۔ اوقاتِ فرصت میں تعلیم بھی حاصل کرتا رہا۔ والدہ مرحوم ہو چکی تھیں۔ بوڑھے والد، 6 سال کی ایک بہن اور 8 سال کا ایک بھائی میرے متعلقین میں سے تھے۔ دونوں وقت خود کھانا پکاتا تھا، بہن بھائی کی خبر گیری کرتا تھا اور بعد مغرب مکان سے دو میل کے فاصلے پر ایک بزرگ کے پاس پڑھنے جاتا تھا، جہاں 10 بجے رات تک پڑھتا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا میرے یہ اُستادِ محترم (خدا انھیں سلامت رکھے) کس شفقت، دل سوزی اور محنت سے پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں عربی کی درمیانی کتابیں اور فارسی کی اعلا کتابیں زیرِ درس تھیں۔ 1945 کے آخر میں جب خاتمۂ جنگ کی خوشی میں کارخانے میں کمی کی گئی تو میں دوسرے ہزاروں مزدوروں کے ساتھ بے کار ہو گیا۔ کچھ دن تک ایک زمین دار صاحب کے یہاں کارندہ گیری کا کام کیا۔ جیٹھ بیساکھ کی بھری گرمی اور چل چلاتی دھوپ میں گاؤں در گاؤں خاک چھانتا پھرتا تھا۔ تنخواہ صرف 25 روپے تھی۔ پھر دو سال بعد ایک فلور مل پر ''منشی جی'' بن گیا، جہاں 30 روپے تنخواہ ملنے لگی۔ صبح 7 بجے سے 8 بجے رات تک کام کرنا پڑتا۔ تعلیم حسبِ معمول جاری رہی۔ 2 سال بعد راشن کی دُکان پر محرری کی نوکری مل گئی۔ اب تنخواہ 45 روپیہ (کذا) ہو گئی۔ اس دوران میں میں فارسی و عربی کے بعض امتحانات بھی پاس کر چکا تھا۔ 50ء میں ایک عربی مدرسے میں بنگالی طلبہ کو ابتدائی عربی اور منشی و کامل کے طلبہ کو فارسی پڑھانے کے لیے نائب مدرس کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ اب تنخواہ 55 روپے ہو گئی۔ 52ء میں شہر کے ایک ہایر سکینڈری اسکول میں پرشین ٹیچر کی جگہ خالی ہوئی، ایک پرانے مولوی صاحب اُمیدوار تھے۔ میں نے مولوی کا امتحان ضرور پاس کیا تھا، لیکن ڈاڑھی بالکل نہیں تھی۔ ڈاڑھی درکنار، مونچھیں بھی ندارد تھیں۔ یہ بہت قابلِ ذکر بات تھی کہ ایک ڈاڑھی منڈا ایک متقی کے مقابلے میں آ رہا ہے، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مینجنگ کمیٹی کے بیش تر اراکین خود بے نیازِ ریش تھے۔ مولوی صاحب اور ان کے حواریوں کی کوشش بار آور نہیں ہوئی۔ آخر میں جب بالکل مایوس ہو گئے تو شہر کی بعض مسجدوں میں باقاعدہ تبلیغ کی گئی کہ یہ ایک حامیِ دینِ مبین کی سخت توہین ہے کہ اس کے مقابلے میں ایک ناآشنائے رسم و راہِ تقویٰ اور آوارۂ حدودِ تدیّن کو ترجیح دی جائے، لیکن بات کچھ بنی نہیں۔ سارے واویلا (کذا) کے باوصف میں اسکول میں پرشین ٹیچر ہو گیا۔ اب تنخواہ 100 روپے ہو گئی۔ پچھلے سال اگست میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ''اسسٹنٹ اُردو اسٹڈیز'' کی ایک نئی جگہ نکالی گئی اور کسی سفارش کے بغیر میرا تقرر ہو گیا۔ اب 230 روپے مل رہے ہیں''۔

رشید حسن خاں 1959 میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہوئے تھے۔ 30 برس بعد وہ 31 دسمبر 1989 کو یہاں سے سبک دوش ہوئے۔

اس رُوداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ غربت اور ناداری کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی جدوجہد کے ساتھ، رشید حسن خاں کے ہاں اوائلِ عمر ہی سے مطالعے اور کتب بینی کا ذوق وشوق اور حصولِ علم کے لیے ایک لگن بھی موجود تھی۔ اس ضمن میں اطہر فاروقی کے روایت کردہ ایک واقعے کا ذکر بھی دل چسپی کا باعث ہوگا۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''فیکٹری کی ملازمت کے زمانے میں بہت سے واقعات رشید صاحب نے مجھے سنائے تھے۔ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ اس فیکٹری میں اس زمانے میں تین شفٹیں آٹھ آٹھ گھنٹے کی ہوتی تھیں۔تیسری شفٹ میں، جو صبح چھے بجے ختم ہوتی تھی، درمیان میں آدھ گھنٹے سے کچھ زیادہ کا وقفہ ہوتا تھا۔لوگ ذرا آرام کرلیا کرتے تھے۔رشید صاحب طلسم ہوش رُبا دسوں جلدیں (آٹھ اصل جلدیں اور دو بقیہ طلسم ہوش رُبا) دو بار مکمل طور پر اسی زمانے میں پڑھی تھیں۔''

4

رشید حسن خاں ایک خوش گفتار اور نفیس انسان تھے۔اصول پرست، صاف گو، اپنے مقاصد اور اہدافِ علمی میں یکسو، ہر طرح کی مصلحتوں، بے ڈھنگے پن اور کج روی سے بے نیاز...ان کی باتیں، ہمیشہ کھری اور تحریر واضح اور دوٹوک ہوتی ہے۔ان کے اپنے بقول: ''خاندانی روایت، نسلی اثرات، اور مقامی خصوصیات نے شروع ہی سے صاف گوئی کا عادی بنا دیا تھا اور اسی نے تحقیق کی طرف متوجہ کیا۔'' اور اس میدان میں آکر خاں صاحب کو تحقیق و تدوین سے ایک طبعی مناسبت کا اندازہ ہوا۔یہی وجہ ہے کہ وہ خشک سے خشک موضوع اور مسئلے کو بھی ایسے سادہ، مگر علمی انداز و انہماک سے واضح کرتے کہ زیرِ بحث نکتہ سامعین کے ذہن نشین ہو جاتا تھا۔

رشید حسن خاں صاحب ایک کامیاب اُستاد اور مقرر بھی تھے۔باقاعدہ درس و تدریس تو انھوں نے صرف اسکول کے زمانے میں کی، مگر بعد ازاں انھیں بیسوں سمیناروں میں لیکچر دینے اور ادبی حلقوں میں تقریریں کرنے کا موقع ملا۔اسّی کی دہائی میں وہ بمبئی یونی ورسٹی میں لیکچر دینے گئے۔موضوعِ گفتگو اِملا اور تدوین کے مسائل تھا۔بہت خشک اور اَدَق موضوع ہے، لیکن خاں صاحب مدتوں سے ان مسائل کا مطالعہ کرتے اور ان پر لکھتے چلے آرہے تھے۔انھیں متذکرہ موضوعات پر ایسی دسترس حاصل تھی کہ سامعین ان کے گرویدہ ہوگئے۔ان کا پہلا ہی لیکچر ایسا شگفتہ، دل چسپ اور اس درجہ دل کش تھا کہ باقی لیکچروں میں بھی (جس کے موضوعات بظاہر خشک اور اَدَق تھے) ہال طلبہ و طالبات سے بھرا ہوتا تھا۔

ان کی شخصیت کا ایک دل چسپ پہلو یہ ہے کہ وہ کھیلوں سے بہت رغبت رکھتے تھے، خصوصاً ہاکی سے...دہلی میں جب کبھی ہاکی کا کوئی اہم میچ ہوتا، وہ بالالتزام اسٹیڈیم جا کر میچ دیکھتے اور اگر نہ جاسکتے تو ٹیلی وژن پر دیکھتے۔فٹ بال، والی بال اور باسکٹ بال بھی ان کے پسندیدہ کھیل تھے۔کہتے تھے کہ کھیل بہت انہماک سے دیکھتا ہوں، مگر اس سے ''میرے تحقیقی کاموں پر ذرا بھی اثر نہیں پڑتا۔'' ان کی طبیعت کا یہ ، غالباً علمی اشغال میں غیر معمولی انہماک، دیدہ ریزی اور اَدَق لُغوی و لسانی مباحث میں مصروف رہنے کا نتیجہ تھا، اور طبیعت کو یک رخے پن سے بچانے اور متوازن رکھنے کی ایک کوشش بھی، جو بہرحال مستحسن ہے۔

رشید حسن خاں، جاہ طلبی، نام و نمود اور شہرت پسندی سے ہمیشہ گریزاں رہے۔11,10 سال پہلے میں نے ایم۔اے۔اُردو کی ایک طالبہ مسرت انیس سے خاں صاحب پر تحقیقی مقالہ لکھوانے کا ڈول ڈالا۔اس ضرورت سے شخصی زندگی کے بارے میں چند سوالات لکھ کر، خاں صاحب کو بھیجے گئے۔پہلے تو انھوں نے جوابات دینے سے صاف انکار کر دیا، پھر میرے کہنے سننے اور عرض معروض کرنے سے کچھ پسیجے اور سوالات کے مطابق اپنے حالات پر مستمل چند صفحات لکھ بھیجے، جنھیں میں نے ''کچھ اپنے بارے میں'' کے عنوان سے ایک مضمون کی شکل میں شعبہ اُردو، اورینٹل کالج لاہور کے مجلّے بازیافت (شمارہ اول: جنوری 2002) میں شائع کر دیا۔یہ رشید حسن خاں کی مختصر آپ بیتی ہے اور ان کی شخصیت کی تفہیم کے لیے ایک کلیدی تحریر بھی۔(ان کی دست نوشت تحریر کا عکس زیرِ نظر کتاب کے آخر میں شائع کیا جارہا ہے)۔

بلاشبہ رشید حسن خاں، ایک یگانۂ روزگار شخص تھے۔بقول خلیق انجم: حق گوئی اور بے باکی جسے ''آئینِ جواں مرداں'' کہا گیا ہے، وہ مرحوم کی فطرت کی جز تھی، اور یہ ان کی شخصیت کا سب سے تابناک وصف تھا۔بددیانتی ٹریڈ یونین میں ہو یا ادب میں، اُن کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔وہ ایک کھرے اور صاف گو انسان تھے۔انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ہم میں کوئی بھوکوں نہیں مرتا ہوتا۔زندگی گزارنے کے لیے مناسب آمدنی موجود ہے، لیکن ہوس نے آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے۔'' انھوں نے ہوس اور شہرت طلبی سے مقدور بھر اپنا دامن بچائے رکھا اور اپنے قلم اور عملی رویوں کے ذریعے ان فتنوں کے خلاف جہاد بھی کیا۔وہ محسوس کرتے تھے کہ ''آدمی اگر ایمان داری کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں مصروف رہے تو اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچ سکتا کہ وہ ہوس کا کاروبار چلا سکے۔''

رشید حسن خاں کے بارے میں پروفیسر شمیم حنفی نے کہا ہے کہ انھیں سچ، اپنی عافیت سے زیادہ عزیز تھا۔ایک بار کسی مذاکرے میں تدریس کے مسائل زیرِ بحث تھے: متعدد نام ور اور جلیل القدر اساتذہ بحث میں شریک تھے۔دو تین مقرروں کے بعد خاں صاحب نے مائک سنبھالا۔متن کی صحیح قرأت کے سوال پر انھوں نے بہت دوٹوک انداز میں کہا: ابھی جو تقریریں ہوئیں اور مقالے پڑھے گئے، ان میں تلفظ کی کم سے کم بیس غلطیاں میں نے نوٹ کی ہیں۔جب حال یہ ہے تو ہم کیا پڑھائیں گے اور طلبہ کو کیا سکھائیں گے؟ ایک اور موقع پر انھوں نے لکھا: ''آسان پسندی، علم اور تحقیق کی سب سے بڑی دشمن ہے: چناں چہ گذشتہ پندرہ سال کے دوران میں یونی ورسٹیوں سے جو مقالے شائع ہوئے ہیں، اگر وہ پچاس ہیں تو شاید ایک دو اس قابل ہوں کہ تحقیق کی تعریف ان پر درست آتی ہو۔''...شاید خاں صاحب کی یہی صاف گوئی تھی کہ بھارت کی جامعات میں، جہاں اُردو شعبوں کے اساتذہ نے تیسرے درجے کے شاعروں اور نقادوں پر بکثرت ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے اور لکھوائے، رشید حسن خاں پر ایک مقالہ بھی نہیں لکھا گیا۔شاید

انھیں حق گوئی کی سزا دی گئی تھی، مگر انھیں اِن باتوں کی پروا کب تھی۔

5

ان کے علمی اشغال اور تحقیق و تصنیف کا اصل زمانہ دہلی یونی ورسٹی کی ملازمت کا ہے۔ ''یہاں ان کی شہرت اس ایک مضمون سے ہوئی، جو انھوں نے فیض احمد فیض کی شاعری پر لکھا تھا اور اس مشہور زمانہ شاعر کی زبان و بیان کی غلطیوں پر گرفت کی تھی۔ یہ مضمون انھوں نے انجمن ترقی اُردو کے جلسے میں پڑھا تھا اور اس کا بہت چرچا ہوا۔ فیض ٹھہرے ترقی پسندوں کی مثالی شاعر۔ ان کی غلطیوں کو دوٹوک انداز میں طشت از بام کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا'' یہ مضمون ان کے مجموعۂ مضامین تلاش و تعبیر میں شامل ہے۔ ان کا بیش تر تحقیقی و تفصیلی اور تدوینی کام قیامِ دہلی ہی کے (یا کچھ مابعد) زمانے کا ہے۔ فسانۂ عجائب، باغ و بہار، مثنوی گلزارِ نسیم، سحر البیان، مثنویاتِ شوق اور زٹل نامہ ان کے مخصوص اسلوبِ تدوین کے مثالی نمونے ہیں۔ اسی طرح کلاسکی ادب کی فرہنگ، مصطلحاتِ ٹھگی اور زیرِ طبع گنجینۂ معنی کا طلسم لُغت و زبان پر ایک سیر حاصل اور بے مثل تحقیق ہے۔ زبان اور قواعد میں صحتِ زبان سے بحث کی گئی۔ انھوں نے طلبہ و طالبات کی راہ نمائی کے لیے بھی تین مختصر کتابیں تیار کی تھیں (اُردو کیسے لکھیں، انشا اور تلفظ، عبارت کیسے لکھیں۔)

ایک زمانے میں مکتبہ جامعہ نے' حکومتِ جموں و کشمیر کے تعاون سے قدیم اور کلاسیکی کتابوں کو صحتِ متن کے ساتھ مدوّن کرا کے، شائع کرنے کا ڈول ڈالا تھا۔ اس سلسلے کو ''معیاری ادب'' کا نام دیا گیا۔ اس کی مجلس ادارت میں رشید حسن خاں بھی شامل تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے خود باغ و بہار مرتب کر کے تدوین کا ایک نمونہ پیش کیا (1964) جو بقول شخصے: ''خاں صاحب کے وفورِ شوق کی پہلی انگڑائی تھی۔'' بعدہٗ اس سلسلے کی مزید بارہ، کلاسیکی کتابیں مدوّن کر کے شائع کیں۔ یہ طلبہ کے لیے تھیں: اس لیے انھوں نے یہ سب، صحتِ متن اور تدوین کے کڑے معیار اور اصولوں کے مطابق مرتب کیں۔ اُن میں خاص طور پر انتخابِ سودا اور انتخاب ناسخ کی حیثیت ایک اعتبار سے مثالی تدوین کی ہے۔

خاں صاحب معیار اور اصولوں کے سلسلے میں کسی رُو رعایت یا سمجھوتے کے قائل نہ تھے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کی تاریخ ادبِ اُردو (اوّل) پر ان کے تبصرے کے نتیجے میں، یونی ورسٹی نے مذکورہ جلد واپس لے لی اور پھر اس منصوبے کی بساط ہی لپیٹ دی گئی۔ ان کی علمی گرفت نے اُردو محققین کو محتاط بنا دیا تھا۔ اسی سبب سے انتظار حسین نے انھیں ''تعمیری محقق'' قرار دیا ہے۔ یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ رشید حسن خاں کے تنبیہی رویّوں نے اُردو تحقیق و تدوین پر مثبت اثرات مرتب کیے اور اس سے ہمارا علمی معیار بلند ہوا ہے۔

رشید حسن خاں ایک بے بدل عالم اور محقق تھے۔ ان کی علیمت، ان کی ژرف نگہی اور اجتہادی بصیرت: ان کی برسوں کی محنت و ریاضت، یکسوئی اور علمی انہماک و شغف کا نتیجہ تھی۔ تدوین میں انہوں نے حافظ محمود شیرانی کو ''معلم اوّل'' قرار دیا اور تدوین میں وہ خود کو عرشی صاحب کا ''تلمیذِ معنوی'' سمجھتے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر اُستاد سے فیض''.....

چناں چہ خاں صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحریروں سے تحقیق کے آداب سیکھے، اسی لیے ان چاروں حضرات کو میں اپنا معنوی اُستاد مانتا ہوں۔ رشید حسن خاں نے مذکورہ اساتذۂ تحقیق و تدوین کی روایت میں نہایت مفید اور وقیع اضافے کیے ہیں، جو ان کے عالمانہ اجتہاد کی مثال ہیں۔

خاں صاحب کی مرتبہ باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند جین کا خیال ہے کہ ''یہ ایسے مکمل و مثالی کام ہیں جن کی نظیر نہ ماضی میں ملتی ہے، نہ عرصے تک مستقبل میں ملنے کی اُمید ہے۔ یہ کتابیں تدوین کا ایسا بیش بہا خزینہ ہیں، جن میں لامتناہی دولت چھپی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک ایسی کتاب تیار کرنے کے لیے پندرہ بیس سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ ان میں ہر سے کتاب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے لیے ایک ایک سال کی مدت چاہیے: کیوں کہ ان کے ضمیموں میں جو معلومات بھری پڑی ہیں، انھیں پرکھنے اور ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے عمرِ عزیز کا ایک موقر حصہ نذر کرنا ہوگا۔ میر کا شعر ہے:۔

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے''

گیان چند جین نے خاں صاحب کو ''خدائے تدوین'' کا لقب دیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک رشید حسن خاں کی تدوینات ''آنے والی نسلوں کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں۔'' بقول ڈاکٹر نیّر مسعود: ''وہ کلاسیکی متون کے بہترین تدوین کرنے والوں میں تھے اور یہی متن ان کا نام زندہ رکھیں گے۔'' میرا خیال ہے کہ تحقیق و تدوین کے کام آیندہ بھی ہوں گے، مگر اس معیار کی توقع کم ہی کی جا سکتی ہے۔ اس اعتبار سے ممکن ہے، خاں صاحب ہی 'خاتم المدوّنین' ثابت ہوں۔

رشید حسن خاں نے ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ میں تحقیق و تدوین کی عملی مثالوں کے ساتھ، ان کے اصول و قواعد اور ضابطوں پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ان کا کام نظری و عملی تحقیق میں تطابق کی ایک عمدہ مثال ہے۔

اس کے ساتھ وہ ایک شگفتہ قلم نقاد بھی تھے۔ تلاش و تعبیر اور تفہیم ان کی اعلا درجے کی تنقیدی بصیرت کے یادگار نمونے ہیں۔ ان مجموعوں میں یوں تو سارے ہی مضامین لائق مطالعہ ہیں، لیکن ''دُہرا کردار'' میں خاں صاحب نے پتے کی بات کہی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمارا المیہ ہے کہ دُہرا کردار رفیق مستقبل ہے: لیکن مشکل یہ ہے کہ محقق ہو، نقاد ہو یا اُستاد: دُہرا کردار کسی کو بھی راس نہیں آ سکتا۔ ایک بار اطہر فاروقی صاحب نے اُن سے پوچھا کہ ہمارے ہاں علمی کام، اجتماعی سطح پر اور منصوبہ بندی کے ساتھ کیوں نہیں انجام پاتے؟

خاں صاحب کا جواب تھا: ''ہمارے ہاں سب سے بڑی کمی اس وقت یہ ہے کہ اخلاقیاتِ تحقیق کا وجود گویا نہیں ہے، جس کی ہر بڑے اور اچھے کام کے لیے بنیادی حیثیت ہوتی ہے۔ اوّل تو ہمارے پاس ایسے کام کرنے والے کم ہیں اور جو ہیں، وہ دنیا کے دوسرے دھندوں میں اس قدر اُلجھے ہوئے ہیں، ایسے لگے ہوئے ہیں کہ علمی کام جس یکسوئی، جس ڈوب جانے والے انداز کا مطالبہ کرتے ہیں، اس کی نوبت نہیں آ پاتی۔ ہر آدمی بہت سی کمیٹیوں کا رکن ہوتا ہے اور ممبر بننے اور ترقی کرنے میں لگا رہتا ہے۔ بہت سے سیمینار، بہت سے سلیکشن کمیٹیاں، بہت سے منصوبے بنانا ہوتے ہیں۔ اپنا گروپ تیار کرنا ہوتا ہے، اس کی ٹانگ کھینچنا ہوتا ہے، اس کو آگے بڑھانا ہے۔ تو جب ذہن میں ہر وقت ایسی غیر علمی و غیر ایمان دارانہ باتیں رہیں گی تو وہ کام کیسے عمل میں آ سکتا ہے، جس کے لیے ایمان داری اور یکسوئی کی شرائط سب سے پہلے خود اپنے اوپر عائد کیں۔ اچھی، پرسکون اور راحت بھری زندگی کسے عزیز نہیں؟ کون چاہتا ہے کہ وہ اپنے بچوں سے دور رہ کر، اُن ساری مسرتوں اور خوشیوں سے محروم رہے، جو اُن کے درمیان رہتے ہوئے حاصل ہوتی ہیں: مگر رشید حسن خاں نے کم و بیش تیس برس تک بن باس کاٹا اور دہلی میں اکیلے رہے۔ ایک بڑے مقصد کے لیے دنیا سے کنارہ کشی، ایثار و قربانی کا ایسا مظاہرہ کم ہی لوگوں نے کیا ہوگا۔

6

آخری زمانے میں انھوں نے امراؤ جان ادا اور عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات مرتب کرنے کا عزم رکھا تھا۔ مؤخر الذکر پر تو کام شروع کر دیا تھا۔ 39 صفحات کا مسودہ تیار ہو گیا تھا، مگر پھر یہ کام ''مستقلاً ملتوی کر دیا۔'' البتہ حیاتِ مستعار کے آخری برس (2005 میں) انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریک و تجویز پر کلیاتِ اقبال اُردو کی تحقیقی تدوین کا پختہ عزم کر لیا تھا اور مُعاونت کے لیے اِس ناچیز کو شریکِ مدوّن نامزد کیا تھا۔ ہم نے اس کام کا ایک نقشہ بنایا، طریق کار طے کیا، اور میں نے انھیں ضروری کتابیں، کلامِ اقبال کی بعض بیاضیں اور متفرق لوازمہ بھیجا۔ اِس سلسلے میں خاں صاحب کے ایک مدّاح اور نیاز مند جناب عبدالوہاب خاں سلیم صاحب، ہر طرح سے ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے، مگر خرابیِ صحت کے سبب کام شروع کرنے میں تاخیر ہوتی رہی۔ راقم کے نام ایک خط میں عیدالاضحیٰ کے بعد کام بالفعل شروع کر دینے کا عزم ظاہر کیا تھا، مگر صحت کا مسئلہ آڑے آتا رہا۔ عارضہ قلب اور بے خوابی... ماقبل زمانے میں پھیپھڑوں کی خرابی میں مبتلا رہے تھے۔ 6 دسمبر 2005 کے ایک خط (بنام راقم) میں لکھا گیا:

''سردی کا موسم مجھے راس نہیں آتا۔ اب پچھلے مہینے کے اواخر سے احوال یہ ہے کہ سر جھکا کر ذرا دیر بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ ریزش، چھینکیں اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ لکھنا پڑھنا بند ہے۔''

دراصل خاں صاحب کا لکھنا پڑھنا کئی ماہ سے معطل چلا آ رہا تھا۔ اپنی مخدوش صحت کے پیشِ نظر، شاید انھیں دھڑکا بھی لگا رہتا ہوگا۔ کئی برس پہلے (غالبًا، اکتوبر 1997) میں عرشی زادہ کے اچانک انتقال پر خاں صاحب کا ''جی دہل کر رہ گیا۔'' انھوں نے نیّر مسعود کو لکھا:

''موت کا چھونکا پڑھا تھا، اس کا عمل اب معلوم ہوا۔ سچ ہے، یہ دنیا فانی ہے، مگر تدوین کا کام کرنے والوں کے لیے یہ سوچنا گناہ ہے، اس لیے میں یہ نہیں سوچتا ...'' سو، خرابیِ صحت کے باوجود عزم یہ تھا کہ ''میں اقبال والے کام کو مثالی کام کے طور پر مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں دو سال تو لگ جائیں گے۔'' راقم خوش تھا کہ خاں صاحب جیسے محقق اور نقاد نے اقبالیات کی جانب اتنا کیا ہے، اسے میں نے اقبالیات کی خوش قسمتی جانا، لیکن کیا خبر تھی کہ یہ خوشی عارضی ہوگی اور وہ، اقبالیات تو ایک طرف، دنیائے فانی ہی سے منہ موڑ کر، اُردو ادب، خصوصاً دنیائے تحقیق و تدوین اور اپنے مدّاحوں اور قدردانوں کو سوگوار چھوڑ جائیں گے۔ خدا اُن کی مغفرت کرے اور اُن کی روح کو آسودہ رکھے، آمین۔''

جیسا کہ میں نے ابتدا میں ذکر کیا، ریزِ نظر مکاتیب کی تدوین و ترتیب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کی مرہونِ منت ہے۔ ڈیڑھ دو برس پہلے، جب میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ رشید حسن خاں کے مکاتیب مرتب کر دیں تو انھوں نے بطیّبِ خاطر میری درخواست قبول کر لی۔ میں اس تعاون کے لیے، ان کا دلی طور پر ممنون ہوں۔ میرے لیے باعثِ فخر و مسرت ہے کہ مجھے اُن جیسے تحقیق و تدوین کی اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے شخص کی معاونت حاصل ہوئی۔

آخر میں اُس ذاتِ باری تعالیٰ کا شکر واجب ہے، جس نے مکتوب الیہ، مرتب اور ناشر کو اتنی مہلت اور توفیق بخشی کہ اُردو تحقیق کے ایک نابغۂ روزگار شخص کی یاد میں یہ کتاب پیش کر سکیں۔

25 اپریل 2009

رفیع الدین ہاشمی rdhashmi@yahoo.com

(دیباچہ، مکاتیب رشید حسن خاں، بہ نام رفیع الدین ہاشمی، مرتب، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ادبیات، رحمان مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، جون 2009)

ooo

رشید حسن خاں: احوال و آثار

ڈاکٹر رفاقت علی شاہد

رشید حسن خاں اُردو کے صفِ اوّل کے محقق، مدوِّن، ماہرِ زبان، لغت شناس اور نقّاد تھے۔ اُردو ادب اور تحقیق کے لیے ان کی خدمات کثیر الجہات ہیں۔

رشید حسن خاں کی تاریخِ ولادت 10 جنوری 1930 (۱) اور 25 دسمبر 1925 (۲) لکھی جاتی ہے، لیکن خود رشید حسن خاں نے اپنی تاریخِ پیدایش سے متعلق لکھا ہے:

"تعلیمی کاغذات میں تاریخ ولادت 30 جنوری 1930 لکھی ہوئی ہے۔ یہ تاریخ کس نے لکھائی تھی؟ مجھے نہیں معلوم۔ صحیح سالِ ولادت 1925 ہے، دسمبر کا مہینا، تاریخ کا علم نہیں۔" (۳)

رشید حسن خاں کے اپنے بیان کے بعد بقیہ تمام تاریخیں غلط ٹھہرتی ہیں اور ان کی صحیح تاریخِ پیدایش دسمبر 1925 بنتی ہے۔

رشید حسن خاں کا تعلق پٹھانوں کی یوسف زئی شاخ سے تھا اور وہ اپنے طور طریق سے مکمل پٹھان تھے۔ (۴) انھوں نے اپنے اسلاف سے متعلق انتہائی مختصر معلومات دی ہیں۔ (۵) ان کے مطابق ان کے دادا کا نام علی حسن خاں اور والد کا نام امیر حسن خاں تھا۔ خاندان کے بزرگ فوج کی ملازمت کو نشانِ امتیاز سمجھتے تھے، چناں چہ ان کے دادا بھی فوج کے ملازم تھے۔ ان کے والد کو کسرت اور کُشتی کا شوق تھا، اس لیے انھوں نے پولیس کی ملازمت کو ترجیح دی۔ ان کے والد سچّے اور پکّے محبِّ وطن تھے، لہٰذا تحریکِ عدمِ تعاون کے دوران میں انھوں نے اپنی سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا لیکن ان کا محکمانہ ریکارڈ اچھا ہونے کے سبب ان کے سپرنٹنڈنٹ نے انھیں استعفیٰ دینے کے بجائے قبل از وقت سبک دوشی حاصل کرنے پر آمادہ کرلیا۔ یوں ان کی پنشن پندرہ روپے دو آنے لگ گئی جو آخر تک ملتی رہی۔

حبِّ وطنی کے جذبے کے باعث امیر حسن خاں انگریزی تعلیم کے خلاف تھے، چناں چہ انھوں نے رشید حسن خاں کو اسکول میں داخل کرانے کے بجائے اپنے اُستاد کے ہاں محلّے میں بھجوانا شروع کیا۔ یہاں رشید حسن خاں نے عربی و فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد 1934 میں انھیں درسِ نظامی کی تکمیل کے لیے شاہ جہاں

پور کے معروف مدرسے بحرالعلوم میں بھیج دیا گیا۔ ابھی انھوں نے متوسّطات تک کی کتابیں پڑھی تھیں کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ شاہ جہاں پور میں آرڈننس کلودنگ فیکٹری تھی۔ اس فیکٹری میں فوجی وردیاں سلتی تھیں۔ جنگ کی وجہ سے فوجی وردیوں کی مانگ میں اضافہ ہوا اور نتیجے میں طلب پوری کرنے کے لیے آرڈننس فیکٹری میں فوجی وردیوں کی تیاری میں تیزی آ گئی، لہٰذا کام کی رفتار تیز کرنے کے لیے اضافی عملے کی بھرتی شروع ہوگئی۔ چوں کہ گھر کے معاشی حالات اچھے نہیں تھے، اس لیے رشید حسن خاں نے تعلیم ادھوری چھوڑ کر 1939 میں آرڈیننس فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ یوں پانچ سال تک مدرسہ بحرالعلوم میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود وہ درسِ نظامی کی تکمیل نہ کر سکے۔ یہ آرڈی ننس فیکٹری رشید حسن خاں کے آخری زمانۂ حیات تک موجود تھی۔ ڈاکٹر آرتی رینا نے یہ فیکٹری جولائی 2003 میں دیکھی تھی۔(٦)

اس وقت چوں کہ جنگِ عظیم جاری تھی، لہٰذا سول کارخانوں میں تو مزدور یونین بنانے کی اجازت تھی لیکن آرڈننس فیکٹریوں میں اس کی اجازت نہ تھی۔ اس کے باوجود کچھ لوگوں نے 1940 کے اواخر میں چھپ چھپا کر آرڈیننس فیکٹری، شاہ جہاں پور میں مزدور یونین کا آغاز کر دیا۔ شروع شروع میں یونین کے جلسے خفیہ طور پر کیرتن اور میلاد شریف کے بہانے ہوتے تھے، پھر جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد آہستہ آہستہ یونین کا کام کھل کر کیا جانے لگا۔ 1945 کے اواخر میں شاہ جہاں پور کی آرڈیننس فیکٹری میں 33 دن کی ہڑتال ہوئی۔(٧) یہ کسی بھی آرڈیننس فیکٹری میں پہلی باضابطہ ہڑتال تھی۔ اس وقت رشید حسن خاں مزدور یونین کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ اسی پاداش میں 1946 کے شروع میں انھیں فیکٹری سے نکال دیا گیا۔(٨) ڈاکٹر شمس بدایونی نے فیکٹری سے برطرفی 1947 میں لکھی ہے۔(٩) یہ درست نہیں۔

مزدور یونین کی سیاست کا تجربہ رشید حسن خان کے لیے خوش گوار نہیں رہا۔ وہ تھے سیدھے، سچّے اور کھرے پٹھان، سیاست کا ہیر پھیر اور منافقت اُن کے مزاج کے خلاف تھا، چناں چہ یونین کی منافقانہ سیاست کے رجحانات اُن کے دل میں پائیدار منفی اثرات چھوڑ گئے۔ مزدور یونین کی سیاست کے بارے میں اُن کے مشاہدات خود اُن کی زبانی دیکھیے:

''ہماری یونین کے سکریٹری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ایک تربیت یافتہ شخص تھے، بہت محنتی، ایمان دار اور پڑھے لکھے۔ ان دنوں کمیونسٹ پارٹی میں کامریڈ رندیوے کے گروپ کو برتری حاصل تھی اور یہ زمانہ انتہا پسندی کا تھا، سیاسی سطح پر مفاہمت نام کی ان دنوں کوئی چیز نہیں تھی۔ ٹریڈ یونین سے، مزدوروں کے مسائل کو حل کرنے سے زیادہ، پارٹی کی آئیڈیالوجی کو پھیلانے کا کام لیا جاتا تھا، اور ورکروں کی اسی لحاظ سے، شام کے بیٹھکوں میں ذہنی تربیت کی جاتی تھی۔ یونین میں تین چار لوگ ایسے تھے جو اس پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ میں بھی انھی میں سے تھا۔ ہمارا کہنا تھا کہ ''دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ!'' کھوکھلا نعرہ ہے اور محض سیاسی ہتھ کنڈا۔ ہر ملک، بل کہ ہر کارخانے کے مزدوروں کے مسائل یک ساں نہیں، پھر وہ سب ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم یہ بھی کہتے تھے کہ مینجمنٹ سے لڑنا ہمارا مقصود نہیں ہو سکتا، طریقۂ کار کا عارضی حصہ ہو سکتا ہے، مگر یہ پارٹی کی پالیسی کے خلاف تھا۔''

''پھر شخصی جھگڑے تھے۔ اب ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اس وقت ورکر تو نچلے درجے سے آئے تھے جو بہت ایمان دار، سچّے تھے، مگر سادہ دل اور سیاسی داؤ پیچ سے ناآشنا، جب کہ جتنے لیڈر تھے، وہ سب اپر کلاس سے آئے تھے اور اپنے طبقے کے سارے ذہنی اور عملی تضادات ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس سے ایک سطح پر کش مکش کا پیدا ہونا لازم تھا، اور وہ ہوا۔ آخر میں دو گروہ بن گئے تھے یونین میں، اسی سوال پر۔''(١٠)

''اس دوران میں یوپی کے بیش تر لیڈروں اور کمیونسٹ پارٹی کے ذمّے داروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور جس قدر ان سے قریب ہوتا گیا، اسی قدر ذہنی طور پر ان سے دور ہوتا گیا... غرض کہ خاص خاص ورکروں اور لیڈروں میں خلیج بڑھتی گئی اور آخر کار مجھ ایسے ناآشنائے سیاست کارکن بالکل الگ ہو گئے۔ ان دنوں ایسے تلخ تجربے ان رہ نماؤں کے ہوئے تھے کہ آج تک ان کی یاد باقی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ صورتِ حال رونما نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں بھی آج ترقّی پسندی کا لیبل لگائے ہوئے ہوتا۔''(١١)

مزدور یونین کی سیاست کے بد اثرات اگر چہ انھیں ترقّی پسندی کی جانب راغب کر رہے تھے لیکن بقول اُن کے:

''ترقی پسندی تحریک سے بچنے کی ایک وجہ یہ بھی پیدا ہوگئی کہ میں نے تنقیدی کتابیں پڑھنے سے پہلے وہ ادب پڑھا تھا اور اس نے مجھے محفوظ رکھا، کیوں کہ فارسی شاعری اور کلاسیکی اُردو ادب کے مطالعے نے ذہن میں ذوق اور معیار کا ایک تصور ضرور پیدا کر دیا تھا جس نے صحافت، نعرے بازی اور ادب میں فرق کرنا سکھایا تھا اور فرد کی حیثیت اور شخصیّت کے دائرے کی وسعت سے آشنا کیا تھا۔''(١٢)

فیکٹری کی ملازمت کے دوران 1945 میں رشید حسن خاں کی شادی ہوگئی۔(١٣) ڈاکٹر شمس بدایونی لکھتے ہیں:

''1994 [کذا] میں اُن کی شادی خاندان ہی کے ایک فرد منظور علی خاں کی بیٹی نفیس بیگم سے ہوئی تھی جن کے بطن سے ایک بیٹی پیدا ہو کر آٹھ نو ماہ بعد فوت ہوگئی تھی۔''(١٤)

ظاہر ہے 1994 کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ ڈاکٹر شمس نے 1944ء لکھا ہوگا۔ خود رشید صاحب نے واضح طور پر اپنی شادی کا سنہ 1945 لکھا ہے، اس لیے 1944 کے بجائے 1945 مروج ہے۔ دوسرے: شادی کی تاریخ اور بیوی اور بیٹی سے متعلق درج بالا کوائف کا اندراج صرف ڈاکٹر شمس نے کیا ہے، ان کی صحت سے متعلق

یقین سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔

شادی کی وجہ سے ذمّے داریوں کا مزید بوجھ رشید صاحب کے کندھوں پر آن پڑا۔ اُدھر 1946 کے آغاز میں انھیں فیکٹری کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ذمّے داریوں میں اضافے کے سبب سے بے روزگاری کا یہ دور اُن کے لیے شدید مالی مشکلات لے کر آیا۔ خود اُن کے بیان کے مطابق اگلے چار پانچ سال وہ معاشی طور پر بہت پریشان رہے،(۱۵) چناں چہ آرڈیننس فیکٹری کی ملازمت کے بعد معاشی ضروریات کے تحت مجبوراً انھیں چھوٹی موٹی نوکریوں پر گزارا کرنا پڑا۔ فیکٹری کی ملازمت کے خاتمے کے بعد 1946 کے آغاز میں وہ آٹا پیسنے والی چکّی پر منشی کے فرائض انجام دینے لگے۔ 1946 سے 1947 تک ایک زمین دار کے کارندے کے طور پر نوکری کی اور گاؤں اور زمین داری کی زندگی کے مشاہدات حاصل کیے۔ 1947 سے 1949 تک راشن کی ایک دُکان پر منشی رہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر شمس بدایونی کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے:

''انھوں نے کچھ دن مدرسہ فیضِ عام، شاہ جہاں پور میں عربی اور فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں...کچھ مدّت انگریزوں کو کھانے کی اشیا سپلائی کرنے کے لیے اشیائے خوردنی کی دکان کھولی مگر اس میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر ترکِ وطن کی، اہلیہ کو میکے بھیجا اور خود بریلی آ گئے اور ایک مقامی ہفت روزہ اخبار ''ندرت'' کے دفتر میں ملازمت کر لی۔''

'ہفت روزہ ''ندرت'' (بریلی) کے مالک و مدیر سیّد ابراہیم حسن رسؔا بریلوی (ف 1987) تلمیذِ دلؔ شاہ جہاں پوری...نے 1948 میں ہفتہ وار ''ندرت'' کا اجرا کیا تھا۔ ''ندرت'' کا دفتر رسؔا کے رہائشی مکان واقع محلّہ شاہ آباد، بریلی میں تھا۔ ملازمت کی نوعیّت کا پتا نہیں چلا۔ بزرگ ادیب ڈاکٹر سیّد لطیف حسین ادیب...جو اُن دنوں شاہ آباد محلّے میں رہتے تھے؛ نے بتایا کہ خاں صاحب کا قیام رسؔا کے رہائشی مکان ہی میں تھا...یہ 1950 کے بعد یا قریب کا زمانہ رہا ہوگا۔''(۱۶)

ڈاکٹر شمس بدایونی نے تفصیلِ مزید کے لیے رشید صاحب کے بیٹے خورشید حسن خاں سے رابطہ کیا تو انھوں نے فون پر یہ بتایا:

''میری والدہ بتاتی تھیں کہ یہ تمھاری ولادت (16 اپریل 1953) سے پہلے کی بات ہے جب تمھارے والد بریلی میں ملازمت کرتے تھے۔ تقریباً ساڑھے تین سال وہ بریلی میں ملازم رہے۔ اس کے بعد شاہ جہان پور آ گئے۔''(۱۷)

رشید صاحب کو مدرسۂ فیضِ عام کی نوکری چھوڑنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یاد رہے کہ خود رشید صاحب نے واضح کیا ہے کہ مدرسۂ فیضِ عام کے مہتمم اُن کے دوست اور کرم فرما تھے۔ اگر مہتممِ مدرسہ کو انھیں نکالنا مقصود ہوتا تو رشید صاحب کو اُسی وقت فارغ کر دیتے جب طلبہ نے اُن سے درس لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر مدرسۂ فیضِ عام سے رشید صاحب کی ملازمت ختم ہوئی تھی تو ایسا خود رشید صاحب نے کیا ہوگا، مہتممِ مدرسہ کی جانب سے کسی ایسے اقدام کی توقّع نہیں۔ اسی تناظر میں یہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اُس وقت رشید صاحب شدید معاشی مشکلات کا شکار تھے۔ ان دگرگوں حالات میں معقول ملازمت سے ہاتھ دھونا انھوں نے کیسے گوارا کیا ہوگا؟

اب رہا معاملہ بریلی میں ملازمت اور رہائش کا۔ رشید صاحب نے اپنی گزشتہ زندگی کے تقریباً تمام بڑے واقعات اور مشکل حالات کا ذکر کر دیا ہے لیکن عجیب بات ہے بریلی جانے کی مجبوری اور تفصیلات کی جانب اشارہ تک نہیں کیا۔ رشید صاحب کی اہلیہ اور بیٹے کی تصدیق کے بعد یہ تو طے ہے کہ تلاشِ معاش کے سلسلے میں رشید صاحب کے بریلی جانے کا واقعہ درست ہے لیکن اس کے زمانۂ وقوع کے سلسلے میں مذکورہ بالا بیانات میں ابہام پایا جاتا ہے، جس کا اظہار خود صاحبِ مضمون نے بھی کیا ہے۔(۱۸)

رشید صاحب نے مدرسۂ فیضِ عام، شاہ جہاں پور میں مدّرسی کا زمانہ 1949 تا 1952 لکھا ہے۔(۱۹) قرینِ قیاس نہیں کہ اس ملازمت کو خیرباد کہہ کر رشید صاحب نے بریلی جا کر قسمت آزمائی کرنے کو ترجیح دی ہو۔ 1952 سے 1959 تک وہ اسلامیہ اسکول میں اُستاد کی حیثیت سے ملازم تھے۔ اس کا تو بالکل امکان نہیں کہ اتنی اچھی نوکری چھوڑ کر وہ طالع آزمائی کرنے بریلی گئے ہوں۔ اس لیے امکان ہے کہ بریلی مراجعت کا زمانہ 1950 کے آس پاس کا نہیں بل کہ 1949 یا اس سے پہلے کا ہوگا۔ رشید صاحب کی اہلیہ نے 1953 سے قبل کا زمانہ کہا تھا جو 1949 یا اس سے پہلے کا بھی ہوسکتا ہے۔

اس سلسلے میں رسؔا بریلوی کے بھائی سیّد عابد حسین کلیم (پ 1925) کا بیان اہمیت رکھتا ہے جس سے بہت سی گتھیاں سلجھتی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر شمس بدایونی کے مطابق 1960 سے 1970 کے دہے میں کلیم صاحب سے رشید صاحب کی لگاتار خط کتابت رہی ہے۔ ان میں جو خطوط مضمون نگار کو دست یاب ہوئے، اُن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ دہلی یونی ورسٹی میں ملازمت کے دوران بھی رشید صاحب؛ کلیم صاحب سے ملنے بریلی آتے رہتے تھے۔ کلیم صاحب کے مطابق:

''رشید حسن خاں؛ میرے بھائی سیّد زاہد حسن کے ساتھ آرڈیننس فیکٹری میں ملازمت کرتے تھے۔ دونوں میں باہمی اتحاد و اُنس تھا۔ خاں صاحب عملاً بائیں بازو کے ٹریڈ یونینسٹ تھے۔ ملازمت سے برطرف ہوجانے کے بعد زاہد حسن کے ذریعے بریلی آ کر روپوش ہوگئے جہاں میرے اہلِ خانہ نے ان کی تقریباً ڈیڑھ دو برس کفالت کی۔ وہ اپنا وقت اہلِ خانہ اور اہلِ محلّہ کی مصروفیتوں میں ہاتھ بٹا کر اور شریک ہوکر گزارتے۔ خاں صاحب محلّے کی ایک آٹا چکی پر بھی بیٹھتے تھے اور اس کا حساب لکھ دیا کرتے تھے۔ محلّے کے بچوں کو بھی پڑھا دیا کرتے تھے۔ خاں صاحب نے یہ وقت انتہائی تنگ دستی، تکلیف مگر استقلال اور

خودداری کے ساتھ گزارا۔ ڈیڑھ دو برس بعد ان کی شاہ جہان پور واپسی ہوئی۔''(۲۰)

کلیم صاحب کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ آرڈیننس فیکٹری میں ٹریڈ یونین کے جوائنٹ سیکرٹری ہونے کے باعث اگر چہ رشید صاحب کو فیکٹری کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے، اس سے بڑھ کر کوئی ایسی صورتِ حال بھی درپیش ہوگئی تھی کہ رشید صاحب کو بریلی میں روپوش ہونے کی ضرورت پیش آئی اور ڈیڑھ دو سال تک وہ واپس شاہ جہاں پور نہیں جا سکے۔ اس صورتِ حال کا ذکر رشید صاحب نے نہیں کیا۔ اسی طرح یہ بھی قرینِ قیاس نہیں کہ رشید حسن خاں جیسا غیّور پٹھان محنت مزدوری کرنے کے بجائے ڈیڑھ دو سال تک دوست کی روٹیوں پر پڑا رہے اور اپنے متعلقین کو شاہ جہاں پور میں اکیلا چھوڑ آئے، خصوصاً شدید مالی مشکلات میں گھر والوں کی ضروریات اور احتیاجات کو نظر انداز کرتا رہے۔ اس لیے یہ بیان محتاجِ ثبوت ہیں کہ رشید صاحب فیکٹری سے فارغ کیے جانے کے بعد چُھپتے چھپاتے بریلی پہنچے اور ڈیڑھ دو سال تک ڈر کے مارے شاہ جہان پور واپس نہیں گئے اور اتنے طویل عرصے تک وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور ان کی کفالت اُن کے دوست کرتے رہے۔

کلیم صاحب اور رشید صاحب کی اہلیہ کے بیانات سے البتہ یہ امور واضح ہوتے ہیں کہ رشید صاحب تلاشِ معاش کے سلسلے میں بریلی گئے تھے۔ کلیم صاحب کے بیان کی روشنی میں اُن کے بریلی جانے کا زمانہ فیکٹری کی ملازمت چُھٹ جانے کے فوراً بعد شروع 1946ء کا بنتا ہے۔ قیاس ہے کہ اُن کے دوست انھیں قسمت آزمائی کے لیے اپنے ساتھ بریلی لے آئے ہوں گے۔ یہاں انھوں نے آٹا چکی پر کام کیا، رشید صاحب نے بھی فیکٹری کی ملازمت کے بعد آٹا چکی پر کچھ عرصے کے لیے منشی کا کام کرنے کا لکھا ہے۔(۲۱) اس کے بعد زمین دار کے کارندے اور راشن کی دکان پر منشی گیری کی ملازمتیں بھی بریلی کی یادگار لگتی ہیں کیوں کہ آٹا چکی پر منشی گیری اور زمین دار کے کارندے کے طور پر ملازمت کا دورانیہ رشید صاحب نے اوائل 1946 تا 1947 تحریر کیا ہے(۲۲) جو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال بنتا ہے۔ کلیم صاحب نے بھی رشید صاحب کے بریلی میں قیام کی مدّت ڈیڑھ دو سال بیان کی ہے لیکن رشید صاحب کی اہلیہ کے مطابق رشید صاحب تقریباً ساڑھے تین سال بریلی میں ملازم رہے۔ گویا رشید صاحب اوائل 1946 سے وسط 1949 تک بریلی میں ملازمت کرتے رہے۔ کلیم صاحب سے سہو ہوسکتا ہے لیکن رشید صاحب کی اہلیہ سے اس کا امکان نہیں کیوں کہ انھوں نے اپنے شوہر سے دُوری کا یہ عرصہ جس تنگ دستی اور مشکلات میں بسر کیا، اُسے بُھلا نا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ یوں بیگم رشید حسن خاں کے بیان کے مطابق اوائل 1946 سے 1949 میں مدرسۂ فیضِ عام میں مدّرس کی ملازمت ملنے تک رشید حسن خاں بریلی میں رہے، چناں چہ اس دورانیے میں انھوں نے جن تین چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کا ذکر کیا ہے (آٹا چکی پر منشی گیری، زمین دار کے کارندے کے طور پر اور راشن ڈپو پر منشی گیری) وہ بریلی کے زمانے کی یادگار ہوسکتی ہیں۔

1949 میں وہ شاہ جہاں پور واپس آ گئے۔ یہاں اُنھیں مدرسۂ فیضِ عام میں مدّرس کی جگہ مِل گئی۔ رشید صاحب کو مدرسے کے طلبہ کو درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھانا تھیں۔ جلد ہی انھیں محسوس ہوا کہ طلبہ اُن سے درس لینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ کچھ دنوں بعد یہ بات تب کھلی جب طلبہ نے مہتمم مدرسہ سے شکایت کی کہ اُستادِ محترم تو داڑھی منڈاتے ہیں، اس لیے وہ اُن سے نہیں پڑھ سکتے۔ مہتمم مدرسہ؛ رشید حسن خاں کے دوست اور کرم فرما تھے۔ انھوں نے رشید صاحب سے طلبہ کی شکایت کے بارے میں بات کی اور کہا کہ داڑھی تو ضرور رکھنی پڑے گی ورنہ مدرسے میں آپ کی مخالفت زیادہ ہو جائے گی۔ رشید صاحب نے رشوت کی داڑھی رکھنے سے انکار کر دیا۔ مہتمم چوں کہ رشید صاحب کے دوست اور کرم فرما بھی تھے، اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ انھیں مدرسے کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں، چناں چہ درمیانی راستہ یہ نکالا گیا کہ انھیں درسِ نظامی کے بجائے منشی فاصل، مولوی فاضل اور منشی کامل کے طلبہ کو امتحانات کی تیاری کرانے پر مامور کر دیا گیا۔ اس پر سبھی مطمئن ہو گئے۔(۲۳) مدرسۂ فیضِ عام میں انھوں نے 1949 سے 1952 تک فرائض انجام دیے۔

اسی زمانے میں 1952 میں اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول، شاہ جہان پور میں فارسی اور اُردو کے اُستاد کی خالی اسامی پر بھرتی ہونے لگی۔(۲۴) رشید صاحب نے بھی اس جگہ کے لیے درخواست دے دی۔ اگر چہ رشید صاحب کو یہ ملازمت مِل گئی لیکن اس کے ساتھ ایک دل چسپ واقعہ بھی وابستہ ہے۔ یہ واقعہ خود رشید صاحب کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

> ''اس جگہ کے لیے ہمارے شہر کے مولوی محمد یوسف صاحب بھی اُمیدوار تھے، جو گورنمنٹ اسکول میں اس وقت ٹیچر تھے اور ریٹائر ہونے والے تھے۔ وہ شہر کی ایک بڑی مسجد کے امام تھے اور بہت لوگوں کے پیر بھی تھے۔ مشہور شخص تھے۔ وہ دو تین سال کے لیے اس اسکول میں ملازمت کرنا چاہتے تھے۔ میرے اُستاد مولوی مجتبیٰ حسن خاں صاحب میرے لیے کوشاں تھے اور ان کے اثرات سے میرا کام یاب ہونا یقینی سا تھا۔ مولانا یوسف صاحب نے بعد نمازِ جمعہ، منبر سے یہ اعلان کیا کہ یہ شخص چوں کہ کمیونسٹوں کے ساتھ ٹریڈ یونین میں کام کرتا رہا ہے اور کمیونزم کو مانتا ہے، اس لیے یہ مسلمان نہیں ہوسکتا، اور ایسے شخص کو اسلامیہ اسکول میں جگہ کیسے دی جاسکتی ہے۔ یہ گویا ترپ کا پتا تھا مگر افسوس کہ انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔''(۲۵)

ڈاکٹر خلیق انجم نے مولوی صاحب کے اس واقعے کو مدرسۂ فیضِ عام سے جوڑا ہے۔(۲۶)

16 اپریل 1953 کو اُن کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اس کا نام خورشید حسن خاں رکھا گیا۔(۲۷)

رشید صاحب کا بیان ہے کہ اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں ملازمت حاصل کرنے تک وہ عربی فارسی بورڈ، یوپی سے مولوی کا امتحان پاس کر چکے تھے، جب کہ شعبۂ

مشرقی، لکھنؤ یونی ورسٹی سے دبیر کامل کے امتحان میں امتیازی نمبروں کے ساتھ کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ (۲۸) امکان ہے کہ 1945 سے 1949 کے زمانے میں چھوٹی موٹی نوکریوں کے دوران انھیں ان امتحانات کی تیاری کرنے اور امتحانات دینے کا موقع نہ ملا ہوگا۔ بہت حد تک ممکن ہے کہ یہ فراغت اور موقع انھیں مدرسۂ فیضِ عام میں ملازمت کے دوران ملا ہو۔ یوں قیاساً اُن کے مولوی اور دبیر کامل کے امتحانات پاس کرنے کا دورانیہ 1949 سے 1952 کا زمانہ رہا ہوگا۔

1952 سے وسط 1959 تک رشید حسن خاں نے اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول، شاہ جہان پور میں خدمات انجام دیں۔ (۲۹) اگست 1959 میں وہ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر ملازم ہو گئے۔ بعد میں اسی جگہ ترقی کر کے ریسرچ ایسوسی ایٹ ہوئے۔ (۳۰) رفعت سروش لکھتے ہیں۔

''وہ 60ء کے آس پاس شاہ جہان پور سے دہلی آئے تھے اور دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں ملازم ہو گئے تھے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی بھی ان کے ہم پیشہ تھے مگر وہ پرائیویٹ امتحان دے دے کر پی ایچ ڈی کی [کذا] اور پھر پروفیسر ہو گئے لیکن رشید حسن خاں لائبریری کے کارکن ہی رہے۔ ویسے وہ ریسرچ اسکالروں کے گائیڈ بھی تھے اور نہ جانتے کتنے ''ادبی ڈاکٹروں'' نے خاں صاحب سے فیض اُٹھایا ہوگا۔'' (۳۱)

رشید صاحب کے دہلی یونی ورسٹی لائبریری سے وابستہ ہونے کی بابت تسلیم غوری بدایونی نے بھی لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''خاں صاحب سے میرے تعلقات اس زمانے سے تھے جب وہ دہلی میں مقیم تھے اور دہلی یونی ورسٹی کی لائبریری سے وابستہ تھے۔'' (۳۲)

حیرت یہ ہے کہ خود رشید صاحب نے کہیں بھی کتب خانۂ جامعہ دہلی سے اپنی وابستگی کے بارے میں نہیں لکھا۔

جہاں تک رشید صاحب کے ''ریسرچ اسکالروں کے گائیڈ'' ہونے کی بات ہے تو اس کا ذکر نہ رشید صاحب نے کیا، نہ کسی اور نے۔ لگتا ہے رفعت سروش صاحب اپنی رو میں ممتحن کو گائیڈ لکھ گئے جب کہ دونوں میں واضح فرق ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے اپنے مضمون میں یہ لکھا ہے کہ رشید حسن خاں؛ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے سندی مقالات کے ممتحن بنائے جاتے تھے۔ (۳۳)

رشید حسن خاں کی دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ملازمت کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''...خاں صاحب اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں ملازم ہو گئے اور یہیں انھوں نے عروض اور قواعد پر کچھ مضامین لکھے جن کی وجہ سے خواجہ احمد فاروقی کی نظرِ انتخاب پڑی اور خواجہ صاحب انھیں دہلی یونیورسٹی کے اُردو شعبے میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر لے آئے۔'' (۳۴)

اسی مضمون میں ڈاکٹر خلیق انجم نے رشید صاحب سے متعلق کچھ واقعات تحریر کیے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ دہلی یونی ورسٹی میں آمد سے قبل اہلِ علم؛ رشید صاحب کی تحریروں سے متاثر تھے۔

اسی ذیل میں سیّد عابد حسن کلیم کا یہ بیان بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں:

''ڈاکٹر قمر رئیس کی کوشش سے انھیں دہلی یونی ورسٹی میں سروس مل گئی۔'' (۳۵)

ڈاکٹر قمر رئیس کا تعلق بھی شاہ جہاں پور سے ہے اور تفصیلات کے مطابق رشید صاحب اور قمر رئیس صاحب میں گاڑھی چھنتی رہی ہے، اس لیے اس کا بھی قوی امکان ہے کہ قمر رئیس نے کوشش کر کے خواجہ احمد فاروقی کے ذریعے رشید صاحب کا تقرر دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں کرایا ہو۔

شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی کی ملازمت ہی کے سلسلے میں ڈاکٹر شمس بدایونی رقم طراز ہیں:

''اگست 1959 میں شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر ان کا تقرر ہوا۔ یہ تقرر عارضی تھا۔ 1964 میں اسے کُل وقتی منظوری حاصل ہو گئی۔'' (۳۶)

اگست 1959 تا دسمبر 1989؛ تیس سال سے زائد عرصے تک رشید صاحب نے شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی میں تحقیقی خدمات انجام دیں اور 13 دسمبر 1989 کو ذرا سا قبل از وقت یہاں سے سبک دوش ہوئے۔ (۳۷)

سبک دوشی کے بعد بھی رشید حسن خاں 1996 تک دہلی میں ہی رہے۔ اس سلسلے میں رشید حسن خاں کے بیٹے خورشید حسن خاں کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے:

''دہلی یونی ورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد 1996 میں وہ اپنے وطن شاہ جہاں پور واپس آئے اور ہم لوگوں کے ساتھ رہنے لگے۔'' (۳۸)

ڈاکٹر شمس بدایونی نے اپنے مضمون میں رشید صاحب کی شاہ جہاں پور مستقل واپسی کی تاریخ 2 فروری 1996 لکھّی ہے اور اس کے لیے اپنے نام رشید صاحب کے خط کا حوالہ دیا ہے۔ (۳۹) خود رشید صاحب کے خط سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

شاہ جہاں پور میں وہ اپنے علمی و تدوینی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ عمر کے ستّر برس عبور کرنے تک وہ بعض عوارض کا شکار ہو چکے تھے۔ 1990 کے بعد، دہلی کے زمانۂ قیام میں وہ ذیابطیس کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے جس کے باعث انجائنا کا مرض بھی اُنھیں لاحق ہو گیا۔ (۴۰) ستمبر 1995 تک اُن کی آنکھوں اور دل کے آپریشن ہو چکے تھے اور وہ کھانے میں احتیاط برت رہے تھے۔ بھاری غذا، روشن و مسالے دار اشیا کی مناہی تھی۔ ناشتے میں دلیا، دوپہر اور رات کے کھانے میں دال مونگ، چنے کا شوربہ، خشک روٹی

اور سلاد کھاتے تھے۔ (۴۱) اسی سلسلے میں علاج کے لیے یکم اگست 1998 کو اُن کے بمبئی جانے کی بھی شہادت ملتی ہے۔ (۴۲) اس کے علاوہ اور جگہ بھی زیر علاج رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر ٹی آر رینا اوائل نومبر 2005 میں رشید صاحب سے ملے تھے۔ وہ اُن کے اُس وقت کے عوارض سے متعلق لکھتے ہیں:

''خاں صاحب (نے) جواب دیا؛ میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا۔ بات کرنے میں تھوڑی تکلیف ہوتی ہے، سانس پھولنے لگتی ہے۔'' (۴۳)

''آج۔ کل موسم تبدیل ہو رہا ہے۔ سردی شروع ہونے پر میں کام کے لیے بیٹھ نہیں سکتا۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ جُھک کے بیٹھنا مشکل ہوتا ہے۔ میرے گُھٹنے میں بہت درد رہتا ہے۔ کمرے میں بھی چلنا پھرنا نہیں ہوتا۔ تین سالوں سے میں نے باہر جانے کے لیے اپنی دہلیز پار نہیں کی۔ پراسٹریٹ کی تکلیف بھی ہے۔ پیٹ اکثر خراب رہتا ہے۔ صبح سے شام تک دوائیاں وقت پر لینی پڑتی ہیں۔ سانس پھولنے لگتا ہے۔ زیادہ حرکت کرنے کے لیے ڈاکٹروں نے سختی سے منع کیا ہے۔ اب گھر کی چار دیواری کے اندر مقیّد ہو کر رہ گیا ہوں۔ جب موسمِ گرما شروع ہوگا تو میں اچھی طرح کام کاج کرنے لگوں گا۔'' (۴۴)

اسی طرح کی بات رشید صاحب نے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں (مظفر پور، بہار) کے نام 17 نومبر 2005 کے خط میں لکھی ہے۔ اس خط میں گھر سے باہر نہ جانے کی سخت ہدایت ڈاکٹر کی جانب سے لکھی ہے کیوں کہ ''سانس کی رفتار اچانک بگڑ جایا کرتی ہے۔'' (۴۵) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ان کے علاوہ خاں صاحب کے عوارض میں بے خوابی اور پھیپھڑوں کی خرابی کا بھی اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے عبدالوہاب خاں سلیم کے نام رشید صاحب کے دسمبر (غالباً 2005) کے خط کا ذکر کیا ہے جس میں رشید صاحب نے لکھا:

''سردی کا موسم مجھے راس نہیں آتا۔ اب پچھلے مہینے کے اواخر سے احوال یہ ہے کہ سر جُھکا کر ذرا دیر بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ ریزش، چھینکیں اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ لکھنا پڑھنا بند ہے۔'' (۴۶)

مذکورہ بالا تفصیلات سے علم ہوا کہ اپنی زندگی کے آخری کم و بیش تیرہ سال (تقریباً 1994 سے 2006 تک) رشید صاحب مختلف عوارض میں مبتلا رہے اور آخری تین چار سال تو ان عوارض کی شدّت میں ایسا اضافہ ہوا کہ اُن کے لیے بیٹھ کر کام کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا۔ انھی عوارض کے باعث بالآخر 25 اور 26 فروری 2006 کی شب وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ (۴۷)

29 مارچ 2003 کو رشید صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس سانحے کا رشید صاحب کو دلی دُکھ ہوا اور وہ اپنی زندگی میں خلا سا محسوس کرنے لگے۔ (۴۸) اُن کی اہلیہ نے زندگی کے نامساعد حالات میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ حوصلے اور پامردی سے دیا تھا۔ رشید صاحب نے اپنی اہلیہ کی تعریف کرتے ہوئے 2002 میں لکھا:

''1945 میں میری شادی ہو چکی تھی۔ بے حد قانع اور صابر و شاکر بیوی ملی تھی جس نے بے حد استقلال اور خوش دلی کے ساتھ اُن دنوں رفاقت کا حق ادا کیا اور یہ روش آج بھی برقرار ہے۔'' (۴۹)

رشید حسن خاں کے دیگر متعلقین میں دو بیٹے اور ایک بیٹی موجود ہیں۔ بیٹوں کے نام خورشید حسن خاں اور خالد حسن خاں ہیں جو شاہ جہان پور میں اُردو کے اُستاد ہیں۔ بیٹی کا نام نادرہ بیگم اور اُن کے شوہر کا نام مقصود حسن خاں ہے جو ڈرافٹ انجینئر ہیں۔ (۵۰) ڈاکٹر ٹی آر رینا نے رشید صاحب کے پوتے پوتیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ (۵۱) خورشید حسن خاں نے بھی اپنے چھوٹے بھائی کے بچوں کا ذکر کیا ہے۔ (۵۲)

محمد ایوب واقف نے رشید حسن خاں کی ظاہری شباہت کی کچھ تفصیل قلم بند کی ہے:

''ان کی ہمہ جہت اور مہتم بالشّان شخصیت میں اتنی کشش اور اثر پذیری تھی کہ آدمی پہلی فرصت میں اُن سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ میرے دل و دماغ پر ان کی ہمہ گیریت کا بہت گہرا اثر تھا... ان کا سراپا نگاہوں میں سرایت کر گیا۔ متوسط قد و قامت کے رشید حسن خاں صاحب کا گورا چٹا چہرہ اپنی تمام تر ضیا پاشیوں کے ساتھ سامنے تھرک رہا تھا۔ چوڑی پیشانی، متجسّس دمکتی آنکھیں، سر پر گھنے اور پیچھے کی جانب مُڑے ہوئے سفید بال، اس پر ستواں ناک اور بڑے بڑے کان ان کے سراپے کو خوب صورت بنانے کے لیے کافی تھے۔'' (۵۳)

دہلی میں رشید صاحب کا قیام تقریباً ساڑھے چھتیس برس رہا (اگست 1959 تا 2 فروری 1996)۔ شروع میں ان کی رہایش گاہ کے طور پر متعدد جگہوں کی عمارتوں کا ذکر ملتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز کے مطابق دلّی آنے کے بعد رشید صاحب کا قیام ''کچھ دنوں'' کے لیے سرسیّد روڈ (دریا گنج) پر واقع سرسید کے مکان میں رہا۔ وہ ان سے ملنے اس مکان میں جاتے رہے ہیں۔ (۵۴) ڈاکٹر خلیق انجم کے مطابق شروع شروع میں شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی کے سامنے ٹیوٹوریل بلڈنگ میں رشید صاحب کو ایک کشادہ کمرہ ملا جس میں کتابوں کے لیے چند الماریاں بھی تھیں (۵۵)۔ جگن ناتھ آزادؔ نے 1963 سے قبل دہلی یونی ورسٹی کے قریب لکھنؤ روڈ کے ایک مکان میں رشید حسن خاں اور قمر رئیس کی رہائش کے بارے میں لکھا ہے (۵۶)۔ بعد میں وہ دہلی یونی ورسٹی کے گوائر ہال میں منتقل ہوگئے اور شاہ جہاں پور مستقل واپسی تک اسی یونی ورسٹی ہاسٹل میں گزر اوقات کرتے رہے (۵۷)۔ گوائر ہال میں انھیں دو کمرے ملے ہوئے تھے۔ شمیم حنفی صاحب کے مطابق دونوں کمرے کتابوں سے بھرے تھے (۵۸)۔ میرے ایک دوست محمد علی انجم کی زبانی روایت کے مطابق اگست 1995 میں وہ دہلی گئے تو ایک روز دوپہر کے وقت رشید صاحب سے ملنے گوائر ہال بھی گئے۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ

ایک بہت بڑا کمرہ ہے جس میں چاروں طرف کتابوں کی الماریاں ہیں۔ کمرے میں کوئی تنفس نظر نہ آیا تو وہ کمرے میں داخل ہوکر دس بارہ قدم آگے آئے۔ کمرے کی سامنے والی دیوار کے قریب انھیں ایک میز نظر آئی جس کے اوپر مناسب روشنی والا ایک بلب جل رہا تھا اور میز کے پیچھے کرسی پر، چاروں جانب سے کتابوں میں گھرے رشید صاحب لکھنے میں مصروف تھے (۵۹)۔

رشید صاحب تمام زندگی کچھ معمولات پر سختی سے کاربند رہے۔ اس کے باعث ان کی طبیعت میں استقلال اور کام میں باقاعدگی پیدا ہوئی۔ اپنے روزانہ کے معمولات کے بارے میں رشید صاحب لکھتے ہیں:

''میرے معمولات میں 1959 کے بعد بہت کم تبدیلی آئی ہے، یوں کہوں کہ گویا نہیں آئی۔ صبح پانچ بجے اٹھتا ہوں۔ ہر موسم میں ساڑھے پانچ بجے کے قریب نہاتا ہوں، شدید سردی کے زمانے میں بھی اس کا ناغہ نہیں ہوتا (بیماری کی بات الگ ہے)، پھر چھ بجے سادہ چاے پیتا ہوں، لیمن ٹی۔ آٹھ بجے ناشتا کرتا ہوں۔ چھ بجے لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں، آٹھ بجے تک پھر نو بجے سے ایک بجے تک۔ ایک بجے دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں۔ دو گھنٹے آرام کرتا ہوں، ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق... تین بجے اُٹھ کر چاے پیتا ہوں اور پھر آٹھ بجے تک کام کرتا ہوں۔ شام کی خبریں سن کر ساڑھے نو بجے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔

''دہلی یونی ورسٹی کے ہوسٹل میں رہتا رہا... کھانا ناشتا میس میں ملتا تھا۔ میں ناشتا کر لیا کرتا تھا... چاے اپنے کمرے میں آ کر پیتا تھا، خود بنا کر۔

''کافی ہاؤس میں پابندی سے بیٹھا کرتا تھا، جب تک دہلی میں رہا، مگر ہمیشہ تنہا... مجلس آرائی کا میں قائل نہیں۔ فضول باتوں کا شوق نہیں، اتنا وقت ہی نہیں ملا کبھی، مزاج بھی یہ نہیں۔ اب جب دہلی جانا ہوتا ہے تو کافی ہاؤس ضرور جاتا ہوں، کم سے کم دو بار۔ یونی ورسٹی کافی ہاؤس میری پسندیدہ جگہ ہے۔ یہاں کے بیرے بڑے تربیت یافتہ تھے اور مردم شناس۔ مہینے کی آخری تاریخوں میں اکثر جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے مگر یونی ورسٹی کافی ہاؤس کا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ پرانا بیرا تھا۔ اس کو خوب معلوم تھا کہ جیب میں پیسے ہوں گے، فوراً دیے جائیں گے، نہیں ہوں گے تو نہیں۔ اس نے کبھی پیسے نہیں مانگے، کبھی بل لا کر ٹیبل پر نہیں رکھا۔ دو دن، تین دن، چار دن۔ جب تنخواہ ملی، اسی دن ادائیگی [کذا] کر دی۔ نہ اس نے حساب بتایا، نہ اس سے پوچھا۔ کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کمی بیشی ہوئی ہے'' (۶۰)۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے رشید صاحب کے معمولات میں وقت کی پابندی کی جو عملی مثالیں اپنے مضمون میں پیش کی ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ عمر بھر ان کے معمولات اور مقررہ اوقات کار میں کوئی فرق نہیں آیا (۶۱)۔ عبداللہ ولی بخش قادری کے مطابق 1993 تک رشید صاحب بلا ناغہ ہر اتوار کو صبح دس بجے ان کے ہاں اوکھلا، جامعہ نگر آتے تھے۔ یہاں دوستوں کے جمگھٹے میں دنیا جہان کے موضوعات پر بحث مباحثہ ہوتا اور رشید صاحب کھل کر ان دوستانہ بحثوں میں حصّہ لیتے تھے (۶۲)۔

دہلی میں قیام کے دوران ایک تو دہلی یونیورسٹی کے منصبی فرائض تھے، اس سے ہٹ کر دیگر اہلِ علم بھی رشید صاحب کی صلاحیتّوں سے مستفید ہونے کے راستے نکالتے رہتے تھے، چناں چہ وہ بھارت کی مختلف جامعات، مثلاً بمبئی، جموں، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نئی دہلی میں توسیعی لیکچر دینے کے لیے بلائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے سَنَدی مقالات کے ممتحن بھی بنائے گئے (۶۳)۔ ڈاکٹر اشفاق محمد خاں نے بتایا ہے کہ رشید صاحب سے ان کا تعلق قائم ہونے کے بعد دہلی میں رشید صاحب کے قیام کے زمانے تک وہ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی میں ایم فل کے طلبہ کو توسیعی لیکچر دینے کے لیے انھیں برابر زحمت دیتے رہے (۶۴)۔ رفعت سروش نے ساٹھ کی دہائی میں رشید صاحب کی ریڈیو کے ادبی پروگراموں میں شرکت کے بارے میں تفصیل دی ہے (۶۵)۔ یہ سب اضافی ذمے داریاں تھیں جو رشید صاحب دہلی کے زمانۂ قیام میں انجام دیتے رہے۔

عمومی شہرت کے باوصف رشید حسن خاں خشک طبیعت کے آدمی نہیں تھے۔ تحقیق اور مطالعہ و تصنیف کے ساتھ ساتھ دیگر مشاغل بھی ان کی زندگی کا حصّہ تھے۔ ان مشاغل میں کھیلوں میں دل چسپی سرِ فہرست ہے۔ کھیلوں میں بھی انھیں ہاکی کا کھیل زیادہ پسند تھا۔ ان کے اپنے مطابق انھیں ہاکی کے کھیل میں شروع ہی سے دل چسپی رہی اور یہ دل چسپی آخر تک برقرار رہی۔ 1949 سے 1959 تک انھوں نے خود بھی ہاکی کھیلی۔ ہاکی کے علاوہ کبڈی کا کھیل بھی انھوں نے کھیلا۔ فٹ بال، والی بال اور باسکٹ بال سے بھی انھیں دل چسپی تھی، لیکن دیکھنے کی حد تک۔ ہاکی اور فٹ بال کے میچ وہ باقاعدگی اور انہماک سے دیکھا کرتے تھے۔ اس انہماک اور دل چسپی کے باعث ان کے تحقیقی کاموں پر ذرا بھی اثر نہیں پڑتا تھا (۶۶)۔ رشید صاحب کے بیٹے خورشید حسن خاں نے کھیلوں کے علاوہ ڈراموں سے رشید صاحب کی دل چسپی کے بارے میں لکھا ہے اور بتایا ہے کہ انھوں نے کئی ڈرامے رشید صاحب کے ساتھ دیکھے (۶۷)۔

پہناوے اور کھانے پینے میں رکھ رکھاؤ اور بعض معمولات کی پابندی کا ذکر ان کے بعض جاننے والوں نے کیا ہے۔ ان کے پہناوے کے بارے میں ڈاکٹر اسلم پرویز ذیل کی تفصیل مہیا کرتے ہیں:

''خاں صاحب لباس کے بارے میں بھی وضع کے پابند ہیں۔ گرمیوں میں بوشرٹ، پتلون اور چمڑے کے براؤن رنگ کے سینڈل پہنتے ہیں۔ جاڑوں میں پوری آستین کی قمیض، پتلون اور وہی براؤن رنگ کا لیس والا جوتا۔ بوشرٹ اور قمیض ہمیشہ چیک کی ہوتی ہے۔ ہاتھ پر ویسٹ اینڈ کمپنی کی

گھڑی‘‘(۶۸)۔

جامہ زیبی میں رشید صاحب کے قرینے کی داد انور خاں نے بھی دی ہے۔ دہلی کے معمولات میں کھانے پینے میں ان کے معمول کا ذکر ہو چکا ہے، کچھ اور معمولات کا ذکر کرتے ہوئے انور خاں لکھتے ہیں:

’’کسی خاص ریستوران میں داخل ہونے سے پہلے وہ تسلی کر لیتے ہیں کہ صاف ستھرا اور کچھ قرینے کا ہے۔ ریستوران میں چائے پر کافی کو ترجیح دیں گے اور اگر فلٹر کافی مل جائے تو کیا کہنے! غذا تھوڑی ہو مگر اچھی ہو‘‘(۶۹)۔

رشید صاحب کے بیٹے خورشید حسن خاں کا کہنا ہے کہ رشید صاحب کو بہترین کھانے کا بھی شوق تھا۔ گھر میں وہ اکثر مچھلی، مرغ وغیرہ پکواتے تھے۔ وفات سے ایک روز قبل بھی اپنے چھوٹے بیٹے سے مچھلی کی فرمایش کی لیکن وہ ان کے نصیب میں نہ ہو سکی (۷۰)۔

اخلاقی خصوصیات انسانی شخصیت کا لازمہ ہیں۔ رشید صاحب کی شخصیت میں اچھے اخلاق کی چند ایسی خصوصیات بھی موجود تھیں۔ رشید صاحب لکھتے ہیں:

’’خاندانی روایت، نسلی اثرات اور مقامی خصوصیات نے شروع ہی سے صاف گوئی کا عادی بنا دیا تھا۔ اسی نے تحقیق کی طرف متوجہ کیا...‘‘

’’میں صاف، سادہ، واضح اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دل چسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں گے یا منفی۔... مجھے سچ کی تلاش ہے۔... میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں‘‘(۷۱)۔

ان کے قریبی دوست ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی لکھتے ہیں:

’’وہ صاف گو، سچے، معاملات کے کھرے اور بڑے نوک پلک درست رکھنے کے قائل تھے۔ ان کا لباس، وضع قطع، اخلاق و آداب، گفتگو؛ غرض کہ ہر شے میں ایک ستھرا پن، شایستگی اور طبقۂ اشرافیہ کے سے انداز تھے‘‘ (۷۲)۔

ان کی صاف گوئی کا اعادہ بعض دیگر مضمون نگاروں نے بھی کیا ہے۔ سچائی کی تلاش میں خلوص اور صاف گوئی کے اوصاف رشید صاحب کی تحقیق میں گہرائی اور معیار کا سبب بنے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے رشید حسن خاں کی آزاد فکری، روشن خیالی اور دور اندیشی کا ذکر کیا ہے (۷۳)۔ نامی انصاری کا مشاہدہ ہے کہ رشید صاحب عادتاً شایستہ، نرم خو اور خلیق تھے (۷۴)۔ رفعت سروش نے ان کی مروّت اور اعلیٰ اخلاق کا واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک بار انھوں نے ریڈیو کے ادبی پروگرام ’’بزمِ ادب‘‘ میں رشید صاحب کو خواجہ احمد فاروقی کی کتاب پر تنقید کے لیے بلایا۔ رشید صاحب نے رفعت سروش کا خیال کرتے ہوئے اپنا نثری تنقیدی تجزیہ متوازن رکھا اور کھل کر کتاب پر تنقید نہیں کی، چناں چہ وہ ریکارڈ شدہ پروگرام بغیر تدوین کے جوں کا توں نشر کیا گیا (۷۵)۔

کالی داس گپتا رضاؔ نے اپنے مضمون میں رشید صاحب کے خطوط سے مثالیں پیش کر کے ان کی کچھ اور خوبیوں کو واضح کیا ہے۔ ایک خط میں رشید صاحب نے اپنی مدوّنہ ’’گلزارِ نسیم‘‘ میں خود اپنی غلطی سے رضاؔ صاحب کو آگاہ کیا (۷۶)۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاں صاحب کو اپنی غلطی تسلیم کرنے میں کوئی عار نہ تھی۔ اسی طرح دوسروں کے اچھے کاموں کی تعریف کرنے میں بھی وہ کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے، جیسا کہ عام طور پر مشاہیر میں پایا جاتا ہے، چناں چہ رشید صاحب نے رضاؔ صاحب کی بعض کتابوں کے افادی پہلوؤں کی دل کھول کر تعریف کی ہے (۷۷)۔ مخمور سعیدی نے اپنی مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے اور رشید صاحب نے غالبؔ کی ’’دستنبو‘‘ کا اُردو ترجمہ کیا جو دہلی سے ساتھ ساتھ شائع ہوئے۔ رشید صاحب نے مخمور صاحب کے ترجمے کی داد ان الفاظ میں دی:

’’آپ نے صرف کتاب کے مفہوم کو نہیں، غالبؔ کے اسلوب کو بھی اُردو میں منتقل کر دیا ہے‘‘(۷۸)۔

رضاؔ صاحب نے ان کی زندہ دلی کی مثالیں بھی اپنے مضمون میں پیش کی ہیں (۷۹)۔

خورشید حسن خاں اور انور خاں نے رشید صاحب کی کچھ اور اخلاقی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ رشید صاحب خواتین اور بچوں سے شفقت سے پیش آتے اور ان کی مصروفیات اور دل چسپیوں پر ان سے گفتگو کرتے۔ اس وجہ سے مخاطب ان سے انسیّت محسوس کرتا۔ رشید صاحب اپنے مخلصین کو گھر اور دفتر کی ذمّے داریاں بہ خوبی نبھانے اور بے پروائی نہ برتنے کا مشورہ دیتے جو ان کے خلوصِ نیّت پر دال ہے۔ عام معمولات میں دل چسپی لینا اور ہر طرح کے ماحول میں نباہ کرنا بھی ان کی شخصیّت کی نمایاں خوبی تھی (۸۰)۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے واضح کیا ہے کہ رشید صاحب کم گو اور کم آمیز تھے۔ ہم مزاج لوگوں سے ہی ملتے تھے۔ شعبہ جاتی سیاست اور سازشوں سے دامن بچا کر رکھتے۔ یوں اگر چہ وہ گوشہ گیر سے ہو گئے تھے لیکن سنجیدہ ریسرچ اسکالروں کی ہر ممکن مدد کرتے۔ انھیں سب سے زیادہ ریسرچ اسکالروں سے قربت تھی (۸۱)۔

رشید صاحب کے بیٹے نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ رشید صاحب خشک اور کھردری طبیعت کے شخص تھے، حال آں کہ ایسا نہیں۔ وہ بہت خوش مزاج اور ملن سار تھے۔ ان کے دروازے سائلینِ علم کے لیے کھلے رہتے تھے۔ طلبہ کے لیے انھوں نے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ انھیں وقت برباد کرنے

سے سخت نفرت تھی، اس لیے ایسے لوگوں سے نہ ملتے۔ وہ ہر ایک سے شیریں بیانی سے پیش آتے۔ جب کوئی بلند آواز سے بولتا یا شور مچاتا تو انھیں غصہ آتا تھا۔ اپنے بیٹوں سے بے تکلفی تھی۔ ضرورت مندوں کی مالی مدد کرتے۔ کسی کی پریشانی ان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اصول پسند اور وقت کے بہت پابند تھے۔ بے ترتیبی ناپسند کرتے تھے۔ اپنی ترتیب پسند تھی، اس لیے اگر کوئی چیز ان کی ترتیب سے ہٹی ہوئی نظر آتی تو بہت ناراض ہوتے۔ کٹرپن کے خلاف تھے اور میانہ روی کو پسند کرتے تھے۔ شعائرِ اسلام کی پابندی کرنے کی نصیحت اور نماز پڑھنے کی تلقین کرتے، ہمیں احادیثِ مبارکہ بتاتے۔ زندگی کے ہر معاملے پر ہم سے گفتگو کرتے۔ اپنے خیالات ضرور بیان کرتے لیکن اپنی پسند دوسروں پر تھوپتے نہیں تھے۔ ان کی لکھنے کی میز پر کتابیں، قلم، کاغذ، پیپر ویٹ وغیرہ سلیقے اور ترتیب سے رکھے ہوتے۔ اچھے قلم انھیں بڑے پسند تھے۔ ہر قسم کے غیر ملکی قلم ان کے میز کی آرایش دوبالا کرتے۔ اپنے شاگردوں کا بڑا خیال کرتے اور ان کی عزت و توقیر کرتے۔ خود دار بہت تھے۔ سفارش کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اپنی اولاد کے لیے کبھی سفارش نہیں کی، بل کہ انھیں محنت سے اپنا مقام خود بنانے کی تلقین کرتے۔ تعلیم کی اہمیّت سے وہ بخوبی واقف تھے اور اکثر کہتے تھے کہ تعلیم کے بغیر قومیں ترقّی نہیں کر سکتیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر فکرمند ہوتے تھے۔ مدرسوں میں دینی تعلیم کے ساتھ جدید علوم کی تعلیم کو بھی ضروری خیال کرتے تھے، خصوصاً انگریزی، سائنس اور کمپیوٹر کی تعلیم پر زیادہ زور دیتے تا کہ بچوں کو آگے جا کر اپنی تعلیم جاری رکھنے میں مشکل پیش نہ آئے (۸۲)۔

مختلف حوالوں سے ان کے کچھ دوستوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس سے غالباً دہلی میں آمد سے قبل ہی گہرا دوستانہ تعلق قائم تھا۔ شمیم حنفی نے باقر مہدی سے ان کے دوستانے کا ذکر کیا ہے (۸۳)۔ دونوں میں صاف گوئی کی قدرِ مشترک غالباً دونوں کی دوستی کی وجہ تھی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے گوپال متّل اور اپنے ساتھ دوستی کی تفصیلات مہیا کی ہیں (۸۴)۔ گوپال متّل سے دوستی کا ذکر رفعت سروش نے بھی کیا ہے۔ (۸۵) خورشید حسن خاں نے ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور ڈاکٹر اسلم پرویز کو دہلی میں رشید صاحب کے خاص ملنے والوں میں شمار کیا ہے۔ (۸۶) پاکستان میں ان کا قریبی تعلّق مشفق خواجہ اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے تھا۔

کالی داس گپتا رضاؔ نے لکھا ہے کہ رشید صاحب خط نگاری میں بھی منفرد طبیعت رکھتے تھے۔ وہ خطوط کا جواب لکھنے کے بعد عموماً خطوط تلف کر دیتے تھے۔ (۸۷) اس طرح مکتوب الیہ اور مکتوب نگار کے لیے بے تکلفی سے خط لکھنا ممکن ہوتا ہے۔

رشید صاحب نے شاعری کو اپنی تنہائی کا رفیق قرار دیا تھا۔ شاعری کو ان کی زندگی میں کیا مقام حاصل تھا، اس کا علم ان کے اس بیان سے ہوتا ہے:

"میں تنہائی کے لمحوں میں پہلے دن سے آج تک شاعری کو سب سے زیادہ رفیق رکھتا ہوں، کیوں کہ میرا خیال ہی نہیں، عقیدہ بھی ہے کہ شعر؛ محفل میں پڑھنے کی چیز نہیں؛ زور سے پڑھنے کی چیز نہیں۔ جب زور سے شعر پڑھا جاتا ہے تو اپنی آب و تاب آدھی کھو دیتا ہے، جیسے کوئی بہت اچھا گانا ہو اور ٹرانسسٹر کو بہت اونچا کر دیا جائے تو گانے کی خوبی آدھے سے زیادہ ختم ہو جاتی ہے۔ جب میں تنہا ہوتا ہوں، پریشان ہوتا ہوں، گھبرایا ہوا ہوتا [ہوں] تو صرف شاعری سے اپنا دل بہلاتا ہوں لیکن کسی کو سناتا نہیں اور اس شاعری کو پڑھتا ہوں جو پہلے میرے ذہن پر حملہ نہ کرے بل کہ میرے دل میں اتر جائے۔ میں شاعری پڑھتا ہوں اور اس میں قدیم و جدید کی تخصیص نہیں۔ میں نئے نئے شاعروں کو بھی پڑھتا ہوں۔ فیضؔ کو اتنی بار پڑھا ہے کہ بہت سے فیضؔ پرستوں نے بھی شاید اتنی بار نہ پڑھا ہو" (۸۸)۔

گپتا رضاؔ نے لطافتِ شعری سے ان کے گہرے لگاؤ اور فنِ شعر، عروض، محاورہ روزمرہ سے گہری واقفیت کا ذکر کیا ہے (۸۹)۔ اس امر کا اندازہ رشید صاحب کے تحقیقی مضامین اور تدوینات کو دیکھ کر بھی بہ خوبی ہوتا ہے۔ شعر فہمی کے علاوہ شعر گوئی سے بھی انھیں طبعی مناسبت تھی لیکن کبھی شاعری کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شمیم حنفی نے ایک ادبی مذاکرے میں ان کے فی البدیہہ شعر کہنے کا واقعہ اپنے مضمون میں لکھا ہے (۹۰)۔

شعری ذوق کے ساتھ ساتھ ذوقِ نقد بھی ان کی طبیعت میں رچا ہوا تھا۔ انھیں حالؔی اور کلیم الدین احمد بطور نقاد پسند تھے۔ کلیم الدین احمد کے ذکر میں انھوں نے تنقیدی تحریروں کا معیاری اسلوب یوں واضح کیا ہے:

"حالؔی، کلیم الدین احمد... کی تنقیدی زبان کو، ان کے لہجے کو، ان کے اسلوب کو میں تنقید کا سچا اسلوب سمجھتا ہوں۔ کلیم الدین احمد سے شدید ترین اختلافات ہیں.... یہاں ان سے بحث نہیں.... حالؔی کے یہاں یہ ہے کہ سادگی کا عنصر کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ کلیم الدین چوں کہ مغربی ادب سے اچھی واقفیت رکھتے تھے اور قدیم ادب سے بھی خوب واقف تھے۔ اس چیز نے ان کے یہاں ایک توازن رکھا ہے، تو کلیم الدین کا اسلوب حالؔی کے اسلوب کی ترقّی یافتہ صورت ہے؛ روشن، واضح، جس میں کوئی ابہام نہیں، کوئی انشا پردازی کی لہریں نہیں اور کوئی قولِ محال نہیں" (۹۱)۔

احتشام حسین کا اندازِ نقد بھی انھیں پسند تھا لیکن وہ شاکی تھے کہ احتشام حسین اپنے نظریے کے سخت اور ایمان داری کے ساتھ پابند تھے، غالباً اسی جانب داری کے سبب ان کا تنقیدی اسلوب رشید صاحب کے ذہن میں نہیں سما سکا۔ اُن کے نزدیک کچھ زمانے تک اسلوب احمد انصاری کا اسلوب بھی تنقید کا اندازِ نگارش رہا ہے۔ اس کی وجہ بھی اسلوب صاحب کی انگریزی ادبیات سے گہری واقفیت ہے (۹۲)۔

مطالعے کا بھی انھیں شروع ہی سے شوق تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ فیکٹری کی ملازمت کے دوران جب ان کی عمر ابھی بیس سال کے لگ بھگ تھی؛ انھوں نے

''آبِ حیات'' اور ''طلسمِ ہوش ربا'' کی تمام جلدوں کا مطالعہ کیا، پھر ''نگار'' ان مطالعے میں رہنے لگا۔ آہستہ آہستہ فارسی شاعری اور اُردو کلاسیکی ادب کا مطالعہ بڑھنے لگا جس نے ان کی مزاج گری میں بڑا کردار ادا کیا۔ ان کے مطابق یونین کی سیاست سے مایوسی کے دور میں وہ ترقّی پسند تحریک سے متاثر ہوکر اس کے اسیر ہو جاتے اگر کلاسیکی ادب کے مطالعے نے ان کی طبیعت میں ذوق اور معیار کا ایک تصور نہ پیدا کر دیا ہوتا (۹۳)۔ لغت، صرف ونحو، رسمِ خط، عروض وقواعد، تاریخِ ادب اور تنقید بھی شروع ہی سے ان کی دل چسپی اور تحقیق کے موضوعات رہے (۹۴)۔ اسی دل چسپی کے باعث وہ کثیر المطالعہ تھے۔ ان کے سینے میں علم کا ایک سمندر تھا اور وہ اسے فیّاضی سے خرچ کرتے تھے۔ ادب کی تقریباً ہر صنف اور موضوع کے حوالے سے ان کے مطالعے اور معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ قدیم ادب ہو کہ جدید ادب، شاعری ہو کہ نثر، تحقیق ہو کہ تدوین، تخلیق وتنقید ہو کہ زبان، لسانیات، لغت نگاری کے مباحث؛ ہر موضوع پر معلومات کو اس وضاحت کے ساتھ پیش کرتے کہ تشنگی باقی نہ رہتی اور سامع جواب سے مطمئن دکھائی دیتا (۹۵)۔

رشید حسن خاں کو اُردو سے بے حد لگاؤ تھا۔ انھوں نے اُردو زبان اور املا کی اصلاح کے لیے کتابیں لکھیں، خطبات اور لیکچر دیے اور عملی کام بھی انجام دیے۔ ان کے بیٹے خورشید حسن خاں کا بیان ہے کہ وہ اور ان کے بھائی اردو کے اُستاد ہیں اور رشید صاحب اکثر ان سے طلبہ کی اُردو تدریس سے متعلق دریافت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ رشید صاحب اپنے پوتوں کو روزانہ ایک گھنٹا اُردو پڑھاتے تھے۔ اُردو سے رشید صاحب کی اس گہری دل چسپی کے نتیجے میں ان کے اہل عیال میں سب لوگ اُردو پڑھے ہوئے ہیں (۹۶)۔ رشید صاحب نے ایک بار اطہر فاروقی کے ساتھ بات چیت میں بھی اُردو کے خلاف سیاسی سازشوں کا ذکر کر کے اُردو کی حمایت میں اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کیا تھا۔ وہ پاکستان میں اُردو کی زبوں حالی سے بھی آگاہ تھے اور اس پر تاسف کا اظہار کرتے تھے (۹۷)۔

رشید صاحب فارسی اور اُردو زبانوں میں ماہرانہ دست گاہ رکھتے تھے۔ وہ کبھی اسکول، کالج یا یونی ورسٹی میں زیرِ تعلیم نہیں رہے۔ اُردو اور فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں میں ان کی شُد بُد اکتسابی تھی۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق فیکٹری ملازمت کے دوران انھوں نے محلّے کے ایک پنڈت جی سے ہندی کی پہلی کتاب پڑھی، پھر ہندی میں کسی قدر مشق بہم پہنچائی۔ اس کے نتیجے میں وہ ہندی پڑھ تو لیتے تھے، لکھ نہیں سکتے تھے۔ رشتے کے ایک بھائی صاحب سے انگریزی کی ''کنگ ریڈر'' پڑھی، پھر انگریزی اخبار خوانی کی مشق کی۔ اس باعث وہ انگریزی کی ہلکی پھلکی کتابیں آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے تھے اور حوالے کی کتابوں سے بہ خوبی استفادہ کر لیتے تھے (۹۸)۔ نامی انصاری نے لکھا ہے کہ رشید صاحب انگریزی سے تقریباً ناواقف تھے (۹۹)۔ ان کے تحقیقی کاموں میں کئی انگریزی کتابوں اور عبارتوں کے حوالے موجود ہیں، چناں چہ یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ رشید صاحب انگریزی زبان سے ''تقریباً ناواقف'' تھے۔

تحقیق کا شوق اور طبعی مناسبت انھیں کیسے حاصل ہوئی؟ اس سے متعلق انھوں نے تفصیلی معلومات دی ہیں۔ ان کے مطابق ان کے دل میں تحقیق کے نقوش اوّل اوّل مدرسے کے اُستادِ محترم کی اس بات سے بیٹھے کہ ہر بات کی تصدیق کر لینی چاہیے۔ سنی سنائی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ روایت اور درایت کے اصولوں کی تعلیم اور منطق کا مطالعہ بھی اس سلسلے میں معاون ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ گھر میں والد صاحب اور ارد گرد کے دیگر افراد کے کھرے پن اور عدم مفاہمت کے رویّے نے بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1944 کے قریب ماہ نامہ ''نگار'' (لکھنؤ) اور نیاز فتح پوری کی تحریریں مطالعے میں آئیں تو ان کی علمیّت اور اندازِ تحریر نے مزاج پر بڑا اثر ڈالا۔ تشکیک، دلیل کا مطالبہ، شہادت اور گواہی کا تصّور اور روایت کی پرکھ کے متعلقات کا شعور ابتداً نیاز فتح پوری کی تحریروں سے ہوا۔ اس کے ساتھ مولانا شبلی کی ''شعر العجم'' کا مطالعہ بھی مؤثر ثابت ہوا۔ اسی دوران انھوں نے حافظ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود اور عبدالستار صدیقی کی تحقیقی تحریروں کا مطالعہ کیا تو نیاز فتح پوری اور مولانا شبلی کی تحریروں کا سحر ٹوٹا اور انھیں علم ہوا کہ نیاز اور شبلی کا اندازِ تحریر یقیناً مؤثر ہے لیکن دونوں ادیب تحقیق میں خاصے کمزور ہیں (۱۰۰)۔

رشید صاحب کے اپنے بیان کے مطابق لغت، زبان کے مسائل، عروض، قواعد، زبان و بیان، رسمِ خط، ادبی تحقیق، تدوین، تاریخ ادب اور تنقید ان کے پسندیدہ موضوعاتِ تحقیق تھے۔ (۱۰۱) لغات وزبان دانی اور املا وغیرہ سے دل چسپی کی وجہ یہ تھی کہ ان کی بنیادی تعلیم مدرسے کی عربی وفارسی تعلیم تھی جس میں دو سال تک قواعدِ زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس سے ذہن میں عبارت اور لفظوں کو ناپنے کا پیمانہ بن جاتا ہے۔

لغات ومتعلقاتِ زبان پر مطالعہ وتحریر کا آغاز انھوں نے 64-1945 میں کیا۔ املا پر سب سے پہلے انھوں نے عبدالستار صدیقی کی تحریروں کا مطالعہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ اُردو والوں نے املا کی معیار بندی کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ مکروہاتِ زمانہ سے کچھ فرصت پا کر 1960 میں انھوں نے اُردو املا پر اپنی تحقیق کے کام کا آغاز کیا اور موضوع پر متعلقہ مواد کا مطالعہ شروع کر دیا۔ تیرہ سال کی محنت کے بعد 1973 میں انھوں نے اپنی تحقیقات مکمل کیں اور اسے کتابی صورت میں ''اُردو املا'' کے نام سے شائع کرایا۔ رشید صاحب نے ایک سے زیادہ جگہوں پر یہ وضاحت کی ہے کہ انھوں نے اُردو املا میں کوئی تبدیلی نہیں کی بل کہ اسے سہل بنایا ہے۔ مختلف الفاظ کی ایک سے زیادہ رائج شکلوں اور املا میں سے معیاری شکلوں اور املا کی نشان دہی کی ہے۔ املا پر ان کے کام کی بنیاد انجمن ترقّی اُردو ہند کی شائع ہونے والی وہ رپورٹ ہے جو سہ ماہی ''اُردو'' میں 1944 میں شائع ہوئی۔ یہ رپورٹ اصل میں اس کمیٹی کی سفارشات پر مبنی تھی جو 1943 میں انجمن ترقّیِ اُردو ہند نے قائم کی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اس کے معتمد (سیکرٹری) تھے (۱۰۲)۔

رشید صاحب تحقیق میں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کو اپنا معنوی اُستاد تسلیم کرتے تھے اور اعتراف کرتے تھے کہ انھوں نے ان محققین کی تحریروں سے تحقیق و تدوین کے اصول اور آداب سیکھے (۱۰۳)۔

رشید صاحب کے تدوینی کاموں کے معیار سے متاثر ہو کر ڈاکٹر گیان چند جین نے انھیں ''خدائے تدوین'' کا خطاب دیا۔(۱۰۴)

رشید صاحب کو شہرت، دولت اور نام و نمود کی خواہش نہیں تھی اور وہ اسے تحقیق کی طبعی مناسبت کے خلاف سمجھتے۔ کالی داس گپتا رضاؔ کے نام 6 دسمبر 1995 کے ایک خط میں رشید صاحب نے لکھا کہ محققین کے حصے میں ہمیشہ بے قدری آئی ہے۔ شہرتِ عام ویسے بھی محقق کو راس نہیں آتی، نہ محقق کے کام کی ہوتی ہے (۱۰۵)۔ ایک اور جگہ انھوں نے محقق کی خصوصیات کے سلسلے میں لکھا کہ محقق میں صبر، تحمل اور قوتِ برداشت ہونی چاہیے اور دنیا کو حاصل کرنے کا جذبہ کم سے کم ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ محقق کو کثیر المطالعہ ہونا چاہیے۔ اسے پڑھنا زیادہ اور لکھنا کم چاہیے۔ سہل انگاری اور غیر ضروری موضوعات کا انتخاب بھی تحقیق کُش ہوتا ہے (۱۰۶)۔

رشید صاحب اپنی زندگی اور حاصلات سے مطمئن تھے۔ تحقیق جیسے غیر منفعت بخش کام میں عمر گزارنے پر انھیں کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔ اپنی وفات سے چند سال قبل انھوں نے خود لکھا کہ انھوں نے سوچ سمجھ کر تحقیق جیسے گھاٹے کے سودے کا انتخاب کیا اور انھیں اس پر کوئی پچھتاوا نہیں۔ ان کا ضمیر مطمئن تھا۔ کبھی غلط کی حمایت اور سچ کی مخالفت نہیں کی، اسی وجہ سے پاک و ہند کے کئی لوگ ان سے ناخوش تھے لیکن انھوں نے اسے کبھی اہمیت نہیں دی۔ وہ اپنی زندگی اور کارگزاری سے قطعی مطمئن اور خوش تھے (۱۰۷)۔

تصانیف و تدویناتِ رشید حسن خاں

- باغ و بہار (از میر امّن دہلوی) [تدوین، مقدمہ]
  اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، 1964
- مقدمۂ شعر و شاعری (از مولانا الطاف حسین حالیؔ) [تدوین، مقدمہ]
  اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1969
- انتخابِ نظیرؔ اکبرآبادی (از ولی محمد نظیرؔ اکبرآبادی) [انتخاب، تدوین، مقدمہ]
  اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1970
- دیوانِ دردؔ (از خواجہ میر دردؔ دہلوی) [تدوین، مقدمہ]
  اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1971
- انتخابِ مراثیِ انیسؔ و دبیرؔ (از میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ) [انتخاب، تدوین، مقدمہ]
  اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1971
- انتخابِ شبلی (مضامین) (از مولانا شبلی نعمانی) [انتخاب، تدوین، مقدمہ]
  اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1971
- انتخابِ سوداؔ (از مرزا محمد رفیع سوداؔ) [انتخاب، تدوین، مقدمہ]
  اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1972
- انتخابِ ناسخؔ (از امام بخش ناسخؔ لکھنوی) [انتخاب، تدوین، مقدمہ]
  اشاعت اوّل: نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1972/ طبع دوم: کراچی، انجمنِ ترقیِ اُردو پاکستان، 1996
- حیاتِ سعدیؔ (از مولانا الطاف حسین حالیؔ) [تدوین، مقدمہ]
  اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔
- موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ (از مولانا شبلی نعمانی) [تدوین، مقدمہ]
  اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔
- گذشتہ لکھنؤ (از عبدالحلیم شررؔ لکھنوی) [تدوین، مقدمہ]
  اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔
- اُردو املا

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، ترقی اُردُو بورڈ، 1974۔ طبعِ دوم: لاہور، فکشن ہاؤس 91۔ طبعِ سوم: نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اُردُو زبان، 1998

- اُردو کیسے لکھیں (صحیح اِملا)

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1975۔ طبعِ دوم: لاہور، اظہار سنز، 2007

- زبان اور قواعد (لغت، تلفّظ اور قواعدِ شاعری پر مضامین)

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، ترقّیِ اُردُو بورڈ، 1976۔ طبعِ ثانی: ایضاً [ترقی اُردُو بیورو] 1983

- ادبی تحقیق؛ مسائل اور تجزیہ (نظریاتی اور عملی تحقیق پر مضامین)

اشاعتِ اوّل: علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 1975۔ طبعِ دوم: لاہور، الفیصل، 1989

طبعِ سوم: لکھنؤ، اُتر پردیش اُردُو اکادمی، 1990

- تلاش و تعبیر (تنقیدی مضامین)

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، ناشر مصنف، 1988

- فسانۂ عجائب (از رجب علی بیگ سرورؔ) [تدوین، مقدمہ، حواشی، لغات]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، انجمن ترقی اُردُو ہند، 1990۔ طبعِ دوم: لاہور، نقوش، اپریل 1990

طبعِ سوم: نئی دہلی، انجمن ترقّیِ اُردُو ہند، 1996

- باغ و بہار (از میر امّن دہلوی) [تدوینِ جدید، مقدمہ، حواشی، لغات]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، انجمنِ ترقی اُردُو ہند، 1992۔ طبعِ دوم: لاہور، نقوش، 1992

طبعِ سوم: نئی دہلی، انجمن ترقی اُردُو ہند، 1997

- تفہیم (تحقیقی و تنقیدی مضامین)

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1993

- انشا اور تلفّظ

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ پیامِ تعلیم، دسمبر 1993۔ طبعِ دوم: لاہور، اظہار سنز، 2007

- عبارت کیسے لکھیں

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ پیامِ تعلیم، 1994۔ طبعِ دوم: لاہور، اظہار سنز، 2007

- انشائے غالب (از مرزا غالب) [تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اکتوبر 1994

- مثنوی گلزارِ نسیم (از پنڈت دیا شنکر نسیمؔ لکھنوی) [تدوین، مقدمہ، حواشی، لغات]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، انجمن ترقی اُردُو ہند، 1995

- مثنویاتِ شوقؔ (از نواب مرزا شوقؔ لکھنوی) [تدوین، مقدمہ، حواشی، لغات]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی انجمن ترقی اُردُو ہند، 1998۔ طبع دوم: کراچی، انجمن ترقی اُردُو پاکستان، 1998

- تدوین۔ تحقیق، روایت (تحقیقی مضامین کا مجموعہ)

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، ناشر مصنف، 1999

- سحر البیان (از میر غلام حسن حسنؔ دہلوی) [تدوین، مقدمہ، حواشی، لغات]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، انجمن ترقی اُردُو ہند، 2000

- املائے غالبؔ

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ، 2000۔ طبعِ دوم: کراچی، ادارۂ یادگارِ غالب، 2001

- مصطلحاتِ ٹھگی (از علی اکبر الٰہ آبادی) [تدوین، مقدمہ، حواشی]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، ناشر مدوّن، 2002ء۔ طبعِ دوم: لاہور، دارالنوادر، 2005

- کلاسیکی اَدب کی فرہنگ (پہلی جلد)

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، انجمنِ ترقی اُردو ہند، 2003

زٹل نامہ (کلّیاتِ جعفرزٹلّی) [تدوین، مقدمہ، حواشی، لغات]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، ناشر مدوّن، 2003

گنجینۂ معنی کا طلسم (لفظیاتِ غالبؔ۔ مسودہ تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے) زیرِ طبع: انجمنِ ترقّیِ اُردو ہند، نئی دہلی۔

نامکمل منصوبے

- غرائب اللغات (از عبدالواسع ہانسوی)
- قصائد سوداؔ (از مرزا محمد رفیع سوداؔ)
- امراؤ جان ادا (از مرزا محمد ہادی مرزاؔ ورسواؔ)
- کلیاتِ اقبالؔ (اُردُو)

حواشی و تعلیقات

۱۔ ''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ:''ص۹؛ ''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش):ص146؛ ''رشید حسن خاں'' (نامی انصاری):ص150

۲۔ ''رشید حسن خاں'' (نامی انصاری):ص251، حاشیہ از ادارہ؛ ''رشید حسن خاں کی یاد میں'' (نکہت بریلوی):ص153، 155

۳۔ ''کچھ اپنے بارے میں'':ص 157۔ ایک جگہ رشید صاحب نے تعلیمی اسناد میں پیدایش کی تاریخ 10 جنوری 1930 لکھی ہے [''رشید حسن خاں؛ یادوں کے آئینے میں'':ص۳۳]۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے 30 رجنوری کا اندراج غلطی کی بنا پر کردیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کمپوزنگ کی غلطی ہو

۴۔ ''رشید حسن خاں کی یاد میں'':ص30

۵۔ ''کچھ اپنے بارے میں'':ص157

۶۔ ''رشید حسن خاں؛ یادوں کے آئینے میں'':ص19۔

۷۔ اطہر فاروقی نے ہڑتال کا دورانیہ 34 دن لکھا ہے۔ [''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ'':10]۔ خود رشید حسن خاں نے بھی ایک جگہ ہڑتال کا یہی دورانیہ بیان کیا ہے [خود نوشت حالات در مجلّہ ''اظہار''، بمبئی، شمارہ 5: جنوری 1984، بحوالہ ''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ'':ص21]

۸۔ ایضاً، ص159، 160۔ اطہر فاروقی نے لکھا ہے: ''اس فیکٹری میں 1941 کے آخر میں چُھپ چھپا کر پہلی مزدور یونین بنائی گئی۔'' [''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ'': ص10] ظاہر ہے خود رشید حسن خاں کے بیان کے بعد یہ بیان درست نہیں رہا۔

۹۔ ''رشید حسن کاں کی یاد میں'':ص13

۱۰۔ ''کچھ اپنے بارے میں'':ص160

۱۱۔ خود نوشت حالات در مجلّہ ''اظہار''، بمبئی، شمارہ 5: جنوری 1984، بحوالہ ''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ'':ص21، 22

۱۲۔ ایضاً، ص31

۱۳۔ ''کچھ اپنے بارے میں'':ص160

۱۴۔ ''رشید حسن کی یاد میں'':ص13

۱۵۔ ''کچھ اپنے بارے میں'' ص160

۱۶، ۱۷، ۱۸۔ ''رشید حسن کی یاد میں'':13

۱۹۔ ''کچھ اپنے بارے میں'':ص158

۲۰۔ ''رشید حسن خاں کی یاد میں'':ص13

۲۱۔ ''کچھ اپنے بارے میں'':ص159

۲۲۔ ایضاً، ص158۔ اطہر فاروقی کا بیان ہے: ''عربی مدرسے کے طلبہ نے ان سے پڑھنے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد رشید صاحب کو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے

لیے دوسری جماعت میں بھیج دیا گیا۔'' [''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ'': ص10] ۔رشید صاحب نے مدرسۂ فیضِ عام میں دوسری جماعت کے بچوں کو پڑھانے کی بات کہیں نہیں لکھی۔ اُن کے اپنے بیان کے مطابق:

۲۳۔ ''سمجھوتا اس پر ہوا کہ میں درسِ نظامی کے بجائے منشی، مولوی اور منشی کامل کے امتحانات کی تیاری کراؤں اور اس کے پر سبھی مطمئن ہو گئے۔'' [''کچھ اپنے بارے میں'': ص158]

۲۴۔ اطہر فاروقی نے فارسی اُردو کے بجائے فارسی عربی اُستاد کی جگہ خالی ہونے کا لکھا ہے [ایضاً]۔ یہ درست نہیں۔

۲۵۔ ''کچھ اپنے بارے میں'': ص159۔

۲۶۔ ''ممتاز محقق اور متنی نقاد؛ رشید حسن خاں'': ص۴۔

۲۷۔ ''رشید حسن خاں کی یاد میں'': 31۔

۲۸۔ ''کچھ اپنے بارے میں'': ص159۔

۲۹۔ ''انھوں نے ۱۱ سال تک اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول (شاہ جہاں پور) میں اُردُو اور فارسی کی تدریسی خدمات انجام دیں۔'' [''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش): تعارف از ادارہ، ص146] ۔معلوم ہوتا ہے کہ سہ ماہی ''روشنائی'' کے مدیران نے اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں ملازمت کا دورانیہ 1949 سے 1959 تک شمار کیا ہے۔ 1949 میں رشید صاحب مدرسۂ فیضِ عام میں مدرّس ہوئے تھے جب کہ اسلامیہ اسکول میں ملازمت 1952 میں اختیار کی۔ یوں اسلامیہ اسکول میں اُن کی ملازمت کا دورانیہ 1952 سے وسط 1959 اور عرصہ کم و بیش سات سال بنتا ہے۔

۳۰۔ ''کچھ اپنے بارے میں'': ص159۔ سہ ماہی ''روشنائی'' (کراچی) میں تحریر ہے: ''...انھوں نے دہلی یونی ورسٹی میں ریسرچ افسر کے عہد پر 1999 تک کام کیا۔ [''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش): تعارف از ادارہ، ص146] ۔ظاہر ہے یہ درست نہیں۔ دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ افسر کا کوئی عہدہ موجود نہیں تھا۔ یہ عہدہ یونیورسٹی کے کسی شعبے میں تو ہو سکتا تھا اور اس عہدے کا نام ''ریسرچ افسر'' بھی نہیں تھا۔ رشید صاحب شعبۂ اُردُو میں ملازم تھے اور انھوں نے یہاں ''ریسرچ اسسٹنٹ'' اور ''ریسرچ ایسوسی ایٹ'' کے طور پر فرائض انجام دیے تھے۔

۳۱۔ ''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش): ص147۔

۳۲۔ ''رشید حسن خاں؛ کچھ یادیں، کچھ باتیں'': ص23۔

۳۳،۳۴۔ ''رشید حسن خاں؛ ادب اور زندگی کی ایک متوازن شخصیت'': ص6۔

۳۵،۳۶۔ ''رشید حسن خاں کی یاد میں'': ص31۔

۳۷۔ ''کچھ اپنے بارے میں'': ص159۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے مضمون میں سبک دوشی کی تاریخ 13 دسمبر 1989 درج ہے [رشید حسن خاں؛ اُردُو تحقیق کا رجُلِ رشید'': ص47] ۔13 دسمبر یقیناً کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ ہاشمی صاحب نے 31 دسمبر ہی لکھا ہوگا۔

۳۸۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی و غیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو'': ص۱۱۔

۳۹۔ ''رشید حسن خاں کی یاد میں'': ص30 اور 31۔

۴۰۔ ایضاً، ص31۔

۴۱۔ ''رشید حسن خاں؛ یادوں کے آئینے میں'': 19۔

۴۲۔ ''رشید حسن خاں کی یاد میں'': ص30۔

۴۳۔ ''رشید حسن خاں؛ یادوں کے آئینے میں'': ص32۔

۴۴۔ ایضاً، ص33۔

۴۵۔ ''رشید حسن خاں؛ میرے مشفق، میرے اُستاد'': ص15۔

۴۶۔ ''رشید حسن خاں؛ اُردُو تحقیق کا رُجلِ رشید'': ص50۔

۴۷۔ ''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش): ص147۔

۴۸۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی و غیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو'': ص۱۱؛ ''رشید حسن خاں کی یاد میں'': ص13۔

۴۹۔ ''کچھ اپنے بارے میں'': ص160۔

۵۰۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی وغیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو'':ص۱۱؛''رشید حسن خاں کی یاد میں'':ص13۔
۵۱۔ ''رشید حسن خاں؛ یادوں کے آئینے میں'':ص19۔
۵۲۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی وغیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو'':ص۱۱۔
۵۳۔ ''رشید حسن خاں؛ ایک عہد ساز شخصیت'':ص13۔
۵۴۔ ''رشید حسن خاں؛ ادب اور زندگی کی ایک متوازن شخصیّت'':ص5۔
۵۵۔ ''ممتاز محقّق اور متنی نقاد؛ رشید حسن خاں'':ص4۔
۵۶۔ ''رشید حسن خاں'' (جگن ناتھ آزاد):ص21۔
۵۷۔ ''رشید حسن خاں؛ ادب اور زندگی کسی ایک متوازن'' :ص6۔
۵۸۔ ''خاں صاحب رشید حسن خاں'':ص45۔
۵۹۔ زبانی روایت جناب محمد علی انجم (مالک و منیجر اظہار سنز، اُردو بازار، لاہور)۔
۶۰۔ ''کچھ اپنے بارے میں'':ص163 تا165۔
۶۱۔ ''رشید حسن خاں؛ ادب اور زندگی کی ایک متوازن شخصیّت'':ص6۔
۶۲۔ ''ہمارے خاں صاحب'':ص135۔
۶۳۔ ''رشید حسن خاں؛ ادب اور زندگی کی ایک متوازن شخصیّت'':ص6۔
۶۴۔ ''رشید حسن خاں صاحب'' :ص17۔
۶۵۔ ''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش):ص148۔
۶۶۔ ''کچھ اپنے بارے میں'': ص162،163۔
۶۷۔ ''رشید صاحب کی ادبی وغیر ادبی شخصیّت کے مختلف پہلو'':ص۱۱۔
۶۸۔ ''خاں صاحب'' (ڈاکٹر اسلم پرویز):ص39،40۔
۶۹۔ ''رشید حسن خاں کا تنقیدی رویّہ اور شخصیّت'':ص56؛''قابل قدر عالم، خوش اسلوب انسان'':ص 49۔
۷۰۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی وغیر ادبی شخصیّت کے مختلف پہلو'':ص۱۱۔
۷۱۔ ''رشید حسن خاں'' (صدیق الرحمٰن قدوائی):ص2۔
۷۲۔ خودنوشت حالات در مجلّہ ''اظہار''، بمبئی: ص13،14۔
۷۳۔ ''ممتاز محقّق اور متنی نقاد؛ رشید حسن خاں'':ص۳۔
۷۴۔ ''رشید حسن خاں'' (نامی انصاری):ص150۔
۷۵۔ ''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش):ص481۔
۷۶۔ ''ہمارے خاں صاحب'':ص10۔
۷۷۔ ایضاً،ص۱۱۔
۷۸۔ ''خانِ والاشان'':ص57۔
۷۹۔ ''ہمارے خان صاحب'':ص12۔
۸۰۔ ''رشید حسن خاں کا تنقیدی رویہ اور شخصیّت'':ص56؛''قابل قدر عالم، خوش اسلوب انسان'':ص 49؛''رشید حسن خاں ادبی وغیر ادبی شخصیّت کے مختلف پہلو'':ص ۱۱۔
۸۱۔ ''ممتاز محقّق اور متنی نقاد؛ رشید حسن خاں'':ص۴۔
۸۲۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی اور غیر ادبی شخصیّت کے مختلف پہلو'':ص۱۱۔
۸۳۔ ''خاں صاحب رشید حسن خاں'':ص43۔

۸۴۔ ''ممتاز محقّق اور متنی نقاد؛ رشید حسن خاں''؛ص۳۔

۸۵۔ ''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش):ص147۔

۸۶۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی وغیر ادبی شخصیّت کے مختلف پہلو'':ص۱۱۔

۸۷۔ ''ہمارے خان صاحب'':ص۹۔

۸۸۔ مذاکرہ:ص59۔

۸۹۔ ''ہمارے خاں صاحب'':ص۹۔

۹۰۔ ''خاں صاحب رشید حسن خاں'':ص45۔

۹۱۔ ''خاں صاحب سے بات چیت'':ص62۔

۹۲۔ ایضاً،ص63۔

۹۳۔ ''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ'':ص11،13؛''خاں صاحب سے بات چیت'':ص60،61۔

۹۴۔ ''رشید حسن خاں کا ایک یادگار خط'':ص157،158۔

۹۵۔ ''خانِ والا شان'':ص57؛''ہمارے خان صاحب'':ص137۔

۹۶۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی وغیر ادبی شخصیّت کے مختلف پہلو'':ص۱۱۔

۹۷۔ ''رشید حسن خاں سے بات چیت'':ص60 تا64۔

۹۸۔ ''کچھ اپنے بارے میں'':ص158۔

۹۹۔ ''رشید حسن خاں'' (نامی انصاری):ص 150۔

۱۰۰۔ ''کچھ اپنے بارے میں'':ص160 تا162؛''خاں صاحب سے بات چیت'':ص6۰تا62۔

۱۰۱۔ خودنوشت حالات در مجلّہ ''اظہار''، بمبئی:ص 13؛''رشید حسن خاں کا ایک یادگار خط'':ص158۔

۱۰۲۔ مذاکرہ:ص51۔

۱۰۳۔ خودنوشت حالات در مجلّہ ''اظہار''، بمبئی:ص۱۱؛''رشید حسن خاں سے ایک انٹرویو'':ص۲۲۔

۱۰۴۔ ''خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ:مثنویاتِ شوق'':ص 29۔

۱۰۵۔ ''ہمارے خاں صاحب'':ص۱۰۔

۱۰۶۔ مذاکرہ:ص54،55۔

۱۰۷۔ ''کچھ اپنے بارے میں'':ص166۔

۱۰۸۔ تصانیف و تدوینیاتِ رشید حسن خاں کی ترتیب میں ذاتی تحقیق و تلاش کے علاوہ ذیل کے ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱) ''رشید حسن خاں کی یاد میں'':ص31،32۔

کتاب یات (مضامین)

۱۔ ادارہ: تعارف برمضمون ''رشید حسن خاں''(رفعت سروش)؛''ادبی کارگزاریاں:رشید حسن خاں۔'' سہ ماہی ''روشنائی'' (کراچی)۔جلد7، شمارہ26: جولائی تا ستمبر 2006۔ص144 تا146۔

۲۔ اسلم پرویز: ''رشید حسن خاں؛ادب اور زندگی کی ایک متوازن شخصیت۔'' ہفت روزہ ''ہماری زبان'' (نئی دہلی)۔جلد 65، شمارہ 33 تا36: یکم تا28 ستمبر، 2006 (رشید حسن خاں نمبر)۔ص5،6،11۔

۳۔ ایضاً ''خاں صاحب''۔مشمولہ:''رشید حسن خاں (شخصیّت اورادبی خدمات)''۔ مرتّب: اطہر فاروقی، نئی دہلی، ماہنامہ''کتاب نما''۔ پہلی بار: جولائی۔ص 34تا40۔
۴۔ اشفاق محمد خاں،ڈاکٹر: ''رشید حسن خاں صاحب''۔سہ ماہی''ترسیل'' (بمبئی) شمارہ 12،22: جنوری تاجون1999۔ص 14 تا18،28۔
۵۔ اطہر فاروقی: ''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ''۔مشمولہ:''رشید حسن خاں (شخصیّت اور ادبی خدمات)''۔مرتّب:اطہر فاروقی،نئی دہلی، ماہنامہ''کتاب نما''۔پہلی بار:جولائی2003۔ص9تا18۔
۶۔ انورخاں: ''قابلِ قدر عالم، خوش اسلوب انسان''۔مشمولہ :''رشید حسن خاں (شخصیّت اور ادبی خدمات)'' ۔مرتّب: اطہر فاروقی، نئی دہلی، ماہنامہ ''کتاب نما''۔پہلی بار:جولائی2003۔ص47تا52۔
۷۔ ایضاً ''رشید حسن خاں کا تنقیدی رویہ اورشخصیّت'': سہ ماہی''ترسیل'' (بمبئی) شمارہ21،22:جنوری تاجون1999ء۔ص 54 تا59۔
۸۔ تسلیم غوری بدایونی: ''رشید حسن خاں؛ کچھ یادیں، کچھ باتیں''ہفت روزہ''ہماری زبان''(نئی دہلی)۔جلد65،شمارہ33 تا36: یکم تا28 ستمبر 2006 (رشید حسن خاں نمبر)۔ص23،14۔
۹۔ جگن ناتھ آزاد: ''رشید حسن خاں''۔مشمولہ:''رشید حسن خاں (شخصیّت اورادبی خدمات)'' ۔مرتّب: اطہر فاروقی، نئی دہلی، ماہنامہ''کتاب نما''۔ پہلی بار: جولائی 2003۔ص21 تا 24۔
۱۰۔ خلیق انجم،ڈاکٹر: ''ممتاز محقّق اورمتنی نقّاد؛رشید حسن خاں''۔ ایضاً،ص3،4،30۔
۱۱۔ خورشید حسن خاں: ''رشید حسن خاں کی ادبی وغیرادبی شخصیت کے مختلف پہلو''۔ایضاً،ص11۔
۱۲۔ ایضاً: ''رشید حسن خاں کاایک یادگارخط بنام محمد اسداللہ(مقیم برلن،جرمنی)''۔سہ ماہی''روشنائی''(کراچی)۔جلد7،شمارہ26: جولائی تاستمبر2006۔ص 156 تا158۔
۱۳۔ رشید حسن خاں: ''کچھ اپنے بارے میں'' مجلّہ''بازیافت''(لاہور)۔شمارۂ اوّل: جنوری 2002۔ص151تا166۔
۱۴۔ رفعت سروش: ''رشید حسن خاں''۔سہ ماہی''روشنائی''(کراچی)،جلد 7 شمارہ: 26: جولائی تاستمبر2006۔ص147 تا149۔
۱۵۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: ''رشید حسن خاں...اُردو تحقیق کا رجلِ رشید'' ماہ نامہ''کتاب نما''(نئی دہلی)۔جلد46،شمارہ8:اگست2006۔ص47 تا51۔
۱۶۔ رینا،ڈاکٹرٹی آر: ''رشید حسن خاں؛ یادوں کے آئینے میں'' ہفت روزہ'ہماری زبان''(نئی دہلی)۔جلد65،شمارہ33 تا36: یکم تا28 رستمبر،2006(رشید حسن خاں نمبر)۔ص18،19،32،33۔
۱۷۔ شمس بدایونی،ڈاکٹر: ''رشید حسن خاں کی یاد میں''۔ایضاً،ص9،10،30 تا32۔

۱۸۔ شمیم حنفی: ''خاں صاحب رشید حسن خاں''، ماہ نامہ ''کتاب نما'' (نئی دہلی)۔جلد ۳۰، شمارہ ۸: اگست 1990۔ص 42 تا 46۔

۱۹۔ عبداللہ ولی بخش قادری: ''ہمارے خاں صاحب''۔مشمولہ: ''رشید حسن خاں (شخصیّت اور ادبی خدمات)''۔مرتّب: اطہر فاروقی، نئی دہلی، ماہنامہ ''کتاب نما''۔پہلی بار: جولائی 2003۔ص 134 تا 137۔

۲۰۔ قدوائی، (ڈاکٹر) صدیق الرحمٰن: ''رشید حسن خاں'' ہفت روزہ ''ہماری زبان'' (نئی دہلی)۔جلد 65، شمارہ 33 تا 36: یکم تا 25/ستمبر، 2006 (رشید حسن خاں نمبر)۔ص ۲، ۲۲۔

۲۱۔ گپتا رضا، کالی داس: ''ہمارے خان صاحب''۔سہ ماہی ''ترسیل'' (بمبئی) شمارہ 21، 22: جنوری تا جون 1999۔ص 6 تا 13۔

۲۲۔ گیان چند جین، ڈاکٹر: ''خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ: مثنویاتِ شوق''۔سہ ماہی ''ترسیل'' (بمبئی) شمارہ 21، 22: جنوری تا جون 1999۔ص 29 تا 35۔

۲۳۔ مخمور سعیدی: ''خانِ والا شان''۔مشمولہ: ''رشید حسن خاں (شخصیّت اور ادبی خدمات)''۔مرتّب: اطہر فاروقی، نئی دہلی، ماہنامہ ''کتاب نما''۔ پہلی بار: جولائی 2003ء۔ص 53 تا 57۔

۲۴۔ معین الدین جینابڑے (مکالمہ نگار): ''خاں صاحب سے بات چیت''۔ سہ ماہی ''ترسیل'' (بمبئی) شمارہ 21، 22: جنوری تا جون 1999۔ص 60 تا 72۔

۲۵۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر: ''اُردو تحقیق اور املا کے مسائل سے متعلق رشید حسن خاں سے ایک انٹرویو''۔ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' (نئی دہلی)۔جلد 65، شمارہ 33 تا 36: یکم تا 25 ستمبر 2006ء (رشید حسن خاں نمبر)۔ص 20 تا 22۔

۲۶۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر: ''رشید حسن خاں؛ میرے مشفق، میرے اُستاذ''۔ایضاً ص 15، 22۔

۲۷۔ نامی انصاری: ''رشید حسن خاں'' سہ ماہی ''روشنائی'' (کراچی)۔جلد 7، شمارہ 26: جولائی تا ستمبر 2006۔ص 150 تا 152۔

۲۸۔ نکہت بریلوی ''رشید حسن خاں کی یاد میں''۔ ایضاً، حاشیہ از مدیر، ص ۱۵۵۔

۲۹۔ یعقوب میراں مجتہدی: ''رشید حسن خاں؛ چند یادیں۔'' ہفت روزہ ''ہماری زبان'' (نئی دہلی)۔جلد 65، شمارہ 33 تا 36: یکم تا 25/ستمبر، 2006ء (رشید حسن خاں نمبر)۔ص 12۔

۳۰۔ 'مذاکرہ: اُردو زبان میں تحقیق کی اہمیت اور موجودہ صورتِ حال''۔شخصیت: رشید حسن خاں۔شرکائے گفتگو: ڈاکٹر معین الرحمٰن، سجّاد باقر رضوی، جیلانی کامران، مسعود اشعر، اکرام چغتائی، ذوالفقار تابش۔ ماہ نامہ ''کتاب نما'' (نئی دہلی)۔اگست 1990۔ص 15 تا 59۔

(مخزن، لاہور، پاکستان، شمارہ مسلسل 18، 2009 جلد 9، شمارہ 2، صفحہ 7 تا 31)

نوٹ: یہ مضمون ذکیہ مراد (لاہور) نے احقر کے استفسار پر یکم/اپریل 2017 کو بہ ذریعہ ای میل احقر کو بھیجا۔

○○○

رشید حسن خاں

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

رشید حسن خاں ہمارے عہد کے یگانۂ روزگار محقق، بے بدل تدوین کار اور عبقری عالم تھے۔ اُنھوں نے تحقیق، تدوین، املا اور مسائلِ زبان جیسے متنوع اور دقیق موضوعات پر قلم اُٹھایا اور اپنی بے پناہ تحقیقی بصیرت اور علمی لیاقت سے ان موضوعات کو ثمر بار کیا۔ رشید حسن خاں نے حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جیسے اکابرینِ تحقیق کے کمالاتِ علمی اور حاصلاتِ تحقیق سے کماحقہ استفادہ کیا اور ایک ایسے مہم آفریں اور صبر آزما جادۂ تحقیق پر سفر کا آغاز کیا جس پر چلنا کارِ آساں نہ تھا اور جس پر چلتے ہوئے بڑے بڑے ''محقق'' دو قدموں کی مسافت پر ہانپتے دکھائی دیتے ہیں۔ رشید حسن خاں کی ذات میں اکابرینِ تحقیق کے انفرادی خصائص مجتمع تھے۔ اُنھوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ علم و ادب کے مختلف شعبوں میں جس انہاک اور دیدہ ریزی سے کام کیا، اُس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

علمی دُنیا میں اُن کا ہر کارنامہ اپنی مثال آپ ہے۔ اُنھیں تحقیق اور تدوین کی قدر و قیمت اور ضرورت و افادیت کا کامل احساس تھا؛ اسی احساس کے تحت اُنھوں نے بے سروسامانی اور نامساعد حالات کے باوجود تنِ تنہا ان شعبوں میں اتنا وقیع اور معیاری کام کیا جو باوسائل اداروں اور کئی افراد کے اشتراک سے بھی ممکن نہیں۔ کلاسیکی ادب پاروں کی تدوینِ جدید کو وہ وقت کی اہم ضرورت خیال کرتے تھے؛ اُنھوں نے اپنی تحریروں، تقریروں، سمیناروں، لیکچروں، مکالموں اور خطوں میں اس شعبے کو باثروت بنانے پر زور دیا۔ وہ محض گفتار کے دھنی نہ تھے بل کہ عمل کے خوگر بھی تھے۔ اُنھوں نے عملی طور پر کلاسیکی سرمائے کی تدوین کر کے ایسی مثالیں قائم کی ہیں جن کی ضیا پوشیوں سے تحقیق و تدوین کے طلبہ تا دیر استفادہ کرتے رہیں گے۔

رشید حسن خاں اپنی بے پناہ تصنیفی و تالیفی مصروفیات کے باوجود 'کثیر المراسلت' تھے۔ پاک و ہند کے بیسیوں اہلِ علم کے ساتھ اُن کا برسوں کا سلسلۂ مکاتیب تھا۔ خط کا جواب دینے میں وہ ہمیشہ مستعد اور تیار رہتے تھے۔ اُن کے مکاتیب محض مزاج پُرسی اور احوال آشنائی کا اشاریہ نہیں بل کہ علمی اور ادبی جواہر کا مرقع ہیں۔ ان کے مکاتیب کے آئینے میں اُن کا علمی تجمّل پوری شان کے ساتھ عکس فگن ہے۔

(مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، مرتب ارشد محمود ناشاد، ادارہ مطبوعات سلیمانی، لاہور، ص 12-11، جون 2009)

رشید حسن خاں کی آخری آرام گاہ اور کچھ باتیں

ڈاکٹر ٹی.آر. رینا

14 جولائی 2008 کی شام سات بج کر پندرہ منٹ پر میں سیالدہ ایکسپریس سے شاہ جہاں پور کے لیے روانہ ہوا۔ دوسرے دن، 15 جولائی کو، 2:05 بجے میں، شاہ جہاں پور ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ باہر نکلتے ہی رکشا کیا اور مرحوم رشید حسن خاں صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ جب رِکشا اُن کے مکان کے سامنے گلی میں رُکا تو دیکھا کہ وہاں مرحوم کا چھوٹا بیٹا خالد حسن میرے انتظار میں کھڑا ہے۔ اسے دو دن پہلے میں نے اپنے آنے کی اطلاع بہ ذریعہ فون دے دی تھی۔ مجھے ساتھ لے کر وہ اپنے مکان میں داخل ہوا۔ جس بیٹھک (یعنی ڈرائنگ روم) میں، میں پہلے دو بار آ چکا تھا وہ بند تھی۔ مجھے اندر لے جا کر ایک دوسری بیٹھک میں بٹھایا گیا، جس میں ایک صوفہ، اُس کے ساتھ دو اسی ٹائپ کی کرسیاں، درمیان میں ایک میز اور تخت بچھے ہوئے تھے۔ خالد حسن کی بیگم صاحبہ فوراً ٹھنڈا پانی لے کر آ گئیں۔ ابھی ہم بات چیت کر ہی رہے تھے کہ چاے آ گئی۔ اب کی بار چاے لانے کا انداز بدلا ہوا تھا۔ خاں صاحب کے وقت میں چاے دانی پہ ٹی کوزی رکھی ہوتی تھی، شکر اور دودھ الگ الگ برتنوں میں ہوتے تھے۔ ہاں کروکری وہی تھی۔ مٹھائی اور بسکٹ بڑی خوب صورتی سے پلیٹوں میں سجائے ہوئے تھے۔ خالد میاں، اُن کی بیگم صاحبہ اور اُن کی بڑی بھاوج یعنی خورشید حسن خاں کی بیگم صاحبہ اور راقم نے اکٹھے بیٹھ کر چاے پی اور مرحوم خاں صاحب سے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔

چاے پینے کے تھوڑی دیر بعد دونوں دیورانی اور جیٹھانی رسوئی گھر میں چلی گئیں اور جلد ہی میز پر کھانا لگا دیا گیا۔ میں نے اور خالد میاں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ دورانِ گفتگو خالد میاں نے مرحوم خاں صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ ہم دونوں بھائیوں اور ہماری بیگموں کے علاوہ بھائی صاحب کی دو بچیوں اور میرے بیٹے سے وہ بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ اپنے ادبی کاموں سے وقت نکال کر روزانہ ہمارے بچوں کو اُردو پڑھایا کرتے تھے۔

خورشید حسن خاں بھی اب اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد گھر چلے آئے اور آ کر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان کی دونوں بچیاں پہلے ہی مل چکی تھیں۔ خورشید حسن خاں اوپر والی منزل میں رہتے ہیں اور خالد نیچے والی میں۔

وقت کافی گزر چکا تھا، میں نے مرحوم رشید حسن خاں صاحب کے مزار پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ خالد میاں ساتھ ہو لیے۔ گھر سے نکل کر گلی سے ہوتے ہوئے یوں

اس کے دو گیٹ ہیں، مشرق کی جانب بڑا اور جنوب کی جانب چھوٹا۔ بڑے گیٹ کے اوپر پکی چھت ڈلی ہوئی ہے جو چار ستونوں کے سہارے کھڑی ہے۔ گیٹ کے دونوں پٹ ٹین کی چادر کے بنے ہوئے ہیں۔ گیٹ تالے کے بجائے کالے کپڑے کی ایک پٹی سے بندھا ہوا تھا۔ خالد نے آگے بڑھ کر اسے کھولا۔ اِس وقت یہاں کوئی تکیے دار نہیں تھا۔ اس وقت شام کے پونے پانچ بج رہے تھے اور تکیے دار گیسوشاہ اپنے گھر جا چکا تھا۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو وہاں کا منظر عجیب سا لگ رہا تھا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ شاید اِسی لیے شعرا حضرات ایسی جگھوں کو شہرِ خموشاں کے نام سے پکارتے ہیں۔ چاروں طرف گھاس ہی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ بارش ہونے کی وجہ سے یہاں کی زمین کافی نرم ہو چکی تھی۔ چلتے ہوئے زمین میں پانوں دھنس جاتا تھا۔ اِسی احاطے کے درمیان بر گد کا ایک بڑا سا درخت ہے۔ کسی حضرت کی آرام گاہ پکی بنی ہوئی ہے۔ اُس پر سبز رنگ کی چادر چڑھی ہوئی ہے اور چار ستونوں پہ ایک چھوٹی سی چھت بھی ڈالی گئی ہے۔ کوئی کتبہ نہیں، اسی لیے نام کا پتا نہیں چلتا۔ ساتھ ہی دو اور چھوٹے چھوٹے سیمنٹ اور اینٹوں کے بنے ہوئے نشانات ہیں، جس کی اونچائی قریب دو فٹ ہوگی۔ لیکن ہم انھیں کتبے نہیں کہہ سکتے۔ انھی سے ملی ہوئی مستطیل شکل کی ایک اور پکی آرام گاہ ہے جس کا درمیانی حصّہ کچّا ہے۔ ہم اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سیدھے مرحوم رشید حسن خاں کی آخری آرام گاہ تک پہنچے جو بالکل کچی ہے اور ایک چھوٹے سے بیری کے پیڑ کے نیچے احاطے کی چار دیواری سے متصل ہے۔ خالد میاں نے بتایا کہ ''ان کی امّی خاں صاحب کے داہنے پہلو میں آرام فرما رہی ہیں''۔

مگر وہاں ایسا کوئی نشان نہیں جسے ہم اُن کی آرام گاہ کہہ سکیں۔ زمین ہموار ہو چکی ہے۔ دونوں آرام گاہوں پر کوئی کتبہ نہیں اور نہ ہی کسی اور پر۔ خالد میاں نے بتایا کہ '' اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان کی آخری آرام گاہوں کو پکا کیا جائے اور ان پر کتبے لگائے جائیں''۔ لیکن ظہورِ اسلام سے لے کر آج تک کتنے لوگوں نے اِس اصول کی پیروی کی ہے؟

مرحوم خاں صاحب کی آخری آرام گاہ نے یہ تیسری برسات اپنے اوپر برداشت کی ہے۔ اگلی برسات اس کے رہ گئے نشانات بھی مٹا ڈالے گی، جس طرح اس شہرِ خموشاں میں باقی آرام گاہوں کے نشانات مٹ چکے ہیں۔

گیٹ سے رشید حسن خاں کی آخری آرام گاہ تک پہنچنے کے لیے نہ جانے ہمیں کتنی اور آرام گاہوں کے اوپر سے ہو کر گزرنا پڑا اور ہمارے نام کتنے گناہ لکھے گئے۔ لیکن اِس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ یہاں کی ساری زمین ہموار ہو چکی ہے۔ آج کا دن اچھا تھا کہ آج بارش نہیں ہوئی ورنہ اُن کی آخری آرام گاہ تک پہنچنا مشکل ہو جاتا، کیوں کہ یہاں چاروں طرف پانی بھر جاتا ہے۔ ہاں اس شہرِ خاموشاں کے چاروں طرف اینٹوں کی پکی دیوار ہے جو قریب پانچ فٹ سے زیادہ ہی اونچی ہوگی۔ مغرب کی جانب ایک مسجد بھی ہے جہاں آخری نماز ادا کی جاتی ہے۔

مرحوم رشید حسن خاں کے سبھی بزرگوں کی بھی یہیں آخری آرام گاہیں ہیں، لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس کی آرام گاہ کون سی ہے۔ بقولِ خالد میاں ''اس بات کو تکیے دار گیسوشاہ کے والد بہتر جانتے تھے۔ انھیں ہر ایک بزرگ اور جوان کی آرام گاہ کا پتا تھا''۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے اور دُعا کرنے کے بعد ہم واپس گھر لوٹ آئے۔

جب ہم گھر پہنچے تو خالد میاں نے مرحوم خاں صاحب کا وہ کمرہ کھولا جس میں اُن کی ایک کُرسی اور میز لگی ہوئی ہے اور ساتھ ہی ایک تخت بھی بچھا ہوا ہے۔ یہ اُن کے لکھنے کی میز ہے۔ اِس پر ہر چیز قرینے سے رکھی ہے۔ اُن کی دو گھڑیاں، چھوٹی سی ٹوکری میں اُن کا رومال، وہ موزے جو انھوں نے آخری رات اُتار کے یہاں رکھے تھے، قلم دان میں اچھی کوالٹی کے قلم، پیپر ویٹ، چھوٹا ریڈیو مع ٹیپس، کارڈ بورڈ جس میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پُرزے لگے ہوئے ہیں اور اُن پر 'غرائب الغات' کے مختلف قدیم نسخوں سے متعلق درج ہے کہ کس نسخے کا عکس کہاں سے آ گیا ہے اور کس کا کہاں سے آنا باقی ہے۔ سامنے میز پر کتابوں کی ایک قطار ہے جو اُن کی ترتیب و تدوین شدہ ہیں۔ الماریوں میں ہر کتاب اپنی جگہ پر ہے اور تخت پر بھی کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔ مرحوم خاں صاحب کو اعزازت وانعامات ملے تھے اُن کی سندیں فریم میں لگی ہوئی اپنی اپنی جگہ قائم ہیں جہاں خاں صاحب نے انھیں سجایا تھا۔

خالد میاں نے ہمیں یہ جان کاری دی کہ انھوں نے کسی بھی کتاب کی جگہ نہیں بدلی، جہاں مرحوم نے انھیں رکھا تھا یہ وہاں کی وہاں ہی ہیں۔ ہاں ہم انھیں ہر ماہ اچھی طرح سے دھوپ لگواتے ہیں اور جھاڑ کر واپس اُسی جگہ رکھ دیتے ہیں۔ کتابوں پر گرد نام کی کوئی چیز نہیں۔ سبھی کتابیں صاف ستھری حالت میں ہیں۔ راقم نے بہت سی کتابوں کو چھو کر دیکھا۔

خالد حسن نے اُداس لہجے میں اِس بات کا ذکر کیا کہ ''میں اور میری بیگم روزانہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے اس کمرے میں آ بیٹھتے ہیں اور شام کی چائے اکثر اسی کمرے میں پیتے ہیں۔ ہمیں بالکل نہیں لگتا کہ خاں صاحب ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں اور ابھی لوٹ کر آتے ہی ہوں گے''۔ خالقِ کائنات نے ہر ذی ہوش کو ایک دھڑکتا ہوا دل دیا ہے، یہ باتیں دل کی ہیں دماغ کی نہیں۔

مرحوم رشید حسن خاں کی سبھی کتابیں اسی کمرے میں نہیں ہیں۔ کچھ کتابیں ایک الگ کمرے میں ہیں جو ترتیب سے نہیں لیکن سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کمرے میں الماریوں کی کمی ہے۔

جیسا راقم ابتدا میں ذکر کر چکا ہے کہ مرحوم خاں صاحب کی بیٹھک بند تھی۔ وہ کافی بڑا اور مستطیل طرز کا کمرہ ہے۔ خالد میاں نے اُسے کھولا اور بتایا کہ ''اِس میں انھوں نے قلفی بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ لگا لیا ہے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی ہو رہا ہے۔ میری بیگم اس کام کو دیکھ لیتی ہیں۔ اس کام سے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی ہے اور بیگم صاحبہ کا ملازموں کی نگرانی کرتے ہوئے وقت بھی کٹ جاتا ہے''۔

ایک وقت ایسا تھا جب یہاں مکمل خاموشی چھائی رہتی تھی۔ درمیان میں صوفہ، میز اور خاں صاحب کی آرام کرسی ہوا کرتی تھی۔ چاروں طرف الماریوں میں کتابیں اور مخطوطے سجے رہتے تھے۔ ایسا علمی ماحول تھا کہ جس نے اس بیٹھک کو پہلے دیکھا ہے اور اس میں کچھ وقت خاں صاحب کے ساتھ گزرا ہے اُسے اب یقین نہیں ہوتا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں خاں صاحب ہر ملنے والے سے ملا کرتے تھے اور ادبی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ آج یہاں بجلی سے چلنے والی مشینوں کا شور ہے اور ساتھ ہی جنریٹر کا بھی۔

دہلی سے یہاں منتقل ہونے کے بعد یہی دو کمرے مرحوم کی دنیا ہو کر رہ گئے تھے۔ جب تک وہ سفر کے قابل رہے تو کبھی کبھار طویل سفر بھی کر آتے تھے، مگر دھیرے دھیرے انھوں نے دور دراز کے اسفار سے قطع تعلق کر لیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب انھیں دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا تو ڈاکٹروں نے باہر جانے کی ممانعت کر دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ہارٹ بیٹس اِرریگولر ہو جاتی تھیں۔ گھٹنے کی تکلیف نے انھیں چلنے پھرنے سے معذور کر دیا تھا۔

انھی دو کمروں کی تنہا دنیا میں رہ کر انھوں نے تحقیق و تدوین کے ادبی ذخیرے میں جن شاہ کاروں کا اضافہ کیا اُن کے نام ہیں: 'مثنویاتِ شوق'، 'تدوین تحقیق، روایت'، 'املائے غالب'، 'مثنوی سحرالبیان'، 'مصطلحاتِ ٹھگی'، 'جعفر زٹلی کا 'زٹل نامہ'، کلاسکی ادب کی فرہنگ' (دو جلدیں، شائع صرف جلد اوّل ہوئی ہے) اور 'گنجینۂ معنی کا طلسم' (دو جلدیں، جو 1750 صفحات پر مشتمل ہیں)، جس کی جلد اوّل کی کمپوزنگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی ہے۔ میری ناقص جان کاری کے مطابق انجمن ترقی اُردو (ہند) جلد ہی اسے شائع کرنے والی ہے۔

تحقیق و تدوین کے علاوہ معیاری ادب کی سیریز کے تحت شائع ہونے والی کتابوں پر انھوں نے مقدمے لکھے۔ ان کی ریڈیو نشریات کی اچھی خاصی ہے۔ برصغیر ہندو پاک کے کئی مقدار ادبی رسائل میں اُن کے بہت سے مضامین اور تبصرے شائع ہوئے جنھیں کتابی صورت میں ابھی تک یکجا نہیں کیا گیا۔ خاں صاحب جہاں بھی جاتے اُس شہر کے اخبارات و رسائل، ان کے انٹرویو اور گفتگو شائع کرتے تھے۔

مرحوم خاں صاحب نے ہندو پاک کی مختلف یونی ورسٹیوں، سیمیناروں اور تعلیمی اداروں میں اصولِ تحقیق، ترتیبِ متن، صحتِ اِملا، مشرقی شعریات، قواعدِ زبان اور قواعدِ شاعری پر بہت سے لکچر دیے۔ اندرونِ ملک انھوں نے یونی ورسٹی، کالج، ہائر سکنڈری اور پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کے لیے بہت سی املائی ورک شاپ کنڈکٹ کیں۔ اس کے علاوہ مختلف اوقات میں خاں صاحب بمبئی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کی دعوت پر دو ماہ کے لیے بحیثیت وزیٹنگ فیلو تشریف لے گئے اور اسی طرح جمّوں یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کی دعوت پر تین بار (تین ہفتوں، چار ہفتوں اور تین ہفتوں کے لیے) تشریف لائے۔

زندگی میں مرحوم رشید حسن خاں کو ہند و پاک نے ایک درجن سے زیادہ انعامات و اعزازات سے نوازا۔ تین مرتبہ تو صرف یوپی اُردو اکیڈمی نے (1978، 1994، 1998) انھیں ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

اتنی بڑی علمی شخصیت کی آخری آرام گاہ کی طرف نہ تو دہلی، نہ ہریانہ اور نہ ہی یوپی حکومت کی نظرِ التفات گئی۔ دہلی کے ادبی حلقوں میں مرحوم نے اپنی زندگی کے بہترین چھتیس برس گزارے ہیں۔ ایک بھی تعلیمی یا ادبی ادارہ اُن پر ایک سیمینار تک نہیں کروا سکا۔ حالاں کہ اُن کے ہم عصروں اور عزیز شاگردوں کی کوئی کمی نہیں ہے اور وہ اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔

اب جب کہ راقم یہ سطور قلم بند کر رہا ہے، تیسری برسات گزر چکی ہے۔ مرحوم کی آخری آرام گاہ دوسرے رفتگاں کی آرام گاہوں کی طرح منہدم ہو چکی ہوگی۔ یوپی حکومت کو چاہیے کہ علی گڑھ، الٰہ آباد یا لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں رشید حسن خاں نام کی ایک چیئر قائم کی جائے، جس کے تحت کام کرنے والے نئے اسکالروں کو تحقیق، تدوین اور ترتیبِ متن کے اصول سکھائے جائیں اور اُن کے ذمے کلاسیکی متون کا تدوینی کام سپرد کیا جائے تاکہ قدیم و کلاسیکی متون دست بردِ زمانہ ہونے سے محفوظ ہو جائیں اور ادب کے نئے ذخیرے میں اضافہ ہو۔ آج کل تحقیقی کاموں میں سہل نگاری نے زیادہ راہ پالی ہے۔ یونی ورسٹیوں کے اُردو شعبہ جات میں سطحی قسم کے موضوعات پر مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ کوئی بھی اسکالر اپنا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا وہ جلد از جلد اس کام سے گزر جانا چاہتا ہے حالاں کہ تدوینی کاموں کے لیے آنکھوں کا تیل ٹپکانا پڑتا ہے، جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

یوپی حکومت کو شاہ جہاں پور میں ایک رشید حسن خاں میموریل ٹرسٹ قائم کرنا چاہیے جس کے تحت برصغیر ہندو پاک میں اچھے تحقیقی و تدوینی کام کرنے والوں کو ہر سال ایک ایوارڈ سے نوازہ جائے۔ یہی اُن کی ادبی خدمات کے لیے بہترین خراجِ عقیدت ہوگا۔

یوپی حکومت کو ایک کام اور بھی کرنا چاہیے کہ اُن کی لائبریری کے مخطوطات و کتب کو لائبریری گرانٹ کمیشن کی طرف سے اُن کے صاحب زادوں سے اجازت لے کر محفوظ کر لینا چاہیے تاکہ وہ انھی کے ہاں زمانے کے اثرات سے بچ رہیں اور آنے والی نسلیں اُن سے فیض یاب ہو سکیں۔

یہ کام اُتر پردیش اُردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے اُنھی کے گھر کے اوپر ایک ہال تعمیر کر کے بھی کیا جا سکتا ہے۔ انھی کے گھر کے ایک فرد کو اس لائبریری کی دیکھ بھال کے لیے مامور کیا جا سکتا ہے جو زیادہ دل چسپی سے کام کر سکتا ہے۔ راقم اِس بات پہ حیران ہے کہ یوپی سرکار جو اُردو کی ترقی کی بڑی دعوے دار بنتی ہے، اُس کی نظر اپنی ہی ریاست کے اس فخرِ زماں ادبی شخصیت مرحوم رشید حسن خاں کی طرف کیوں نہیں گئی۔ ادبی ماہ نامہ 'نیا دور' جو حکومتِ اتر پردیش کے محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ کی زیرِ نگرانی شائع ہوتا ہے، نے ایک سال دس ماہ بعد دسمبر 2007 میں ایک 'شمارہ رشید حسن خاں کے نام' کا شائع کیا جو اُن کی شایانِ شان نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے منتظمین کو چاہیے تھا کہ ایک ایسا ضخیم نمبر شائع کرتے جو اُن کی بلند شخصیت کے لیے یادگاری نذرانۂ عقیدت ہوتا۔

دہلی سے شائع ہونے والا اُردو ماہنامہ 'رہنمائے تعلیم' جو کسی ادبی ادارے یا حکومت کے مالی تعاون سے شائع نہیں ہوتا، نے جب اپنے سو برس پورے کیے تو سردار ہربھجن سنگھ تھاپر کی زیرِ نگرانی اس کا وہ نمبر شائع ہوا جس کی ضخامت دیکھتے ہی بنتی تھی۔ اس کے بعد سردار ہربھجن سنگھ تھاپر کی وفات پر بھی جو نمبر شائع ہوا اُس کی ضخامت بھی کچھ کم نہیں۔ لیکن 'نیا دور' لکھنؤ کو حکومت کی سرپرستی اور مالی تعاون دونوں حاصل ہیں پھر بھی یہ ماہ نامہ اپنے فرائضِ منصبی پورے نہیں کر سکا۔ میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم (اب مرحوم) کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے دس ماہ کے اندر ہی اپنے ہفت روزہ 'ہماری زبان' کا دسمبر 2006 میں ایک نہایت ہی خوب صورت اور اپنے سائز کے 36 صفحات پر مشتمل رشید حسن خاں نمبر شائع کیا جو ادب میں دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔

مرحوم رشید حسن خاں نے اپنی تحقیقی بصارت سے بڑے بڑے ادبی ستونوں کو ہلا کر رکھ دیا اور بہت سے چہروں سے ملمع اتار دیا۔ وہ زندگی بھر اپنے تحقیقی و تدوینی کاموں میں منہمک رہے۔ اور جوڑ توڑ کی سیاست سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے نے اُن کے ساتھ بے اعتنائی برتی۔ ذیل کا شعر اُن پہ صادق آتا ہے ۔

زمانے میں جب تک رہے ہم ، میرِ کارواں رہے
رخصت ہوئے جب ہم ، زمانے نے ہمیں بھلا دیا

(ادبی و تحقیقی مضامین، ڈاکٹر ٹی. آر. رینا، اُردو بک ریویو، نئی دہلی، جون 2013 صفحہ 74 تا 80)

○○○

رشید حسن خاں اور تحقیق کا کلٹ (Cult)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

رشید حسن خاں دورِ جدید میں اُردو کی نظری اور عملی تحقیق کے باکمال محقق تھے۔ وہ تحقیقی ماخذوں کا مطالعہ دقت نظر سے کرتے تھے اور ماخذات کی صحت پر پوری توجہ صرف کرتے تھے۔ وہ نیم معتبر یا غیر معتبر حوالوں کو کبھی قبول نہ کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ صحت متن کو نہایت ضروری سمجھتے تھے۔ وہ تحقیق کے عمومی اصولوں پر کار بند رہتے تھے اور دوسروں سے توقع رکھتے تھے کہ وہ ان اصولوں پر عمل کریں گے۔

ایک محقق کے طور پر ان کا نظریۂ تحقیق بہت صاف اور واضح ہے۔ اس میں کسی قسم کا ابہام نظر نہیں آتا اور نہ ہی کسی قسم کی لچک ملتی ہے۔ تحقیق میں پختہ نظریہ رکھنے کے باعث وہ کسی قسم کی نرمی یا گنجایش کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ ہمارے محقق اور نقاد اپنے بیانات میں اتنے واضح نہیں ہوتے جتنے رشید حسن خاں تھے۔ یہ لوگ مسائل کے بیان میں عموماً گنجایش کا پہلو رکھتے ہیں۔ ان کا انداز اس قسم کا ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اس طرح سے ہے اور اس طرح سے بھی ہوسکتا ہے یعنی تیقن کا نہ ہونا یا کم زور ہونا۔ رشید حسن خاں حقائق بیان کرنے کے بعد دوٹوک انداز میں نتیجہ اخذ کرنے کے قائل تھے۔ یہ ان کی مستحکم شخصیت کا م اور محنت کا ثبوت تھا کہ وہ جدید اُردو تحقیق کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی وفات سے اُردو تحقیق کی روشنی ماند پڑ گئی ہے۔ ان کے قد کا کوئی بھی محقق باقی نہیں رہا بل کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اب اُردو تحقیق میں چھوٹے قد کے محقق بھی کم کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔

اُردو تحقیق میں رشید حسن خاں نے تحقیقی اصولوں پر کام کیا۔ انھوں نے نظری تحقیق کے جملہ مسائل پر عالمانہ روشنی ڈالی۔ ان کا دوسرا کام جو پہلے سے زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے وہ اُردو ادب کی بنیادی کتب کی تدوین کا ہے۔ انھوں نے اُردو کی کلاسیکی کتب باغ و بہار، فسانۂ عجائب، گلزارِ نسیم اور سحر البیان کے معیاری ایڈیشن مرتب کیے اور تدوین کتب کو وہ ادبی وقار عطا کیا جو اس سے پہلے حاصل نہ ہوسکا تھا۔

ادبی کتب کے مطالعات کے دوران میں وہ مصنفین رمحققین کے بیانات کو گہری توجہ سے دیکھتے تھے۔ اس قسم کے بیانات کی اغلاط کو دیکھ کر وہ اصولِ تحقیق وضع کرتے تھے۔ ان کے تقریباً تمام مقالات اسی نوعیت کے ہوتے تھے۔ چوں کہ وہ حقائق کے محقق تھے، اس لیے اپنی پوری توجہ حقائق کی جانچ پرکھ میں صرف کرتے تھے۔ جہاں جہاں ان کو ضعیف روایت نظر آتیں، حقائق اپنے اصل متون کے مطابق نہ ملتے، حوالے معتبر اور مستند معلوم نہ ہوتے، سنین پیدایش اور وفات میں مسائل نظر آتے، اقتباسات میں کم زوری کا احساس ہوتا یا مصنف نے اصل حوالوں اور اصل متون تک رسائی کے لیے سعی نہ کی ہوتی، یا اوریجنل مصادر کی جگہ ثانوی مصادر برتے ہوتے تو رشید حسن خاں ان اغلاط کو سامنے لا کر تحقیقی اصول وضع کرتے۔ انہوں نے اپنی کتب میں جو اصولِ تحقیق وضع کیے، وہ تحقیق پر لکھی جانے والی کتب سے اخذ نہیں کیے بل کہ عملی تحقیق کے مطالعات کے دوران میں یہ اصول وضع ہوتے رہے ہیں۔ یہ وہی طریق کار ہے جو اس سے پہلے اُردو تحقیق کے شریعت ساز محمود شیرانی اپنی تحقیق میں استعمال کرتے رہے ہیں۔ محمود شیرانی برِّصغیر کے اولین محقق تھے جنھوں نے اُردو فارسی ادب کی تحقیق میں دستاویزی رتاریخی طریقِ تحقیق کی کو استعمال کیا تھا اور یہی طریق دبستان لاہور کی تحقیق کی اساس بنا تھا۔ اُنیسویں صدی مغرب میں دستاویزی رتاریخی تحقیق کی صدی تھی۔ اس حوالے سے انیسویں صدی تحقیق کی صدی تھی۔ یہ وہ دور تھا جس میں دستاویزی تحقیق کا دورِ دورہ تھا۔ اس دور کے محققین و مدون دستاویزی تحقیق اور تاریخی تنقید کے شیدا تھے۔ اس رسمی طریق کا سلسلہ امریکہ اور مغرب میں دوسری جنگ عظیم سے قبل نئی تاریخ کے فروغ تک جاری رہا۔

رشید حسن خاں دستاویزی تحقیق کی روایت سے تعلق رکھنے والے محقق تھے، اس لیے وہ تحقیق میں حقائق پر گہری توجہ دیتے تھے۔ تحقیق کے دستاویزی سلسلے میں بنیاد حقائق پر ہی استوار کی جاتی ہے، اس لیے حقائق کی صحت اور حوالہ کی سند کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے ممدوح حقائق سے کیا مراد لیتے تھے۔ اور وہ کس حد تک حقائق کی تحقیق پر ایمان رکھتے تھے اور اس طریقِ تحقیق سے ان کے تحقیقی کام میں کس قسم کے اثرات پیدا ہوئے۔

رشید حسن خاں کے ہاں تحقیق میں کئی مسئلے پیدا ہوئے جن میں سے ایک مسئلہ ان کے تحقیقی کلٹ (Cult) کا ہے۔ یہ مسئلہ حقائق کی اس تعریف یا تعبیر سے پیدا ہوتا ہے جو وہ عمر بھر کرتے رہے۔ ان کو حقائق کی تعریف پر جو اعتماد تھا اور ساری زندگی مستحکم رہا بل کہ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا اعتماد اور بھی پختہ ہوتا چلا گیا۔ کسی فاضل محقق کا اپنے کسی نظریہ پر پختگی سے اعتماد ہونا ایک مثبت پہلو ہے مگر جس بات کو ہم مثبت قرار دیتے ہیں، اس کے منفی پہلو بھی ہوسکتے ہیں۔ دنیا میں سمجھا جاتا ہے کہ ہر مسئلہ مثبت اور منفی پہلوؤں کا

حامل ہوسکتا ہے۔ رشید حسن خاں کے ہاں بھی کچھ اس قسم کی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ اس مقالہ سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ان کی تحقیق میں حقائق کی تعریف سے پیدا ہونے والے مسائل کا جائزہ لیا جائے اور حقائق سے متعلق ان کے موقف کا تجزیہ کر کے کچھ نتائج تک پہنچا جا سکے۔ مسئلہ کی بہتر تفہیم کے لیے ہم سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اُنھوں نے تحقیق میں حقائق کے متعلق کیا کچھ کہا ہے۔ ان کے متعدد اہل اقتباسات ان باتوں پر روشنی ڈالنے کے لیے درج کیے جاتے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ جب میں نے ان کے تخلیقی کام میں مذکورہ بالا مواد کی تلاش شروع کی تو سب سے پہلے ان کی قابل قدر تصنیف ''اُردو تحقیق مسائل اور تجزیہ'' سے رجوع کیا اور اس کتاب کے پہلے صفحے کی پہلی سطر ہی میں مجھے مطلوبہ تعریف مل گئی جو یہ ہے:

''حقیقت کی بازیافت تحقیق کا مقصد ہے۔ اس کو یوں بھی کہا گیا ہے ''تحقیق کسی امر کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔'' (قاضی عبدالودود) اس کے لیے یہ ماننا ہوگا کہ حقیقت واقعہ (یا اصلی شکل) بہ ذات خود موجود ہوتی ہے۔ خواہ معلوم نہ ہو۔ اسی بنا پر یہ بات بھی ماننی ہوگی کہ ایسی رائیں جو تعبیر اور تاویل پر مبنی ہوں، واقعات کی مرادف نہیں ہوسکتیں، کیوں کہ وہ فی نفسہٖ کسی امر کی اصلی شکل نہیں ہوتیں۔ تعبیرات پر حقائق کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔'' 1

''تعبیرات کو واقعات نہیں کہا جا سکتا اور تحقیق کا مقصود حقائق کی دریافت ہے اس لیے ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل دخل ہو، تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔'' 2

ان دونوں اقتباسات میں تقریباً ایک جیسی باتیں کہی گئی ہیں۔ جو خاص نکات ان سے برآمد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

(ا) تحقیق کا مقصد حقائق کی بازیافت ہے۔
(ب) ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات موجود ہوں، تحقیق کے دائرے کار سے خارج ہیں۔
(ج) تعبیرات کو واقعات کے مترادف قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔
(د) تعبیرات پر حقائق کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

مندرجات بالا نکات میں جو بات سب سے بنیادی ہے وہ وہ حقائق ہیں جیسا کہ رشید حسن خاں نے کہا ہے کہ تحقیق کا مقصد حقائق کی بازیافت ہے۔ اب دیکھنے والی بات یہ کہ تحقیق میں وہ حقائق سے کیا مراد لیتے ہیں، اس کا اطلاق کن باتوں پر ہوتا ہے اور کن باتوں پر نہیں ہوتا ہے۔ رشید حسن کے نزدیک حقائق کا اطلاق صرف محدود باتوں پر ہی ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ کسی شاعر کے اصل نام کا مسئلہ ہو تو اس کا اصل نام دریافت کرنا، جیسے وؔلی کے نام کا مسئلہ کسی ادیب یا شاعر کے سنِ پیدایش کی تحقیق کرنا، مثلاً غالبؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، اقبال یا مصحفی کا سن پیدایش معلوم کرنا۔ اسی طرح سے کسی شاعر کے مقام پیدایش کی تحقیق۔ جیسے ولی گجراتی تھا یا اورنگ آبادی۔ (''ولی گجراتی اور ظہیرالدین مدنی، اور'' ولی اورنگ آبادی'' از ڈاکٹر عبادت بریلوی) مصنفین کے سفروں کے اذکار جیسے غالب کا سفر کلکتہ اور صحیح تاریخوں کا تعین۔ تصنیفات کے سنین، اشاعت، دواوین کی صحیح تعداد اور ترتیب کے سال۔ شعرا میں الحاقی کلام کی شناخت، زندگی کے واقعات کی صحیح شکلوں کو دریافت کرنا، جیسے وؔلی اور شاہ سعداللہ گلشنؔ کی ملاقات دلّی میں ہوئی تھی یا کسی اور مقام پر اور کیا یہ ملاقات ہوئی بھی تھی یا نہیں؟ میرؔ نے تاباںؔ پر الزام لگایا تھا کہ اس کے نام پر جو کلام ہے وہ مرزا مظہر کا کہا ہوا ہے۔ اس بات میں حقیقت کس قدر نظر آتی ہے؟ رشید حسن خاں مندرجہ بالا باتوں کو حقائق سمجھتے ہیں۔ یا اس سے ہٹ کر حقائق کی کوئی اور تعریف نہیں کرتے۔ حقائق سے یہاں ان کی مراد وہ باتیں ہیں جو کبھی واقع ہوئی نہیں۔ ان ہی باتوں کی اصل شکل کو وہ دیکھنے کا نام وہ تحقیق سمجھتے ہیں۔

حقائق کی تحقیق رشید حسن خاں نے کس طرح سے ایک کلٹ *(Cult)* سلسلہ ان کے تصور تحقیق کا پیدا کردہ ہے۔ ان کے تصور تحقیق کی بنیاد جیسا کہ ہم نے کہا ہے حقائق پر ہے۔ تحقیق میں حقائق کے کردار سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ اگر حقائق میں یہ نہ ہوسکیں تو تحقیق کا رول شروع ہی نہیں ہوسکتا ہے۔ حقائق کی تلاش محقق کی پہلی منزل یا پہلی کڑی ہے۔ حقائق جتنے معتبر اور جتنے مستند ہوں گے تحقیق بھی اتنی ہی مستند ہوسکے گی۔ اگر حقائق کم زور اور غیر معتبر ہوں گے تو تحقیق کا کام شروع نہ کیا جا سکے گا اور اگر کام کیا گیا تو تو یہ کام غیر معتبر قرار پائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ رشید حسن خاں کے کلٹ میں اس تصور تحقیق سے کیا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے؟ رشید حسن کے تحقیق کے کلٹ *(Cult)* میں مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ صرف پیدایش، وفات، سوانح، سفر، تصانیف اور اسی قسم کے مواد کو حقائق سمجھنے پر بضد نظر آتے ہیں۔

ان کا خیال یہ ہے کہ جو تحقیقی مقالے تنقید پر مبنی ہوتے ہیں، وہ تحقیق نہیں ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کی دانش گاہوں میں ایسا Rigid یا Orthodox تصور نظر نہیں آتا۔ عمر بھر وہ پوری سختی اور استحکام کے ساتھ اس تصور سے وابستہ رہے اور ایمان کی حد تک اس پر یقین کرتے رہے۔ دانش گاہوں میں جب بھی کوئی اسکالر تحقیقی مقالہ لکھے گا، چاہے وہ مقالہ تنقید پر ہی کیوں نہ ہوں، اسے تحقیق کی منزلوں سے گزرنا پڑے گا۔ اب ظاہر ہے ان منزلوں میں اسے حقائق حاصل ہوں گے مگر یہ حقائق وہ نہیں ہوں گے جنھیں رشید حسن خاں مغلق حقائق سمجھتے ہیں۔ جب 1927 سے پہلے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنا تحقیقی مقالہ ''اُردو تنقید کا ارتقا'' لکھا تھا تو ان کو اُردو تنقید کے ارتقائی ادوار سے متعلق جو حقائق ملے تھے، وہ حقائق نظریات، رجحانات اور تصورات کے بارے میں تھے اور اس سارے مواد کو سمیٹ کر تنقید کے ارتقا پر انھوں نے اپنے تحقیقی مقالے کی بنیاد رکھی تھی۔

آیئے اب ہم رشید حسن خاں کے تحقیقی کلٹ *(Cult)* کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ان کی تحریروں سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ تنقید اور تحقیق کو دو الگ الگ اکائیاں سمجھتے

ہیں اور ان کے درمیاں ہونے والے اشتراکِ عمل کو وہ بالکل قبول نہیں کرتے ہیں:

''تحقیق کا مقصد حقائق کی دریافت ہے۔اس لیے ایسے موضوعات جن میں تنقیدی تعبیرات کا عمل دخل ہو،تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے۔تنقیدی صداقت،تنقیدی تعبیرات کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسئلہ پر مختلف لوگ مختلف رائیں رکھتے ہیں۔جب کہ تحقیق میں اختلاف رائے کی اس طرح گنجایش نہیں۔اس زمانے میں یہ رجحان فروغ پا رہا ہے کہ تحقیقی مقالوں کے لیے ایسے موضوعات منتخب کیے جائیں جو اصلاً تنقید کے دائرے میں آتے ہیں۔یہ تحقیق اور تنقید دونوں کی حق تلفی ہے۔تنقید کے مقابلے میں تحقیق کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے۔تحقیق بنیادی حقائق کا تعین کرے گی اور ان کی مدد سے ایسے نتائج نکالے جاسکیں گے جن میں شک یا قیاس یا تاویل یا ذاتی رائے کا عمل دخل نہ ہو۔اخذ نتائج میں جہاں سے تعبیرات کی کارفرمائی شروع ہوگی اور ان پر مبنی اظہار رائے کا پھیلاؤ شروع ہوگا وہاں تحقیق کی کارفرمائی ختم ہوجائے گی۔''3

رشید حسن خاں کے تحقیقی تصور کی مزید وضاحت کے لیے ہم ان کا ایک اور بیان درج کریں گے جو ان کے تحقیقی نقطۂ نظر کو زیادہ بہتر طور پر بیان کرے گا۔تحقیق وتنقید کے درمیان وہ فرق اور فاصلہ دیکھتے ہیں۔یہی فرق ان کی تحقیق کے متعلق کچھ سوال اُٹھاتا ہے۔اقتباس طویل ہے مگر معنی خیز ہے:

''میرے ایک فاضل دوست نے ایک بار دورانِ گفتگو میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اس زمانے کی ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ تنقید وتحقیق کا درمیانی فاصلہ کم ہوا ہے اور ان دونوں کی سرحدیں ملنے لگی ہیں۔یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ اب تنقید کی واقعی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔لیکن چوں کہ بنیادی طور پر یہ دو مختلف موضوع ہیں،اس لیے ان میں اس طرح کی نزدیکی کبھی نہیں ہوسکتی کہ ان کی سرحدیں مل جائیں۔جس دن ایسا ہوگا اس دن تحقیق پر حرف آجائے گا۔

بات یہ ہے کہ تنقیدی رائیں،تحقیق کے فراہم کیے ہوئے مواد پر مبنی ہوسکتی ہیں۔لیکن تنقیدی سطح پر استخراج نتائج میں ہمیشہ اختلاف رائے رہے گا۔کیوں کہ تنقیدی سطح پر نتائج کا جس طرح تعین اور استخراج عمل میں آتا ہے،اس کا بڑا حصہ تعبیری ہوتا ہے اور یہ مسلم ہے کہ تعبیر کا اختلاف ہمیشہ کارفرما رہے گا اور اس کے اثرات کے ایک ہی بات کے متعلق مختلف ناقدین مختلف رایوں کا اظہار کرتے ہیں،جب کہ تحقیق میں اس طرح کے اختلاف رائے کی گنجایش نہیں۔کیوں کہ وہاں تعبیرات داخل نہیں ہوتیں۔تحقیق میں اختلافات،حقیقت کے تعین پر ہوتے ہیں اور ان نتایج کے استخراج پر،جو غیر متعین حقائق کی بنا پر اخذ کیے گئے ہوں،اگر حقائق متعین ہیں تو تحقیقی حدود کے اندر جو نتایج اخذ کیے جائیں گے،وہ بھی متعین ہوں گے۔جب اخذ نتایج میں تنقیدی تعبیر کا اثر شامل ہوگا تو اختلاف کی کرنیں پھوٹنا شروع ہوجائیں گی۔یہیں سے تنقید،تحقیق کے راستے الگ ہوجاتے ہیں۔اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ تنقید جن موضوعات کو اپناتی ہے اور جن امور کی نشان دہی کرتی ہے اور اس کے لیے جن اسلوب کو اختیار کرتی ہے،یہ سب چیزیں تحقیق کے دائرے سے باہر ہیں۔نقاد اور محقق دو مختلف راستوں کے راہی ہوتے ہیں۔نقاد تحقیق کے نتایج کے بغیر بہت سی صورتوں میں اپنا کام انجام نہیں دے سکتا،لیکن محقق تنقید کے نتایج سے بے نیاز ہوتا ہے۔اس فرق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔متن،قیاس،تعبیر،تاویل اور ذوق،یہ سارے اجزا تنقید کے لیے اہم حیثیت رکھتے ہیں،جب کہ تحقیق میں یہ اظہار احتمال کے سوا اور کسی کام نہیں آسکتے۔''4

رشید حسن خاں کا ایک مسئلہ تو حقائق کے کلٹ (Cult) سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا مسئلہ تحقیق وتنقید کو جداگانہ ڈسپلن سمجھ کر ان کے درمیان خلیج پیدا کرتا ہے۔وہ تحقیق وتنقید کے درمیان کسی ربط یا معنویت کے قائل نہیں ہیں۔اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے لیے ہم یہاں تحقیق وتنقید پر کچھ باتیں کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ تحقیق اور تنقید دو الگ الگ شعبے ہیں۔دونوں اپنے اپنے طور پر آزاد ہیں۔اپنا اپنا دائرہ کار رکھتے ہیں۔ان کے پیراڈائمز مختلف ہیں۔تحقیق کا تعلق بالعموم ماضی،ماضی کی تاریخ ادوار،اصناف اور مصنفین کے کام سے ہوتا ہے۔تنقید ماضی اور حال کے کام سے تنقیدی بحث کرتی ہے اور تحقیق سے برآمد ہونے والے حقائق کی تعبیر سے بصیرت افروزی پیدا کرتی ہے۔ہم نے کہا ہے کہ دونوں الگ الگ شعبے ہیں۔تحقیق اور تنقید کی تعریف سے اس بات کی وضاحت ہوسکے گی۔تحقیق کے متعلق بنیادی بات یہ ہے کہ تحقیق حقائق کی تلاش کا نام ہے۔تحقیق حقائق و واقعات کے معتبر ہونے کا نام بھی ہے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تحقیق بات کی صداقت یا سچائی کو معلوم کرنے کا عمل ہے۔یعنی تحقیق ماضی کے اندھیرے میں چھپے ہوئے حقائق کی تلاش اور ان کے مصدقہ یا غیر مصدقہ ہونے سے عبارت ہے،مثلاً 'خالق باری' کا مسئلہ،ولی اور شاہ گلشن کے مابین فارسی اسالیب کو اُردو میں استعمال کرنے کی روایت،اس روایت کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کہا جاتا تھا کہ 'معراج العاشقین' خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف ہے مگر جدید دور میں معلوم ہوا کہ حقیقت کچھ اور ہے۔

ادبی تنقید کی تھیوری تحقیق سے مختلف ہے۔ادبی تنقید حقائق کی تلاش میں نہیں کرتی،ادبی تنقید حقائق اور واقعات کے معتبر،مصدقہ یا غیر مصدقہ ہونے کا فیصلہ بھی نہیں کرتی اور نہ ہی مصنفین کے کوائف فراہم کرتی ہے جب کہ تحقیق کا فرض مصنفین کے کوائف معلوم کرنے کا نام ہے۔

ادبی تنقید اس شعبہ کا نام ہے جس میں کسی فن پارے کے محاسن اور معائب بیان کیے جاتے ہیں،تجزیہ وتعبیر کی جاتی ہے،جمالیاتی عناصر سے بحث ہوتی ہے،فن

پارے کے تلازمے، استعارے، علامتیں زیرِ بحث آتی ہیں۔ کسی فن پارے کو اس کی صنف کے اعتبار سے مسلمہ معیارات کے مطابق پرکھا جاتا ہے۔ تنقید میں فن پارے کی سماجیات کو بھی دیکھا جاتا ہے اور پھر اس کی مجموعی قدر و قیمت کا تعین کیا جاتا ہے۔

تحقیق و تنقید اگر چہ دو جدا گانہ شعبے ہیں مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ادب میں ان دونوں شعبوں کا آپس میں اشتراک ممکن نہیں ہے۔ اس میں شک کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ تحقیق حقائق کی شکل میں خام مال فراہم کرتی ہے اور ان حقائق کے تنقیدی تجزیے سے کوئی وژن یا کوئی بصیرت افروز تصور (Concept) پیدا ہوتا ہے۔ یہ دونوں شعبے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ان دونوں کی باہمی شراکت ہی سے ادب کی ایک معنی خیز تصویر وجود میں آتی ہے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ہمارے پاس محمود شیرانی کا ایک اقتباس موجود ہے جس میں شمالی ہند اور دکنی مصوری کی تحقیق اور ان کی تنقید سے پیدا ہونے والی بصیرت اور تنقید اور تحقیق کے اشتراکِ عمل سے تخلیق ہونے والا بصیرت افروز تجزیہ نظر آتا ہے۔

اقتباس کی پہلی دو سطور قابلِ توجہ ہیں:

''فنِ مصوری میں دبستانِ دکن بہ لحاظ مجموعی دبستانِ اکبری کا مقلد ہے جو اپنے پیش رو دبستانِ ھرات کا اتباع کرتا ہے۔''[5]

مندرجہ بالا بیان اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ فاضل محقق نے حقائق کے طور پر دبستانِ اکبری اور 'دبستانِ دکن' کی مصوری کے فن پاروں کا گہری نظر سے تخلیقی مطالعہ کیا ہے اور حقائق کے مطالعہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مصوری کا دکنی دبستان، اکبری دبستان کی فنی تقلید کرتا ہے اور خود اکبری دبستان بھی ھرات کے دبستان کا اتباع کرتا رہا ہے۔ گویا اکبری دبستان کے حقائق کا انھوں نے ھراتی دبستان مصوری سے تقابلی جائزہ لینے کے بعد یہ رائے دی تھی جس سے ایک بصیرت افروز نقطۂ نظر پیدا ہوتا تھا۔ یہ تحقیق اور تنقید کے مشترکہ عمل کی سعی تھی۔ ہم اس جگہ ایک بار پھر وضاحت کریں گے کہ حقائق صرف اعداد و شمار کا نام نہیں ہے، اس سے بڑھ کر اور بھی کچھ ہے۔ جیسے مصوری کے نمونے ہوں یا خطاطی کے، نقاشی ہو یا پچی کاری، یا کچھ اور، یہ ساری چیزیں 'حقائق' ہی کی شکل ہیں۔ ان کو حقائق تسلیم نہ کرنے کا مطلب حقائق کے دائرے کو محدود کرنے کی کوشش ہے۔ محمود شیرانی نے اپنے تجزیہ کو جس خوش گوار تنقیدی اسلوب میں بیان کیا ہے، اسے ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ تحقیق کو محض معروضی سادگی کے جس اسلوب سے منسوب کیا جاتا ہے، شیرانی کا اسلوب بہت کچھ سیکھنے کی دعوت بھی دیتا ہے:

> ''فنِ مصوری میں دبستانِ دکن بہ لحاظ مجموعی دبستانِ اکبری کا مقلد ہے جو اپنے پیش رو دبستانِ ھرات کا اتباع کرتا ہے۔ پر شکوہ عمارات، قدرتی مناظر، صحرا و باغ، گل و ریاحین، سبزہ و لبِ جو، طیور و حوش، میدانِ جنگ اور کوہستانی مناظر کے پیش کرنے میں دبستانِ اکبری بہت پیش پیش ہے۔ فتح پور سیکری کے قدرتی مناظر اور عماراتِ اکبری مصورین کے پیشِ نظر تھیں اور ان کو، اکثر اوقات کثرتِ تکرار کے خوف سے بے خبر، عالم رنگ و نقش میں بار بار پیش کرتے ہیں۔ دور افق میں پہاڑوں کی ٹیکریاں اور پتھروں کی چٹانیں دکھائی جاتی ہیں جن کی ترتیب اور اظہار میں مصورین خاص اہتمام سے کام لیتے ہیں۔ چٹانوں کے دامن میں سبزہ زار ہے جس کے گرد سرسبز نہال دور و نزدیک نظر آتے ہیں۔ نیلگو آسماں میں غروب ہونے والے آفتاب کی ناتواں شعاعوں نے ایک زریں دریا کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس نیم سبز اور نیلگو سراب میں بسیرا لینے والے پرندے قطار در قطار اپنے آشیانوں کو جاتے نظر آتے ہیں۔ سب سے بلند چٹان پر ایک پہاڑی بکرا اپنی پوری عظمت کے احساس کے ساتھ زیرِ قدم وادیوں پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال رہا ہے۔
>
> قریب قریب یہی خط و خال دبستانِ دکن میں بھی کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ہیں جو مقامی خصوصیات کی مناسبت سے نشو و نما پاتے ہیں، ترتیب اشیا، چہرے کا حلیہ بعینہ وہی ہے، البتہ انسانی جسم کے دو اعضا کے اظہار میں وہ مختلف ہے۔ دکن نے آنکھ کو کنارے کے ساتھ تشبیہ دی ہے، سینے کو بہت اُبھارا ہے اور کمر کو بہت نازک بنا دیا ہے۔ دکنی نقاش خاص تصاویر پر اپنا زورِ قلم دکھاتا ہے اور اکثر تصویر کو ایک قابل رحم اور غیر تکمیل یافتہ حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔
>
> ایک امر میں ہندوستانی مصور ایرانی نقاش پر تفوق رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایرانی مصور تخیل کے اعتبار سے، برخلاف ایرانی شاعر کے ایک محدود سرمائے کا مالک ہے۔ ایران کی قدرتی سرسبزی، چار فصلیں، باغات کی کثرت، گل و ریاحین کی بہتات، طیور و حوش اور قدرتی مناظر کی افراط سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہاں کا تصویر کش اپنے ملکی مناظر اور گرد و پیش کی فضا میں اپنی تصاویر کو بے انتہا متفاوت مناظر اور جذبات کا دل کش مرقع بنا دیتا ہوگا لیکن افسوس سے دیکھا جاتا ہے کہ اس کی قوتِ تخیل نہایت محدود ہے۔ وہ قدرت کی دل فریب اشیا پر نظر نہیں ڈالتا، اپنے گرد و پیش فطرت کے اعلا نمونوں سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا۔ اس کے پیشِ نظر وہ مرقعے ہیں جو ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے مغولی اور تیموری دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نمونے بجائے خود ہر قسم کے تخیل سے عاری ہیں اور ایرانی شاعر تقلید کا پابند ہے، یہی حالت وہاں کے مصور کی ہے۔ ہندوستان میں شاعر اگر چہ ایرانی شاعری کا مقلد رہا ہے لیکن برخلاف اس کے ہندی مصور نے اپنے آپ پر تقلید کی زنجیروں کا سلسلہ برپا نہیں کیا۔ صفحۂ فطرت کے نمونوں کو خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اہم ہو یا غیر اہم، نہایت غور کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے اور اس کی تمثال کو نقش و رنگ کے واسطے سے صفحۂ قرطاس کے حوالے کر دیتا ہے۔''[6]

تنقید و تحقیق کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے اور ان کے درمیان کسی بھی اشتراک و امتزاج و اتصال سے انکار کرنے کے باعث رشید حسن خاں کا دائرہ کار محدود ہوتا چلا گیا تھا۔ اس وجہ سے ان کے ہاں جو مسائل پیدا ہوئے، انھیں بیان کرنے کے لیے ہم اس تبصرے پر بات کریں گے جو انھوں نے ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اُردو'' پر

لکھا تھا۔ تبصرے کے ابتدائی حصہ میں وہ لکھتے ہیں:

''تاریخ ادب اور تنقید ادب، یہ دو مستقل موضوعات ہیں، لامحالہ ان کے دائرے بھی الگ الگ ہوں گے اور طریق کار بھی مختلف ہوگا۔'' 7

رشید حسن خاں یہ سمجھتے ہیں کہ تاریخِ ادب اور تنقید ادب دو الگ الگ شعبے ہیں۔ ان کے دائرہ ہائے کار مختلف ہیں۔ تاریخ ادب، ادبی تاریخ کی کہانی سنتی ہے اور ادبی تنقید ادب پاروں کا تجزیہ کرتی ہے اور ان کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔ رشید حسن خاں ہوں یا گیان چند جین، دونوں ادبی تاریخ کو ادبی تحقیق کی کتاب قرار دیتے ہیں یعنی ادبی تاریخ مستند سوانحات، واقعات اور ادبی کارناموں کی ایک مستند دستاویز ہوتی ہے۔ جس میں تنقیدی عمل تقریباً سرسری سا ہوتا ہے۔ گیان چند جین نے ''تاریخ ادب اُردو'' کی جو پانچ جلدیں سیدہ جعفر کے تعاون سے تیار کی تھیں وہ ہمارے بیان کی شہادت کے لیے کافی ہیں۔

رشید حسن خاں انتہائی باخبر انسان تھے مگر حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ بیسویں صدی کے ربع آخر میں بھی سماجی علوم اور ادب وفن میں شعبہ جاتی (Interdisciplinary) اشتراک عمل کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ دراصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ حقائق کی تحقیق کے محقق تھے۔ ادب کی تاریخ ہو یا کوئی اور ادبی شعبہ، وہ ان کو صرف حقائق کی عینک لگا کر دیکھنے کے عادی تھے۔ تنقید و تجزیہ کے عمل کو وہ تحقیق کا حصہ نہ سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے ہاں کئی مسائل پیدا ہوئے۔ جالبی صاحب کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ان ہی اسباب کی بنا پر انھوں نے ادبی تاریخ اور ادبی تنقید کو دو جداگانہ شعبے قرار دے دیے مگر یہ نہ سوچا کہ ادبی تاریخ میں اگر ادبی تنقید کا عمل کارفرما نہ ہوتا تو ادبی تاریخ کی گئی قدر و قیمت کا تعین کیسے ہو سکے گا۔ بیسویں صدی میں شعبہ جاتی حد بندیوں (Compartmental Studies) کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ادبی تاریخ ادب کی محدود حد بندیوں سے نکل کر سماجی علوم کے متعلقہ شعبوں سے استفادہ شروع کر چکی تھی۔ ادبی تاریخ کا تجزیہ کرنے کے لیے فلسفہ، نفسیات، معاشیات، بشریات دیومالا، سماجی، تہذیب اور اقتصادی تاریخ، سیاسی تاریخ اور دوسرے علوم کا استعمال کیا جانے لگا تھا جس سے اب ادبی تاریخ ایک بڑے تناظر میں نظر آنے لگی ہے مگر رشید حسن خاں اس تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب پر انھوں نے جو طویل تبصرہ تحریر کیا تھا، وہ اکسٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔ ان صفحات میں بہ مشکل نصف صفحہ ایسا ہوگا جو تاریخ ادب کی تنقید کہا جا سکتا ہے۔ کیا ان کے نزدیک ادبی تاریخ کا کوئی تصور موجود تھا؟ کیا انھوں نے تبصرہ کرنے سے پہلے ادبی تاریخ کو define کیا تھا؟ ایسا ہرگز نہیں کیا گیا۔ انھوں نے کتاب کے فنی محاسن کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ تاریخِ ادب کو تحقیقی حقائق کا مجموعہ سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنی پوری توجہ حقائق کے اختلافات اور اغلاط پر صرف کر دی تھی۔ حقائق کی تحقیق ان کے لیے قائم بالذات چیز تھی اور وہ ادبی تحقیق کے تمام اوصاف کو نظرانداز کر کے صرف حقائق ہی میں الجھے رہے۔ یوں تبصرہ کا توازن برقرار نہ رہ سکا۔

جدید تحقیق میں تنقید کے بغیر تحقیق کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ تحقیق کا کام مواد کی دریافت ہے اور تنقید کا کام اس مواد سے وژن یا بصیرت افروزی پیدا کرنا ہے۔ حقائق کے تجزیے سے کوئی نیا تصور یا کوئی نقطۂ نظر سامنے لانا ہے مگر یہ کام حقائق کی تحقیق نہیں کر سکتی۔ تحقیق اور تنقید دونوں ایک دوسرے کی معاون ثابت ہوتی ہیں اور ان کے اشتراکِ عمل سے ادبی تاریخ کے نئے نئے باب روشن ہوتے ہیں۔ اگر اُردو محققین رشید حسن خاں کے نظریہ تک محدود ہو جائیں اور تنقید و تحقیق کے ربط اور اشتراک کو رد کر دیں تو پھر اُردو ادب کی تاریخ کیسے لکھی جائے گی۔ متون اور تحقیق کے تجزیے کیسے کیے جا سکیں گے۔ اس نظریے کو لے کر اگر چلنا ہے تو تو پھر تاریخ ادب کا کام نہ ہو سکے گا۔

رشید حسن خاں ہوں یا قاضی عبدالودود یا پھر گیان چند جین، سب تحقیق اور تنقید کے بُعد کے قائل ہیں۔ دونوں تحقیق و تنقید کو جداگانہ شعبے قرار دیتے ہیں اور دونوں ان شعبوں کے درمیان اشتراکِ عمل کو قبول نہیں کرتے ہیں۔

اب دیکھنے والی بات یہ ہے کہ کیا تحقیق و تنقید اور دیگر علوم کے درمیان کوئی ربط ہوتا ہے۔ اور کیا علوم آپس میں Inter-Link بھی ہوتے ہیں؟ کیا ایک علم دوسرے علم سے مستفیض ہو کر علم کی کوئی نئی شکل بھی بناتا ہے؟ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جدید علوم اپنے اپنے دائرہ کار اور حدود میں کام کرتے ہیں اور اپنی اپنی مُسر دحیثیت رکھتے ہیں مگر جدید دور میں علوم Compartmental Studies کی قید سے آزاد ہو چکے ہیں۔ یہ ایک بین الشعبہ جاتی علوم (Annals School) نے شعبہ جاتی قیود سے بغاوت کر کے علوم کے درمیان بین الشعبہ جاتی تکنیک کا آغاز کیا تو یورپ اور امریکہ میں Socio-linguistics, Psycho- linguistics کے نئے شعبے نکل آئے اور لسانیات کو کثیر الجہتی علم (Multi-dimentional subject) بنا دیا گیا۔ بیسویں صدی میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد ادب، کلاسیکی تعریف سے آزاد ہوا۔ اس کی تشریحات تعبیرات اور توضیحات فلسفہ، نفسیات، دیومالا، سماجیات، تہذیب، ثقافت اور تاریخ کے حوالے سے ہونے لگیں اور یوں علوم وفنون کے درمیان ایک وسیع اشتراک، ربط اور نئی جہات کا سلسلہ شروع ہوا۔ چناں چہ تحقیق بھی مطلق حقائق کے اس تصور سے آزاد ہوئی جو اس انیسویں صدی سے چھایا ہوا تھا۔

بیسویں صدی میں شعبہ جاتی اشتراک سے ادبی سماجیات، ادبی بشریات اور ادب کی سماجیاتی تاریخ بھی لکھی جانے لگی تھی۔ جدید تحقیق کے اس قسم کے مطالعات میں حقائق متون کے تحقیقی جائزوں سے فراہم ہوں گے۔ ''دکنی ادب کی ثقافتی تاریخ'' کا مطالعہ دکنی متون سے حاصل ہونے والے حقائق سے کیا جائے گا۔ محمد قلی قطب شاہ کی نظمیں اور اس دور کی مثنویاں اسی نوعیت کے کام کے لیے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اُردو ادب میں فی الحال جس ادیب نے ادبی سماجیات اور اُردو ادب کی سماجیاتی تاریخ کا تصور پیش کر کے اسے عملی شکل دی ہے، وہ ڈاکٹر محمد حسن ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے ''اُردو ادب کی سماجیاتی تاریخ'' قلم بند کی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن اعداد و شمار کی تاریخ کے محقق تو نہ تھے مگر ادبی

تاریخ کے ایک صاحب نظر نقاد اور محقق ضرور تھے۔متون کے عمیق مطالعہ نے ان کے اندر تاریخی شعور کا نادر ادراک پیدا کیا تھا۔متون کی تحقیق سے ملنے والے حقائق اور حقائق کی تاریخ کے نئے ادراک کی مثالیں پیش کی ہیں۔جدید تحقیق کا ایک عمل تو روایتی تحقیق کی طرح حقائق کی دریافت ہے اور دوسرا عمل جدید تحقیق کا ہے یعنی تحقیق حقائق کی تعبیر...غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقائق کے اندر سماجیاتی صداقتیں محوِ خواب ہوتی ہیں، کسی دانش ور محقق کا کام ان کو بیدار کرنا ہوتا ہے۔اس کا وژن حقائق کی نئی تعبیر کرتا ہے اور وہ بہت کچھ جوان دیکھا ہوتا ہے، یہ وژن ہمیں وہ سارا منظر دکھلا دیتا ہے۔تحقیق میں حقائق کو مطلق حقائق سمجھ لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تحقیق کی اگلی منزلوں کو نظر انداز کر دیا ہے اور حقائق سے دریافت ہونے والے منظروں سے تحقیق کو محروم کر دیا ہے۔جدید تحقیق اس بات کو قبول نہیں کرتی۔جدید تحقیق حقائق کی تعبیرات سے تاریخ کے خاموش اور گم گشتہ گوشوں کو از سرِ نو روشنی عطا کرتی ہے، یوں تاریخ نئے سرے سے سانس لینے لگتی ہے۔ہم یہاں حقائق سے پیدا ہونے والی جدید تحقیق کی ایک مثال پیش کریں گے۔تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وسط ایشیا مغربی ایشیا اور عرب علاقوں کو منگولوں نے شدید طور پر تباہ و برباد کیا تھا۔ان خطوں کے بے شمار ذہین لوگوں نے ان ادوار میں ہندوستان کا رُخ کیا تھا۔یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا تھا۔اکبر کے زمانے میں وحدتِ ادیان، ملکی و قومی وحدت اور ہم آہنگی کے تصورات تیزی سے پروان چڑھے تھے۔تاریخ کے اس عمل نے تہذیب و ثقافت ،ادبیات اور مذہب و فکر پر کیا اثر ڈالا تھا، ڈاکٹر محمد حسن اُردو ادب کی سماجیاتی تاریخ میں اس کا تجزیہ حقائق کے گہرے مطالعے کے بعد پیش کرتے ہیں:

''اس صورت حال نے مختلف ادبی روایات کو چاروں طریقوں پر متاثر کیا۔ایران اور وسط ایشیا سے آنے والے شاعروں کے کلام میں ہندوستانی اثرات نے ''سبک ہندی' کو جنم دیا۔ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں خصوصاً برج بھاشا میں فارسی کے اثرات نے شعری صناعی اور فکری تہ داری کی وہ صورتیں پیدا کر دیں جنھیں ریتی کال کی کاری گری اور نفاست سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کی اعلاترین مثال بہادری کے دوہوں میں ملتی ہے کہ ہر دوہے کی کئی کئی طریقوں سے تفسیر کی جاسکتی ہے۔تیسرے ریختہ یا اُردو شاعری کا رواج ہوا اور اس شاعری نے ملک کی سیکولر مدنی تہذیب کی روایت کو اپنا کر اسے بین الاقوامی کلچر کا حصہ بنا دیا اور چوتھے گجرات کی گوجری اور دکن میں احمد نگر، بیجا پور اور گولکنڈہ میں دکنی اُردو کی نظم اور نثر نے ہندوستان اور ایران کے کلاسیکی ذخیروں کو اس نئی مدنی مرکزیت کی زبان میں ڈھالنے کی کوشش کی۔طوطا کہانی شک ستتی کا روپ ہے تو رتن پدم سید محمد جائسی کی پدماوت کا۔سب رس میں پر بودھ چندرا اودے کا عکس ہے تو یوسف زلیخا میں عرب روایات کا۔محمد قلی قطب شاہ بارہ پیاریوں پر نظمیں لکھتا ہے۔حافظ کے طرز کی عشقیہ غزلیں تصنیف کرتا ہے اور اپنے علاقے کے تہواروں کے ساتھ ساتھ ملک گیر اور بین الاقوامی تہواروں مثلاً نوروز پر بھی قلم فرسائی کرتا ہے۔محمد شاہ کے دور میں لباس سے لے کر فنونِ لطیفہ تک میں ہندوستانی عناصر کو غلبہ حاصل ہونے لگا۔مصوری میں راجپوت طرز اُبھرا، موسیقی میں جنگلہ یا زنگولا اور ادا رنگ اور سدا رنگ کی خیال گائکی، رقص میں ہندستانی عناصر کا عروج فنِ تعمیر میں صفدر جنگ کے مقبرے کی طرز کی ہندوستانیت...اور دلّی میں فارسی مشاعرے کی بجائے اُردو مراختوں کا رواج۔قوالیوں اور ارباب نشاط میں اُردو، اور ولی کے دیوان کے دلّی آنے سے حاتم، آبرو، مظہر جانِ جاناں، ناجی ،یکرنگ اور یک رُو کے ذریعے اُردو غزل کی مقبولیت جس نے فارسی سے لطافت تو لی مگر برج اور سبک ہندی سے ایہام کی طرز اُڑا کر اپنی مقبولیت کا سامان پیدا کر لیا۔یہ دکن سے اس ادبی زبان کی بازیافت تھی جو مدنی مرکزیت کی روایت بن چکی تھی اور جس کی غیر حاضری میں امیر خسرو کے بعد سے شمالی ہند کی ادبی ضرورت برج بھاشا اور اودھی پوری کر رہی تھی۔''9

اکیسویں صدی کے آغاز تک اُردو کے بڑے محقق تنقید اور تحقیق کے شعبہ میں کسی اشتراکِ عمل کے قائل نہ تھے۔وہ تحقیق میں تنقید کے عمل کو برداشت کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ہم یہاں گیان چند جین کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں:

''یونی ورسٹیوں کے قوانین میں جو ایک شق ہوتی ہے پرانے یا معلوم حقائق کی نئی تشریح۔اسی کے سایۂ دامن میں تنقید، تحقیق میں در انداز ہو جاتی ہے۔یونی ورسٹیوں کی سندی تحقیق کے لیے ایسے موضوعات لیے جاتے ہیں جو محض اقداری و فکری ہوتے ہیں، ان کا تحقیق کہلانا مشتبہ ہے۔''10

گیان چند کا بیان ظاہر کر رہا ہے کہ وہ اقدار اور فکر سے تعلق رکھنے والے تحقیقی کام کو تحقیق کے دائرۂ کار سے خارج سمجھتے ہیں یعنی وہ بھی رشید حسن خاں کی روایت کے مطابق واقعات و سنین کی دریافت کو حقائق کی دریافت قرار دیتے ہیں اور ان حقائق کی تنقیدی تعبیرات کو وہ تحقیق نہیں سمجھتے ہیں۔

اب ہم اس بات کی مزید وضاحت کریں گے حقائق صرف واقعات، شواہد اور سنین ہی کا نام نہیں ہے یہ تعریف حقائق کے کردار کو محدود کر دینے کے مترادف ہے۔حقائق اس اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو متون کے مواد اور تحریر سے برآمد ہوتی ہے۔حقائق کے حصول کا بنیادی ذریعہ دستاویزات کے جائزہ اور تجزیہ سے حقائق برآمد ہوتے ہیں۔

متون کے مواد اور تجزیہ سے صرف واقعات و سنین ہی کو برآمد نہیں کیا جاتا ہے، اس تجزیہ سے کسی مسئلہ کے بارے میں تحقیقی حقائق بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔اس بات کا انحصار تو منشائے محقق پر ہے کہ اس کے تجزیہ کا اصل مقصد کیا ہے۔کیا وہ کسی مصنف کے سنین دریافت کرنے کے لیے کوشاں ہے یا اس کی دل چسپی کا محور اس کی زندگی کے واقعات ہیں یا پھر کسی متن کے تجزیہ سے وہ تحقیقی حقائق تک پہنچنا چاہتا ہے۔اس بات کو واضح کرنے کے لیے ہم یہاں ایک مثال درج کرتے ہیں۔

محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں بہادر شاہ ظفر پر یہ الزام لگایا تھا کہ ان کے کلام کا کثیر حصہ ذوق کا کہا ہوا ہے۔اس بات کی گونج مدتوں تک ادبی دنیا میں گونجتی رہی

ہے۔''آبِ حیات'' کی اشاعت 1880 میں ہوئی تھی۔اس زمانے تک پورے ہندوستان میں ذوقؔ کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا،اس لیے آزاد کی بات پر یقین کرلیا گیا تھا۔وہ دور آزاد کی پھیلائی ہوئی گمراہی کے باعث اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ظفرؔ تو بس نام کا شاعر تھا،اصل کام تو ذوقؔ تھا۔1990 کی دہائی کے آخر میں جب میں اپنی کتاب ''اُردو ادب کی تاریخ'' میں بہادر شاہ ظفرؔ پر کام کر رہا تھا تو مجھے آزاد کے لگائے ہوئے الزام کی حقیقت جاننے کا موقع ملا۔میں نے ذوقؔ اور ظفرؔ کے شعری متون میں اشعار کی خارجی اور داخلی سطحوں کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا چناں چہ دونوں شاعروں کے متون کے تقابلی جائزے سے جو تحقیقی حقائق برآمد ہوئے وہ آزاد کے بیان کی نفی کر رہے تھے۔میں ایک طویل اور صبر آزما سفر کر کے ان حقائق تک پہنچا تھا۔میں یہاں اس طویل مطالعہ کے کچھ حصے پیش کروں گا،جس سے حقائق کے متعلق میرے موقف کی وضاحت ہو سکے گی کہ صرف اعداد و شمار کی تحقیق ہی سے نہیں متون کے تحقیقی جائزے سے بھی تحقیقی حقائق برآمد ہو سکتے ہیں۔رشید حسن خاں نے مطلق حقائق کا جو کلٹ (cult) بنایا تھا اس کے ذریعے اس قسم کے حقائق کا حصول ممکن نہیں تھا۔میں ''اُردو ادب کی تاریخ'' سے کچھ اقتباسات یہاں درج کرنے کی اجازت چاہوں گا:

''دونوں شعرا کا تجزیہ کریں تو ان کے جداگانہ رنگوں کی واضح طور پر گواہی ملتی ہے۔ذوقؔ خشک رنگوں کا شاعر ہے۔وہ اخلاقیات،زندگی کی عمومی صداقتوں اور معاشرتی مسلمات کا شاعر ہے۔ذوقؔ جذبے اور احساس کی اس آنچ کا مظاہرہ نہیں کر سکا جو ظفرؔ کی شاعری کا امتیاز ہے۔ظفرؔ کے اندر سے لپکتی ہوئی گہری اداسی،خستگی اور تنہائی اسے شعری حرارت سے مالا مال کرتی ہے۔ان آوازوں میں مغلیہ انا کی شدید بے بسی کا الم ناک کرب بھی موجود ہے۔

ظفرؔ کی شعری تخلیقیت کا ثبوت اس کے علامتی نظام میں موجود ہے۔''قفس''،''زنجیر''،''پرندہ''،''زنداں'' اور ''باغ'' ایسی علامتیں ہیں جو دیوانِ اول سے تسلسل کے ساتھ دیوانِ چہارم تک اس کے تخلیقی عمل میں آگے بڑھتی رہتی ہیں۔ظفرؔ کی کلیدی علامتیں ہیں اور اس کی شناخت اور انفرادیت کا ثبوت ہیں مگر ذوقؔ کے دیوان میں ان علامتوں کا سیاسی و سماجی سیاق و سباق سرے سے غائب ہے۔

اس بات کا جائزہ لینے کے لیے ظفرؔ کا کلام ظفرؔ ہی کی تخلیق ہے۔ہم کلیاتِ ظفرؔ کے ابتدائی پچاس صفحات سے محبوب اور متعلقاتِ محبوب سے وابستہ تشبیہیں،استعارے،تلازمے اور ترکیبیں ایک سرسری جائزہ لے کر درج کرتے ہیں:

محبوب:

دل ربا مس ناز،خوباں،جاناں،بت شیریں،دہن،وحشی نگاہ،رشکِ گلستاں،گلابی پوش،چشمِ مست،قاتل،مہر لقا،نگار،پری زاد،جلاد،کافر صنم،نورِ جمال،بت کافر،عشوہ گر،ماہِ پیکر،غیرتِ گل،شیر افگن،نازک فگن۔

چشم:

چشمِ دل بر،چشم سیہ مست،خانۂ چشم،آہو،گردشِ چشم بتاں،ایوانِ چشم،چشمِ پُرآب،چشمِ مے گوں،چشمِ وحشی،چشمِ رفتاں۔

ابرو:

تیغ ابرو،چین ابرو،طاق ابرو۔

مژگاں:

مژگانِ تر،تیرِ مژگاں،دامنِ مژگاں،عکسِ مژگاں،تیغ مژگاں،دستِ مژگاں،ناوک اندازِ مژگاں،نشترِ مژگاں،ابرِ مژگاں،نوکِ مژگاں۔

زلف:

زلفِ مشکیں،زلف دوتا،مریدان،زلف کافر،زلف عنبر افشاں،تاب زلفِ عرق آلودہ،زلف پرشکن،حلقۂ زلف،زلف گرہ گیر،موجۂ دریائے حسن،زلف مشک ناب،زلف معتبر،اسیر زلف،گوشۂ زلف۔

دل:

دل صد چاک،داغ دل سوزاں،زخمِ دل،دلِ بے تاب،دلِ بے کس،شیشۂ دل،آئینۂ دل،ظالمِ دل،جانِ دل،کشتیِ دل،صحرائے دل،دلِ آدم،خانۂ دل۔

ظفرؔ کے تلازموں،تمثالوں،اور ترکیبوں،میں محبوب کی جو تصویر بنتی ہے۔ذوقؔ کا متخیلہ اس دنیا کے قریب سے بھی گزر سکا ہے۔'زاد نے اُستاد پرستی کے زور میں ظفرؔ پر جو الزام لگایا تھا،آج وہ بے حقیقت معلوم ہوتا ہے۔تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ آج ذوقؔ کا کلام پس منظر میں جا چکا ہے اور ظفرؔ کا کلام اپنی شعریت اور معنویت کی وجہ سے بیسویں صدی میں زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔

ظفرؔ کی انفرادیت کو دیکھنے کے لیے اس کی شعری ذات کو تلاش کیجیے جو خالصتاً اس کی اپنی ہے۔اس منفرد شعری ذات کا ذوقؔ کی عطا سے کوئی تعلق نہیں۔ظفرؔ کی شعری ذات میں تنہائی،اداسی اور یاسیت کی ایک رُت چھائی رہتی ہے۔ذوقؔ اس رُت کے طرزِ احساس ہی سے محروم ہے جب کہ یہی طرزِ احساس ظفرؔ

کی کلیدی شناخت بن جاتا ہے۔

وہ شاعری جو ظفر کی شناخت بنتی ہے، اس کا ذوق کی شعری روایت سے کوئی تعلق نہیں بنتا ہے۔ تنہائی، بے قراری، تحقیقِ وجود، احساسِ اسیری اور ذات کی اتھاہ گہرائیوں سے جھانکتی ہوئی اداسی ظفر کی شناخت ہے۔'' 11

ظفر بنیادی طور پر رومانوی طرزِ احساس کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری کا منظر نامہ معشوق، دشت، صحرا، ریت، دیوانگی، زنجیر، باغ، پھول، گریہ زاری، سوز و گداز، داخلیت کی آگ، غم و یاس، حسرت و ناکامی اور تمنا جیسے اب رومانوی موضوعات سے مزین ہے۔ وہ سوزِ عشق کی دھیمی آنچ کو پیش کرتا ہے۔ اس کے ہاں شدتوں کا اظہار ذریعہ ہے۔ اس کی شاعری پر یاسیت مستقل طور پر چھائی رہتی ہے مگر رومانوی شاعر کی حیثیت سے وہ مسرت و انبساط باغ و راغ اور زندگی کی جمالیاتی کیفیتوں کا تجزیہ بھی کرتا ہے۔ یہی شعری اوصاف اسے واضح طور پر ذوق سے مختلف شاعر بناتے ہیں، اس لیے اُردو کی ادبی روایت میں وہ اپنی شعری انفرادیت کے ساتھ جلوہ گر ملتا ہے۔

رشید حسن خاں اور ان کے دور کے دیگر محققوں کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ حقائق کی تحقیق ہی کو تحقیق سمجھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان بزرگ محققین کی کاوشوں سے حقائق سے وابستہ اعلا درجے کی تحقیق پیدا ہوئی مگر تحقیق کو اعداد و شمار کی تحقیق تک محدود کر دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُردو تحقیق کا دائرۂ عمل بے حد محدود ہو گیا۔ یہ بزرگ محقق حقائق سے آگے بڑھ کر بصیرت افروزی اور وژن (Vision) کی منزل تک نہ پہنچ سکے۔

رشید حسن خاں حقائق کی تلاش یا دریافت کی مقصود بالذات سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ حقائق کی تلاش مطلق تحقیق نہیں ہے۔ حقائق کی تلاش تو تحقیق کا پہلا مرحلہ ہے۔ اصل تحقیق تو اس کے بعد شروع ہوتی ہے جب کہ ہمارے ممدوح حقائق ہی کو سب کچھ کہتے ہیں۔

حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو تحقیق کے بارے میں رشید حسن خاں کا نظریہ محدود اور عالمی معیارات سے بہت دور تھا۔ حقائق کی تلاش بلا شبہ تحقیق کا اولین مرحلہ ہے اور تحقیقی کام کی بنیاد اسی پر استوار ہوتی ہے مگر حقائق تحقیق کی تکمیل نہیں کرتے، حقائق تو تحقیق کے سفر کی اہم کڑی ہے۔ صرف حقائق پر زور دینے کا مطلب یہ ہے کہ تحقیق کو اس کے مکمل روپ میں دیکھنے سے گریز کر رہے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں حقائق کسی مصنف کی حالت، واقعات، کوائف اور کارناموں کے بارے میں ضروری مواد مہیا کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے مواد کو مطلق تحقیق کا نام دے دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے تحقیق کو سکیڑ کر رکھ دیا ہے۔ اگر ایک اسکالر اُردو شاعری پر عجمی جمالیات کے اثرات پر تحقیقی کام کرنا چاہتا ہے یا اُردو داستان کے اساطیری عناصر یا داستانوں میں کایا کلپ اور فینٹسی پر تحقیق کی منصوبہ بندی کرے یا پھر 'اُردو ناول میں متوسط طبقے کا ظہور' پر مقالہ لکھنا چاہے تو رشید حسن خاں کے نزدیک یہ تحقیق نہیں ہوگی۔ کیوں کہ اس میں تنقید کا عمل دخل ہوگا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اسکالر نے اگر عجمی جمالیات پر تحقیق کرنی ہے تو اسے عجمی جمالیات کے تصورات اور اس کے ارتقا پر تحقیقی کام کرنا ہوگا۔ اسی طرح سے اگر موضوع داستان کے اساطیری عناصر ہے تو اسے اول اساطیری تحقیق کا مرحلہ طے کرنا ہوگا اور پھر اساطیر کو داستان میں تلاش کر کے ایک تحقیقی زاویہ نظر بنانا ہوگا۔ یہی صورت ناول اور متوسط طبقے کا ظہور میں پیش آئی ہے۔ اس میں اسکالر کو اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کے کلونیل نظام اور تعلیم کے اثرات کے باعث سماج میں متوسط طبقے کے ظہور پر تحقیق کرنا ہوگی اور پھر اُردو ناول میں اس طبقے کے نمود پر تحقیقی کام انجام دینا ہوگا۔ جدید تحقیق میں اس قسم کے مطالعات پر تحقیقی کام ہو رہا ہے مگر رشید حسن خاں کے نزدیک یہ تحقیق، تحقیق نہیں ہوگی کیوں کہ وہ مطلق حقائق کے قائل ہیں۔

آج کے دور میں بین الشعبہ جاتی تحقیق ہو رہی ہے۔ ادب میں سیاست، تہذیب، فلسفہ، معاشیات اور بے شمار دوسرے علوم کے اشتراک عمل سے تحقیق کی جاتی ہے۔ رشید حسن خاں اسے تحقیق نہیں سمجھتے تھے۔ ہر قسم کے تنقیدی موضوعات کو وہ تحقیق کے دائرۂ کار سے خارج قرار دیتے تھے۔

یہ بات لائقِ تحسین ہے کہ انھوں نے حقائق کی تحقیق کو اعلاترین معیارات تک پہنچایا۔ ان کی بے باک تنقید کے باعث اسکالرز زیادہ محنت سے کام کرنے لگے تھے۔ ان کی اس تحقیق نے ماضی کے سینکڑوں خلا پُر کیے اور اغلاط کی تصحیح کی۔ یوں ادبی تاریخ حقائق کے اعتبار سے پہلے سے زیادہ مستند اور معتبر نظر آنے لگی مگر حقائق ہی کو سب کچھ سمجھ لینے کے سبب اُردو تحقیق کا افق وسیع نہ ہو گا۔ رشید حسن خاں، قاضی عبدالودود اور اس قسم کے دیگر محققین کے اثرات کے سبب تحقیق سے پیدا ہونے والا وژن (Vision) ظہور پذیر ہو سکا۔

اُردو کے محققین یہ سمجھتے ہیں کہ اچھا محقق صرف اچھا محقق ہی ہوتا ہے وہ اچھا نقاد نہیں ہو سکتا۔ اگر اچھے محقق سے مراد قاضی عبدالودود یا ڈاکٹر گیان چند جین ہیں تو یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے اور اگر اچھے محقق سے مراد مسعود حسن خاں رضوی ادیب، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، یا جمیل جالبی ہیں تو یہ حضرات اچھے محقق بھی ہیں اور اچھے نقاد بھی۔ مسئلہ یہ ہے کہ رشید حسن خاں ہوں یا قاضی عبدالودود یا پھر گیان چند جین ان بزرگ محققوں نے تحقیق کی تعریف اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بنیاد پر کی ہے۔ وہ حقائق کی تلاش کے محقق تھے اور یہی ان کا فن تھا اور اسی میں ان کو قدرت حاصل تھی۔ ادبی تنقید سے ان کی طبع کو مناسبت نہ تھی اس لیے انھوں نے حقائق کی تحقیق ہی کو مطلق تحقیق قرار دے دیا تھا۔ تاریخ کے ایک بڑے محقق اور نقاد ای۔ ایچ۔ کار (EH Carr) نے حقائق کی تحقیق کے متعلق ایک بڑی دل چسپ بات کہی تھی۔ اس کا کہنا ہے مورخین کے لیے حقائق دستاویزات میں اس طرح موجود ہوتے ہیں جس طرح کہ مچھلی فروش کے اڈے پر مچھلی ہوتی ہے۔ مورخین حقائق کو اکٹھا کرتے ہیں، اپنے گھر لے جاتے ہیں اور ان کی طباخی حسبِ منشا کرتے ہیں اور پھر ان کو پیش کر دیتے ہیں 12۔ کار کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک حقائق کی تعبیر و تنقید نہیں کی جاتی اور ان کی کوئی شکل نہیں بنائی جاتی اس وقت تک ان کی

مثال مچھلی فروش کے اڈے پر پڑی ہوئی مچھلی کی سی ہے۔گویا اگر حقائق ہی کو مطلق سمجھ لیا جائے تو تحقیق اپنی اگلی منزل کی طرف سفر نہیں کر سکتی۔یہ ایک جگہ پر جامد نظر آنے لگتی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ وژن (Vision) کو استعمال کر کے اسے بصیرت افروز بنایا جائے۔

رشید حسن خاں نے تحقیق کا جو مطلق تصور بنایا تھا اس میں ایک آدھ مقام پر تضاد کا عنصر بھی ملتا ہے مثلاً اپنے تصورِ تحقیق کے برعکس ایک مقام پر وہ نہ بھی کہتے ہیں:

''اگر ایک شخص صرف حقائق واقعات کا تعین کر دیتا ہے تو اس موضوع کا حق ادا کر دیا۔تب اگر اس کے اندر استخراج نتائج کی بھی صلاحیت ہے زیادہ سیاسیات وسماجیات سے بھی واقف ہ تو سبحان اللہ۔نور علی۔یہ درجہ تکمیل ہے۔''13؎

ان کی تحریروں میں یہ تصور بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔معلوم نہیں کہ کس رو میں وہ اس قسم کی تحریر قلم بند کر گئے ہوں گے۔ان کی تحقیق صرف حقائق اور حقائق کے نتائج نکالنے تک مصر رہتی ہے۔وہ نتائج میں سیاسی وسماجی مسائل کی طرف توجہ نہیں دیتی۔ان کا کہنا ہے کہ جب بھی سیاسی وسماجی تعبیرات، مباحث، مسائل کا ذکر شروع ہوگا تو یہ تنقید کا آغاز ہوگا۔سیاسی وسماجی صورتِ حال کی تنقیدی تعبیرات کے بغیر بات مکمل نہ ہو سکے گی اور یہ سب کچھ ان کے تحقیقی تصورات کی نفی معلوم ہوتی ہے۔اس لیے ہم اس تصور کو ان کے ہاں وقتی طور پر نظر آنے والے تضاد سے تعبیر کریں گے۔

اس جگہ میں ان کے ایک خاص مقالے ''تدوین اور تحقیق کے رجحانات'' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔یہ مقالہ ان کی تصنیف ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' میں شامل ہے۔مذکورہ مقالے میں انھوں نے اپنے دور میں تدوین اور تحقیق کے شعبوں میں نظر آنے والے جدید رجحانات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔میں اس مقالے کے دوسرے حصے سے دو اقتباسات یہاں درج کروں گا مگر اس سے پہلے میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان اقتباسات میں رشید حسن خاں نے اپنے عہد کی تحقیق میں ملنے والے رجحانات کا تجزیہ پیش کیا ہے:

''اس زمانے میں اہم ترین بات یہ ہوئی کہ تحقیق کی اہمیت کا احساس بڑھا۔اب اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا گیا ہے کہ تحقیق کا کام بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔حقائق اور شواہد کا تعین تحقیق ہی کرے گی اور ناقد کے لیے لازم ہوگا کہ وہ ان کو ملحوظ رکھے اور اس دائرے کی حد تک نقادِ تحقیق کا احترام کرے اور اس کو بنیادی چیز سمجھنے پر مجبور ہوگا۔

ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تحقیق میں استخراجِ نتائج کی اہمیت پر زور دیا گیا۔عام طور سے اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ تحقیق میں اعداد وشمار اور مطلق حقائق کا تعین بنیادی چیز ہے، لیکن یہی سب کچھ نہیں، یہ اس کا ابتدائی حصہ ہے۔بے حد اہم ہے بے حد ضروری لیکن اہم یہ بھی ہے کہ جن حقائق کا تعین کیا گیا ہے اور جن حقائق کی بازیافت کی گئی ہے، دیکھا جائے کہ ان سے کیا نتائج نکلتے ہیں اور ان سے علم وآگہی میں کس نوعیت کا اضافہ ہوتا ہے۔''14؎

مندرجہ بالا اقتباسات درج کرنے سے پہلے ہم اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ رشید حسن خاں نے اپنے مقالے میں اپنے عہد کے رجحانات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔میں نہیں سمجھتا کہ وہ ان اقتباسات کے مطالب پر یقین بھی رکھتے تھے۔دراصل جب بھی کوئی تجزیہ نگار کسی مسئلہ پر کوئی تجزیہ درج کرتا ہے تو اس کے مندرجات سے اس کا اتفاق کرنا ضروری نہیں ہوتا ہے۔لہٰذا ان باتوں کو رشید حسن خاں کی سوچ قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ ان کی عملی یا نظری تحقیق میں ان مباحث کا اطلاق بھی نہیں ملتا ہے۔نظری تحقیق میں تو وہ کھل کر حقائق وشواہد ہی کی تحقیق کوشش قرار دیتے ہیں۔

تحقیق کا ایک جتنی تصور مطالعات کا افق از بس سکیڑ دیتا ہے۔اس قسم کا کام مطالعات کے درمیان دیوار کھینچ دینے کے مترادف ہے۔اسی قسم کی صورت حال تھی جب گذشتہ صدی میں فرانس کے Annalos School نے یہ سمجھ لیا تھا کہ شعبہ جاتی اسٹڈیز نے تاریخ کو ایک بند گلی میں پہنچا دیا ہے اس لیے اسٹڈیز کی حد بندیوں کو توڑ کر ڈسپلنز کو آزاد کر دینا چاہیے تاکہ علوم کے باہمی اشتراک سے تاریخ کو دیکھنے کا افق وسیع تر کر دیا جائے۔یہ Annalos اسکول ہی تھا کہ جس نے یورپ کی پرانی تاریخ کو دیکھنے کے نئے زاویے مہیا کیے اور یوں تاریخ اور نظریہ تاریخ کا ایک بالکل نیا دور شروع ہوا۔

رشید حسن خاں، گیان چند جین اور قاضی عبدالودود نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں کو حقائق کی تحقیق کے سپرد کیے رکھا تھا۔یہ تحقیق کی تھیوری کا بے حد محدود شعبہ تھا جس کا واحد مقصد حقائق کی تلاش تھا۔ان بزرگ محققین نے اُردو تحقیق کو بہت Compartmentalized کر رکھا تھا۔پوری دنیا میں اس نوعیت کی تحقیق کا تصور بیسویں صدی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ادھر برصغیر کے محققین کی صورت یہ تھی کہ ان کی تربیت ہی ایک شعبہ جاتی بنیاد پر ہوئی تھی۔یہ تحقیق کا وہی دستاویزی اسلوب تھا جسے بیسویں صدی کے ربع اول میں مغرب سے تربیت پانے کے بعد پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کے تین اساتذہ نے اختیار کیا تھا۔میری مراد مولوی شفیع محمود شیرانی اور شیخ محمد اقبال سے ہے۔محمود شیرانی کے مقالوں کی اشاعت اول رسالہ ''اُردو'' میں شروع ہوئی تھی اور بعد ازاں ان کے مقالے ''اورینٹل کالج میگزین'' میں چھپے۔مولوی محمد شفیع اور شیخ محمد اقبال کے تحقیقی کام کی اشاعت ''اورینٹل کالج میگزین'' میں ہوتی رہی۔محمود شیرانی دستاویزی تحقیق کے فاضل محقق تھے۔مولوی محمد شفیع اور شیخ محمد اقبال دستاویزی تحقیق کے ساتھ ساتھ جدید تدوین کے اولین محقق تھے۔رشید حسن خاں اسی دبستان کے مسلک سے تعلق رکھنے والے تھے،اس لیے ان کی تحقیق اورینٹل کالج کی دستاویزی تحقیق کے پس منظر میں دیکھی جا سکتی ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ لاہور کے دبستانِ تحقیق نے اُردو فارسی میں حقائق کی تحقیق کو بنیادی اہمیت دی کہ اس دور میں اس طرزِ تحقیق کی از بس ضرورت تھی۔اسی دبستان کی پیروی میں رشید حسن خاں، گیان چند جین، عرشی اور قاضی عبدالودود نے گراں قدر تحقیقی

کام کیے اور اُردو مصنفین اور اُردو ادب کی تاریخ کے لیے بنیادی مواد مہیا کیا۔ یہ ان لوگوں کی سعی تھی کہ اُردو تحقیق کا دامن وسیع بھی ہوا۔

مندرجہ بالا حقائق کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ ادب کا کوئی بھی نظریہ کسی خاص زمانے کے خاص ماحول میں جنم لیتا ہے، اسے ہمیشگی حاصل نہیں ہوتی۔ وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ یہ نظریے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے پہلی جنگِ عظیم کے بعد یورپ میں تاریخ کے تصورات تیزی کے ساتھ تبدیل ہوئے۔ ہم ان باتوں کا ذکر Annals School کے حوالے سے پہلے ہی کر چکے ہیں۔ برصغیر میں مغربی تبدیلیوں کی اطلاع بھی پہنچی ہوگی اور ہمارے موقر اُردو محققین ان باتوں سے واقف بھی تھے مگر وہ تحقیق کے میدان میں نظر آنے والی تبدیلیوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ تحقیق کو ایک بند اور محدود شعبہ میں دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے، اس لیے وہ شعبہ سے باہر نکل کر دیکھنے کے لیے تیار ہی نہ ہو سکے۔ یہی سبب ہے کہ اُردو تحقیق ایک مختصر دائرے میں طویل مدت تک گردش کرتی رہی۔

حواشی

- رشید حسن خاں، ادبی تحقیق۔ مسائل اور تجزیہ (علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس 1978) ص،7
- ایضاً، ص12
- ایضاً
- ایضاً، ص108-110
- محمود شیرانی۔، مقالات شیرانی، مظہر محمود شیرانی۔ مرتب (لاہور مجلس ترقی ادب 1987) ص205
- ایضاً، ص305-306
- ادبی تحقیق، ص292
- ڈاکٹر محمد حسن، اُردو ادب کی سماجیاتی تاریخ (نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان 1998) ص19
- ایضاً، ص20-21
- گیان چند جین، تحقیق کا فن (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان 2003) ص،19
- تبسم کاشمیری، اُردو ادب کی تاریخ (لاہور سنگ میل پبلی کیشنز 2003) ص،766-768
- EH Carr, What is History (England Penguin Books,1990) P-9
- ادبی تحقیق، ص105
- مذکورہ حوالہ، ص102-103

''بازیافت''

شمارہ:22/جنوری تا جون 2012

شعبہ اُردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

(اُردو کے نام ور محققین، مرتبین ڈاکٹر تبسم کاشمیری، محمد ذیشان وکیل، ناشر: پاکستان کو آپریٹیو سوسائٹی، قاعدِ اعظم روڈ، لاہور، 2018، صفحہ 762 تا 779)

نوٹ: یہ مضمون ڈاکٹر الیاس اعظمی صاحب نے (اعظم گڑھ، یوپی) میرے استفسار پر مورخہ 18 اگست 2018 کو پی ڈی ایف فائل بنا کر احقر کے واٹس ایپ پر ارسال کیا۔

❍❍❍

رشید حسن خاں

ڈاکٹر خالد مبشر

رشید حسن خاں ابنِ امیر حسن خاں کی پیدائش تعلیمی اسناد کے مطابق 1930 ہے (1) لیکن خود ان کے اپنے بیان کے مطابق 1925 (2) کو شاہ جہاں پور (یو پی) میں ہوئی۔ اُردو تحقیق و تدوین میں ان کی امتیازی حیثیت مسلم ہے۔ یوں تو انھوں نے تنقید سے بھی سروکار رکھا جس کا ثبوت ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''تلاش و تعبیر'' ہے لیکن ان کا تنقیدی کینوس کلاسیکی شعریات یعنی زبان و بیان اور لفظ و معنی وغیرہ تک ہی محدود ہے اور عصری تنقیدی مباحث ان کی تحریروں میں مفقود نظر آتے ہیں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان اکا صل میدان تحقیق ہے اور یہ تحقیقی جوہر سب سے زیادہ ان کے تدوین کردہ کلاسیکی ادبیات کے مقدموں میں کھلتا ہے۔ ان کا تدوینی کارنامے بے حد وقیع ہے۔ اُردو میں اتنی بڑی تعداد میں ایسے معیاری اور مستند کلاسیکی متون کی تدوین کسی اور مدوّن کے حصے میں نہیں آئی اور اس سلسلے میں انھوں نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی روایت کو فروغ دیتے ہوئے صحیح معنوں میں فنِ ترتیب و تدوین کو خالص سائنٹفک بنیادیں فراہم کیں اور ان کتابوں پر لکھے گئے ان کے مقدمات کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تحقیق و تدوین کے جو اصول و ضوابط اور معیارات متعین کیے، یہ مقدمے ان کا عملی نمونہ پیش کرتے ہیں۔ فنِ تدوین میں رشید حسن خاں کو کیا اختصاص حاصل ہے؟ اس کا کچھ اندازہ اُن پر لکھے گئے دو مضامین کے عنوانات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

(1) خدائے تدوین از گیان چند جین

(2) اُردو میں اصولِ تدوین کو مجدد از شان الحق حقی

(مشمولہ ''رشید حسن خاں: حیات ادبی و خدمات''، خصوصی شمارہ کتاب نما، جولائی 2002، نئی دہلی)

یہاں پر ایک بنیادی سوال قائم کیا جا سکتا ہے کہ رشید حسن خاں کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں کون سے بنیادی عوامل و عناصر کار فرما رہے جن کی بنا پر ان کی طبیعت میں

تحقیق وتدوین کا مادّہ نمو پذیر ہوا اور اس میدان میں انھوں نے کار ہائے نمایاں انجام دیے۔ اِس ضمن میں خود رشید حسن خاں کا طویل اقتباس ملاحظہ ہو:

''میرے استادوں میں قابلِ ذکر نام مفتی محمد مجتبیٰ حسن خاں صاحب (شاہ جہاں پوری) مغفور مرحوم کا ہے جن سے میں نے عربی پڑھی تھی اور میری تربیت میں نمایاں حصہ انھی کا رہا ہے۔ اساتذۂ معنوی کی حیثیت سے حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا عرشی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی تحریروں سے میں نے صحیح معنوں میں تحقیق اور تدوین کے آداب اور اصول سیکھے۔ لیکن اُن سب میں مقدم نام نیاز فتح پوری کا ہے جن کی تحریروں سے ابتدا ہی میں بہت کچھ سیکھا۔ تشکیک اور خطائے بزرگاں کو بھی خطا ہی سمجھنے کا سبق پہلے نیاز صاحب ہی سے پڑھا تھا۔ ان سے ملاقات تو بہت بعد میں ہوئی، متاثر بہت پہلے سے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ تحقیق کہ بہ ضابطہ طالب علم کی حیثیت سے شیرانی صاحب اور قاضی صاحب کی تحریروں سے استفادہ کیا تو نیاز صاحب کا طلسم ٹوٹ گیا لیکن جو ابتدائی نقوش مرتسم ہو گئے تھے وہ اب تک کچھ نہ کچھ نمایاں ہیں۔ روایت سے بغاوت اور تشکیک ان میں خاص کر شامل ہیں۔ اس لیے میں نیاز صاحب کا بہت قائل رہا ہوں۔ کچھ دنوں تک تو معتقدانہ انداز رہا، لیکن پھر وہ بات تو نہیں رہی۔ رہ بھی نہیں سکتی تھی، لیکن قائل آج بھی ہوں۔ ناقدین میں (بعض اختلافات کے باوجود) کلیم الدین احمد کی میں بہت عزت کرتا ہوں اور ان کی تحریروں کو بہت توجہ سے پڑھتا ہوں۔ سرور صاحب کے مطالعے اور ذہانت کا میں قائل ہوں، لیکن اُن سے بس یہ شکایت ہے کہ انھوں نے تنقید کو انشائیے سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ تنقید کا رنگ دب گیا ہے اور منافقانہ اندازِ بیان کے لیے بڑی گنجائش پیدا ہو گئی ہے۔ احتشام صاحب سے بحیثیت انسان بہت متاثر تھا۔ ایسے شریف انسان بہت کم پائے جاتے ہیں لیکن ان کی تنقیدی نگارشات سے کبھی متاثر نہ ہو سکا۔ خواجہ احمد عباس کی فلموں کی طرح وہ مجھے بے اثر محسوس ہوتی رہیں۔ البتہ مجنوں صاحب کے ذوق اور کلاسیکی ادب کے مطالعے سے متاثر رہا۔ ناقدین میں کم لوگ شعر کے معاملے میں مجنوں صاحب کی طرح خوش ذوق ہوں گے۔ ایسا رچا ہوا شعری ذوق کم ملتا ہے۔

مشاغل میں سرِ فہرست اسپورٹس کو رکھا جانا چاہیے۔ ہاکی خود کھیلی ہے، اس لیے وہ میرا پسندیدہ کھیل ہے۔ اس کھیل میں جو فن کارانہ دقت پسندی ہے اُس کا میں عاشق ہوں۔ اس کے بعد باسکٹ بال، والی بال اور فٹ بال کا نمبر ہے۔ میں اب بھی اپنے وقت کا اچھا خاصا حصہ ان کھیلوں کو دیکھنے میں صرف کرتا ہوں۔

ابتدائی تعلیم عربی مدرسے میں ہوئی تھی اور درسِ نظامی کے طالب علم کی حیثیت سے شعور نے بالیدگی پائی تھی۔ اچانک 1941 میں ٹریڈ یونین کے دائرے میں آ گیا۔ میرے شہر شاہ جہاں پور میں اس زمانے کی بہت بڑی آرڈیننس فیکٹری تھی جس میں تیس ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے۔ اس فیکٹری میں، بار بار چھپ چھپا کر مزدوروں کی یونین بنائی گئی اور پھر 34 دن کی ہڑتال ہوئی۔ یہ 1945 کی بات ہے۔ میں اس فیکٹری میں 1939 میں مزدور کی حیثیت سے بھرتی ہوا تھا اور اب اِس یونین کا جوائنٹ سکریٹری بھی تھا۔ اِس دوران میں یوپی کے بیش تر لیڈروں اور کمیونسٹ پارٹی کے ذمہ داروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور جس قدر ذہنی طور پر ان سے دور ہوتا گیا۔ وہ زمانہ کمیونسٹ پارٹی میں سیاسی انتہا پسندی کا تھا۔ مزدوروں کے مسائل کمیونسٹ پارٹی کے لیے پارٹی کے دائرے کو وسیع کرنے کا وسیلہ بن کر رہ گئے تھے۔ مجھ جیسے ورکر یہ محسوس کرتے تھے کہ ہمارے مسائل دوسرے کے مسائل سے مختلف ہیں اور انھیں مقامی مسائل کے مطابق حل کیا جانا چاہیے، جب کہ لیڈر شپ کا نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ صرف ایک نعرہ ہم سے لگواتے تھے کہ دُنیا کے مزدوروں ایک ہو جاؤ۔ یہ بات ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ یونین کے فیلڈ ورکر سیاسی مسائل اور جوڑ توڑ سے بیگانہ تھے۔ جی توڑ کام کرتے تھے اور سب کچھ لٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ہم کو جو لیڈر ملے تھے وہ اپنے سے اوپر والے لیڈروں کے کٹھ پتلی تھے۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ورکر تو نچلے درجے سے نکل کر آیا تھا لیکن اُس کا لیڈر اوپر کے طبقے سے نکل کر آیا تھا اور انتہا پسندانہ پالیسی نے کام بنانے کے بجائے کاموں کو بگاڑنے کو اپنا نقطۂ نظر بنا لیا تھا کہ اس وقت یہی سیاسی نقطۂ نظر تھا کمیونسٹ پارٹی کا۔

غرض کہ خاص خاص ورکروں اور لیڈروں میں خلیج بڑھتی گئی اور آخر کار مجھ جیسے ناآشنائے سیاست کارکن بالکل الگ ہو گئے۔ ان دنوں ایسے تلخ تجربے اُن رہ نماؤں کے ہوئے تھے کہ آج تک اُن کی یاد باقی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ صورتِ حال رونما نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں آج ترقی پسندی کا لیبل لگائے ہوئے ہوتا۔ ترقی پسند تحریک سے بچنے کی ایک وجہ یہ بھی پیدا ہو گئی کہ میں نے تنقیدی کتابیں پڑھنے سے پہلے وہ ادب پڑھا تھا اور اسی نے مجھے محفوظ رکھا کیوں کہ فارسی شاعری اور کلاسیکی اُردو ادب کے مطالعے نے ذہن میں ذوق اور معیار کا ایک تصور ضرور پیدا کر دیا تھا جس نے صحافت، نعرے بازی اور ادب میں فرق کرنا سکھایا تھا اور فرد کی حیثیت اور شخصیت کے دائرے کی وسعت سے آشنا کیا تھا۔

میں 23-22 سال سے دہلی میں ہوں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس شخص کی اصل رائے کیا ہے۔ اس کے بر خلاف آپ میرے چھوٹے سے شہر میں چلیے، پانچ منٹ میں معلوم ہو جائے گا کہ کس شخص کی اصلی رائے کیا ہے۔ خاندانی روایت، نسلی اثرات اور مقامی

خصوصیات نے شروع ہی سے صاف گوئی کا عادی بنا دیا تھا۔ اُسی نے تحقیق کی طرف متوجہ کیا اور اِس میدان میں آ کر مجھے طبعی مناسبت کا اندازہ ہوا، لغت زبان کے مسائل، عروض اور قواعد جیسے موضوعات شروع میں میرے پسندیدہ موضوع تھے۔ ادبی تحقیق سے بھی تعلق خاطر تھا لیکن کچھ کم۔ 1960 سے اِس طرف زیادہ توجہ مبذول ہوئی۔ شیرانی صاحب کی تحریریں اولین رہ نما کی حیثیت سے پیشِ نظر رہیں اور پھر قاضی عبدالودود صاحب کی تحریروں نے متاثر کیا۔ اس طرح ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تحریروں نے بھی عرفان کی نئی روشنی بخشی۔

ادبی تحقیق اور تدوین اب میرے پسندیدہ ترین موضوعات ہیں۔ میں اِس تنقید کا قطعاً قائل نہیں جس میں انشائیہ نگاری کا اندازہ ہو اور وہ اسلوب ہو جو منافق کی سخن آرائی کا ہوتا ہے۔ اِسی طرح میں اس تحقیق کو فکر شاعرانہ کا بدل سمجھتا ہوں جس میں صاف گوئی کے بجائے پسینے پوتنے کا انداز ہو۔ چوں کہ حالات نے اب بیش تر افراد کو دُنیا داری کے پھیر میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس لیے تحقیق کا یہ سادہ صاف انداز ان کو پسند نہیں آتا اور اس کے لیے ان حضرات نے ''منفی اندازِ نظر'' کی ایک اصطلاح وضع کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جھوٹ کو جھوٹ کہیں اور دوٹوک انداز میں رائے ظاہر کریں وہ تو منفی انداز والے ہوئے اور جو لوگ ادب کے نام پر تجارت اور جہالت کو فروغ دیں وہ مثبت اندازِ نظر والے ہوئے۔ آپ چور کو چور کہیں وہ بہت واویلا مچائے گا۔ یہی حال ان تاجرانِ ادب کا ہے۔

میں صاف، سادہ، واضح اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دل چسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں گے یا منفی۔ ایسی فضول اصطلاحوں سے میں بہت دور رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سچ کی تلاش ہے۔ مجھے شخص سے دل چسپی نہیں، اس نے جو کچھ کہا یا لکھا ہے اس سے دل چسپی ہے، جھوٹ کوئی بھی بولے وہ جھوٹ ہے۔ میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں۔

آج علم وادب میں جس طرح اسیری کے جال بچھائے گئے ہیں، گروپ بندی نے جس طرح دائرے بنائے ہیں اور دانش گاہوں میں جس انداز سے تحقیقی، مقالوں کے نام پر کم سوادی کے اعلا ترین نمونے تیار کیے جا رہے ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ تحقیق اپنی صاف گوئی اور صاف بیانی کے دائرے کو وسیع کرے۔ سچ واقعتاً کڑوا ہوتا ہے اور تحقیق کا مقصد سچ کی تلاش ہے۔ اِس صورت میں اگر تحقیقی نگارشات میں سچ کی تلخی شامل ہو تو اس کی شکایت نہیں کی جانی چاہیے۔ اگر ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' کے نام سے ایک کثیر رقم صرف کرنے کے بعد اور بہت دھوم دھڑ کے کے ساتھ ایک ایسی کتاب پیش کی جائے جس کو پشتارۂ اغلاط کہنا مناسب ہوگا اور کوئی شخص یہ بتائے کہ یہ کتاب مقالہ نگاروں کی آسان پسندی اور بے پروائی کا شاہ کار ہے اور اس کے اندراجات اِس قابل نہیں کہ انھیں معتبر قرار دیا جا سکے تو اس میں شکایت کی کیا بات ہے؟ یہ عجیب بات ہے کہ ہم بے ایمانی کرنے والے کو تو کچھ نہیں کہنا چاہتے اور اگر کوئی شخص بے ایمان کا پردہ فاش کرے تو اُسے منفی اندازِ نظر نمایش قرار دینا چاہتے ہیں۔

تحقیق کو سچ کی تلاش رہتی ہے۔ جھوٹ کس نے بولا، یہ بھی ایک بات ہے، لیکن اصلی بات یہ ہے کہ جھوٹ کیوں بولا گیا اور کیسے بولا گیا؟ اِس ''کیوں اور'' کیسے'' کی تلاش اور وضاحت بھی تحقیق کا ایک مقصد ہے اور یہ میرا محبوب موضوعِ سخن ہے اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ تحقیق کا بڑا مقصد ہے حقائق کی تلاش اور ان سے اخذِ نتائج، اور یہ میرا محبوب ترین مشغلہ ہے۔'' 3

مذکورہ اقتباس سے درج ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

(1) فنِ تحقیق میں انھوں نے سب سے زیادہ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی سے اکتساب فیض کیا ہے۔

(2) تحقیقی آداب تو مذکورہ محققین سے سیکھے لیکن تحقیقی مزاج کی تشکیل میں بنیادی طور پر نیاز فتح پوری کی تحریروں کا خاص حصہ رہا۔ خصوصاً روایت سے بغاوت اور تشکیک کا مادّہ انھیں کے زیر اثر پیدا ہوا۔

(3) ناقدوں میں سب سے زیادہ کلیم الدین احمد کے قائل تھے۔ اس کی وجہ شاید ان کا دوٹوک انداز تھا۔ تنقید میں انشا پردازی اور ذو معنی طرزِ بیان ان کو بہت ناگوار تھا۔ اسی بنا پر وہ آل احمد سرور سے شاکی تھے۔

(4) ''فن کارانہ دقت پسندی'' کی وجہ سے ہا کی ان کا محبوب ترین کھیل تھا۔ اس سے ان کی مشقت طلب طبیعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یہی عنصر ان کی تحقیق وتدوین کا جوہر بھی ہے۔

(5) خود ان کے بقول ان کی صاف گوئی میں اُن کی خاندانی روایت، نسلی اثرات (پٹھان) اور مقامی خصوصیات کا بڑا عمل دخل رہا ہے اور اسی حوالے سے انھیں فنِ تحقیق سے طبعی مناسبت بھی ہے۔

(6) مذکورہ اقتباس میں اِس مسئلے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ تحقیق کی زبان اور اُس کا اسلوب کیسا ہونا چاہیے۔ رشید حسن خاں کے نزدیک تحقیق وتنقید میں انشا پردازی غیر مستحسن ہے۔ اس کے لیے صاف، سادہ اور دوٹوک انداز مطلوب ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رشید حسن خاں نے اصولاً جس اسلوب کی وکالت کی ہے خود انھوں

نے بھی عملی طور پر یہی طرزِ تحریر اختیار کیا ہے۔ اُن کے اسلوب کے بارے میں جگن ناتھ آزاد کی رائے ملاحظہ ہو:

''ایک خاصیت جو ان تمام تصنیفات اور تالیفات میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ ان کی رواں دواں اور دل کش نثر ہے جو پتھر کی طرح مضمون کو بھی پانی اور خشک سے خشک مسائل علم و ادب کو دل کش اور سرسبز بنائے چلی جاتی ہے۔ رشید حسن خاں کی نثر کی امتیازی خصوصیت جسے Readability کہتے ہیں انھیں دوسرے محققین سے ممتاز کرتی ہے اور ان کی تحقیق، تنقید اور تالیف کو تخلیقی ادب کی حدوں سے جا ملاتی ہے۔'' 4

رنگین اور مرصع نثر نگاری سے شعوری اجتناب کے باوجود ان کی تحریر میں دل کشی ہے، اُس کا راز یہی ہے کہ سادگی بھی تو قیامت کی ادا ہوتی ہے۔ علمیت، استدلال اور قطعیت کے پیش نظر رشید حسن خاں کی زبان کو ڈاکٹر اسلم پرویز نے ''دستاویزی زبان'' (5) سے تعبیر کیا ہے۔

اِس مقالے میں رشید حسن خاں کے مقدمات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیشِ نظر ہے۔ لیکن قبل ازیں ان کے مطبوعات کی فہرست یہاں درج کی جاتی ہے:

(1) اُردو املا، ترقی اُردو بورڈ، دہلی، 1974

(2) انتخابِ نظیر اکبر آبادی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1970

(3) انتخابِ شبلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1970

(4) انتخابِ مراثی انیس و دبیر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1971

(5) دیوانِ خواجہ میر درد، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1971

(6) انتخابِ ناسخ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1972

(7) انتخابِ سودا، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1972

(8) اُردو کیسے لکھیں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1975

(9) زبان اور قواد (لغت، تلفظ اور قواعد شاعری) ترقی اُردو بورڈ، نئی دہلی، اشاعت اول 1974، اشاعتِ ثانی 1983

(10) تلاش و تعبیر (تنقیدی مضامین) دلّی اُردو اکادمی کی اعانت سے 1988

(11) ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، اشاعتِ اول، ایجوکیشنل بُک ہاؤس علی گڑھ، 1978، اشاعتِ ثانی اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ، تیسری اشاعت، لاہور، 1989

(12) فسانۂ عجائب (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 1990

(13) باغ و بہار (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1992

(14) تفہیم (تنقیدی اور تحقیقی مضامین) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1993

(15) انشا اور تلفظ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994

(16) عبارت کیسے لکھیں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994

(17) انشائے غالب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1994

(18) مثنوی گلزارِ نسیم، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1995

(19) مثنویاتِ شوق، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1998ء

(20) مثنوی سحر البیان (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2000

(21) کلاسکی ادب کی فرہنگ، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2003

(22) مصطلحاتِ ٹھگی، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2002

(23) زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2003

ان میں سے بیشتر کتابوں پر رشید حسن خاں نے مقدمہ لکھا ہے۔ خصوصاً جن کتابوں کے مقدمے مبسوط اور تحقیقی و تنقیدی اعتبار سے بے حد وقیع ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(1) فسانۂ عجائب (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1990

(2) انتخابِ سودا، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 1972

(3) مثنوہ گلزارِ نسیم، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1995

(4) مثنویاتِ شوق، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1998

(5) مثنوی سحرالبیان (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2000

(6) مصطلحاتِ ٹھگی، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2002

(7) زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2003

(1) فسانۂ عجائب

فسانۂ عجائب کا مقدمہ 114 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مقدمہ کس قدر مبسوط ہے، اِس کا اندازہ مقدمے کے ذیلی عنوانات سے کیا جا سکتا ہے۔ عنوانات ملاحظہ ہوں:

''(سرور کی) ولادت، وفات مدفن، تعلیم اور مختلف فنون سے واقفیت، (فسانۂ عجائب کی) وجہِ تصنیف اور زمانۂ تصنیف، نوازش اور اصلاح، بیان، لکھنؤ کے اختلافات، آسان کہنے کی فرمایش، میر امن، باغ و بہار، ضمنی داستانیں، بندر کی تقریر، زبان و بیان، خطی نسخے، مطبوعہ نسخے، بنیادی متن، (مرتب کا) طریقِ کار، علامات، رموزِ اوقاف۔''

سب سے پہلے مقدمہ نگار نے فسانۂ عجائب کی نمایاں خامیوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً؛

(1) اس کے کردار بے حد سادہ لوح ہیں۔ جیسے: بادشاہ اپنی بیوی کو اجنبی سوداگر کے ساتھ بھیج دیتا ہے۔

(2) کردار مجہول ہیں اور بقول مقدمہ نگار:

''یہ بات اگر نظر کے سامنے ہو کہ اودھ کی حکومت میں آصف الدولہ کے زمانے سے مجہولیت نے جس طرح چھاونی چھالی تھی، اور ''شہزادگانِ کرام'' جس طرح حکم رانی کی صلاحیت اور صفات سے تہی دامن تھے، تو پھر اُس کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ سرور نے کہانی کسی بھی خیالی دنیا کی کہی ہو، داستان کی فضا اور اُس کے کردار انھی کے زمانے کے ہیں اور ان کے زمانے میں اکثر امرا اور ولی عہد صاحبان کا احوال یہی تھا۔''(6)

(3) زبان میں بھی جھول ہے۔ اُکھڑے اُکھڑے جملے اور بے محل الفاظ بھی بہت ہیں۔ مذکورہ خامیوں کے بعد مقدمہ نگار نے ''فسانۂ عجائب'' کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے درج ذیل نکات پیش کیے ہیں:

(1) ''یہ کتاب محض ایک داستان نہیں، صرف زبان کا نگار خانہ نہیں، یہ دراصل ایک اسلوب کا دوسرا نام ہے۔''7 خصوصاً اہلِ لکھنؤ اسی اسلوب کے دل دادہ تھے۔

(2) ''اس کی حیثیت صرف ادبی نہیں، تاریخی بھی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ دہلی و لکھنؤ کی دبستانی بحث کے فروغ میں اس کا حصہ بہت زیادہ ہے۔''8

(3) ''ناسخ اور سرور دونوں اپنے اسالیبِ بیان کے واسطے سے دبستانِ لکھنؤ کے نمایندہ افراد ہیں۔ ایک کی شاعری لکھنؤ کی نئی شعری روایت کا نقطۂ آغاز بنی اور دوسرے کی نثر (فسانۂ عجائب کی صورت میں) وہاں کے خاص انداز کا پہلا نقش بن کر سامنے آئی۔''9

مقدمہ نگار نے ''فسانۂ عجائب'' کی زبان و بیان کے پر جو کچھ لکھا ہے وہ تنقیدی نقطۂ نظر سے اہم ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''معلوم نہیں یہ خیال ذہنوں میں کیسے سما گیا اور دلوں میں بیٹھ گیا کہ فسانۂ عجائب کی نثر بہت مشکل ہے۔ مشکل نثر کا معیار اگر نوطرزِ مرصع کو مانا جائے تو پھر اس کتاب کو تو آسان تر کہا جائے گا۔ مشکل نثر کی مثال میں اکثر اِس کتاب کے وہ مقامات پیش کیے جاتے ہیں جہاں یہ کتاب شروع ہوتی ہے، یا ضمنی کہانیاں یا نئے بیانات شروع ہوتے ہیں یعنی تمہیدی مقامات؛ اور یہ بڑی ناانصافی ہے۔ یہ بات ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی تھی، اُس زمانے میں قصوں کی تمہید بہت پُر تکلف انداز کی ہوا کرتی تھی۔ طلسم ہوش ربا کی زبان کو کون مشکل کہے گا، لیکن تمہیدی مقامات اس میں بھی پُر تکلف اندازِ بیان سے خالی نہیں۔''10

مزید رقم طراز ہیں:

''تمہیدی حصوں سے قطعِ نظر کو روا رکھا جائے، تو پھر معلوم ہوگا کہ اِس کتاب میں زبان اور بیان کے بہ طورِ عموم دو رنگ پائے جاتے ہیں۔ کہیں تو ایسا صاف شفاف بیان ہے کہ آج کے اوسط درجے کی استعداد رکھنے والے قاری کو بھی اُس کے پڑھنے میں دقت نہیں ہوگی۔ خاص کر جہاں مکالمات ہیں، وہ مقامات تو بیان کی تشنگی اور زبان کی سلاست کے لحاظ سے کسی طرح کم رتبہ نہیں۔ دوسرا انداز وہ ہے جہاں علمیت کا رنگ ذرا گہرا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے مقامات پر بیان کا انداز وہی ہے جو متاخر ہندوستانی فارسی نثر نگاروں کے اثر سے رواج پا گیا تھا۔ ایسے مقامات اگر آج ہمیں کچھ مشکل نظر آتے ہیں، تو اِس کی اصل وجہ یہ نہیں کہ یہ بجائے خود مشکل ہیں، اس کی اصل وجہ ہے آتے ہیں، تو اِس کی اصل وجہ ہے ہمارے دور کی عمومی کم استعدادی، فارسی زبان سے ناواقفیت اور کلاسیکی اسالیب سے کم آشنائی۔ مصنف جس معاشرے کا فرد تھا، اُس معاشرے کے ان لوگوں کے لیے جو لکھنے پڑھنے سے تعلق خاطر رکھتے تھے، یہ طرزِ ادا غیر معمولی نہیں تھا۔ مصنف نے اپنے زمانے کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کتاب لکھی تھی، اِس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔''11

فسانۂ عجائب کے مقدمے کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ رشید حسن خاں نے اصول تدوین کی حدود متعین کی ہیں اور ان اصولی مباحث کو فنِ تحقیق و تدوین کی تاریخ میں تقدیمِ زمانی حاصل ہے۔ خود رشید حسن خاں نے اپنی بعد کی کتابوں میں بھی ان اصولوں کا بار بار اعادہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تدوین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی متن کو ممکن حد تک منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں بنیادی حیثیت متن کی ہوتی ہے۔''[12]

گیان چند جین نے اپنے ایک مضمون ''خدائے تدوین'' میں فسانۂ عجائب کے مقدمے پر از روئے تحقیق اختلاف کیا ہے۔ اُن کے اعتراضات حسب ذیل ہیں:

(1) رشید حسن خاں نے رجب علی سرور کا وطن لکھنؤ کو قرار دیا ہے جب کہ بتلا و عشق میرٹھی نے ''تذکرہ طبقاتِ سخن'' میں خیراتی لال بے جگر نے اپنے تذکرے میں اور خوب چند ذکا نے ''معیار الشعرا'' میں ان کا وطن'' کالنہ پور'' بتایا ہے اور یہ تذکرے اس وقت کے ہیں جب سرور نے فسانۂ عجائب نہیں لکھی تھی۔ جب کہ رشید حسن خاں نے ان ماخذ کا کوئی حوالہ تک نہیں دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان مصادر سے ناواقف تھے۔

(2) مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ ''اُس وقت تک قصے کہانیوں کی جو کتابیں تھیں، ان میں ایک نوطرزِ مرصع کو چھوڑ کر، اور کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو مشکل زبان میں لکھی گئی ہو۔''[13]

گیان چند جین اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''حکیم مجہور کی گلشنِ نوبہار کے بھی بعض حصے حسبِ توفیق مرصع اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً او پرسخن دانِ شیریں مقال و نکتہ دانانِ صحیفہ خیال کے حقیقت اس شکستۂ حال، وابستۂ ملال، خیم الاعمال، وخیم الخصال، آوارۂ بادیہ کربت و سرگشتہ صحرائے غربت کے اخفا اور پوشیدہ نہ رہے۔''[14]

مجھے اِس میں شک نہیں کہ سرورِ نے اِسی کتاب کے اسلوب کی تقلید کی۔''[15]

مذکورہ اختلافات کے باوجود گیان چند جین نے رشید حسن خاں کو اِس مضمون میں ''خدائے تدوین'' قرار دیا ہے۔

(2) انتخابِ ناسخ

اس کا مقدمہ 124 صفحات کو محیط ہے۔ یہ مقدمہ خود مقدمہ نگار کی نظر میں بھی اہم ہے، اس سے متعلق وہ ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''میرا ایک کام جو مجھے بہت زیادہ عزیز ہے وہ ہے انتخابِ ناسخ کا مقدمہ۔''[16]

پیشِ نظر مقدمے کی علمی و ادبی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے معروف شاعر مخمور سعیدی مرحوم لکھتے ہیں:

''قطعِ نظر اس سے ناسخ کے کلام کا اس سے بہتر انتخاب میرے محدود مطالعے میں ابھی تک نہیں آیا، اس کا مقدمہ خاں صاحب کی ادبی سوجھ بوجھ ہی کو نہیں تاریخی عوامل اور فلسفۂ سیاست سے بھی ان کی گہری شناسائی کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لکھنؤ میں تہذیبی و ادبی سطح پر دہلی سے جو انحرافات روبہ عمل آئے، دراصل اس کی نوعیت سیاسی تھی۔ اودھ میں تاریخ نے ایک نئی بساطِ سیاست بچھا دی تھی۔ اِس بساط پر جو کھیل کھیلا جا رہا تھا، اس کی کامیابی کی شرط تھی۔ دہلی سے ہر معاملے میں انقطاع و انحراف اور نئے کھلاڑیوں کی اپنی امتیازی پہچان اور انفرادی شان۔ ناسخ کی شاعری کو اس عمل انحراف کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے اور اُس وقت کے لکھنوی معاشرے میں ان کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب بھی یہی تلاش کیا جا سکتا ہے۔''[17]

انتخابِ ناسخ کے مقدمے کا سب سے بڑا تحقیقی کارنامہ یہ ہے کہ اس میں خاں صاحب نے ثابت کر دیا ہے کہ متروکات کی جو فہرست ناسخ سے منسوب ہے وہ ناسخ سے منسوب ہے وہ ناسخ نے نہیں بل کہ ان کے شاگرد رشکؔ نے مرتب کی تھی۔ یوں اصلاحِ زبان دراصل ناسخؔ کے بجائے رشکؔ کی کاوش قرار پاتی ہے۔ ذیل میں اس مقدمہ بعنوان ''تعارف'' کے مشمولات کا خلاصہ پیش ہے:

اس مقدمے کے سات حصے ہیں:

(1) ناسخ کی شاعری کا پس منظر۔ اس کے دو اجزا ہیں۔

(2) ناسخ کی شاعری کا جائزہ۔ اس کے آٹھ اجزا ہیں:

(i) اسلوبِ ناسخ کے اہم اجزا

(ii) ناسخ کی شاعری، خیال بند شعرا سے مختلف ہے

(iii) ناسخ کی تراکیب

(iv) کلامِ ناسخ میں سادگی کی جھلک

(v) کلامِ ناسخ کے بعض اور اجزا

(vi) کلامِ ناسخ کی قدر و قیمت

(vii) ناسخ کی شاعری سے ملتا جلتا انداز جو بعض شعرائے دہلی کے یہاں بھی پایا جاتا ہے، اُس کی حیثیت کیا ہے۔

(viii) کیا ناسخ نے واقعی ریختہ گویانِ سادہ کلام کے انداز پر خطِ نسخ کھینچ دیا۔

(3) زبانِ لکھنؤ سے کیا مراد ہے؟ کیا اِس سے ناسخ کی زبان مراد لی جاسکتی ہے؟

(4) اِس غلط فہمی کی تردید کی گئی ہے کہ ناسخ نے اصلاحِ زبان کے ضابطے بنائے اور متروکات کا تعین کیا اور یہ ثابت کردیا کہ بیش تر ان کے شاگردوں کا کیا کارنامہ ہے۔

(5) اس شک کا اظہار کہ ناسخ کے شاگرد رشک نے کلیاتِ ناسخ کا جو غلط نامہ مرتب کیا ہے اس پر تصحیح کی بجائے ترمیم کا شبہ ہوتا ہے لہٰذا کلام ناسخ کے خطی نسخوں کی مدد سے کلیاتِ ناسخ کی ازسرِ نو تدوین کی ضرورت ہے۔

(7) انتخابِ کلام سے متعلق کچھ معروضات بیان کی گئی ہیں۔

اس مقدمے کی تحقیقی اہمیت سے قطع نظر کلام ناسخ کی عملی تنقید کا بھی یہ مقدمہ اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اقتباس دیکھئے:

''یہ عجیب بات تھی کہ ایک طرف تو معاشرت میں لذت کوشی کی انتہا تھی، دوسری طرف عزاداری کا عروج تھا...ان عناصر نے تضاد اور ثنویت یعنی دوہرے پن کو معاشرت کا نہایت حسین اور لازمی جز بنا دینے میں بہت کامیابی حاصل کی اور تصنع کو فروغ بخشا۔ ان حالات میں اگر شاعری میں ظاہر آرائی، رعایتِ لفظی اور بے روح خیال آفرینی کا اثر بڑھا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے...یہی ان (ناسخ) کا سرمایۂ کمال ہے۔ 18

مذکورہ اقتباس میں رشید حسن خاں کے ''ثقافتی نقاد'' ہونے کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ مقدمہ نگار نے کلامِ ناسخ کی فنی خصوصیات کو اُس عہد کی لکھنوی تہذیب کا عکس قرار دیا ہے۔

(3) مثنوی گلزارِ نسیم

''گلزارِ نسیم'' کا مقدمہ ڈیڑھ سو صفحات کو محیط ہے۔ اِس مقدمے میں مثنوی گلزارِ نسیم کا ادبی مقام و مرتبہ اُس سے وابستہ اصل قصہ یعنی قصہ گُل بکاؤلی کی روایات کی تحقیق تمثیلی اسلوب کا تفصیلی جائزہ اور پھر نسیم کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن اُس میں معرکۂ چکبست و شرر کا جس طرح تجزیہ کیا گیا ہے وہ بے حد اہم ہے۔ حسبِ معمول مقدمہ نگار نے پیشِ نظر مقدمے میں بھی دماغ سوزی سے کام لیا ہے۔ ثبوت کے بہ طور اس کے ذیلی عنوانات ہی دیکھ لیجیے:

تمہید، گلزارِ نسیم کی ادبی و نصابی اہمیت، قصے کا محلِ وقوع، قصے کے اجزا، تمثیلی انداز، قصے کی قدیم ترین تحریری روایت، کیا یہ قدیم ترین روایت ترجمہ ہے، نسیم کے حالاتِ زندگی، تصنیفات، گلزارِ نسیم سے متعلق بعض قابل ذکر روایتیں، (تعارف) گلزارِ نسیم اشاعتِ اوّل، گلزارِ نسیم نسخۂ شیرازی، نسخۂ قاضی عبدالودود، نسخۂ اصغر گونڈوی، فارسی متن، مذہبِ عشق (فارسی متن کا ترجمہ) کیا افسوس نے ترجمے پر نظرِ ثانی کی تھی؟ مذہبِ عشق اور فارسی متن، ریحان کی مثنوی باغ و بہار، باغ و بہار اور مذہبِ عشق، باغ و بہار اور گلزارِ نسیم، معرکہ چکبست و شرر، چکبست اور شرر کے معرکے کا پس منظر، طریق کار، خاتمہ۔

مقدمے کے آغاز میں ''سحر البیان'' اور ''گلزارِ نسیم'' کے مابین اسلوبیاتی تفریق بجا طور پر قائم کی گئی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سحر البیان اور گلزارِ نسیم کے راستے الگ الگ ہیں۔ اس لیے یہ بے انصافی ہوگی اور بے دردی بھی کہ ان دونوں کا موازنہ کیا جائے۔ میر حسن کے یہاں مرقع نگاری کی شان ہے۔ وہ مصوری کرتے ہیں لیکن نیم رخ تصویریں نہیں بناتے۔ وہ جزئیات کی اہمیت سے خوب واقف ہیں اور تاثیر کی قدر و قیمت اور اُس کے انداز و اسلوب سے ناآشنا نہیں۔ یوں بھی زبانِ لکھنؤ کی نمود اُس وقت تک محوِ خواب تھی۔ بیان کی سادگی، جذبات کی تصویر کشی محاکات، یہ چیزیں تو ان کے خاندان کا جوہر ہوکر رہ گئی ہیں۔ انیس کے مرثیے اِس پر گواہی دینے کے لیے کافی ہیں۔ یہ وہی نور ہے جو کئی پردوں سے چھن کر گزر رہا ہے۔ ''اُجلا سا میداں چمکتی سی ریت'' کا عکس انیس کے مرثیوں میں جگہ جگہ نظر آئے گا۔

نسیم کے وقت تک نیا راگ اپنا رنگ جما چکا تھا۔ شاعری بندشِ الفاظ تھی اور بندشِ الفاظ، نگینے جڑنے سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ زندگی سر سے پیر تک رعایتوں اور تلازموں کا نگار خانہ تھی۔ 19

آگے مزید لکھتے ہیں:

''نسیم نے یہی نیا رنگ پسند کیا۔ انھوں نے لفظی و معنوی صنعتوں اور رعایتِ لفظی کے التزام کو اپنا شیوۂ خاص قرار دیا، لیکن اُن کی ذہانت نے خوش سلیقگی سے قطعِ تعلق کو روا نہیں رکھا۔ رعایتوں اور مناسبتوں سے اس طرح کام لیا کہ یہ عمل کا کھیل بننے کے بجائے معنی آفرینی کا ایک نیا انداز بن گیا۔'' 20

رشید حسن خاں کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پانچ نکات میں نسیم کی امتیازی خصوصیات کو سمیٹ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان کا خاص انداز پانچ اجزا سے مرکب ہے: (1) بیان کا ایسا اختصار کہ بہ ظاہر اُس سے زیادہ ممکن نہیں معلوم ہوتا (2) لفظی مناسبتوں اور رعایتوں کی مدد سے مفہوم میں پہلوداری پیدا کرنا (3) لفظی اور معنی صنعتوں کے واسطے سے حسنِ بیان میں اضافہ کرنا (4) نئے پن سے معمور تشبیہیں (5) بیان کا استحکام یعنی بندش کی چستی۔''[21]

پروفیسر شمیم حنفی نے ''گلزارِ نسیم مرتبہ رشید حسن خاں'' کے عنوان سے نہایت وقیع تبصراتی مقالہ لکھا ہے۔ وہ خاں صاحب کی تحقیقی دقت پسندی کی داد دیتے ہیں اور انھیں عہد حاضر کا لاثانی محقق قرار دیتے ہیں لیکن ''گلزارِ نسیم'' کے تنقیدی مباحث سے انھیں اختلاف ہے۔ انھوں نے خاں صاحب کے طبعی میلان کی طرف بجا طور پر اشارہ کیا ہے کہ ان (خاں صاحب) کا سروکار بنیادی طور پر قدیم مشرقی شعریات سے ہے اور گلزارِ نسیم کے بعض مسائل محض کلاسیکی اصولِ نقد سے حل نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے میں شمیم حنفی کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''لفظوں کے معنی کا مسئلہ تخلیقی زبان کی سطح پر ایک ساتھ کئی جہتیں رکھتا ہے اور کبھی کبھی یہ مسئلہ لغات کی مدد سے حل نہیں ہوتے۔ تکثیرِ معنی کے مضمرات تک رسائی کے لیے کئی راستے جدید علوم اور جدید تنقید نے کھولے ہیں۔ صرف کلاسیکی اصولوں اور ضابطوں کی مدد سے یہاں تک پہنچنا آسان نہیں کیوں کہ تخلیقی تجربے، اظہار اور اسلوب سے وابستہ بہت سے سوال تفہیم و تعبیر کے روایتی طریقوں کی گرفت میں نہیں آتے۔ یہ قدیم شعریات اور جمالیاتی قدروں کی حدِ اختیار سے آگے ہیں۔ رشید حسن خاں نے اس قسم کے سوالات کو اپنے جائزے کے حدود سے بالعموم باہر رکھا ہے۔''[22]

❖ ❖ ❖

''...جو مفروضے قائم کیے گئے ہیں ان پر ادب کی جمالیاتی، تہذیبی، عمرانیاتی اور نفسیاتی تناظر میں تفصیلی بحث کے بغیر، انھیں کلیوں اور قانون کی طرح قبول کر لینا نہ ممکن ہے نہ مناسب۔''[23]

(4) مثنویاتِ شوق

مثنویاتِ شوق کی تدوینی اہمیت کا کچھ اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ گیان چند جین نے اس پر ایک مضمون لکھا جس کا عنوان ہے ''خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ: مثنویاتِ شوق'' اس مضمون کا عنوان مذکورہ کتاب کے مرتب کی عظمت کا ثنا خواں ہے اور تنقید میں ''حمدیہ'' اسلوب غیر مستحسن سمجھا گیا ہے۔ اس کے باوجود اس عنوان سے رشید حسن خاں کی اہمیت اس لیے اُجاگر ہوتی ہے چوں کہ مضمون نگار خود ایک اعلا پائے کا محقق ہی نہیں بل کہ رشید حسن خاں کا معاصر بھی ہے اور کسی ہم پلّہ ہم عصر کا اعتراف سند کا درجہ رکھتا ہے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ دونوں کے مابین چشمک بھی رہی ہو۔

''مثنویاتِ شوق'' کا مقدمہ 168 صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اس میں پندرہ ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ یہ مقدمہ کئی اہم تحقیقی مسائل کا بھرپور احاطہ کرتا ہے مثلاً: اِس میں شوق کی سوانح، مثنویوں کی تعداد، زمانۂ تصنیف، اشاعت پر پابندی، مثنویاتِ شوق کے مصادر اور زبان و بیان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مقدمے کا پہلا عنوان ''تمہید'' ہے، جس کے تحت مثنوی کی ادبی و تہذیبی معنویت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ حصہ رسالہ ''ایوانِ اُردو'' (اپریل 1998) میں ''مثنویاتِ شوق لکھنوی معاشرت کے آئینے میں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اُس پر معروف افسانہ نگار نیّر مسعود نے اپنے ایک خط (مشمولہ ''ایوانِ اُردو''، جولائی 1998) میں سخت ردِّ عمل ظاہر کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ اِس مضمون میں لکھنوی تہذیب اور نوابینِ لکھنؤ کی کردار کشی کی گئی ہے۔ مذکورہ خط شائع ہونے سے قبل ہی رشید حسن خاں کو حاصل ہو گیا اور انھوں نے نیّر مسعود کو فوری طور پر ایک خط لکھا۔ اِس خط کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے۔:

''دیکھیے بھائی! میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں تھا، ہو بھی نہیں سکتا۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کے دل کو تکلیف پہنچی۔ مجھے اگر ذرا بھی احتمال ہوتا تو یہ تحریر ہی وجود میں نہیں آتی۔ میں اپنے مخلصین کے دل کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ مجھے احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ اب مزید غیر مناسب باتیں ہوں اور بحث بڑھے، یہ کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔ میں نے دہلی (انجمن ترقی اُردو (ہند) کو) ابھی خط لکھا ہے۔ میں جون میں وہاں جاؤں گا اور اُس حصے کو ازسرِ نو لکھوں گا، تا کہ شکایت کا کوئی پہلو نہ رہے اور احتیاط کے تقاضوں کی پاس داری بھی ہو جائے۔ آپ کے خط سے یہ بڑا فائدہ ہوا اور اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ بر وقت بات سامنے آ گئی اور بہ آسانی اُسے بنایا جا سکتا ہے...آپ اپنے احباب سے اِس خط کے حوالے سے یہ باتیں کہہ سکتے ہیں، البتہ یہ خط صرف آپ کے لیے ہے۔ اب آپ اِس پر غور کر لیجیے کہ جب اس تحریر کو ازسرِ نو لکھا ہی جانا ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ خواہ مخواہ بات بڑھے اور یار لوگ لطف لیں... اِس بنا پر کیا مناسب نہ ہوگا کہ اب وہ خط نہ چھپے۔ اس کا لہجہ بھی خاصا غیر مناسب ہے۔''[24]

خاں صاحب کا خط ملتے ہی نیّر مسعود نے ''ایوانِ اُردو'' کو خط لکھا کہ خاں صاحب کے خلاف ان کا مراسلہ شائع نہ کیا جائے۔ اِس بابت مخمور سعدی مرحوم (م

2010) لکھتے ہیں:

''جب آپ (نیّر مسعود) کے دو خط (تقریباً ڈیڑھ دو ماہ بعد) یکے بعد دیگرے اُس کی اشاعت روک دینے کے بارے میں موصول ہوئے، اس وقت تک جولائی کا شمارہ چھپ کر تیار ہو چکا تھا اور یہ ممکن نہ تھا کہ آپ کا خط اس میں حذف کر دیا جائے۔''25ے

اُدھر رشید حسن خاں نے ''مثنویاتِ شوق'' کے مقدمے کا متنازعہ فیہ حصہ بجائے ترمیم موعودہ کے بعینہٖ شائع کر دیا لیکن حیرت ہے کہ آخر رشید حسن خاں جیسے ''کھرے محقق'' نیّر مسعود سے اِس اسلوب میں کیوں کر معذرت کے خواست گار ہوتے ہیں کہ ''مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کے دل کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتا ہوں۔'' جب کہ خاں صاحب کے بارے میں عام رائے یہی ہے کہ وہ تحقیق میں کسی مفاہمت یا مصالحت کے قطعی روادار نہیں ہوتے۔ یہ سارا ماجرا مقدمے کی تمہید سے متعلق تھا۔ اب مقدمے کے دیگر مشمولات پر نظر ڈالی جائے گی۔ تمہید، کے بعد شوق لکھنوی کی مختصر مگر مستند سوانح بیان کی گئی ہے۔ پھر اُس کے بعد ''مثنویاتِ شوق کی تعداد'' کے عنوان سے رشید حسن خاں نے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ شوق نے محض تین مثنویاں لکھی ہیں: (1) فریبِ عشق (2) بہارِ عشق (3) زہرِ عشق۔ باقی تمام مثنویاں غلط طور پر شوقؔ سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ اِس کے بعد ''مثنویات کا زمانۂ تصنیف'' کے زیرِ عنوان صحیح معنوں میں تحقیقی مغز ماری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اِس ذیل میں انھوں نے تین کتابوں کے بیانات کا تجزیہ پیش کیا ہے:

(1) تذکرۂ شوق از عطا اللہ پالوی

(2) دبستانِ آتش نیز کلیات شوق از ڈاکٹر شاہ عبدالسلام

(3) حیاتِ شوق از ڈاکٹر سید مسعود حیدر

عطاء اللہ پالوی نے ''تذکرۂ شوق'' میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مثنوی ''فریبِ عشق'' شوق کی پہلی مثنوی ہے۔ چوں کہ شوق نے اِس میں لڑکپن کا ذکر کیا ہے۔ لیکن خاں صاحب نے اِس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پالوی صاحب کے نزدیک شوقؔ کی پیدائش 1197ھ میں ہوئی جب کہ مثنوی ''فریب عشق'' 1263ھ میں لکھی گئی۔ یعنی شوق کی عمر اس وقت 66 سال تھی۔ گیان چند جین نے ''بہارِ عشق'' کی سنہ اشاعت کے بارے میں قیاس ظاہر کیا ہے کہ:

''چوں کہ یہ مثنوی ایک ذی اقتدار نواب کی فرمایش پر لکھی گئی اور شائع کی گئی، کوئی وجہ نہیں کہ تصنیف کے بعد طباعت میں دیر ہوئی ہو، اِس لیے اس کی تاریخ 1266ھ تسلیم کی جا سکتی ہے۔''26ے

لیکن ذرا خاں صاحب کا یہ محتاط تحقیقی رویہ ملاحظہ ہو:

''جین صاحب کی بات قرینِ قیاس تو ہے، دل کو لگتی ہوئی بھی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کی تصنیف اور طباعت کا درمیانی وقفہ کتنا تھا۔''27ے

مثنوی ''زہرِ عشق'' کی سنہ اشاعت کیا ہے؟ اس کی جستجو رشید حسن خاں کو کہاں کہاں لے جاتی ہے۔ کچھ اس کی روداد جین صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

''میں نے اپنی کتاب ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں'' لکھا تھا کہ 'زہرِ عشق' کا مادۂ تاریخ 'غم دلربا' ہے جسے سب سے پہلے ذاکر بدایونی کا پورا قطعہ درج کر دیا جس میں یہ مادہ نظم کیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں کی طرح جستجو کہاں کرتا ہوں۔ انھوں نے یہ بتایا کہ راس مسعود اور عشرت رحمانی دونوں نے اپنے مآخذ کو چھپا کر یہ تاثر دیا جیسے یہ ان کی دریافت ہے۔ دراصل یہ سب نظامی بدایونی کے دیباچۂ زہرِ عشق (1919) سے لیا گیا ہے۔ رشید حسن خاں ایک ایک جملے اور فقرے پر وکیل کی طرح محتاط ترین نتیجہ نکالتے ہیں۔ انھوں نے اطلاع دی کہ اب تک کی معلومات کے مطابق اس مثنوی کا قدیم ترین اڈیشن مطبع شعلۂ طور، کانپور جنوری 1862 کا ہے۔ 1277ھ مطابق ہے 61-1860 کے۔ وہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ اس کا زمانۂ تصنیف 1277ھ ہی ہوگا۔''28ے

مثنویات کے زمانۂ تصنیف کے بعد ''منعِ اشاعت'' کے زیرِ عنوان ان تمام روایات کا تجزیہ کیا گیا ہے جن میں مثنویاتِ شوق کی اشاعت پر پابندی عائد کرنے کی کہانی گڑھی گئی ہے لیکن رشید حسن خاں نے ان سب روایتوں کو یکسر غیر مستند قرار دیتے ہیں۔

مقدمے کا اگلا عنوان ''مطبوعہ نسخہ'' ہے جس میں انتہائی جزرسی کے ساتھ تینوں مثنویوں کے قدیم ترین مطبوعہ نسخوں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ پھر اس سے آگے ''ذیلی عنوانات'' کی سرخی لگائی گئی ہے جس کے تحت انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ شوق نے اپنی تینوں مثنویوں میں کسی میں بھی ذیلی عنوانات قائم نہیں کیے تھے۔ پھر اس کے بعد دو اہم مباحث کا اہتمام کیا گیا ہے جس کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

(الف) کیا یہ مثنویاں شوق کی سرگزشت ہیں

(ب) وجہِ تصنیف

رشید حسن خاں نے اِس بابت یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شوق کی یہ مثنویاں ان کی سرگزشت نہیں ہیں بل کہ شاعر کا اصل مقصد صرف خواتین کی زبان و بیان کی بہار دکھانا تھا۔

مقدمہ نگار نے ایک اہم تنقیدی بحث ''زبان و بیان'' کی بھی چھیڑی ہے اور یہ کہا ہے کہ فریبِ عشق اور بہارِ عشق میں بیگمات کی زبان بے حد فطری طریقے سے پائی

جاتی ہے جب کہ ''زہرِ عشق'' میں مصنوعی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔
پھر حسبِ معمول آخر میں ''طریقِ کار'' کے عنوان سے متن کی پیش کش سے متعلق ضروری تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

(5) مثنوی سحر البیان

مثنوی سحر البیان کا مقدمہ 142 صفحوں کا ہے۔ پہلے مقدمے کے ذیلی عنوانات ملاحظہ ہوں۔
تمہید، (میر حسن کے) حالاتِ زندگی، تصنیفات، سحر البیان، مثنوی کا نام، زمانۂ تصنیف، وجہِ تصنیف، صلہ، عنوانات، قطعاتِ تاریخ، مثنوی کے متعلق بعض رائیں، قصے کے ماخذ، دیباچہ کب لکھا گیا، متن کس نے مرتب کیا اور کب، سنہ تکمیل، طباعت، مثنوی کے خطی نسخے، ایک غیر معتبر نسخہ، تدوین میں جو نسخے پیش نظر رہے، نسخۂ فورٹ ولیم کالج کلکتہ، زبان و بیان، طریقِ کار، ضمیمے، حدود کا تعین، اختتامیہ۔
تمہید میں مثنوی کے کلیدی پیکر کی جستجو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ سب سے زیادہ ''نوری پیکر'' کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ منبعِ نور ''چاند'' ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں مثنوی سے دی گئی ہیں۔ ''حالاتِ زندگی'' کے زیرِ عنوان میر حسن کے نام، سنہ پیدایش، وطن، والد کا نام، ابتدائے شباب، دہلی سے ہجرت، اولاد اور وفات وغیرہ سوانحی عناصر پر تحقیقی بحثیں کی گئی ہیں۔
عنوان ''تصنیفات'' کے تحت یہ کہا گیا ہے کہ غزل اور دیگر اصناف پر مشتمل دیوان کے علاوہ بارہ مثنویاں ان کی تصنیف ہیں اور ایک تالیف ''تذکرۂ شعرائے اُردو'' بھی ہے۔
''مثنوی کا نام'' سے تعلق خاں صاحب کی تحقیق ہے کہ میر حسن نے اِس مثنوی کا نام متعین نہیں کیا۔ بل کہ یہ نام ''سحر البیان'' بعد کے لوگوں نے وضع کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے مثنوی کا کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ انھوں نے شاعرانہ رعایت کے ساتھ صرف یہ لکھا ہے: نہیں مثنوی، ہے یہ سحر البیان.... سب سے پہلے مصحفی نے اس معنویت کو محسوس کیا اور یہ فرض کر لیا کہ مثنوی کے محاسن اور دل کشی اور دل فریبی کے لحاظ سے یہ کلمہ بہ طورِ نام آیا ہے۔ کوئی بھی بات ہوئی ہو، مصحفی نے اپنے تذکرے میں اس کا یہی نام لکھا۔''29

''زمانۂ تصنیف'' سے بحث کرتے ہوئے یہ لکھا کہ مثنوی کے آخر میں قتیلؔ اور مصحفیؔ کا ایک ایک قطعۂ تاریخ ہے۔ ان کے مادّہ ہائے تاریخ سے سنہ ہجری 1199ھ نکلتا ہے۔
''وجہِ تصنیف'' کے زیرِ عنوان اِس مثنوی کی وجہِ تصنیف سے متعلق تمام روایات کو تحقیق کی رو سے غیر مستند قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ پورے یقین کے ساتھ کوئی خاص وجہ متعین نہیں کی جاسکتی ہے۔
اُسی طرح ''صلہ'' سے متعلق تمام روایات کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ افسوسؔ کی روایات زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ آصف الدولہ نے ایک دوشالہ عطا کیا تھا۔
ایک ذیلی عنوان ''عنوانات'' قائم کیا گیا ہے، جس کے تحت اس مسئلے کی وضاحت کی گئی ہے کہ ہر چند کہ تمام خطی اور مطبوعہ نسخوں میں متن میں عنوانات شامل ہیں لیکن رشید حسن خاں کے نزدیک ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے جس کی بنا پر یہ طے کیا جاسکے کہ یہ عنوانات میر حسن کے قائم کردہ ہیں۔
''قصے کے ماٰخذ'' کی ذیلی سرخی میں یہ نتیجۂ تحقیق پیش کیا گیا ہے کہ مثنوی سحر البیان طبع زاد ہے۔ لیکن یہ درست ہے کہ اِس کے بعض اجزا مختلف داستانوں سے ماخوذ ہیں۔ اس سلسلے میں رشید حسن خاں نے گیان چند جین کی کتاب ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں'' اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب ''اُردو کی منظوم داستانیں'' کی تحقیقات پر ہی تکیہ کر لیا ہے اور اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔
''دیباچہ'' کے ذیل میں کہتے ہیں کہ مثنوی سحر البیان کے آغاز میں ایک دیباچہ لکھا ملتا، جس میں دیباچہ نگار کا نام درج نہیں ہے لیکن رشید حسن خاں اپنی تحقیقی کاوش کی بدولت یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دیباچہ دراصل شیر علی افسوسؔ کا تحریر کردہ ہے۔
پھر اِس کے بعد ایک ذیلی عنوان ہے ''دیباچہ کب لکھا گیا''۔ عتیق صدیقی کی کتاب ''گل کرسٹ اور اس کا عہد'' میں گل کرسٹ کے ایک خط کے حوالے سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ مثنوی سحر البیان 1802 میں شائع ہوئی۔ رشید حسن خاں نے ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی کتاب ''فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات'' کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ گل کرسٹ کے مذکورہ خط میں مثنوی سحر البیان کے بجائے اُس کی نثرِ بے نظیر'' (مؤلفہ میر بہادر علی حسینی) کا ذکر تھا۔ رشید حسن خاں نے بھی یہ لکھا ہے کہ اُس کی ہندی مینول بھی اُن کے سامنے ہے۔ پھر انھوں نے ساری بحث کا نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ افسوسؔ نے جو تاریخ دیباچہ میں خود ہی بتائی ہے یعنی 1803 اُسے تسلیم کر لینے میں کچھ اشکال نہیں۔
''فورٹ ولیم کالج کا متن کس نے مرتب کیا اور کب مرتب ہوا'' اس سلسلے میں رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ:

''سحر البیان نسخۂ فورٹ ولیم کالج میں متن کے تعینات، افسوؔس کی سخن شناسی اور زبان دانی کی آئینہ داری کرتے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اِس نسخے کا متن دوسرے نسخوں کے متن کے مقابلے میں بہتر، عمدہ تر اور صحیح تر ہے، خاص کر تلفظ اور تذکیر و تانیث کے تعینات۔'' 30

''سنہ تکمیل طباعت'' کے تحت رشید حسن خاں نے وحید اختر قریشی اور مثنوی گیان چندجین کی آرا سے بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اس مثنوی کی صحیح سنہ تکمیلِ اشاعت 1805 ہے۔

''مثنوی کے خطی نسخے'' کے زیرِ عنوان مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ مثنوی سحر البیان کے بے شمار خطی نسخے تیار کیے گئے تھے لیکن بیش تر غیر معتبر ہیں۔ بعض مستند نسخے ہیں بھی تو وہ نایاب ہو چکے ہیں۔ اس ذیل میں خاں صاحب نے خطی نسخوں کی عدم دستیابی کی پوری روداد لکھی ہے اور بتایا ہے کہ انھیں کہیں بھی کامیابی نہیں ملی۔ یہ روداد اس لیے بھی اہم ہے کہ اس سے اُردو مخطوطات کی حالتِ زار اور اُردو کلاسیکی متون کی صحیح ترین تدوین کی مشکلات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ کہیں سے نسخہ غائب ہے، کہیں غیر معتبر ہے، کہیں خستہ حالت میں ہے وغیرہ...

''ایک غیر معتبر نسخہ'' کے تحت وضاحت کی گئی ہے کہ پنجاب یونی ورسٹی لاہور لائبریری کے ''شیرانی کلکشن'' میں ایک خطی مجموعۂ مثنویات ہے جس میں سحر البیان بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے تھی کہ یہ نسخہ خود میر حسن نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ چوں کہ اِس میں اشعار کی کاٹ چھانٹ بہت زیادہ ملتی ہے۔ لیکن رشید حسن خاں نے اس کی تردید یوں کی ہے:

> ''میرے لیے یہ رائے ماننا ممکن نہیں، کئی وجہوں سے۔ ایک تو یہ کہ اُس صورت میں یہ بھی ماننا ہوگا کہ (1) میر حسن عقیدے کے لحاظ سے سُنّی تھے (2) وہ اس قدر کم سواد تھے کہ معمولی معمولی لفظوں کے املا سے بھی واقف نہیں تھے (3) وہ زبان اور بے وزن شعر میں فرق نہیں کر سکتے تھے۔'' 31

''متن کی تدوین میں جو نسخے پیشِ نظر رہے ہیں'' اِس عنوان کے تحت مقدمہ نگار نے ان تمام عنوان کے تحت مقدمہ نگار نے ان تمام خطی اور مطبوعہ نسخوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے جن کی مدد سے متن کی تصحیح کی گئی ہے۔ اُن میں گیارہ خطی اور دو مطبوعہ نسخے شامل ہیں۔ اس سے مرتب کی مشکل پسندی کا اندازہ ہوتا ہے۔

''زبان و بیان'' کے زیرِ عنوان آبِ حیات سے ماخوذ محمد حسین آزاد کا ایک طویل اقتباس نقل کیا گیا ہے۔ پھر ان کی تمام باتوں سے اتفاق کا اظہار ہے سوائے اس بات کے کہ جہاں پر محمد حسین آزاد نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سحر البیان کی زبان کے معاصرین کے مقابلے میں کم ''پُرانا پن'' ہے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ:

> ''شعلۂ عشق اور دریائے عشق میرؔ کی مثنویاں ہیں اور ان کی زبان میں پُرانا پن سحر البیان کے مقابلے میں کم ہے (ہاں حسنِ بیان کے لحاظ سے سحر البیان کا درجہ بلند تر ہے)۔'' 32

زبان و بیان کے ذیل میں مقدمہ نگار نے مثنوی سحر البیان کی دو خصوصیات کا بطور خاص تفصیلی محاکمہ کیا ہے:

(1) جذبات کی ترجمانی (2) مرقع نگاری

''طریق کار'' کے تحت مقدمہ نگار نے تدوینِ متن (مثنوی سحر البیان) کے لیے جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے، اس کی وضاحت کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے بیان کردہ ضروری نکات درج ذیل ہیں:

(1) متن کی بنیاد نسخۂ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کو بنایا گیا۔
(2) معروف، مجہول، مخلوط اور لین آوازوں کے تعین کے لیے، نیز غنہ آوازوں کے لیے علامات سے کام لیا گیا ہے اور ان علامات کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے۔
(3) توقیت نگاری کا التزام رکھا گیا ہے۔
(4) اعراب نگاری کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔
(5) کتاب کا متن اپنے ہاتھ سے لکھا گیا ہے۔

مذکورہ نکات سے واضح ہو جاتا ہے کہ رشید حسن خاں کتنے محتاط مدون تھے اور وہ کس جتن سے کام کرتے تھے۔

(6) مصطلحاتِ ٹھگی

یہ بے حد دل چسپ لغت ہے۔ یہ لغت دراصل ٹھگوں کی لفظیات اور اصطلاحات پر مشتمل ہے۔ ہندوستان میں ٹھگوں کی ایک منظّم جماعت تقریباً دو سو سال تک (1635 تا 1835) ٹھگی، لوٹ مار اور قتل و غارت گری میں سرگرم رہی۔ ایک دل چسپ پہلو یہ ہے کہ ٹھگوں کے اپنے علاحدہ مذہبی عقائد اور ٹھگی کے باقاعدہ اصول و قواعد تھے۔ حتیٰ کہ ان کی اپنی لفظیات بھی متعین تھیں۔ انھیں مصطلحات پر مشتمل یہ لغت ہے۔ اس لغت کی ترتیب کس طرح عمل میں آئی۔ خلیق انجم کی زبانی سنیے:

> ''برطانوی حکومت نے ٹھگی کے انسداد کا 1799 میں شروع کیا۔ لیکن غالباً بہت زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ 1830 میں ہندوستان کو گورنر جنرل ولیم

بینٹنگ نے ٹھگی کو ختم کرنے کی ایک مہم تیار کی تھی اور اس مہم کا انچارج کیپٹن ولیم سلیمن کو بنایا۔ سلیمن کا بیان ہے کہ 1835 تک بیش تر ٹھگ پکڑے جا چکے تھے اور ٹھگوں کے منظّم گروہ تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ سلیمن کے دو بڑے کارنامے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے ٹھگی بالکل ختم کر دی اور دوسرے انھوں نے بعض ٹھگوں کو وعدہ معاف گواہ بنا کر اُن سے ٹھگی کے اصول، قواعد اور طریقۂ کار کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ وعدہ معاف گواہوں کی تعداد لگ بھگ چار سو تھی۔ اُن سب کے بیانات کو بڑے سلیقے سے مرتب کر کے سلیمن نے ایک کام یہ بھی کیا کہ ٹھگوں سے ان کی خفیہ زبان کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ایک فرہنگ مرتب کی اور اُسے کتاب کے آخر میں شامل کر دیا۔ ٹھگوں کی زبان کی فرہنگ تیار کرنے میں سلیمن کے مددگار علی اکبر نام کے ایک ہندوستانی تھے۔ انھوں نے سلیمن کی مرتب کی ہوئی فرہنگ کا اُردو میں ترجمہ کیا اور اُس کے علاوہ ٹھگوں کی زبان کی ایک مختصر فرہنگ مرتب کی اور پھر ٹھگوں سے براہِ راست معلومات فراہم کر کے اس فرہنگ میں اچھا خاصہ اضافہ کیا۔ یہ فرہنگ 1839 میں شائع ہوئی۔'' 33

رشید حسن خاں نے ''مصطلحاتِ ٹھگی'' کو از سرِ نو ترتیب دیا اور ''ابتدائیہ'' کے عنوان سے ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا۔ مقدمے کے ذیلی عنوانات یوں ہیں:

''جرم اور عقیدہ۔ نجات کا تصور، سماجی اور عوامل، بھینٹ کی شرط، شگون، مذہب، اختلاف اور مطابقت، لسانی تجزیے کی ضرورت اور اہمیت، اس کتاب کی اہمیت (ٹھگی کی مصطلحات سے متعلق لغات) رماسیانا، مصطلحات ٹھگی، مصطلحاتِ ٹھگاں، مصطلحاتِ ٹھگی (حیدر آباد)، فرہنگ اصطلحاتِ پیشہ وراں، واقعاتِ عجیبہ و غریبہ معروف بہ غریب نامہ۔

یہاں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''ٹھگی'' جیسے بُرے پیشے والوں کی مخصوص زبان سے رشید حسن خاں جیسے سنجیدہ اور محقق عالم کی دل چسپی کو جواز کیا ہے؟ اس کا جواب خود انھیں کی زبانی سنیے:

> ''جرائم کو بُرا کہنا اور جرائم پیشہ لوگوں کو بُرا سمجھنا بجائے خود درست اور برحق، مگر اسے بُرا سمجھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ وہ لوگ جس 'بولی' میں 'کام' کی باتیں کیا کرتے تھے، وہ بھی کم توجہی کی نذر ہو گئی، یہ بہت بُرا ہوا۔ کام بُرے لیکن اُن کاموں سے تعلق اور نسبت رکھنے والے جس قدر لفظ ہیں، وہ سب زبان کا جز ہیں۔ ایسے کسی لفظ کو بھی ناقابلِ قبول نہیں کہا جا سکتا۔ لسانی مباحث سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے اور اُردو لغت نگاری سے متعلق افراد کے لیے ایسے سب لفظ لازمی اجزائے زبان کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' 34

(7) زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی)

اس کتاب کا مقدمہ 93 صفحات کا ہے۔ جعفر زٹلی کے سوانحی کوائف اور اس کی شعری کائنات کا احاطہ کیا گیا ہے اور زٹلی کی زبان و بیان پر خاص طور پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ذیل میں اس مقدمے کے ضمنی عنوانات ملاحظہ ہوں:

> تمہید، حالاتِ زندگی، کلامِ جعفر کی اہمیت، زبان اور بیان، مقتولِ تلخ نوائی، زٹل نامہ، مکمل کلیات کس نے مرتب کیا؟ مختلف نسخے، طریق کار، ضمیمے، سپاس گزاری۔

''تمہید کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ جعفر کا کلام جس طرح شمالی ہند میں ارتقائے زبان کی پہلی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اُسی طرح سماجی مشکلات کے پُر زور اور پُر شور بیان کے لحاظ سے جعفر اُردو کا اولین شاعر ہے جس نے اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے جس کا کلام اس پر گواہی دیتا ہے کہ دہلی میں اُردو شاعری کا آغاز غزل کی روایت سے نہیں ہوا، احتجاجی شاعری نے نظموں کی شکل میں اپنے نقش درست کیے ہیں۔'' 35

مذکورہ اقتباس سے حسبِ ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:

(1) کلامِ جعفر شمالی ہند میں ابتدائی دور کی اُردو کے لسانی مطالعے کے حوالے سے اولین ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔

(2) اُردو شاعری میں نمایاں سماجی حسیت سب سے پہلے جعفر کے یہاں نظر آتی ہے۔

(3) کلامِ جعفر اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ دہلی میں اُردو شاعری کا آغاز غزل کے بجائے نظم سے ہوا۔

(4) جعفر کی شاعری اُردو میں احتجاجی شاعری کا نقوشِ اول ہے۔

اس مقدمے کی بنیادی بحث ''کلامِ جعفر کی اہمیت'' کے عنوان سے قائم ہوتی ہے۔ خصوصاً اس پس منظر میں کہ جعفر کی شاعری کو 'اقدار شکن' تصور کر کے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ رشید حسن خاں نے جعفر زٹلی کی قدر متعین کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''کلامِ جعفر کی یہ بڑی اہمیت ہے کہ اُس کی بنیاد پر اُردو زبان اس پر فخر کر سکتی ہے کہ شروع ہی سے یعنی اُس زمانے سے جسے شمالی ہند میں اُردو کے فروغ کا

پہلا دور کہنا چاہیے، شاعری میں سماجی مسائل ومشکلات کا بےلاگ بیان موضوعِ سخن کے طور پر ملتا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے لہجے میں بے باکی ہے اور کھردرا پن۔ جعفر اس روایت کا بنیادگذار ہے۔ بگڑتے ہوئے سیاسی حالات، بے کاری، بدنظمی، افلاس، ان سب کے ہلکے گہرے بیانات اُس کی شاعری میں محفوظ ہوگئے ہیں۔ وہ بااقتدار افراد، جن کے نکمے پن کے نتیجے میں یہ حالات پیدا ہو رہے تھے، ان کا نام لے کر ان کو اس کا ذمہ دار کہنا یہ صاف گوئی اور بے باکی بھی اس شاعری کا حصہ رہی ہے۔ یہاں ہم کو یہ بات یاد رہنا چاہیے کہ وہ زمانہ مطلق العنان شخصی حکومت کا تھا، آج کل جیسی جمہوریت کا نہیں تھا۔''36

مزید آگے مقدمہ نگار نے جعفر زٹلی کی شاعری کو ''شہر آشوب'' کا پیش رو قرار دیتے ہوئے لسانی اور اسلوبیاتی سطح پر جعفر زٹلی کے کلام کی معنویت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''دورِ اوّل کی اس روایت نے جس کا سب سے بڑا نمایندہ جعفر کا ایک بڑا کام یہ بھی کیا کہ اس کے اثر سے لسانی سطح پر اُس کھردرے پن نے فروغ پایا جس کے بغیر احتجاجی شاعری سرسبز نہیں ہو پاتی۔ لہجے کے بھاری پن کو برقرار رکھا، پُرشور لفظیات کا ذخیرہ فراہم کیا، بیان کو اُس ریشمی پن سے محفوظ رکھا جو لہجے میں تلوار کی جھنکار نہیں پیدا ہونے دیتا اور اُس آہنگ کی تشکیل کی جو رومانیت سے دور کا واسطہ رکھتا ہے۔ ادب کے طالب علموں کے لیے یہ لازم ہے کہ کئی صدیوں پر محیط احتجاجی شاعری کا آغاز اور ارتقا اچھی طرح سمجھنے کے لیے شمالی ہند میں شاعری کے دورِ اوّل کی اس روایت سے واقف ہوں جس کا سب سے بڑا نمایندہ اور بنیادگذار جعفر ہے۔ اس کے بغیر وہ روایت جس نے شہر آشوب میں اپنی اہمیت اور وسعت کو نمایاں کیا، پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکے گی، اُس کے ابتدائی نقوش آنکھوں سے اوجھل رہیں گے۔''37

رشید حسن خاں نے بجا طور پر جعفر زٹلی کے تعلق سے لکھا ہے کہ ان کی شاعری کا اصل جوہر فحشات اور پھکڑ پن نہیں ہے بل کہ سماجی حسیت اس کی اصل روح ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ جعفر کے کلام کا ایک حصہ وہ بھی ہے جس میں پھکڑ پن کے سوا کچھ نہیں، بعض ذاتی ہجویں بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ لیکن اُس کے کل کلام نثر ونظم کا یہ محض دس فیصدی حصہ ہوگا۔ اسے بہ آسانی نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔ اصل قدر و قیمت تقریباً نوّے فی صدی بقیہ کلام کی ہے جو اپنے عہد کا آئینہ ہے۔''38

مقدمہ میں ایک اور اہم بحث ''زبان و بیان'' کے عنوان سے چھیڑی گئی ہے جس کے تحت جعفر زٹلی کی شاعری کی لسانی اہمیت واضح ہوگئی ہے۔ مقدمہ نگار کی یہ رائے ملاحظہ ہو:

''سترہویں صدی کا نصفِ آخر دہلی میں اُردو کے فروغ کا دورِ اوّل تھا۔ اُردو زبان تشکیلی دور سے گزر چکی تھی، لیکن شمالی ہند میں اُس کے فروغ کا ابتدائی زمانہ یہی نصف صدی ہے، یہی زمانہ جعفر کی ریختہ گوئی کا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب فارسی کی حکومت ختم تو نہیں ہوئی تھی، اُس کی علمی حیثیت اور تہذیبی اہمیت برقرار تھی، مگر جس طرح معاشرت میں تبدیلیاں اپنی جگہ بنانے لگی تھیں، اُسی طرح لسانی صورتِ حال میں بھی بدلاو کے آثار نمایاں ہونے لگی تھیں، اُسی طرح لسانی صورتِ حال میں بھی بدلاو کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ اس لسانی عمل کی بہت اچھی اور بھرپور مثالیں جعفر کی نظم و نثر میں محفوظ ہوگئی ہیں۔''39

رشید حسن خاں کے مقدمات کے مطالعے سے حسب ذیل نتائج برآمد کیے جاسکتے ہیں:

(1) رشید حسن خاں محقق، ناقد، مورخ، مدوّن، قواعدداں اور املا کا معیار بند... سبھی کچھ تھے۔
(2) بےلاگ اور مصلحتوں سے آزاد اظہارِ خیال ان کا شیوہ رہا۔
(3) وہ تحقیق سے طبعی مناسبت رکھتے تھے۔
(4) اُردو تحقیق میں بےباکی اور حق گوئی کی روایت کے استحکام و توسیع میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔

حواشی

(1) اطہر فاروقی، مضمون، رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ، مشمولہ رشید حسن خاں: حیات و ادبی خدمات (خصوصی شمارہ، کتاب نما) جولائی 2002 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ص 9

(2) رفیع الدین ہاشمی، مضمون، رشید حسن خاں تحقیق وتنقید کا مردِ میداں، مشمولہ ہماری زبان (رشید حسن خاں نمبر) یکم تا 28 ستمبر 2006 انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، ص 36

(3) اطہر فاروقی، مضمون، رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ، مشمولہ رشید حسن خاں: حیات و ادبی خدمات (خصوصی شمارہ، کتاب نما) جولائی 2002 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ص 11 تا 14

(4) پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مضمون، رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ، مشمولہ رشید حسن خاں: حیات و ادبی خدمات (خصوصی شمارہ، کتاب نما) جولائی 2002 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ص 24

(5) ڈاکٹر اسلم پرویز، مضمون، خاں صاحب، مشمولہ رشید حسن خاں: حیات و ادبی خدمات (خصوصی شمارہ، کتاب نما) جولائی 2002، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ص 37

(6) رشید حسن خاں، مقدمہ فسانۂ عجائب (تدوین)، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1990، ص 16

(7) ایضاً مقدمہ، ص 17

(8) ایضاً ص 17

(9) ایضاً، ص 21

(10) ایضاً، ص 62

(11) ایضاً، ص 63

(12) ایضاً، ص 22

(13) ایضاً، ص 55

(14) ایضاً، ص 55

(15) گیان چند جین، مضمون خدائے تدوین، مشمولہ رشید حسن خاں: حیات و ادبی خدمات (خصوصی شمارہ، کتاب نما) جولائی 2002، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ص 66

(16) ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، مضمون، رشید حسن خاں سے ایک انٹرویو، مشمولہ ہماری زبان (رشید حسن خاں نمبر) یکم تا 28/ستمبر، 2006 دہلی، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، ص 20

(17) مخمور سعیدی، مضمون، خانِ والاشان، مشمولہ رشید حسن خاں: حیات و ادبی خدمات (خصوصی شمارہ، کتاب نما) جولائی 2002 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ص 55

(18) رشید حسن خاں، تعارف، انتخاب ناسخ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1993، ص 17

(19) رشید حسن خاں، مقدمہ گلزارِ نسیم (تدوین)، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 1995، ص 14

(20) ایضاً

(21) ایضاً، ص 20

(22) شمیم حنفی، مضمون، گلزارِ نسیم مرتبہ رشید حسن خاں، مشمولہ ''رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے'' مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، مکتبہ الحرا، دربھنگہ (بہار) 2008، ص 211

(23) ایضاً، ص 212

(24) محررہ 2/مئی 1998 بنام نیر مسعود، ص 235، اُردو ادب، جنوری تا مارچ 2007

(25) ایوانِ اُردو، اگست 1998 ص 57

(26) گیان چند جین، مضمون 'خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ: مثنویاتِ شوق' مشمولہ ''رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے'' مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، مکتبہ الحرا، دربھنگہ (بہار) 2008، ص 216

(27) رشید حسن خاں، مقدمہ مثنویاتِ شوق (تدوین) انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی 1998، ص 45

(28) گیان چند جین، مضمون 'خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ: مثنویاتِ شوق' مشمولہ ''رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے'' مرتبین ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی، مکتبہ الحرا، دربھنگہ (بہار) 2008، ص 217

(29) رشید حسن خاں، مقدمہ سحر البیان، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی 2000 ص 29-30

(30) ایضاً، ص 75

(31) ایضاً، ص 85

(32) ایضاً،ص118
(33) خلیق انجم،حرفِ آغاز،مصطلحاتِ ٹھگی،مرتبہ رشید حسن خاں،انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی 2002
(34) ایضاً مقدمہ رشید حسن خاں،ص11
(35) رشید حسن خاں،مقدمہ زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی 2003،ص12
(36) ایضاً ص17
(37) ایضاً ص18-19
(38) ایضاً ص23
(39) ایضاً ص25

(مقدماتی ادب (تحقیق وتنقید) مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی غیر مطبوعہ،ڈاکٹر خالد مبشر،جامعہ ملیہ اسلامیہ،نئی دہلی،2012،صفحہ 317 تا352)

○○○

اِک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

(رشید حسن خاں سے کی گئی باتوں،ملاقاتوں اور یادوں کے تاثرات پر مبنی تحریر)

ڈاکٹر الف ناظم (افتخار احمد قادری)

اُردو میں تدوین،قواعد وزبان،عروض اور لغت سازی پر تقریباً ڈھائی درجن مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں،جو اِن موضوعات پر گراں قدر اضافہ ہیں،کے مصنف رشید حسن خاں جیسے محققین کی تعداد اتنی بھی نہیں ہے کہ انھیں اُنگلیوں پر گنا جاسکے۔رشید حسن خاں جیسی نابغۂ روزگار شخصیت کو حصولِ علم کے لیے کسی یونی ورسٹی سے ڈگری حاصل کرنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔وہ تو کسی خاص مقصد کی تکمیل کے لیے ہی پیدا ہوتی ہیں۔جھوٹ،لغویات،خرافات سے چڑھ اور راست گوئی،سچائی اور بے باکی اور دیانت داری ہی اس کا اصل مذہب ہوتی ہے۔رشید حسن خاں کی شخصیت انھیں اوصاف جمیلہ کی حامل تھی۔اپنے تعلیمی سفر کے دوران اس خاک سار کو رشید حسن خاں سے اُردو زبان وادب کا درس حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور جس کے سبب خاک سار نے سائنس کی اعلا تعلیم (جو اس وقت حاصل کر رہا تھا) کو خیر باد کہہ کر اُردو زبان وادب ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

دسمبر 1999 کی بات ہے جب میں گاندھی فیض عام (جی۔ایف) کالج،شاہ جہاں پور سے سائنس کی اعلا تعلیم حاصل کر رہا تھا۔وہاں پر روٹری کلب شاہ جہاں پور کے ذریعے پولیو (Polio) مہیم چل رہی تھی۔جیب خرچ نکالنے کی غرض سے میں بھی روٹری کلب سے منسلک ہوگیا۔ایک روز میں پولیو ڈراپس باکس لے کر محلّہ باڑوزئی میں جا پہنچا۔کئی مکانوں میں بچوں کو پولیو خوراک پلانے کے بعد میں نے ایک مکان پر آواز دی۔وہاں کوئی بچہ پانچ سال سے کم عمر کا نہ تھا۔لیکن اندر سے جو آواز آئی اس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔دروازے کے اندر داخل ہوا تو اس سے متصل ایک کمرے میں جھانکا جہاں سے آواز آئی تھی۔حکم ہوا کہ ''آیئے''۔مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی لائبریری میں آگیا ہوں۔سارے کمرے میں کتابیں بے حد سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔درمیان میں ایک بڑی سی ٹیبل پر دائیں بائیں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اُردو کی اتنی کتابیں ایک ساتھ دیکھی تھیں۔

میں نے سلام کیا۔جواب کے بعد انھوں نے فرمایا'' کہیے،کیسے آئے؟''میں نے عرض کیا کہ پولیو خوراک پلانے کی غرض سے۔کیا آپ کے یہاں پانچ برس تک کی عمر کے بچے ہیں۔انھوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''نہیں۔'' یہ رشید حسن خاں تھے جن سے میں اس وقت بالکل ناواقف تھا۔یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ مجھے شعر گوئی کا چسکا لگ چکا تھا اور استادِ محترم نسیم شاہ جہاں پوری کی وساطت سے بعض رسائل میں غزلیں شائع ہونے لگیں تھیں۔میں اپنے ابتدائی کلام میں سے آپ کے سامنے دو غزلیں پیش

کررہاہوں:

مدتوں سے گُم فقط اس سوچ میں رہتا ہوں
برف ہوں،شعلہ ہوں،مٹی ہوں،ہوا ہوں،کیا ہوں میں
قافلے مجھ سے ضیاء لے کر گزرتے ہیں مگر
اپنے ہاتھوں میں لیے مشعل کھڑا رہتا ہوں میں
اس لیے میری خطا دانشوری سمجھی گئی
عیب ہوں لیکن ہنر کے طاق میں رکھتا ہوں میں
بند رہتا ہے وہ تابوت تکلف میں سدا
اور پہلی ہی ملاقاتوں میں کھُل جاتا ہوں میں
دھوپ ،سایہ سب شریکِ حال ہیں ناظم تو پھر
کون کہتا ہے کہ رستے کا شجر تنہا ہوں میں

❖ ❖ ❖

لہو تھوکا ہے اور خوں رو گیا ہے
کہ وہ بھی میرے جیسا ہو گیا ہے
یہ کس دریا نے آ کر تھپکیاں دیں
کہ منہ ڈھک کر سمندر سو گیا ہے
کہاں جاؤں میں اُس کو ڈھونڈنے اب
مرے اندر کہیں وہ کھو گیا ہے
میں خود سے منہ چھپاتا پھر رہا ہوں
کہ میرا غم نمایاں ہو گیا ہے
یقیناً بیڑیاں اُس پار ہوں گی
کہاں لوٹا،اِدھر سے جو گیا ہے
گزرتے وقت کا احساس ناظم
مری آنکھوں میں آنسو بو گیا ہے

اُردوادب بالخصوص کلاسیکل شعرامثلاً میرؔ، غالبؔ فیض احمد فیضؔ،فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی کے بارے میں سُنا تھا کہ یہ سب لوگ بڑے شاعر ہیں۔اُردوزبان کوسیکھنے اورادب بالخصوص شاعری کو پڑھنے کی تمنا تو تھی ہی۔چناں چہ خیال آیا کیوں نہ ان سے اپنا مدعا عرض کردوں۔میں نے کہا''سر مجھے اُردو پڑھنے کا شوق ہےاور کوئی استاد مِل نہیں رہا۔''پوچھا''کیا کرتے ہو۔؟''میں نے اپنے بارے میں بتایا۔انھوں نے پوچھا''اُردو پڑھ لیتے ہو''۔میں نے عرض کیا''پڑھ تو لیتا ہوں لیکن''الفاظوں''پر ماترائیں نہ ہونے کے سبب بعض اوقات لفظ کا صحیح تلفظ نہیں سمجھ پاتا۔اُنگلی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔میری بات کو بڑی توجہ سے سنا۔اور پھر گردن کو تھوڑا پیچھے کر کے فرمایا۔''الفاظ''جو خود جمع ہے''لفظ''کی مزید جمع بنانے کی ضرورت نہیں ماتراؤں کو اُردو میں اعراب کہتے ہیں۔پھر پوچھا''شاہ جہاں پور میں کہاں رہتے ہو؟''۔میں نے عرض کیا''شہید اشفاق اللہ کے مزار کے پاس کرائے پر۔''انھوں نے مجھے فوراً ٹوکا۔''مزار تو خدا کے ولیوں کا ہوتا ہے۔''میں نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے کہا''قبر کہنا چاہیے تھا۔''پھر گویا ہوئے کہ''اچھا کون سی کتابیں آج کل پڑھ رہے ہو۔''میں نے بتایا کہ ایک کتاب میرے پاس جس میں اُردو کے تمام بڑے شاعروں کا ذکر ہے۔''کہا کہ''اسے لے آنا۔''میں سلام کر کے باہر آ گیا۔اس روز شام تک گھر گھر پولیو خوراک پلاتے ہوئے اپنے کمرے پر لوٹ آیا۔

اس روز وہ کتاب مجھے ڈھونڈنے سے بھی نہ ملی جس کا ذکر میں رشید حسن خاں سے کر چکا تھا۔اگلے روز جب میں صبح سو کر اُٹھا تو میری نظر آلماری کے اوپر رکھے ہوئے کارٹون پر گئی۔اسے میں نے نیچے اُتارا۔وہ مطلوبہ کتاب اس کارٹون میں رکھی ہوئی مل گئی۔کتاب کا نام''اُردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ''تھا۔دوسرے روز جب میں پولیو خوراک پلانے کی غرض سے Polio Box لے کر محلّہ باڑوزئی جانے لگا تو کتاب کو پشت کی جانب پینٹ کی بیلٹ کے اندر اُڑس لیا۔جیسا کہ اکثر میں کہیں جاتا تو یہی کرتا تھا۔اُردو سیکھنے کا

یہ میرا ابتدائی دور تھا۔ اُردو کیسے پڑھی جائے یا اُردو کی کتابوں کو کس طرح رکھا جائے یہ سلیقہ میسر نہ آیا تھا۔ لیکن اُردو شاعری سے مجھے والہانہ محبت تھی۔ میری اُردو نوازی اور کو دیکھ کر ایک مرتبہ ٹرین میں ٹی ٹی ای نے میرے شعر سُن کر مجھے اُردو پڑھنے کا مشورہ دیا۔ لہٰذا اس کی بات سے متاثر ہو کر میں نے اُردو کی کتاب اپنے ساتھ رکھنا شروع کر دی اور وقت ملتے ہی نکال کر پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ چناں چہ وقت نکال کر میں رشید حسن خاں کے مکان پر جا پہنچا۔ گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا۔ غالباً خاں صاحب کے بڑے بیٹے خورشید حسن خاں تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں ''سر'' سے اُردو پڑھنے آیا ہوں۔ اس سلسلے میں ایک روز قبل ''سر'' سے اجازت مل چکی ہے۔ انھوں نے لائبریری کا دروازہ کھول کر مجھے اندر بٹھا دیا اور خود اندر چلے گئے۔ کچھ ہی لمحوں میں رشید حسن حسن خاں تشریف لائے۔ میں نے سلام کی غرض سے تو انھوں نے فوراً بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور کرسی پر بیٹھتے ہی مجھ سے پوچھا ''کہیے کون سی کتاب لائے ہو؟''۔ میں نے فوراً کمر میں اُڑسی ہوئی کتاب نکال کر میز پر رکھی۔ یہ دیکھ کر رشید حسن خاں کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ مجھے ڈانٹ کر کہا ''فوراً چلے جاؤ یہاں سے اور جب کتاب ہاتھ میں لے کر آؤ گے تب بات کریں گے۔'' میں گھبرا کر فوراً باہر نکل آیا۔

باہر محسوس کیا کہ میں پسینے میں شرابور ہوں۔ مجھے قطعاً خبر نہ تھی کہ میں کتاب کو کمر میں اُڑس کر بے حرمتی کا مرتکب ہوا۔ اپنی اس حرکت پر بہت نادم ہوا۔ راستے بھر سوچتا رہا کہ اُستاد اتفاق سے ہاتھ آیا، میری حرکت سے وہ بھی جاتا رہا۔ جب کئی دن ہو گئے اور میرے دل و دماغ سے کتاب کی بے حرمتی والے واقعے کا نقش کچھ دھندلا پڑا تو میں نے محسوس کیا کہ اگر وہ واقعی ناراض ہوتے تو یہ کیوں کہتے کہ ''جب ہاتھ میں کتاب لے کر آؤ گے تب پڑھاؤں گا۔'' چناں چہ میں نے پھر سے کمر کس لی۔ میں ان کے نام اور کام سے اب بھی ناواقف تھا۔ ہمّت کر کے کتاب لے کر ریلوے اسٹیشن کے کٹھ پُلے (لکڑی کا پُل) سے پار ہو کر محلّہ باڑو زئی میں رشید حسن خاں کے مکان پر پہنچا۔ لیکن دروازے پر دستک دینے کی ہمت نہ جٹا سکا۔ چناں چہ لوٹ آیا۔ سڑک پر آ کر خیال آیا کہ یہاں تک آیا ہوں تو مل کر ہی چلوں۔ لہٰذا اس بار مصمم ارادہ کر کے ان کے مکان پر پھر پہنچا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بڑی ہمت جٹا کر آخر دستک دے ہی دی اور جب اندر سے آواز آئی ''کون؟'' تو گھبرا کر میں نے اپنا نام بتایا۔ تو کہا ''آیئے''۔ لیکن اندر داخل ہونے سے قبل میں اس فکر میں تھا کہ کتاب کو کس طرح تھاموں تاکہ گذشتہ غلطی کی تلافی ہو جائے۔ آخر میں نے یہ طے کیا جس طرح قرآن کریم کو سینے سے لگا کر لے جاتے ہیں، اسی طرح میں بھی کتاب کو سینے سے لگا کر اندر داخل ہوں گا۔ سلام علیک کے بعد بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ غالباً کتاب کو سینے سے لگا ہوا دیکھ کر طنزاً مسکرائے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''کئی دن بعد آئے ہو؟'' میں گھبرا گیا اور کچھ جواب نہ بن پڑا، خاموش رہا۔ پھر انھوں نے پوچھا ''کیا پڑھ رہے ہو؟'' میں نے کتاب دکھاتے ہوئے کہا کہ جوش ملیح آبادی کو انقلابی شاعر کیوں کہا جاتا ہے؟ انقلاب کا مطلب کیا ہے؟ ملیح آباد کا تلفظ میں نے ملاح آباد کیا۔ جسے انھوں نے فوراً درست کیا کہ یہ لفظ ملیح آبادی' ہے۔ ملیح آباد اور اس کے آموں کے بارے میں انھوں نے کئی باتیں بتائیں۔ پھر بڑے اطمینان سے فرمایا۔ جوش انقلابی شاعر نہ تھے انھیں احتجاجی شاعر کہہ سکتے ہیں۔ اور صحیح معنوں میں انقلابی شاعر تو فیض احمد فیض ہیں۔ انقلاب کا مفہوم بتایا اور انقلاب 1857 اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ اس روز میں نے محسوس کیا کہ اُردو ادب کے بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ دوسرے روز میں اپنے استاد محترم نسیم شاہ جہاں پوری سے ملنے گیا۔ ان سے میں نے رشید حسن خاں کے ساتھ اپنی ملاقاتوں اور باتوں کا تذکرہ کیا۔ نسیم صاحب نے بتایا کہ وہ رشید حسن خاں ہیں۔ وہ شاعروں کو گھاس نہیں ڈالتے۔ ان سے ملنا پسند نہیں کرتے تمہاری ملاقات کیسے ہو گئی؟ تم تو شاعر آدمی ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میں یہ ظاہر ہی نہیں کیا کہ میں شاعری کرتا ہوں۔ کہنے لگے تم کو شاید معلوم نہیں وہ اُردو کے بہت بڑے محقق ہیں۔ دہلی یونی ورسٹی سے وابستہ رہے۔ سبک دوش ہونے کے بعد شاہ جہاں پور ہی میں رہتے ہیں۔ اُردو املا پر ان کا کام بہت معیاری ہے۔ کلاسیکی کتابوں کو انھوں نے از سر نو مرتب کیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں اس وقت ان سے بڑا محقق کوئی نہیں۔ یہ سُن کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور کچھ گھبراہٹ بھی کہ میں نے کہیں ان کی شان میں گستاخی تو نہیں کر دی۔

بہر حال! پھر میں اپنے سوالات لے کر رشید حسن خاں کے پاس جاتا رہا۔ اور وہ بڑے پیار سے مجھے جوابات سے مطمئن کرتے۔ نظیرا کبرآبادی، امام بخش ناسخ اور ان کی اصلاح زبان کی تحریک اور اوسط علی رشک سے متعلق انھوں نے بڑی عالمانہ گفتگو کی۔ لیکن وہ اب میرے ذہن سے محو چکی ہیں۔ ایک روز جب کچھ بات میں سے بات آگے نکلی تو میں نے عرض کیا کہ ''میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں، آپ کے بارے میں مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اُردو کے سب سے بڑے محقق ہیں اور املا کے ماہر بھی''۔ سُن کر مسکرائے۔ اور کہا ''کس نے بتایا ہے؟'' میں نے نسیم شاہ جہاں پوری کا نام لیا۔ بولے وہ بہت اچھے شاعر ہیں۔ اس کے بعد میں کلاسیکی ادب چھوڑ کر املا کی غلطیوں سے متعلق دقتوں کو ان کے سامنے رکھنے لگا۔ ایک روز املا سے متعلق بڑی تفصیل سے بتایا۔ پُرانے محققین نے املا کے سلسلے میں جو مطالعے پیش کیے ان کا بھی ذکر کیا لیکن میری سمجھ میں اس وقت کچھ نہ آیا۔ اپنی دو کتابیں ''انشا اور تلفظ'' اور ''عبارت کیسے لکھیں'' جو جامعہ مکتبہ لمیٹڈ، دہلی سے شائع ہوئی تھیں، مجھے عنایت فرمائیں۔ ان کتابوں کو میں اپنی زندگی کا سرمایہ تصور کرتا ہوں۔

رشید حسن خاں سے اُردو زبان و ادب سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے سائنس کی تعلیم کو ترک کر کے اُردو سے ایم۔اے کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد پہلی ہی کوشش میں NET (نیٹ) اُردو کی سند بھی حاصل ہو گئی۔

2001 میں میرا ایک دوست جو پہلے سے الٰہ آباد میں مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری کر رہا تھا مجھے الٰہ آباد لے آیا۔ میں یہاں آ کر پس و پیش میں پڑ گیا کہ کیا کروں۔ الٰہ آباد میں سول سروسز کی تیاری کا ماحول ہے۔ چناں چہ ایک کوچنگ میں داخلہ لے لیا لیکن طبیعت نہ لگی تھی۔ اتفاق سے ایک سمینار میں ہندوستان اکیڈمی میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے ان سے فون نمبر لیا۔ ایک روز فون کر ان کے یہاں پہنچ گیا۔ ان سے میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ تم پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہو تو

جے این یو (دہلی) یا جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) میں داخلے کا فارم بھردو۔ میں بازار سے جے این یو کا فارم لے آیا۔ پھر تحریری امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ جو سوالات گذشتہ برس پوچھے گئے تھے ان کو فاروقی صاحب سے Discuss کرتا۔ انھوں نے بھی میری بڑی ہمت افزائی فرمائی۔ اس طرح میں جے این یو داخل ہوگیا ایم فل کرنے کے لیے۔ میرا موضوع طے ہوگیا تھا۔ ایک روز جب میں گھر آیا تو رشید صاحب سے فون پر وقت لے کر ان سے ملنے شاہ جہاں پور پہنچ گیا۔ تقریباً چار برس بعد ان سے ملاقات ہوئی۔ انھیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں اُردو سے ایم فل کر رہا ہوں۔ میرے ایم فل کے موضوع ''مصحفی کا شعری اسلوب'' سے متعلق کئی مشورے دیے۔ فرمایا کہ مصحفی پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ ان کا کلام بہت ہے۔ بڑی محنت کرنا پڑے گی۔ مصحفی اور ان کے عہد سے متعلق جو بھی ملے پڑھ ڈالیے۔ ایم فل مکمل کرنے کے بعد میرا داخلہ 2005 میں پی ایچ ڈی کے لیے جے این یو میں ڈاکٹر مظہر مہدی کی زیرنگرانی میں ہوا۔ ڈاکٹر مظہر مہدی نے تحقیقی مقالے کا عنوان ''مصحفی کی شاعری اور ان کا عہد: ایک تنقیدی مطالعہ'' طے کیا۔ یہ تحقیقی مقالہ 2010 میں مکمل ہوا۔

دسمبر 2005 میں، میں پرائمری اسکول کا مدرس ہو کر پورن پور (پیلی بھیت) آ گیا۔ 1999 میں میں بریلی یونی ورسٹی بریلی (اب روہیل کھنڈ یونی ورسٹی، بریلی کے نام سے اسے جانا جاتا ہے) سے بی پی ایڈ (BPEd) کا کورس کر لیا تھا۔ اس بنا پر میری تقرری محکمۂ تعلیم برائے پرائمری، اُتر پردیش میں معاون استاد کے عہدے پر ہوئی۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ رشید حسن خاں کو فون کر کے ان سے ملاقات کا وقت طے کر لوں۔ لیکن افسوس اسکول اور دیگر خانگی ذمہ داریوں کے سبب میں ایسا نہ کر سکا۔ اور 27 فروری، 2006 کے اخبار میں جب میں نے پڑھا کہ اُردو کے مایہ ناز محقق رشید حسن خاں نہیں رہے تو اس وقت میری جو کیفیت تھی اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ بہت دنوں تک میں اپنی کوتاہی پر نادم رہا کہ ان سے ملنے کا وقت میں نے کیوں نہیں لیا۔

رشید حسن خاں کے انتقال کے بعد جاوید رحمانی اور محمد اشرف نے ان کی تحریروں اور شخصیت پر لکھے ہوئے مضامین پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی۔ ٹی آر رینا صاحب نے رشید حسن خاں پر اعلا درجے کا تحقیقی کام کیا۔ انھوں نے رشید صاحب کے خطوط کو دو ضخیم جلدوں میں ترتیب دیا۔ (رشید حسن خاں کے خطوط کی تیسری جلد بھی جلد ہی منظر عام پر آ جائے گی) علاوہ ازیں مقالات رشید حسن خاں جلد اول زیر طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ مقالات رشید حسن خاں کی دوسری، تیسری اور چوتھی جلد مکمل ہو چکی ہیں جلد از جلد یہ بھی منظر عام پر آنے والی ہیں۔ ٹی۔ آر۔ رینا صاحب نے 'رشید حسن خاں محقق اور مدون'' کتاب کو تخلیق کر رشید حسن خاں پر مزید تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والوں کے لیے راہ ہموار کیں۔ عزیز دوست ابراہیم افسر (میرٹھ) اپنا تحقیقی مقالہ (رشید حسن خاں کی ادبی جہات) لکھنے کے بعد ورشید حسن خاں پر مزید تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں۔ رشید حسن خاں پر لکھے گئے مضامین (تحقیق، تنقید، تدوین، املا، زبان و قواعد، خاکے، رپورتاژ، انٹرویو، خطوط، ورک شاپ وغیرہ پر جن صاحب نظر نے خامہ فرسائی کی) کو بڑی محنت، لگن اور جاں فشانی سے یکجا کیا ہے اور ضخامت اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ کئی جلدوں میں یہ مضامین جلد ہی منصۂ شہود پر آنے والے ہیں۔ رشید حسن خاں پر خود ابراہیم افسر کے تحقیقی نوعیت کے درجنوں مقالات ملک و بیرون ملک کے معیاری رسائل و جرائد (قندیل (لندن) مخزن لاہور، غنیمت (پاکستان) کتاب نما (دہلی) ہماری زبان (دہلی) نوائے ادب ممبئی) میں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کے رشید حسن خاں پر تحقیقی و تنقیدی کام کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری و ساری رہے۔

نوٹ: ڈاکٹر افتخار احمد قادری بالمعروف 'الف ناظم' اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ پی جی کالج، دیوبند (یوپی) کے شعبۂ اُردو میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ احقر کے کئی بار استفسار کرنے کے بعد موصوف نے اپنا تاثراتی مضمون بہ ذریعہ ڈاک ارسال کیا۔ احقر کو یہ تاثراتی مضمون 19 فروری 2018، بہ روز پیر موصول ہوا۔

○○○

رشید حسن خاں

سید اختر تلہری (شاہ جہاں پور)

محترمی رشید حسن خاں شاہ جہاں پوری ایک مستعد کثیر المطالعہ نوجوان ادیب ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ کی انشاپردازی کا ذوق سنجیدہ علمی مسائل سے نقد و بحث میں اپنے لیے دل چسپی کا سامان رکھتا ہے۔ موقر جریدہ ''الحمراء'' میں آپ کا مسلسل طولانی مضمون جو بہ عنوان ''اُردو زبان کی ترتیبِ نو'' کے تحت مختلف اقساط میں شائع ہوا ہے، اسی بلند ذوق کا نتیجہ ہے۔ بغاوت کی تحقیق و تمحیص بہت ہی زیادہ خشک ادبی مشغلہ ہے۔ اس تھکا دینے والے سفر کی کڑی منزلیں وہی ارباب ادب طے کر سکتے ہیں جو غیر معمولی صبر و ضبط کے عادی ہوں اور جنھیں ارزاں ہر دل عزیزی کی خواہش نہ ہو۔ رشید صاحب میں دونوں باتیں موجود ہیں اور اسی لیے وہ اس موضوع پر ایک خاصا وزنی مقالہ لکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

میں نے رشید صاحب کے محولۂ بالا مضمون کا اکثر حصہ غور سے پڑھا ہے۔ یہ کہنا تو فضول سی بات ہوگی کہ مجھے زیرِ نظر مضمون کے ہر لفظ سے اتفاق ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس موضوع کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ اس میں ہر اہم موڑ پر اختلاف کے گوشے نکل سکتے ہیں۔ چناں چہ ذیل میں ایسے بعض مقامات کے بارے میں مختصر طریقے سے اظہار خیال کیا جا رہا ہے:

(1) فروری 1952 کے الحمراء میں لائق مضمون نگار نے ''سرقہ'' (چوری) کی لغوی حرکت صرف بہ کسر الکھی ہے اور بہ سکون را کو مستعمل حرکت قرار دیا ہے، لیکن قاموس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''سرقہ'' کی لغوی حرکت بہ سکون را بھی ہے۔ والاسم السرقۃ بالفتح کفرحت'' قاموس۔

(2) اسی فروری نمبر میں ''باقر'' (نام) کی مستعمل حرکت صرف بہ فتح قاف لکھی ہے، حالاں کہ باقر بہ کثرت قاف بھی مستعمل ہے۔

(3) خفگی (خفا ہونا) کے بارے میں رشید صاحب نے لکھا ہے ''یہ خلاف قیاس حاصل مصدر ہے۔ خفا کے حقیقی معنی پوشیدہ کے ہوتے ہیں۔ آزردہ ہونے کے معنی غالباً مفرس ہے۔'' میرا خیال ہے کہ ''خفگی'' خفا سے ماخوذ نہیں ہے بل کہ فارسی کا ایک لفظ ہے ''خبہ'' جو ''خفہ'' کی صورت میں بھی مستعمل ہے جس کے معنی میں گلا گھونٹنا۔ خبہ کردن، فارسی محاورہ ہے بھی ہے۔ اسی ''خفَہ'' سے خفگی فارسی کے صرفی قاعدے سے بن گیا ہے اور اگر رشید صاحب کی تحقیق میں خود لفظ خ۔ خَفَہ فارسی الاصل بل کہ عربی لفظ خفا ہی سے بن گیا ہے تو ضرورت تھی کہ وہ اس مقام کو ذرا تفصیل سے لکھتے تا کہ صحیح صورتِ حال پر اطلاع ہوتی۔ اس صورت میں بھی خفگی کو خلاف قیاس حاصل مصدر لکھنے کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ خفا سے عجمی تصرف کے بعد اگر خفہ بن گیا تو پھر فارسی قاعدے سے ''خفَہ'' کا اسم خفگی کی صورت میں بن سکتا ہے۔

(4) ''مہارت'' کی مستعمل حرکت ''مُہارت'' بضم المیم لکھی ہے لیکن ''مُہارت'' بضم المیم مستعمل نہیں ہے بل کہ ''مَہارت'' میم کے فتح ہی کے ساتھ عام طور سے مستعمل ہے۔

(5) ''لُعَبتُ'' (گڑیا) کی مستعمل حرکت بہ فتح لام و ضم با لکھی ہے۔ ظاہر ہے یہ لفظ عوامی بول چال میں داخل نہیں ہے۔ خواص ہی میں مستعمل ہے اور جہاں تک میری سماعت کا تعلق ہے ''لُعَبت'' ضمہ لام اور فتح با کے ساتھ بولا جاتا ہے۔

(6) مارچ کے الحمراء میں رشید صاحب نے ''مرض'' کی مستعمل حرکت بہ فتح و سکون را لکھی ہے لیکن میں نے اسے ''مَرَض'' بہ فتح را ہی معتبر اہلِ زبان حضرات سے سُنا ہے۔ ''نسخہ'' کو ''نخسہ'' کہنے والے البتہ ''مَر ض'' بول دیتے ہیں لیکن اگر اس قسم کے استعمال کو سند جواز دی جاتی تو پھر زبان میں انتشار پیدا ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ مستعمل وغیر مستعمل حرکات کے فیصلہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ صرف چند بے سود عوام کے تلفظ پر اکتفا کر لینا کافی نہیں ہے۔

خود رشید صاحب نے ہر جگہ ''لغتی حرکت'' استعمال کیا ہے، جو لوگ اس لفظ کو بولتے ہیں، اُن میں ''لغوی'' رائج ہے۔ ایسی صورت میں ''لغوی'' کو چھوڑ کر ''لغتی'' کا استعمال غالباً خود اُس قانون کی خلاف ورزی ہے جس کی تاسیس و تشیید اس مضمون کا اصلی مقصد ہے۔

(رسالہ الحمراء، اگست 1953 لاہور، صفحہ 95 تا 96)

○○○

اوّل

رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں

مرتب ابراہیم افسر

Vol-1

RASHEED HASAN KHAN TEHREERO'N KE AAIENE MAIN

Edited by

Ibraheem Afsar

مرتب ایک نظر میں

نام : ابراہیم
قلمی نام : ابراہیم افسر
والد : افسر علی
والدہ : شکیلہ بانو
ولادت : 5 مارچ 1977
تعلیم : ایم اے (اردو، سیاسیات، ایجوکیشن) (میرٹھ کالج، میرٹھ)
ایل ایل بی : میرٹھ کالج، میرٹھ 2008
بی ایڈ : چودھری چرن سنگھ یونی ورسٹی، میرٹھ 2006
ایم فل : چودھری چرن سنگھ یونی ورسٹی، میرٹھ 2009
یو جی سی نیٹ : دسمبر 2010
پی ایچ ڈی : جاری...
ملازمت : ٹی جی ٹی اردو، ایس بی وی بلند مسجد، شاستری پارک، دہلی 110053

NEW BISMAH KITAB GHAR
Distributor:
Kitabi Duniya
1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan, Turkman Gate, Delhi-110006 (INDIA)
Mob:9313972589, Phone:011-23288452
E-mail:kitabiduniya@rediffmail.com, kitabiduniya@gmail.com
ISBN 978-93-84271-19-0
9789384271190
KITABI DUNIYA